اُٹھو! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا (ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلتے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر - بشیر احمد - بی، اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر - حامد علی خاں - بی، اے

فہرست مضامین

جلد ۱۲ — بابت ماہ جولائی ۱۹۲۷ء — نمبر (۱)

تصویر:- ماں اور بچہ۔

جہاں نما

ہندوستان یا قبرستان

برطانیۂ عظمٰی کے جاہ و جلال اسکی سطوت و جبروت اسکی عظمت و شوکت کا نقارہ اقصائے عالم میں بج رہا ہے اسکے سپہر آشوب لیّارے اسکی ہلاکت بار مشین گنیں اور اس کی اژدر دم توپیں کمزوروں کے تحفظ کیلئے وقف ہیں اسکی سلطنت کا آفتاب جس کی گیتی افروز تجلیاں اہل عالم کی نگاہ کو خیرہ کئے ہوئے ہیں دن اور رات برابر نقطۂ نصف النہار پر چمکتا رہتا ہے لیکن یہ المناک حقیقت یہاں بھی باطل نہ ہو سکی کہ چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہی ہوا کرتا ہے پس کیا تعجب ہے کہ جتنا بڑا یہ چراغ ہے اتنا ہی بڑا اس کے نیچے اندھیرا بھی ہو۔

ہندوستان تاج برطانیہ کا جگمگاتا ہوا ہیرا ہے اس نے برطانیہ کی کلاہ افتخار میں چار چاند لگا رکھے ہیں لیکن کسقدر تاسف کا مقام ہے کہ یہی ملک اسکے غیر مآل اندیشانہ تغافل کے باعث تباہی و بربادی کے اسفل السافلین میں گرا جا رہا ہے۔ اس ہیرے کی چمک روز بروز سلب ہو رہی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ کوئلہ کی سیاہی کے سوا اس سوختہ ساماں کی بساط ہستی پر اور کچھ نہ رہ جائے گا۔

وہ موت سے بدتر امن جو برطانیہ کی توپوں اور ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کے صدقہ میں ہندوستان کو میسّر ہے اس بدبخت ملک کے رخت حیات کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے طول و عرض ملک پر ایک خوفناک اقتصادی انحطاط مستولی ہے جسکے ساتھ ہمارا تعلیمی، تمدنی اور معاشرتی ہبوط تو ناگزیر تھا ہی لیکن افسوس کہ اب زندہ رہنے کا حق جو خدا کی اس زمین پر حیوانوں کو بھی حاصل ہے وہ بھی ہم سے چھن رہا ہے اور یہ اس سلطنت کا سب سے بڑا گناہ ہے جسے خدا نے کمزوروں اور ناتوانوں کے تحفظ پر مامور کر رکھا ہے

ملک کے نظام حکومت میں ایک آدھ اصلاح یا ایوان حکومت میں دو ایک نشستیں شاید ملک کے سرمایہ دار طبقہ کے مٹھی بھر افراد کو سامان طمانیت بہم پہنچا سکیں لیکن وہ نیم جاں جو پیٹ پر پتھر باندھے پھر رہے ہیں کونسل کی کرسی اور نظام حکومت کی اصلاحات کو کیا کریں۔

غریب روٹی کے لئے چلا رہے ہیں خلق خدا کروڑوں کی تعداد میں بھوکوں مر رہی ہے محض قیاس سے نہیں بلکہ اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کی نصف آبادی کو دن میں ایک وقت کا کھانا بھی پیٹ بھر کر میسّر نہیں ہوتا خود حکومت کے اعداد و شمار اس بات کے گواہ ہیں کہ ایک ہندوستانی کی روزانہ آمدنی بالاوسط ایک آنہ یومیہ سے زیادہ نہیں۔ کمی غذا اور فاقہ کشی نے ملک میں بھانت بھانت کی بیماریوں کو فروغ دے رکھا ہے ملک میں جسمانی انحطاط شروع ہو گیا ہے ہر طرف نحیف الجثہ زندہ درگور بھٹکتے نظر آتے ہیں ہندوستانیوں کی عمر کے اوسط پر اس افلاس کا جو اثر ہوا ہے اسکی تفصیل یوں ہے۔ انگلستان میں انسان کی عمر کا اوسط ۵۱٫۵ ہے، امریکا میں ۵۰، فرانس میں ۴۸٫۵ جرمنی اور اٹلی میں ۴۷ جاپان میں ۴۴٫۳ اور ہندوستان میں صرف ۲۴٫۷۔ اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان میں موتیں بہت قبل از وقت واقع ہو رہی ہیں خود حکومت کے بیان کے مطابق ہر سال بیس لاکھ سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں اور جو بچ جاتے ہیں وہ بھی ماحول کی ناموافقت کی وجہ سے انتہا درجے کے کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں قحط اور فاقہ کشی سے جو موتیں واقع ہوتی ہیں وہ اس سے علاوہ ہیں۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں دوسرے ملکوں میں اوسط مرگ ۹ یا ۱۰ اور زیادہ سے زیادہ ۱۹ یا ۱۶ فی ہزار ہے۔ وہاں ہندوستان کا اوسط مرگ ۳۰ فی ہزار ہے

افلاس نے ہماری تہذیب ہمارے تمدن ہماری معاشرت کا نام و نشان مٹا دیا ہے اور اب خود ہمیں قبر کی طرف دھکیل رہا ہے۔ آہ! ہندوستانی قوم فنا ہو رہی ہے اور یہ ملک قبرستان بن رہا ہے + برطانیہ کے پاس اس درد کا کیا علاج ہے اور ہندوستانی اسکے حصول کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ماں اور بچہ

حکمائے مغرب کے خیالات

ماں

۱۔ میں جیسا بھی ہوں مجھے میری ماں نے بنایا۔

۲۔ ایک اچھی ماں ہزار معلموں سے بہتر ہے۔

۳۔ شباب پژمردہ اور عشق افسردہ ہو جاتا ہے اور دوستی کے باغ میں بھی پت جھڑ شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن ماں کی امید اسکے سینہ میں ہمیشہ فروزاں رہتی ہے۔

۴۔ دنیا میں بی بی سے بہتر ایک ہستی ہے اور وہ ماں ہے۔

۵۔ انسانی اقوال اور انسانی افعال اور انسانی خیال سب ماں ہی کی محبت سے

۶۔ ماں کے دل سے نکلی ہوئی نیک دعائیں دو جہاں کی کامرانی کی کفیل ہیں۔

۷۔ ماں کی محبت کے حسن اور اسکی محبت کی طاقت اور عظمت کی تشریح سے دنیا کی تمام زبانیں قاصر ہیں۔

۸۔ وہ نظارہ افسردہ دلوں کو بھی تسکین دے جاتا ہے جب کوئی گلشن ماں اپنے ننھے سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی ہو اور وہ بانہیں پھیلائے ناچتا اور اپنی غوں غاں میں اس کی باتوں کا جواب دے رہا ہو۔

۹۔ یہ امر مسلم ہے کہ نیکی اور ذہنی خوبیاں اور تمام دوسرے فطری محاسن انسان کو اپنی ماں سے ورثہ میں ملتے ہیں۔

بچہ

۱۔ بچہ ایک فرشتہ ہے جو انسان کا محتاج ہے۔

۲۔ بچے انسانیت کے آج کی کل ہیں

۳۔ ہم بچوں کی تربیت کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن شاید ہمیں یہ معلوم نہیں کہ بچے بھی ہماری تربیت کرتے ہیں۔

۴۔ میں اپنے بچوں کو ان کی خطاؤں پر بار بار پیٹنا نہیں چاہتا۔ مبادا ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ جسمانی ایذا ہی سب سے بڑی سزا ہے

۵۔ مجھے ان ننھے لوگوں سے محبت ہے اور اگر یہ جنہیں خدا کی حضور سے آئے زیادہ دیر نہیں گزری کسی سے محبت کریں تو اسے اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونا چاہئے!

۶۔ بچوں کی تربیت کوئی معمولی بات نہیں یہ ایک فن ہے جسکی تحصیل کیلئے ہمیں وقت صرف کرنا چاہئے۔

۷۔ ہماری بیت میں جو کسر عورت اٹھا رکھتی ہے اُسے بچے پورا کر دیتے ہیں

۸۔ بچوں کے لئے نہ ماضی کا غم ہے نہ مستقبل کا خوف اور جو نعمت ہمیں شاید ہی کبھی میسر آتی ہو وہ انہیں حاصل ہے یعنی وہ اپنے حال میں مست رہتے ہیں۔

۹۔ خدا نے تمہیں بچے دیئے ہیں تاکہ انکا نظارہ تمہیں وقتاً فوقتاً خدا کی رحمت کی یاد دلاتا رہے اور تم سچی عقیدت سے اسکی تسبیح بیان کر سکو۔

حامد علی خاں

حضرت گرامی کی وفات

گزشتہ مہینے کا پرچہ چھپ چکا تھا۔ کہ ہمیں ملک الشعرا حضرت مولانا غلام قادر صاحب گرامی کی وفات کی اطلاع ملی انا للہ وانا الیہ راجعون

۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو فارسی شعر کا یہ آفتاب اپنی عمر کی پچاسی منزلیں طے کر کے افق ہوشیارپور میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا اس قومی حادثہ پر ملک کے ادبی حلقوں میں ماتم کی صفیں بچھی ہوئی ہیں اور ملک اس عظیم نقصان کیلئے جسکی تلافی محال ہے۔ یقیناً مدتوں سوگوار رہے گا۔

ہمیں اس حادثہ میں حضرت مرحوم کے تمام متعلقین اور بالخصوص ان کی اہلیہ محترمہ جناب اقبال بیگم صاحبہ ترک سے دلی ہمدردی ہے خدا مرحوم و مغفور کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور انکے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ہم حضرت گرامی کی اہلیہ محترمہ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے گرامی نامہ میں ہمایوں کے لئے حضرت ممدوح کا غیر مطبوعہ کلام عنایت فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔

حضرت گرامی کے ایک آخری خط کا نقش اور چند غیر مطبوعہ اشعار جو انہوں نے ہمیں کچھ عرصہ قبل ارسال فرمائے تھے ہم ذیل میں تبرکاً درج کرتے ہیں۔

خدمت اقدس حضرت حامد تسلیم

ہفتہ وار رسالہ گرامی ایک ساقی شعر کی غزل ہوتا ہے کیا ہمایوں کے قابل ہے

ممکن ہے کہ ہمایوں کی صحبت سے یہ غزل بھی ہمایوں ہو جائے قول ہے

گرامی ادھر سے دور ہوتا جاتا ہے اور اُدھر سے نزدیک ایک حکیم کا یہ دلکو دیز [illegible]

گرامی کا پیمانہ عمر لبریز ہو گیا ہے

دوری میں نزدیکی ہے اور نزدیکی میں دوری ہے

[illegible] اور جانشر؟ کی نسبت کچھ کسور؟ ہے ہمایوں کی نذر ہوگا

نوحۂ گرامی

مُرد ہے شاعرِ گرامی مُرد ۱۳۴۵ھ

آسماں پھر ہے مائلِ بیداد — آج پھر وا ہوئے لبِ فریاد
آج پھر قصۂ غمِ ماضی — اہلِ عالم کو آ رہا ہے یاد
او فلک او عدوئے اہلِ زمیں — او ستم پیشہ او ستم ایجاد
تو نے تاراج کر دیئے گلشن — تو نے کردی ہیں بستیاں برباد
تیرے ہاتھوں ہے تنگ اک دنیا — کیا گرفتار اور کیا آزاد
آج تو نے ہمیں وہ زخم دیا — جس سے خوں ہوگیا دلِ ناشاد
تو نے چھینا وہ شاعرِ یکتا — جس کو کہتے ہیں سب جہاں استاد
اس کا ماتم بپا ہے عالم میں — لب ہر ایک کے ہے یہ فریاد
بلبلِ باغِ خوش کلامی مرد
مُرد ہے شاعرِ گرامی مُرد ۱۳۴۵ھ

آفتابِ سپہرِ علمِ سخن — ہوگیا خاک میں نہاں افسوس
اڑ گیا عندلیبِ خوش الحاں — آج ویراں ہے گلستاں افسوس
کارواں میں نظر نہیں آتا — آج سالارِ کارواں افسوس
لے گیا رازِ دل کے دل ہی میں — وہ حقیقت کا رازداں افسوس
ڈھونڈھنے اسکو اب کہاں جائیں — اسکی منزل ہے بے نشاں افسوس
آج مرنے سے اک گرامی کے — مرگئی فارسی زباں افسوس
سوگ میں حضرت گرامی کے — ایک عالم ہے نوحہ خواں افسوس
اس کا ہندوستاں میں ماتم ہے
اس کا سارے جہاں میں ماتم ہے

پوچھتے کیا ہو رنجِ پنہانی — غم سے خونِ جگر ہوا پانی
تجھ سے کیا دل لگائیں اے دنیا — تیری ایک ایک چیز ہے فانی
بزم میں اب وہ خوش نوا نہ رہا — جسکے دم سے تھی زمزمہ خوانی
اسکی ایک ایک بات میں نکتہ — اس کا ایک ایک شعر لاثانی
وہ تھا اپنے کمال کی تصویر — وہ تھا اک پیکرِ ہمہ دانی
ناز کرتے تھے اس پہ اہلِ سخن — وہ تھا ہندوستاں میں خاقانی
مرگیا ہائے وہ سخن پرور — جس پہ نازاں تھی خود سخندانی
بزم میں ماتمِ گرامی ہے — لوگ کرتے ہیں مرثیہ خوانی
اس کو سب سوگوار روتے ہیں
اسکو سب اس کے یار روتے ہیں

ہائے وہ مردِ صاحبِ اعجاز — ہائے وہ رشکِ بلبلِ شیراز
ہائے وہ ہم زبانِ عارفِ روم — ہائے روح القدس کا وہ ہمراز
ہائے وہ خوشنوا خوش گفتار — ہائے وہ خوش ادا و خوش انداز
ہائے وہ صدرِ بزمِ اہلِ سخن — ہائے وہ تاجِ سر سخن پرداز
ہائے وہ خاکسارِ خاک نشیں — ہائے وہ طائرِ فلک پرواز
ہائے وہ عالمِ رموزِ سخن — ہائے وہ علم کامل سرراز
ہائے وہ عندلیبِ بزمِ سخن — ہائے وہ نغمہ سازِ نغمہ نواز
اٹھ گیا ہائے وہ سخن آرا — مرگیا ہائے وہ سخن پرواز
بزم میں کیا رہا ہے اب باقی
بزم سے اٹھ کے چل دیا ساقی

مرگیا وہ خوش بیاں افسوس — مرگیا شاہ شاعراں افسوس

ہائے وہ نامدارِ جالندھر — باعثِ افتخارِ جالندھر
خاک اڑتی ہے جس طرف دیکھو — اب کہاں وہ بہارِ جالندھر

آج افسوس ہوگیا خاموش بلبلِ بیقرارِ جالندہر
ہوگیا خاک خاک میں مل کر ہائے وہ خاکسارِ جالندہر
دے گیا داغ آج دنیا کو وہ گلِ لالہ زارِ جالندہر
اُٹھ گیا آج اپنی محفل سے شاعرِ باوقارِ جالندہر
مر کے ہشیارپور سے نہ ٹلا ہائے وہ ہوشیارِ جالندہر
اُس پہ نازاں تھی بستیاں اپنی اس سے تھا اعتبارِ جالندہر
پیکرِ حسنِ آدمیت تھا
ملک میں فخرِ ملک و ملت تھا

اسکی ایک ایک بات مستانہ وہ تھا پیری میں پیرِ میخانہ
دل تھا درویش دوست پہلو میں دی تھی ہمت خدا نے شاہانہ
فقر پر اپنے ناز کرتا تھا ٹھاٹھ رکھتا تھا وہ امیرانہ
ہم نے دیکھے ہیں عاقل و ذی ہوش کوئی دیکھا نہ ایسا فرزانہ
پُوچھتے کیا ہو ہم سے کیا کیا تھا وہ تھا ہشیار وہ تھا دیوانہ
ایک عالم تھا آشنا اسکا ایک عالم سے تھا وہ بیگانہ
پند و حکمت میں اسکا اک اک قول گویا اک وعظ تھا حکیمانہ
بزمِ رنداں میں اسکا اک اک حرف گویا فقرہ تھا ایک رندانہ
عالمِ علمِ خوش بیانی تھا
واقفِ رمزِ نکتہ دانی تھا

شاعرِ خوش مقال تھا نہ رہا اک ہی باکمال تھا نہ رہا
اسکا ثانی کہاں سے لائیں اب آپ اپنی مثال تھا نہ رہا
ہوچکی اب جہاں میں فکرِ سخن ایک ہی خوش خیال تھا نہ رہا
اس کے دم ہی سخن کی عزت تھی مردِ عز و جلال تھا نہ رہا
عاشقانِ سخن کی محفل میں شاہدِ خوش جمال تھا نہ رہا
کون اخلاق اب سکھائیگا ایک وہ خوش خصال تھا نہ رہا
بزمِ رنداں کے دورِ آخر میں صاحبِ وجد و حال تھا نہ رہا
اس کی ہستی سے بزمِ یاراں میں اپنا جاہ و جلال تھا نہ رہا
اٹھ گیا باعثِ بہارِ چمن
کیوں نہ ماتم کریں ہزارِ چمن

آج نغمہ سرا ہزار نہیں آج گلشن میں وہ بہار نہیں
کیوں نہ دنیائے شعر ہو تاریک آج خورشیدِ افتخار نہیں
کس سے لیں داد شعراء شاعر بزم میں کوئی باوقار نہیں
اٹھ گیا دہر سے سخن پرور اب سخن کا کچھ اعتبار نہیں
جس پہ کرتی تھی ناز اک دنیا آج وہ فخرِ روزگار نہیں
کس کی جولانیاں کوئی دیکھے آج میداں میں شہسوار نہیں
مرگ پر حضرتِ گرامی کی کونسی آنکھ اشکبار نہیں
کیوں نہ اقلیمِ شعر ہو برباد اب کوئی اسمیں تاجدار نہیں
بزم سے اُٹھ گئے سب اہلِ کمال
بزم میں رہ گیا فقط اقبال

میکدے میں تھا ایک ہی مے نوش وہ بھی افسوس ہوگیا مدہوش
سارے گلشن میں ایک بلبل تھا ہائے وہ آج ہوگیا خاموش
کتنا حیرت نما ہے یہ منظر ہے لحد آج پیر در آغوش
اٹھ گیا بزم سے جو ساقی تھا کیوں نہ ماتم بپا کریں بیہوش
اسکی ہر بات آفتِ صد عقل اسکا ہر شعر آفتِ صد ہوش
شاعرانِ سلف کی وہ تصویر آج آنکھوں سے ہوگئی روپوش
مانگو حق سے دعا اے آذر قبر پر کیوں کھڑے ہو تم خاموش
اے خدا حضرتِ گرامی کی تربتِ عنبریں رہے گلپوش
روز و شب فضل و رحمتِ یزداں
باد بر ایں مزارِ گل افشاں

آذر جالندہری

سمندر کی موج

اس نظم کی بحر اور شعر میں بالکل نئی ہے اور اردو کی اکثر بحروں سے اس طرح ممتاز ہے کہ عربی عروض کی بجائے اس کی بنیاد ہندوستان کی موسیقی پر ہے۔ اسی اعتبار سے اس میں وہ عروضی آزادیاں نظر آئیں گی جو پنگل میں روا رکھی جاتی ہیں (مدیر)

تو چھوڑ کر آئی ہے وہ نیلی دوریاں جُھک کر جہاں نیچے کو تکتا ہے آسماں
بے کل زمیں اٹھلا کر اوپر کو اٹھتی ہے اور پیار سے ملتے ہیں دونوں کے لب جہاں

دھیمے سروں میں نالے کرتی ہے کس لئے؟ کیا گونج ہے میٹھی سی اس تیرے راگ کی!
میں رات بھر سُنتا ہوں ساحل کی ریت پر پُھنکار پانی کے اک لہراتے ناگ کی

سورج کا عکس تیرے دل میں لرزتا ہے ہیں اس کی چنچل کرنیں تیری سہیلیاں
بیتاب ہو کر پھر کیوں تو اُڑتی آتی ہے؟ اپنی ہمجولیوں سے کرتی اٹکھیلیاں

*

"میں بیٹی ہوں اس نیلے، گہرے سمندر کی   میں لاڈلی ہوں بادل بجلی طوفان کی
تھپکا تھپکا کے مجھ کو پالا ہے چاند نے   مجھ پر برکھا لگی ہے اس کے احسان کی

"ابھری ہوں لیکن اپنے نیلے گہوارہ سے   لے کر تڑپ ناگن کی طینت سیماب کی
میرے جگر میں دیکھو گرمی شراروں کی   میری رگوں میں پاؤ سوزش تیزاب کی

"اک میٹھا میٹھا میرے سینہ میں درد ہے   کچھ ہلکی ہلکی دل میں چبھتی ہیں سوئیاں
ساحل جہاں لیٹا ہے پھیلا، رُوٹھا ہُوا   کرنے وہاں جاتی ہوں اسکی دلجوئیاں

"سورج ڈوبا۔ تاروں کی آنکھیں جھپکتی ہیں   ہاں اک خدا اور میری اُلفت بیدار ہے
ہو کر مجبور بڑھتی ہوں ساحل کی طرف   میں ہوں مجبور مجھ کو ساحل سے پیار ہے

"دنیا میں عشق ازل سے آزاد آیا ہے   آزادی اس کا زیور، آزادی زینت ہے
جو عقل اور راحت کی سیمیں زنجیر میں   پھنس کر رہ جائے وہ بھی کوئی محبت ہے

"اڑتی ہوئی بجلی ہوں، چھایا ہوا بادل   اب رعد کے نعروں میں میری للکار ہے
خورشید کے دل میں ہے گرمی مرے دل کی   اور چاند کی کرنوں میں میری رفتار ہے

"جب پھیلتی ظلمت کے سینہ سے اُٹھتا ہے   لہراتا چکّر کھاتا دھندلا کالا دھواں
شبنم کی خاموشی سے نیلم کے دریا میں   جب تیرتی آتی ہیں مرمر کی مچھلیاں

جب آبنوسی سایوں کے نیلے ماتھے پر   ہوتی ہے نتھری نتھری چاندی جڑی ہوئی
اور آسماں کے گنبد تک باہنیں پھیلائے   ہوتی ہے شب کی کالی دیوی کھڑی ہوئی

"جب ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں دھیمی ہواؤں کی   پانی میں ہو جاتی ہیں لہریں بن کر رواں
میں تلملا کر اپنے بستر سے اُٹھتی ہوں   اور گھومتی پھرتی ہوں — جانے کہاں کہاں

"معشوق اور عاشق میں دوئی بھلا کیوں ہو؟   اُٹھوں اور اٹھ کر ساحل سے ایک ہو جاؤں
میرے جگر کے ہیرے ساحل پہ بکھرے ہوں   اپنے سینہ کی دولت ساحل پر ڈال دوں

"ساحل کا منہ دھوؤں اور ساحل کا منہ چوموں ساحل کو لپٹا لوں اور ساحل پر جان دوں
پیچھے ہٹوں اور ہٹ کر دیکھوں اُسے ۔ اور پھر اس سے لپٹ جاؤں اور اسکی بلائیں لوں"

آتی ہے تو افق کے نیلے دھندلکے سے چھینٹیں اڑاتی گاتی دامن کو پھاڑتی
تُو آتی ہے اور ساحل کو چُوم لیتی ہے یہ آخری منزل ہے تیری محبّت کی

ساحل ہی لیکن تجھ سے جب ایک ہو گیا پھر ساحل اور ساحل کی خودداریاں کہاں
اور جب ساحل سے لگ کر تو خود ہی سو گئی تیری الفت اور اس کی بیتابیاں کہاں

کھنچتا چلا آتا ہے تیری آغوش میں ساحل پگھل کر تیرے بوسوں کی آگ سے
اور آسمان پر تارے جھک جھک کے سنتے ہیں مستی چھائی ہے تیرے فرقت کے راگ سے

تیری فرقت کے دم سے تیری محبت میں محشر کی شورش ہے اور گردوں کا اوج ہے
تُو چھوڑ کر ساحل کو بجلی ہے عشق کی ساحل سے آلگی تو پانی کی موج ہے

وہ راز جس سے تیرا سینہ ابھرتا ہے تاروں میں جھلملاتا شبنم میں روتا ہے
اک پیاری سی خلش ہے فرقت سے عشق کو جب یہ خلش مٹ جائے تو عشق سوتا ہے

گر یہ خلش مٹ جائے تو جتنی بھی چیزیں دنیا میں ہوں وہ اپنے ہونے سے شرمائیں
بجلی دبک کر بادل کی گود میں سوئے سورج بجھ جائے، تارے تاریک ہو جائیں

اُلفت کی کامرانی ہے تیری ناکامی ہر دم تڑپتی رہ اور ہر دم مہجور رہ
ساحل سے دُور رہ اور ساحل سے پیار کر ساحل سے پیار کر اور ساحل سے دُور رہ

"بیگانہ"

جو عورت اپنے شوہر اور اپنے بچوں کو خوش رکھتی ہے۔ جو شوہر کو برائی سے بچاتی اور بچوں کو نیکی کی تلقین کرتی ہے وہ اُن عورتوں سے بدرجہا افضل ہے جن کا ذکر افسانوں میں آتا ہے اور جن کا کام بنی نوع انسان کو اپنی آنکھوں سے ہلاک کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گولڈ سمتھ

بدویت و حضریت

انسان کسی پیشہ کا ہو دو حالتوں میں سے ایک اختیار کرتا ہے، حضریت یا بدویت فی زماننا ہم نے دونوں حالتیں اختیار کر رکھی ہیں۔ لیکن پھر بھی شہر، قصبہ یا گاؤں ہمارا وطن ضرور ہے۔ وقتاً فوقتاً ہم دوسرے شہروں اور دور دراز ملکوں میں تجارت یا سیاحت کے لئے جاتے ہیں تاہم ایک خاص مقام ایسا ہوتا ہے جس کو ہم وطن کہتے ہیں اور جہاں خوشی کے ساتھ واپس ہوتے ہیں۔ بدویت ہماری جبلی عادت نہیں لیکن بعض اقوام اسکی عادی ہیں مثلاً مشہور قوم بدوی۔ کونسا شخص ایسا ہوگا جس نے عرب اور شمالی افریقہ کے بدّؤں کی وحشیانہ زندگی کے دلچسپ افسانوں اور ان کے بے نظیر اور بے بہا گھوڑوں کے حالات نہ سنے ہوں جو ان کو اپنی اولاد کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اوصاف حمیدہ، شجاعت، مہمان نوازی، فیاضی اس کے ساتھ ہی قزاقی اور لوٹ مار کے قصّوں سے کس شخص نے لطف نہ اٹھایا ہوگا۔

درحقیقت وہ نہایت نجیب، عالی نسب، اور بزرگ قوم ہے خانہ بدوشی اس کی جبلی عادت نہیں بلکہ ملکی حالت نے اُن کو خانہ بدوش اور قزاق بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ریگستان میں شہر آباد نہیں کر سکتے کیونکہ چراگاہوں کے چھوٹے چھوٹے قطعات اور مختصر نخلستان (جن کی شادابی کسی ننھا اور ادا اس چشمہ پر منحصر ہوتی ہے) ایک دوسرے سے بہت دُور اور آباد خطّوں سے بہت فاصلہ پر واقع ہیں۔ یہ مقامات ان کی ضرورتیں صرف چند ہی روز پورا کر سکتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو اسی وجہ سے وہ ایسے اُجڑے دیار میں کسی جگہ مستقل اقامت اختیار نہیں کر سکتے۔

جنوبی عربستان میں نیز سمندر کے کنارے جہاں جہاں زمین شاداب اور قابلِ زراعت ہے وہاں وہ دیگر اقوام کی طرح آباد ہیں۔

ایک ہزار سال قبل جب عربوں نے یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے وسیع دولتمند ملکوں کو فتح کیا تو وہ صرف بے نظیر کاشتکار ہی ثابت نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے بعض نادر شہروں کے بانی اور اعلیٰ درجہ کے دانشمندانہ قوانین کے مخترع نیز علم و فضل و ہنر میں یکتائے روزگار تسلیم کئے گئے۔

شمالی روس سائبیریا اور وسط ایشیا کی خانہ بدوش اقوام عرب کے بدوؤں سے مختلف ہیں۔ ان میں عربوں کی سی خداداد ذکاوت نہیں ہے تاہم یہ اقوام جلد کاشت کی طرف مائل ہو کر آباد ہو جاتیں اگر بھیڑ اور گھوڑے ان کی دولت نہ ہوتے جن کے چارہ کی غرض سے چراگاہوں کی تلاش میں وہ مختلف مقامات میں پھرتی رہتی ہیں۔ نمدہ کے ڈیرے اور

اور معدودے چند ظروف ساتھ ہوتے ہیں یہ لوگ شیر مادہ اسپ اور بھیڑ کے گوشت پر بسر کرتے ہیں۔

دور و دراز ملک امریکہ کی رڈ انڈین قوم بھی بدویت کا عجیب نمونہ ہے وہ لوگ سب سے زیادہ خونخوار اور وحشی ہیں اور شکار پر گذر کرتے ہیں +

عہد عتیق میں دور حاضرہ کے خلاف حضریت شاذ و نادر اور بدویت عام تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ انسان میں ادراک پیدا ہوتے ہی دیگر ضروریات۔ کے احساس کے علاوہ عمدہ اور خوشگوار مقامات کی تلاش بھی لابد ہوتی ہے +

اگر غور کیا جائے تو بنی آدم کی زندگی کے چار مدارج ہیں۔ صیادی۔ راعیت۔ زراعت اور حکومت۔

صیادی۔ جب بنی آدم کا مسکن غار اور گذر چوپایوں کے شکار پر تھی جن کے گوشت سے شکم پروری اور چرم سے تن پوشی ہوتی تھی اس وقت بھی ان کو اکثر جرگھوں یا خاندانوں کی صورت میں بدویت اختیار کرنی پڑی ہوگی۔ خواہ زبردست وحشی جانوروں کے خوف سے (جن سے ایک زمانہ میں دنیا پُر تھی اور جو غاروں کے رہنے والوں کو نقصان پہنچاتے ہونگے) خواہ نسل کی افزونی کے باعث سکونتی غار ناکافی ہوگیا ہو خواہ خاندانی نفاق دوسرے مقام کی تلاش کا سبب ہوا ہو یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس مقام سے چل کر کہیں نہ کہیں عارضی طور پر اُن کا قیام ضرور رہا ہوگا مگر مندرجہ بالا وجوہ سے اس مقام کو بھی ترک کر کے کسی اور خطّہ میں مقیم ہوئے ہونگے۔

اس میں کلام نہیں کہ ایک مقام چھوڑنے کے بعد اس طرف ان کا گذر پھر نہیں ہوا ہوگا۔ اور نہ رشتہ داروں سے جدائی کے بعد دوبارہ ملے ہونگے گو اس مقام کی تصویر اور خاندان کی یادگار رسم و رواج اُن کے دلوں میں اور ابتدائی سیدھے سادھے ہنر اور فن جو انہوں نے سیکھے تھے اُن کے دماغ میں ہمیشہ تازہ رہے ہونگے۔

راعیت۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ سب سے پہلے کس نے گھوڑے کو زیر اور دیگر جانوروں کو رام کیا لیکن بلا شبہ حضرت انسان اس اپنے ارادہ میں خوب کامیاب ہُوئے۔

صحرائی اور خونخوار زندگی سے گذر کر شائستہ پیشۂ لبانیت اختیار کرنا واقعی انسان کے طرز معاشرت اور خیالات میں ایک عظیم انقلاب کا ثبوت ہے۔ اس تغیر کے ساتھ ہی قبضۂ ملک کے احساس نے بھی (جو تمدنی ترقی و تہذیب کے اصول میں داخل ہے) بھیڑ اور گھوڑوں کی نسل افزائی کے ساتھ ساتھ (جو خانہ بدوش اقوام کی دولت ہے) ضرور ترقی شروع کی ہوگی لیکن اس قسم کی دولت یا ملک کسی ایک مقام پر آباد ہونے یا خاندان کو ملے جلے رہنے کی طرف مائل نہیں کرسکتی۔ کیونکہ بھیڑوں کے گلے اور گھوڑوں کے غولوں کے واسطے وسیع چراگاہوں کی ضرورت ہوتی ہے جو چند ہی روز کے قیام میں صاف ہو کر دوسری چراگاہوں کی تلاش پر مجبور کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسی ملک کے مالکوں کا، خواہ ایک جگہ ہی کے کیوں نہ ہوں، ایک دوسرے سے جدا رہنا

متناسب تصوّر کیا گیا ہے تاکہ ایک کا جانور دوسرے کے ہاں نہ چلا جائے اور نہ ایک قدرتی چشمہ و چاہ سے دو مالکوں کے جانور سیر ہوں جو بہت جلد خشک ہو جانے کے باعث موجب تکلیف و فساد بن جائیں۔ اس کی صداقت توریت سے ہوتی ہے جس میں دنیا کی قدیم خانہ بدوش اقوام کے صحیح و دلچسپ حالات درج ہیں۔ اور جو حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور اُن کے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام اور دیگر بزرگان دین یہود کے حالات اور طرز معاشرت پر روشنی ڈالتی ہے توریت کے باب ۱۳ آیات ۵ سے ۷ تک میں درج ہے "اور لوط کے پاس بھی جو ابراہیم کا ہمسفر تھا بھیڑ۔ بکری۔ گائے بیل اور ڈیرے تھے۔ وہ سرزمین ان کے واسطے ناکافی تھی کیونکہ اُن کے پاس اس قدر مال تھا کہ وہ باہم نہیں رہ سکتے تھے۔ ابراہیم اور لوط کے چرواہوں میں جھگڑا ہوا۔ کنعانی اور فرزّی اس وقت ملک میں آباد تھے۔

ابراہیم نے لوط سے کہا کہ میرے اور تیرے درمیان اور میرے اور تیرے چرواہوں میں جھگڑا نہ ہو کہ ہم بھائی (عزیز) ہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ تم مجھ سے جدا ہو۔ سارا ملک تمہارے سامنے ہے۔ اگر تمہارا ارادہ بائیں طرف سفر کرنے کا ہے تو میں دہنی طرف جاؤں گا (اس گفتگو کے بعد) لوط نے سیرون کی ترائی اپنے لئے پسند کی اور مشرق کی طرف راہی ہوا۔ ابراہیم اور لوط ایک دوسرے سے جدا ہو گئے"۔ اسی طرح عیسو بن اسحاق علیہ السلام کے متعلق توریت کے باب ۳۶ آیت ۶ سے ۸ تک میں بیان ہے "عیسو اپنی ازواج بیٹیاں بیٹے، خدام، مال، اسباب اور ساری دولت جو اُس نے کنعان میں حاصل کی تھی لے کر اپنے بھائی یعقوب سے جُدا ہوا کیونکہ اس کا اسباب اس قدر وافر تھا کہ ایک جگہ رہنے کی صورت نہ ہو سکی اور وہ سرزمین جس میں وہ مسافر تھے اُن کے مویشی کیلئے کفایت نہ کر سکی لہذا عیسو کوہ شعیر پر چلا گیا"۔

قدیم زمانہ میں شاداب میدانوں کے غیر آباد ہونے کی وجہ سے یہ بڑی سہولت تھی کہ جس نے جو خطّہ پسند کیا اس پر قابض ہو گیا، جھگڑے اور کُشت و خون بھی نہیں ہوتے تھے کیونکہ نزاع بدلنے سے پہلے کوچ بدل دیا جاتا تھا لیکن یہ تمام باتیں اس وقت تک ہی حاصل تھیں جب تک کہ کوئی قوم سفر کرتے کرتے عاجز ہو کر کسی مقام پر آباد نہ ہو گئی ہو یا کسی مقام کو دلفریب پا کر بدویت کو خیر باد نہ کہہ دیا ہو اور اپنی قوت کے موافق ملک کے حدود قایم نہ کر لئے ہوں۔

زراعت ۔ کاشتکاری کے بغیر حضریت حاصل نہیں ہوتی۔ کاشتکاری ہی سے تمدن۔ حکومت اور تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو کاشتکار کی جھونپڑی ہی سے ریاست کی ابتدا ہے کیونکہ کاشت کے مختلف کام۔ مویشی کی نگہداشت دودھ دہی کے انتظام اور امور خانہ داری کے سرانجام کیلئے رشتہ داروں کی کافی تعداد اور اُن پر باقاعدہ تقسیم کار کی ضرورت ہے۔ اس طرح ایک خاندان کی متعدد پشتیں ایک ہی قطعۂ زمین پر گزر جاتی ہیں آرام کی زندگی بسر کرنے کی غرض سے سیدھے سادے قواعد کے اجرا کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو رفع فساد اور قیام امن و اتحاد کے باعث ہوتے ہیں اور جن کی رو سے

حقوق و فرائض کے اختلاف کا انصاف کیا جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ ان قوانین کا مجوز و اجرا کنندہ اعلیٰ مورث خاندان (شیخ) کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

افرادِ خاندان کی کثرت سے جب ایک قطعۂ زمین یا گاؤں سکونت کیلئے ناکافی ہو جاتا ہے تو خاندان کی ایک شاخ اصلی مسکن چھوڑنے پر مجبور ہو کر دوسرے مقام کی خواہاں ہوتی ہے مگر خانہ بدوشوں کی طرح اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر کے نہیں چلی جاتی بلکہ یا تو خاندانی زمین کے ایک حصہ پر یا اس کے متصل جدید قطعۂ زمین پر آباد ہو جاتی ہے اور دونوں حالتوں میں اپنے بزرگ شیخ کے ماتحت رہتی ہے۔ اس طرح خاندان کی کثرت کے ساتھ مساکن بھی زیادہ ہوتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ایک گاؤں سے نزدیک و دور متعدد قریے آباد ہو جاتے ہیں۔ مگر خاندانی تعلقات روایات اور رسم و رواج سختی کے ساتھ قایم رکھے جاتے ہیں۔ نیز سب لوگ شیخ کے تابع فرمان رہتے ہیں۔ خاندان کی کثرت اور جائداد زرعی کی ترقی کے ساتھ شیخ کی حکومت میں بھی وسعت ہوتی جاتی ہے۔ خاندانی مناقشات جاگیر کے مقدمات اور وراثت کی پیچیدگیوں کے سلجھانے اور طے کرنے کی غرض سے شیخ کو جدید ضوابط و قوانین کی تجویز اور اُن کا اجرا ضروری ہوتا ہے اور خاندان کے ممبروں پر اُن کی پابندی لازم ہوتی ہے اسی طرح بڑھتے بڑھتے بالآخر شیخ کی حکومت بادشاہی میں مبدّل ہو جاتی ہے۔

قانونِ قدرت کا تقاضا ہے کہ جب انسان اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اپنے ہمسایوں کے ساتھ جو اسی طرح آباد ہو گئے تھے بحالت مخالفت جنگ سے پیش آتا ہے۔ ورنہ بصُورت اتحاد باہمی تجارت کو فروغ دیتا ہے۔ یہی آغاز سلطنت کا ہے جو ملکی تدابیر و مصالح خارجہ کا سرچشمہ ہوتی ہے۔

حکومت یا شاہی ۔ مندرجہ بالا طرزِ معاشرت و زندگی کا اعلیٰ ترین درجہ شہروں کا بنانا اور شہروں میں آباد ہونا ہے۔ جب کثیر التعداد اور ہم قوم بنی آدم ایک مخصوص مقام پر مکانات تعمیر کر کے آباد ہو جاتے ہیں تو وہ مقام شہر یا قصبہ کہلاتا ہے۔ محافظت کی غرض سے اس کے گرداگرد مستحکم دیوار تعمیر کرتے ہیں جو شہر پناہ یا فصیل کے نام سے منسوب ہوتی ہے۔ اس کے ہم قوم باشندے متحد النسل ہونے کے علم پر بھی ایک دوسرے سے بیگانہ اور ناآشنا ہو جاتے ہیں۔ افراد قوم کی کثرت اور علم و ہنر کی مسلسل ترقی کی وجہ سے ضروریات زندگی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ ایک خاندان تمام وہ اشیا نہیں بنا سکتا جو اس کی ضروریات کے واسطے کافی ہوں۔ بعض اشیا اس کو دوسرے خاندانوں سے بصُورت تبادلہ حاصل کرنا ہوتی ہیں۔ اس طرح باشندگان شہر کا ایک طبقہ اہلِ شہر کی ضروریات کے لحاظ سے صنعت و حرفت کی طرف مائل ہوتا ہے اور دوسرا زراعت و لبانیت کی طرف اور اپنی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے ایک دوسرے سے ضروری اشیا کا تبادلہ کرتے ہیں یا سکّہ رائج الوقت کے ذریعہ سے (اگر ایجاد ہو گیا ہو) خرید کرتے ہیں اسی طرح کاروبار حکومت کے زیادہ اور پیچیدہ ہو جانے کی وجہ سے شیخ کو شاہی اختیارات

برتنے پڑتے ہیں۔ شیخ دادرسی کی غرض سے اپنی قوم کے بعض بزرگوں یا دیگر اشخاص کو اپنے انتخاب سے اپنا مددگار مقرر کرتا ہے بعض کو حسب ضرورت اپنے پاس رکھتا ہے بعض کو اپنا نائب بنا کر دوسرے شہروں میں بھیج دیتا ہے جس شہر میں وہ خود اور اُسکے وزیر وزرا نیز دیگر افسر رہتے ہیں۔ قدرتاً سب شہروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور دارالامارت کہلاتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ہر قوم کی ابتدا اور اس کے تمدن کا آغاز مندرجہ بالا صورتوں کے سوا اور کسی صُورت سے نہیں ہؤا۔ بہر حال مندرجہ بالا واقعات سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ایک دفعہ آباد ہو کر کسی قوم نے اس مقام کو پھر نہیں چھوڑا بلکہ زمانۂ قدیم میں جرگہوں اور قوموں کے حصّوں نے ایک جگہ آباد ہو کر دوبارہ خواہ کثرت آبادی یا قلّت مکان یا خانہ جنگی کی وجہ سے دوسرے ملک اور مقام کی تلاش میں روانہ ہو کر شہر آباد کئے یا دیگر بدوی قوموں نے حملہ کر کے آباد قوم کو اس مقام سے خارج کر دیا اور انکے ملک پر قابض ہو گئے۔ بیچاری مفتوح قوم کو وہاں سے نکل جانے یا ذلتِ اطاعت گوارا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا انہی وجوہ سے عہدِ عتیق میں ہر قوم کو غلامی اور نقلِ مقام کے سوال اکثر پیش آتے اور حل کرنے پڑتے تھے۔ کچھ تو ننگ اطاعت اور کچھ شوقِ سیر و سیاحت کی وجہ سے جو انسان کی خلقت میں داخل ہے عموماً ترکِ مقام کو ترجیح دی جاتی تھی

یہ قول بھی جس کی صداقت ہمیشہ قایم رہے گی قابل لحاظ ہے کہ کتنے ہی قدیم زمانہ پر نظر ڈالی جائے اور اُسکے باشندوں کی تحقیق کی جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کے وہ اصلی باشندے نہیں تھے بلکہ کہیں اور سے آئے تھے اور اُن سے قبل اس مقام پر سے کوئی اور قوم گذر چکی تھی۔ جو بدوی جرگہ جس مقام سے گذرا یا جہاں مقام کیا یا آباد ہوا اسکو اس نے پہلے سے آباد پایا تھا یہ بھی ثابت ہے کہ نو وارد قوم نے قدیم آباد قوم کا استیصال نہیں کیا بلکہ مفتوح قوم کا کچھ حصّہ فاتح کی اطاعت کو نقل مقام پر ترجیح دیکر رعیّت کی حیثیت سے آباد رہا اور ایک زمانہ کے بعد رشتہ مندیوں کے ذریعہ سے فاتح اور مفتوح دونوں آپس میں ملکر ایک ہو گئے

نووارد قوم حسب قاعدہ کلیہ گو تعداد میں کم ہوتی ہے لیکن حاکم ہونے کی وجہ سے امیر و شریف بن جاتی ہے اور قدیم قوم عوام یا رعیت کے نام سے موسوم ہو کر حاکموں کی خدمت یا ادائے خراج یا ٹیکس پر مجبور ہو جاتی ہے۔

نووارد اگر صلح پسند اور محدود قابلیّت کے ہوئے اور جگہ بھی کافی ہوئی جو زمانۂ قدیم میں بہت مل جاتی تھی تو اپنی بستی علیحدہ آباد کر کے رفتہ رفتہ قدیم باشندوں کے ماتحت بن جاتے تھے۔ بصورت دیگر یعنی اگر فاتح بہتر، ہوشمند اور صاحب ہنر ہوئے تو قدیم آباد قوم کو اپنے خیالات۔ علم و فضل طرز معاشرت اور قوانین کی تعلیم کے ذریعہ سے زیر اثر کر لیتے تھے۔ الغرض ہر ملک کو کسی نہ کسی زمانہ میں اس قسم کے حملوں کا تجربہ ضرور ہؤا ہے اور ہر قوم رفتہ رفتہ اور [illegible] ہے خواہ وہ آمیزش سے پاک رہی ہو یا مختلف اقوام کی اس میں آمیزش ہو گئی ہو۔ ملک بابل کی قدیم تاریخ ان تمام اقوال کا ایک مجموعہ ہے۔

محمد حامد (دہلوی)

غزل

تغیّر ہائے دنیا دیکھتا ہوں ۔۔۔ تماشے پر تماشا دیکھتا ہوں

سلوکِ جا و بے جا دیکھتا ہوں ۔۔۔ تحیّر خیز نقشا دیکھتا ہوں

ابھی الفت ابھی یک لخت نفرت ۔۔۔ ابھی کیا تھا ابھی کیا دیکھتا ہوں

کبھی غفلت کبھی عذراتِ غفلت ۔۔۔ کھڑا حیرت زدہ سا دیکھتا ہوں

وہ منظر جن سے آنکھوں کو ضیا تھی ۔۔۔ ستم ہے ان کو دھندلا دیکھتا ہوں

وہ مشعل جس کی طلعت دل کشا تھی ۔۔۔ غضب ہے۔ اسکو ٹھنڈا دیکھتا ہوں

جن امیدوں کی دلچسپ ابتدا تھی ۔۔۔ اب ان کو کلفت افزا دیکھتا ہوں

جن ارمانوں کی راحت جانفزا تھی ۔۔۔ اب ان کو روح فرسا دیکھتا ہوں

وہ دل جس میں تمنا کی خوشی تھی ۔۔۔ اُسے صرف تمنا دیکھتا ہوں

وہ خوشیاں جن سے شکلِ زندگی تھی ۔۔۔ اُنہیں دنیا سے عنقا دیکھتا ہوں

وہ چشمِ لطف جس کا آسرا تھا ۔۔۔ اب اک دھوکا ہی دھوکا دیکھتا ہوں

وہ عرضِ شوق جس کا حوصلہ تھا ۔۔۔ اب اک سودا ہی سودا دیکھتا ہوں

انہیں آنکھوں سے لاکھوں لطف دیکھے ۔۔۔ انہیں آنکھوں سے تڑکا دیکھتا ہوں

کمالِ عالمِ بے چارگی سے ۔۔۔ ستمہائے تمنّا دیکھتا ہوں

کہاں تُو اور کہاں فکرِ تلافی ۔۔۔ کسے تکلیف فرما دیکھتا ہوں

وہی تُو اور وہی اندازِ غفلت ۔۔۔ بشرحِ صدر نقشا دیکھتا ہوں

مروّت رسمِ دنیا ہے تو باشد ۔۔۔ تمہیں اس سے معرا دیکھتا ہوں

وفا کر وعدۂ فردا وفا کر ۔۔۔ خبر ہے کب سے رستا دیکھتا ہوں

بس آزاد! اب سکوں باقی نہ وہ جوش
وہ مدّ و جزر دھیما دیکھتا ہوں

حکیم آزاد انصاری

موقع اور عمل

میری زندگی کا واحد مقصد اپنی اور اپنے اہل وطن کی
خدمت کرنا تھا جس میں نہایت خوبی کیساتھ کامیاب ہوا

ان مختصر اور سادہ الفاظ میں، جون اے جانسن نے گورنر کے منصب پر فائز ہونے کے بعد اپنی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ وہ انتہائی مصیبت و افلاس کی حالت میں پیدا ہوا تھا، اس نے ایک ایسے گہوارے میں پرورش پائی تھی جسے ہلانے کیلئے غربت و افلاس کے سوا اور کوئی نہ تھا، چنانچہ ایام طفولیت میں نہ اسے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا، اور نہ وہ کسی اعلیٰ تہذیب و تربیت سے بہرہ مند ہو سکا۔ لیکن اپنی ہمت و اولوالعزمی کی بدولت وہ امریکن نوجوانوں کی اس زرّیں فہرست میں اپنا نام درج کرا کے رہا جو اپنے شاندار مستقبل کے حصول میں اس سے پہلے مشہور ہو چکے تھے، اس بے سروساماں انسان نے تنگ دستی و تہی دامنی پر غلبہ حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ "دنیا اور دنیا کی تمام اعلیٰ ترقیاں صرف مستقل مزاج انسانوں کا حصہ ہیں۔ اور وہ لوگ احمق ہیں جو کامیابی کے لئے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں"

جس وقت کہ ملک میں ہزاروں لڑکے، لڑکیاں اس امر کے شاکی تھے کہ انہیں باوجود اعلیٰ تعلیم کے بھی شاہراہ کامیابی نظر نہیں آتی۔ اس وقت یہ غریب جانسن اپنے والدین اور چھوٹے چھوٹے بھائیوں کی روزی کے لئے بغیر کسی شکایت کے جدوجہد کر رہا تھا

ابھی یہ آٹھ ہی نو برس کا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو کپڑا دھونے میں مدد دینا شروع کر دی اور تیرہ سال کی عمر میں اس نے نہایت فخر کے ساتھ اپنی ماں سے کہا کہ اب وہ آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرے اور دوسروں کی خدمت کرنا ترک کر دے۔

وہ دن دن بھر گاؤں کے ایک کارخانے میں مزدوری کرتا اور شام کو ایک مطبع کے دفتر میں جا کر وہاں کے خطوط آس پاس کے قریوں میں تقسیم کرتا تھا، یہ محنت شاقہ وہ محض اس لئے برداشت کرتا تھا کہ اپنی ماں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش و تعلیم کی فکر سے آزاد رکھ سکے، تیرہ سال کی عمر میں یہ کام اس کا سب سے زیادہ وقیع کارنامہ ہے۔

مفلسی میں مایوسانہ جدوجہد کے باوجود اس نے ہمت و خودداری کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا اور عسرت و

پریشانی میں بھی اپنے شاندار مستقبل کا خواب دیکھتا رہا، حالانکہ ایسی نازک حالت میں ایک انسان متوسط الحال شخص بننے سے زیادہ کی آرزو نہیں رکھتا اور بسا اوقات وہ فلاکت سے اس قدر مایوس و بددل ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے دل و دماغ میں تخیلات عالیہ پیدا ہی نہیں ہوتے مگر جانسن کا عزم اس قدر کمزور نہ تھا، وہ بہادر تھا اور بہادروں کی طرح سے اپنے خیالات کو بلند رکھتا تھا وہ اپنی ترقی کے راستے میں حائل ہونے والی سب رکاوٹوں کو ٹھکرا دیتا تھا اس لئے کہ وہ سمجھتا تھا کہ میں ان تمام موانع سے زیادہ اعلیٰ و اشرف ہوں۔

اگرچہ شمالی ممالک میں سردی کی زیادتی کی وجہ سے جانسن کا جسم پیہم لرزشوں کا مرکز بن جاتا تھا اور خاندان کی روزی کی کفالت کا بوجھ اُس کے شانوں کو توڑ توڑ دیتا تھا، تاہم اس کی ہمت و الوالعزمی میں مطلق فرق نہ آتا تھا اور یہ مشکلات اس کے پائے ثبات کو متزلزل نہ کر سکتی تھیں جو لوگ فطرت کے صحیح توام سے پیدا ہوتے ہیں وہ کام کرنے میں کبھی حیلہ حوالہ نہیں کرتے، انہیں نہ کسی کی استعانت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ کسی عمدہ موقع کے منتظر رہتے ہیں۔ بخلاف اس کے وہ لوگ جو اپنی کاہلی و سستی کی وجہ سے کام کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہوتے ہیں زمانے اور مواقع کی بیجا شکایت کیا کرتے ہیں، وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ "کامیاب لوگوں کی طرح ہمیں کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا اور نہ لوگوں نے آگے بڑھنے میں ہماری مدد کی" اس قسم کے خیالات یہیں پر ختم نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے مایوس و پست ہمت یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ تمام اچھی جگہیں کام کرنے والوں سے پُر ہو چکی ہیں اور ہر پیشے اور ہر کام میں ضرورت سے زیادہ لوگ موجود ہیں پھر ہم اپنی ذاتی کوشش سے اتنے اتنے بڑے مجمع میں کس طرح امتیاز پیدا کر سکتے ہیں۔"

ایک مرتبہ سکندر کی فوج کشی کے بعد کسی نے اس سے دریافت کیا "کہ اگر تمہیں حملے کا کوئی اور موقع مل جائے تو تم پھر اُسے استعمال کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ گے" موقع کا لفظ سُن کر سکندر کا چہرہ متغیر ہو گیا، گویا اس پر حیرت و استعجاب کی بجلی گر پڑی، اس نے کڑک کر کہا کہ اے بیوقوف انسان! موقع کیا چیز ہے، "موقع تو خود ہر انسان کے ہاتھ میں ہے جب چاہے وہ اسے پیدا کرے اور جب چاہے کھو دے"

موقع کا انتظار ایک خوفناک جہالت ہے جو رفتہ رفتہ کاہلی کی صورت میں انسان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، اگر کوئی شخص کسی اہم کام کو انجام دینے کیلئے موقع کا منتظر رہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ہمت اور قوت عمل غیر محسوس طریقہ پر زائل ہو جائیگی، جو لوگ موقع کی تلاش کرتے ہیں، موقع ہمیشہ اُن سے پوشیدہ رہتا ہے، البتہ جو اس کے قائل نہیں اُنہیں ہر کام کا ہر وقت موقع حاصل رہتا ہے۔

موقع تلاش کرنا گویا اپنی آنکھوں کو اندھا کر لینا ہے، جو لوگ اس فکر میں رہتے ہیں وہ بہتر سے بہتر مواقع سے بھی فائدہ

نہیں اٹھا سکتے، یعنی اگر ایسے لوگوں کو سونے کی کان بھی دے دی جائے تو ان کو اس میں کوئی قیمتی چیز نظر نہ آئے گی لیکن جو لوگ کام کیلئے موقع کی تلاش نہیں کرتے وہ ہر چیز اور ہر کام کے لئے خود موقع پیدا کر لیتے ہیں۔

بنیان نے باوجود بڈفورڈ جیل کی انتہائی مصیبتوں کے علم ہندسہ کے سب سے بڑے لاینحل مسئلے کو حل کرکے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ موقع کسی خاص وقت پر منحصر نہیں ہے جس وقت بنیان نے یہ مسئلہ حل کیا تھا، اس وقت اس کے پاس جیل میں لکھنے پڑھنے کا کوئی سامان موجود نہ تھا، تاہم اس نے اس کاغذ پر جو دودھ کی بوتلوں میں بطور کارک استعمال کیا جاتا تھا۔ اس حل شدہ مسئلے کو ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا۔

جس ملک میں تم اپنی بیکاری کے گلہ مند ہو اور موقعہ بہم نہ پہنچنے کی شکایت کر رہے ہو اسی میں ہزاروں لڑکیاں اور لڑکے ایسے ملیں گے جو تم سے زیادہ مفلس اور موقعے کے محتاج ہونگے، مگر وہ اس قدر بد دل نہ ہونگے جتنے تم ہو، بلکہ اُن کا قدم میدان ترقی میں برابر آگے پڑ رہا ہوگا، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ جب تک کہ وہ کالج کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ نہ ہو جائیں یا کچھ سرمایہ فراہم نہ کرلیں کوئی کام شروع ہی نہیں کر سکتے مگر یاد رکھو کہ ہونہار اور ترقی کرنے والے کبھی اس قسم کی باتوں کی پروا نہیں کرتے وہ بغیر تکمیل تعلیم اور فراہمی سرمایہ کے اپنا کاروبار شروع کر دیتے ہیں، اور اپنی اسی مستقل مزاجی کی بدولت ایک دن کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔

نیو انگلینڈ کے نشیب میں ایک ایسا مرغزار ہے جو مچھلی کے شکار کیلئے بہت مشہور ہے۔ یہاں کسی زمانے میں ایک بہترین بندرگاہ تھا اور قلی کثرت سے کام کیا کرتے تھے، مگر اب ایک خاموش و پرسکون مقام بن گیا ہے جس کی وجہ سے بہت سے نوجوان لڑکے گداگری جیسے شرمناک پیشے سے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں اور اگر اس کے متعلق اُن سے کچھ دریافت کیا جائے، تو وہ نہایت دلیری سے اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ "چونکہ اب یہاں کام کی کثرت باقی نہیں رہی اس لئے اگر ہم گداگری نہ کریں تو اور کیا کریں" لیکن اس قصبے میں ایک ایسا لنگڑا بھی رہتا ہے جو نہایت خودداری اور شرافت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور باوجود لنگڑا ہونے کے ایک اسکول کا مہتمم ہے، دو کارخانوں کی نگرانی کرتا ہے، اور اپنا مرتب کیا ہوا اخبار خریداروں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ذمہ اپنی ماں، دو بہنوں اور ایک بھائی کی پرورش بھی ہے۔

کیا آج کل کے نشاکی نوجوان اگر ابراہام لنکن جیسے جنگلی لڑکے کے ساتھ کر دیئے جائیں تو وہ اپنی زندگی کے مواقع پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں گے؟

اگر انہیں ایک ایسی وحشت ناک جھونپڑی میں رکھا جائے جس میں نہ باقاعدہ دروازے ہوں نہ پھاٹک، کھڑکیاں ہوں اور نہ سائبان، اور پھر نہ یہ جھونپڑی کسی اسکول سے قریب ہو اور نہ کسی عبادت گاہ یا ریلوے اسٹیشن سے نزدیک، نہ یہاں

اخبارات پہنچتے ہوں اور نہ کسی قسم کی کتابیں، تو کیا اس قسم کے نوجوان جو موقع کی تلاش میں رہا کرتے ہیں وہاں زندگی بسر کرنا گوارا کریں گے یقیناً نہیں۔

مگر اب لنکن، جیسے غریب و مفلس لڑکے کے حالات پر غور کرو جو اپنی تعلیم کیلئے ۹ میل روزانہ پیدل سفر کرکے اسکول جانے کی زحمت گوارا کرتا ہے، اگر اسے کسی کتاب کی ضرورت ہو تو اس کے خریدنے کے لئے وہ چالیس میل کا سفر کرتا ہے۔ غرض کہ گرد و نواح میں نہ اُسے تعلیمی سامان ملتا ہے اور نہ آسانی سے ضروریات زندگی فراہم ہوسکتی ہیں مگر لنکن بغیر کسی شکایت کے حصول علم کے لئے روزانہ مدرسہ جاتا ہے اور واپس آنے کے بعد باوجود انتہائی خستہ و درماندہ ہونے کے رات کو مطالعۂ کتب میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اس کے پاس روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے۔ پڑھنے کے لئے وہ لکڑیوں کا ایک الاؤ لگاتا ہے اور اس میں آگ لگا کر اس کی روشنی میں کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے، اس قسم کی بے سروسامانی کا سلسلہ ایک دو دن نہیں برسوں جاری رہتا ہے اور لنکن اسی حالت میں پڑھ لکھ کر ایک دن امریکہ کا صدر بن جاتا ہے، لوگ جو اس کے حال سے واقف ہوتے ہیں اس کی اس ترقی پر وقفِ حیرت ہوجاتے ہیں۔

اب تم اپنی دلی کیفیات کا اندازہ کرتے ہوئے بتاؤ کہ کیا تم بھی ان مشکلات میں رہ کر اپنے مستقبل کا ایسا شاندار خواب دیکھ سکتے تھے اگر نہیں تو لنکن کی ہمت سے ہمت کرنے کا سبق لو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا میں موقع کا انتظار کرنا اپنی قوت عمل کو ضائع کرنا ہے

سیّد ابو محمد ثاقب

رباعیّات

نقاشِ ازل ہے محوِ تصویرِ بہار   تنویر سے ہو رہی ہے تعمیرِ بہار
تاروں کی طرح چمک رہی ہے دُنیا   تفسیر ہے رنگ و بو کی تعبیرِ بہار

وارفتۂ عہدِ جوانی ہُوں مَیں   تصویرِ بہارِ شادمانی ہُوں مَیں
دنیا کا ہے آب و رنگ مجھ سے قایم   یہ کس نے کہا کہ نقشِ فانی ہُوں مَیں

عابد

فرمودۂ عابد

رباعیات

ایسا نہ ہو عشق دل کو رنجور کرے
برباد مجھے شعلۂ مستور کرے
دے جامِ شرابِ آتشیں اے ساقی
ممکن ہے کہ زہر زہر کو دُور کرے

ایسا نہ ہو عشق دل کو رنجور کرے

اندوہِ محبت کی فراوانی ہے
محفل مری تصویرِ پریشانی ہے
دے زہر سے بھر کے ایک جام اے ساقی
یہ بادۂ تلخ تو مجھے پانی ہے

غزل

تیوری چڑھائی آپ نے جوشِ عتاب میں
یا پڑ گئے شکن ورقِ آفتاب میں

ساقی بقدرِ غم نہیں تلخی شراب کی
اے کاش کوئی زہر ملا دے شراب میں

محروم ہیں تپش سے بہاریں شباب کی
اے برقِ حسن آگ لگا دے شباب میں

محفل تمام مطلعِ انوار بن گئی
چھپتا نہیں ترا رخِ روشن نقاب میں

ساقی کا بس چلے تو بلا نوش سیر ہوں
سب کو پلائے مے قدحِ آفتاب میں

عابد فریبِ ناز ہے تمکیں نقاب کی
پنہاں ہے ایک موجِ تبسم نقاب میں

قدرت کا انتقام

یوں تو مہینوں بختیار شکل نہیں دکھاتا۔ لیکن جب آتا ہے تو اس مستقل مزاجی سے کہ جب تک میرے چوبیس گھنٹوں کا خون نہ کرلے واپس جانے کا نام نہیں لیتا۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس کا آنا مجھے ناگوار گذرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ وہ آئے اور آرام سے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرے۔ لیکن وہ ہے کہ کمرہ کی دہلیز سے چند قدم باہر ہی ہوتا ہے کہ چلانا شروع کردیتا ہے "تم ابھی تیار نہیں ہوئے۔ اٹھو جلد کپڑے پہنو ایک ضروری کام ہے" اس کے ضروری کاموں کی حقیقت سے میں خوب واقف ہوگیا ہوں، سوائے اس کے کہ اپنا بے مصرف وقت ادھر ادھر سڑکوں پر چکر لگانے میں ضائع کرے۔ اور اسے خاک بھی کام نہیں ہوتا خصوصاً جب سے اس نے لینڈو کی سواری ترک کرکے موٹر کار خریدی ہے اس کا یہ شوقِ آوارہ گردی اور زیادہ ہوگیا ہے۔ میرے متعلق وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ ایک مصروف شخص ہے جسے ایسے بے معنی سیر سپاٹے کے لئے بالکل فرصت نصیب نہیں۔ لیکن اس علم کے باوجود جب وہ ایک تیقن آمیز وپر وثوق لہجہ میں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاں کے سوا کسی اور جواب کی توقع ہی نہیں رکھتا مجھے دعوتِ آوارگی دیتا ہے تو مجبور ہوجاتا ہوں اس کا ساتھ دینے پر صرف اس لئے کہ کہیں میرا انکار اُسکے پندارِ دوستی کو مجروح کرکے اُسے کھسیانا نہ کردے۔ اسکے علاوہ بختیار ہے بھی مزے کا آدمی۔ بالکل آزاد منش، تفکرات دنیوی سے بے بہرہ۔ ہمیشہ خوش باش اس کی صحبت تھکے ہوئے دماغوں کے لئے اک ذریعۂ تفریح ہے۔

آج تعطیل کا دن تھا اور میں کل ہی سے اس فرصت کے وقت میں چند ضروری امور سرانجام دینے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ کالج کا کئی ہفتوں کا کام یونہی رکھا تھا۔ چند خطوط بھی لکھنے تھے چنانچہ ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی میں مطالعہ کی میز پر جا بیٹھا۔ لیکن میری قسمت، کہ بیٹھتے ہی غیر متوقع طور پر بختیار صاحب مرگ ناگہاں کی طرح آنازل ہوئے پہلے تو میں سخت گھبرایا کہ سب ارادے خاک میں مل گئے۔ لیکن آج بختیار کا طرزِ عمل قدرے سدھرا ہوا تھا۔ معمولی علیک سلیک کے بعد وہ خلاف معمول کرسی پر بیٹھ گیا "و کہو بھیا کیسے ہو؟ مدت سے تمہیں ملنے کا ارادہ کر رہا تھا"

میں نے بات ختم کرنے کے لئے جلدی سے جواب دیا "اچھا ہوں۔ آج مجھے بہت سا کام کرنا ہے"

"بس تم ہمیشہ کام ہی کا رونا روتے رہے۔ اٹھو ذرا باہر چلیں۔ دیکھو تو کیسا اچھا دن ہے ایسے وقت میں کام کرنا قدرت کی تحقیر کرنا ہے۔

میں نے سٹپٹا کر کہا "بختیار جہاں تمہارا جی چاہے جاؤ لیکن خدا کے لئے مجھے ہمراہ نہ کھینچو۔ میرا بہت ہرج ہوگا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری ہمرکابی کر سکوں"

"سبحان اللہ اپنی تفریح کو ہمرکابی کہتے ہو؟ اچھا یہ بات ہے تو میں یہاں سے نہیں ٹلنے کا"

اب تو حضرت پھسل پڑے۔ "اتنی دور سے چل کر تمہارا دل بہلانے آتے ہیں پھر بھی تم سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ لو میں یہاں بیٹھا ہوں دیکھوں تو کس طرح کام کرتے ہو"

میں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا "بختیار تم غضب کے بے پروا آدمی ہو"

"کچھ بھی ہو میں تمہیں ساتھ لئے بغیر نہ ٹلوں گا"

الغرض آدھ گھنٹے کی رد و قدح کے بعد میرا کمرہ مقفّل تھا اور میں اور بختیار موٹر میں بیٹھے اُڑے چلے جا رہے تھے کدھر کو؟ اس کا ہم دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا

لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کے ہر لحظہ مجھے یہ تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ میں نے گھبرا کر کہا "بختیار شہر سے باہر نکل چلو"

اس نے موٹر کا رخ بدل لیا۔ منٹو پارک کی نمائش ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے اب پھر وہیں جا ٹھہرے ایک گھنٹہ اِدھر اُدھر گھومنے میں گزارا۔ بختیار نے چند اشیا بھی خریدیں پھر قلعہ کے پاس سے گزرتے ہوئے راوی پر پہنچے اور وہاں سے شاہدرہ۔ شاہدرہ میں خاصی رونق تھی۔ ہماری طرح بہت سے کام چور وہاں جمع ہو رہے تھے۔ دعوتِ بصر و سماع کا سامان بافراط موجود تھا۔ سہ پہر کے آخر تک ہم مصروفِ اوقات کشی رہے اور جب سورج کی کرنیں ہلکی ہونے لگیں تو میں نے بختیار سے کہا کہ "اب چلو" اُس نے واپسی پر پہلے سے بھی لمبا راستہ اختیار کیا۔ اور خدا خدا کر کے چھ گھنٹے کی لاحاصل بادیہ پیمائی کے بعد مجھے میری جائے قیام پر چھوڑ کر اپنے اندازِ خاص میں مسکرا کر ہاتھ سے سلام کا اشارہ کرتے ہوئے وہ میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں مضمحل و پریشان لیکن اطمینان کا سانس لیکر اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں کچھ بند تھیں کچھ کھلی۔ سو تو نہیں رہا تھا۔ البتہ تمام دن کی کوفت دور کرنے کے لئے زبردستی اپنے اوپر غنودگی طاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ میرے کمرے کی بالائی منزل کی داہنی جانب سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ جیسے بندوق چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ میں نے چنداں توجہ نہ کی۔ میرا دماغ پہلے ہی پاش پاش ہو رہا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد بہت سی ملی جلی آوازوں کا شور اور قدموں کے زور زور سے پڑنے کی چاپ سنائی دینے لگی۔ میں سمجھا بلیرڈ یا کوئی اور کھیل کھیلا جا رہا ہے کیونکہ ہوٹل والوں نے بلیرڈ وغیرہ کا انتظام عین میرے کمرے کی سقف پر کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اکثر وہاں کا شور میرے سکوتِ تنہائی میں مخل ہوتا۔

رہتا تھا۔ لیکن چند منٹ بعد وہ غل غپاڑہ اور زیادہ ہوگیا۔ لوگ ایک طرف سے دوسری طرف بھاگے جارہے تھے۔ اب میں خاموش نہ رہ سکا۔ دل ہی دل میں کل ہوٹل والوں کو ہزاروں صلواتیں سناتے ہوئے میں نے بادل ناخواستہ گھنٹی بجائی۔ ملازم ہانپتا ہؤا حاضر ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا "کیا بات ہے؟ یہ کیا شور ہے؟"

"حضور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باون نمبر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا ہوا باون نمبر میں؟"

"حضور ڈاکٹر سہاول کے کمرے سے گولی چلنے کی آواز آئی ہے۔ کمرہ اندر سے بند ہے اور کسی شخص کے کراہنے کی آواز آرہی ہے۔"

"ڈاکٹر سہاول" میں تمام کان بن گیا اور بے اختیار اٹھ کر کمرے سے بھاگا۔ زینے پر سے ہوتا ہوا باون نمبر کے سامنے جا پہنچا۔ لوگ واقعی جمع ہو رہے تھے اور کمرہ اندر سے غالباً مقفل تھا۔ دروازہ توڑنے کی کوشش بے سود ثابت ہو چکی تھی ہوٹل کا مینجر جسے گھبراہٹ اور تشویش کی شدت سے پسینہ آرہا تھا کمرے کے عقب کی کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر ہاتھ سے اندر کی چٹخنی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اشارہ سے بلایا۔ کہنے لگا "معاملہ نازک معلوم ہوتا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیئے کہ چلے جائیں اور کسی کو پولیس میں اطلاع کے لئے بھی بھیج دیجیئے۔" میں نے دو یا ر شخصوں کے سوا سب کو منتشر کر دیا اور ہوٹل کے ملازم کو کوتوالی روانہ کیا۔ چٹخنی کھلی اور ہم آہستگی سے کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری نگاہوں نے جو منظر خونیں دیکھا اس کی لرزہ انگیز یاد نقش فی الحجر کی طرح میرے دماغ میں ثبت ہو چکی ہے۔ اور اب بھی یہ سطور لکھتے وقت اس کے ہیبتناک تصوّر سے میرے بدن میں سنسنی سی پیدا ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سہاول فرش پر پڑا تھا۔ اس کا حسین و توانا جسم اور قیمتی ملبوس خاک و خون میں لتھڑا ہؤا تھا۔ اس کی کنپٹی سے فوارۂ خون جاری تھا اور پستول جس سے رشتۂ جان منقطع کیا گیا تھا قریب ہی گرا پڑا تھا۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی مجھ پر ایک خوفناک کپکپی طاری ہوگئی۔ میں نے گھبرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اُن کے چہرے زرد ہو رہے تھے اور حلق سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ ڈاکٹر کے مردہ جسم کو چھوا تو وہ سرد ہو چکا تھا۔ آثار سے ظاہر تھا کہ موت خودکشی سے واقع ہوئی ہے۔ بڑا آئینہ جس کے سامنے کھڑے ہو کر غالباً اُس نے ٹھیک مقام کا نشانہ باندھا ہوگا میز پر رکھا تھا۔ کمرے کی سپید دیواریں۔ بستر کی چادر اور تمام فرش خون سے رنگین ہو رہا تھا چھینٹے اڑ اڑ کر چھت تک پہنچ گئے تھے۔ آہ روح اور جسم کی جدائی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سہاول تقریباً دو ہفتے سے اس ہوٹل میں مقیم تھا۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا۔ دن کا بیشتر حصہ اپنے کمرے ہی میں رہ کر گزارتا اور اکثر شام کو ٹہلنے یا سینما وغیرہ دیکھنے جاتا تھا۔ لوگوں سے بہت کم ملتا جلتا تھا۔ مجھ سے دو ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی بہت سنجیدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ کہتا تھا صحت کی خرابی کے باعث تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔

کمرے کی مہیب خاموشی کو جو ہمارے دلوں میں بے معنی سا خوف پیدا کر رہی تھی آخر مینیجر کی آواز نے توڑا۔ "میرا خیال ہے ڈاکٹر سہاول نے خودکشی کی ہے"۔

دوسرا ساتھی جو اس ہوٹل کا مکین تھا، کہنے لگا "حالات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے لیکن خودکشی کی کچھ وجہ ضرور ہونی چاہئے"۔

میں کہ اب تک ایک خاص خیال کے ماتحت میز اور کمرے کی دیگر اشیا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا بولا "ممکن ہے ڈاکٹر سہاول کوئی تحریر چھوڑ گئے ہوں۔ کیونکہ ایسے حادثات میں اکثر مرنے والا کچھ نہ کچھ لکھ کر چھوڑ جایا کرتا ہے"۔ میرے اس خیال سے سب نے اتفاق کیا اور ہم میز پر سے چند بکھرے ہوئے کاغذات کو اٹھا اٹھا کر پڑھنے لگے۔ لیکن اُن میں مختلف اخبارات کے پرچوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا اس کے بعد ہم ڈاکٹر سہاول کی جیبیں ٹٹولنے لگے اور آخر اس کے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکلا۔ یہ ایک لمبی تحریر تھی جسے اُس نے اپنی زندگی کے آخری چند گھنٹوں میں سپرد قلم کیا تھا۔ خواہ اُسے دستاویز عبرت کہہ لیجئے یا اعتراف گناہ، اس کا ایک ایک لفظ درد حسرت کی تصویر اور طوفان جذبات کا مرقع تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا اُسے پڑھنے کے بعد میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی۔ بے ثباتی حیات اور سیلاب جذبات کا جسکی کوہ شکن روانی میں ہم تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں خیال کر کے میرا جی زندگی سے کھٹا ہو گیا میں نے بڑی دقت سے اس مسودہ کی نقل حاصل کی جسے صراحتِ واقعات کی غرض سے من و عن ذیل میں درج کرتا ہوں

"سورج کچھ کچھ نمودار ہو چکا ہے اس کی نرم اور روپہلی کرنیں کمرے کی نیم وا کھڑکی کے راستہ سے اندر داخل ہو کر مجھے بیداریٔ سحر کا پیغام دے رہی ہیں۔ ہوٹل کے باقی حصہ میں ابھی تک نصف شب کا سا سکون طاری ہے۔ غالباً لوگ اپنے اپنے بستروں میں مزے کی نیند سو رہے ہونگے۔ آہ! کتنا طویل عرصہ میں بھی ایسی پرامن راتوں کے انتظار میں بسر کر چکا ہوں۔ مدت گزر گئی ہے میرا دماغ آرام اور دل اطمینان کے مفہوم سے نا آشنا ہو گیا ہے۔ میرے پیش نظر کل کائنات پر اس وقت امن کی حکومت ہے ہر جاندار و بے جان چیز فطرت کی نشہ آور لوریوں کے سحر سے خواب میں مدہوش ہے لیکن اس وسیع و بسیط دنیا میں صرف میں ہی غم نصیب ہوں جس کی روح قدرت کی فیاضیوں کے باوجود تشنہ کام ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ قدرت کی

دریا دلی میرے لئے بخل میں تبدیل ہوگئی۔ میں اگرچہ راندہ درگاہ ہوں مگر کفرانِ نعمت کیوں کروں فطرت نے اپنے انمول موتی میرے سامنے بکھیرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اُس نے دہن بستہ خزانوں کے منہ میرے واسطے کھول دیئے۔ مگر میں نے آنکھ اٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھا۔ ان تمام نعمائے عظمیٰ کو لٹاتا ہؤا مستقبل کی تاریکیوں سے بے نیاز ہوکر میں ذلت و نکبت کے اندھے کنوؤں کی طرف بھاگتا گیا۔ ہر شے کی قدر اُسے کھوکر معلوم ہوتی ہے۔ میرے پاس کیا نہیں تھا؟ قابلِ رشک صحت، نیوی وجاہت، دلوں میں گھر کرنے والے اخلاق، معصومیت۔ اور سب سے بڑھ کر اطمینانِ قلب۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو کمزور سے کمزور تیراک کو ساحلِ مراد سے ہم کنار کردیتی ہیں۔ لیکن ایک میں ہوں کہ جس نے آنکھیں بند کرکے قدرت کے پاکیزہ عطیوں کو نفس کی ناپاک خواہشات کی عارضی سیرابی پر قربان کردیا۔ اب میں ایک قلاش ہُوں، نہیں اس سے بھی بدتر، ایک مجرم ہوں جو گناہ کے مسموم جراثیم کے باعث سوسائٹی کے لئے کسی متعدی مرض سے کم نہیں۔ حکومت اپنی غیر محدود قوتوں کے ساتھ سوسائٹی کو اس مرض سے پاک کرنے کے درپے ہوچکی ہے۔ اگر کسی ان دیکھی مصیبت یا کسی غیر متوقع واقعہ نے میرے ارادے میں تزلزل پیدا نہ کردیا تو مجھے یقین ہے کہ آج میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ شام کے وقت لارنس باغ کی بجائے میری روح اس نامعلوم پراسرار سرزمین کی سیر میں مصروف ہوگی جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن پہنچنا ہے اگرچہ ہر ایسے موقع کو جو ہمیں وہاں پہنچانے کا کفیل ہو ہم بڑے شدومد سے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی اتفاقی حادثہ کے متعلق عوام میں بہت کچھ مختلف افواہیں پھیل جایا کرتی ہیں جن سے حقیقت کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میری موت یقیناً عوام میں ہزاروں وسوسوں اور بدگمانیوں کی محرک ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ قبل اس کے کہ میرے ہاتھوں کی جنبش اور آنکھوں کی بصارت سلب ہو چند سطور میں مجمل طور پر اپنی حیثیت حتی الامکان واضح کردوں۔

آج سے نو سال پہلے کا ذکر ہے بعض دفعہ تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا کل ہی کی بات ہے اور بعض اوقات میرا حافظہ ماضی کے دبیز، دھندلے پردوں کو چیر کر اُسی واقعہ کو خواب کی سی مبہم کیفیت میں لپٹا ہُوا پاتا ہے۔ دنیا کے عظیم الشان دریا پہاڑوں سے نکلتے وقت پانی کی معمولی باریک دھار سے زیادہ نہیں ہوتے۔ وہاں ان کی روانی کو مسدود کردینا آسان بات ہے، لیکن میدان میں اُن کے وسیع پاٹ اور کف آلود و فلک بوس لہروں کو دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ اب بھی ہم اُسی سہولت سے انہیں روک سکتے ہیں ایک حماقت ہے۔ انسانی زندگی کے اہم ترین اور مستقبل کو تہ و بالا کردینے والے واقعات بھی ابتدا میں پانی کی باریک دھار سے زیادہ کمزور ہوتے ہیں لیکن مدت گزرنے نہیں پاتی کہ وہی دھار ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر بن جاتی ہے جس کی آغوش میں بڑے بڑے غواص موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ آج جس شغل کو وہ محض تفریح طبع در چند لمحوں کی مسرت کے واسطے اختیار کر رہا ہے۔ کل وہی ہیبتناک اثرات سے اس کی زندگی کا پانسہ پلیٹ دے گا۔ ہاں

میں کیا لکھ رہا تھا۔ اُف! آج سے نو سال قبل کا قصہ۔ عمر کا وہ حصہ جب فطرت پہلے پہل انگڑائیاں لیکر بیدار ہوتی ہے جب بہارِ زیست آرزوؤں کے شگوفوں سے لبریز ہوتی ہے۔ جب شجرِ حیات جذبات کی آبیاری سے ثمر دار ہوتا ہے۔ اور جب زندگی کی ہر ناکامی کامیابی کا لباس پہن کر ایک وسیع سراب کا منظر پیش نظر کر دیتی ہے۔ ایسے آتشیں ایام مجھ پر بھی گزر چکے ہیں۔ میں کیا کہوں میری سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھی تھی یا میرا بخت بیدار ہو گیا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں قوس قزح سے زیادہ حسین اور دامن کوہ سے زیادہ شاداب تھی۔ فضا مشکبار ہواؤں سے لدی ہوئی اور زمین گلہائے رنگا رنگ سے لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ اس تجلی کا پرتو تھا جس سے میرا سینہ فروزاں ہو رہا تھا۔ میرے قلب کی پرسکون سطح کے اندر خاموش نغموں کا اک جہان آباد تھا اور میری روح غیر معلوم طور پر کسی مضراب کی تلاش میں آوارہ تھی جو اس ساز کو چھیڑ کر خوابیدہ نغموں میں ہلچل پیدا کر دے۔ آہ کیسے مطمئن دن تھے جو چشم زدن میں چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے اور زہر سے زیادہ تلخ یاد میرے لئے چھوڑ گئے۔

میں ان دنوں طالب علم تھا۔ میڈیکل کالج میں میرا آخری سال تھا۔ اسی سال مجھے موسم گرما مصوری میں بسر کرنے کا اتفاق ہوا۔ دشتِ نجد میں جس شرارہ نے قیس عامری کی عقل و خرد کو دم بھر میں بھسم کیا جس برقِ جمال نے ایران کی سرزمین میں فرہاد کی متاعِ صبر و شکیب کو جلا کر خاک کر دیا۔ وہی شعلہ میری جانِ ناتوان کے لئے مصوری پہاڑ پر نمودار ہوا۔ میرا جسم اور روح دونوں اس غیر ذمہ دارانہ حالت میں تھے کہ ادنیٰ سی دعوتِ ہلاکت پر لبیک کہنے کو ہر وقت تیار ہو سکتے تھے۔ اس عالم کیف میں میرا زہرہ سے ملنا اور سنبھلے رہنا ایسا ہی تھا جیسے تنکے کو آگ میں رکھ کر جلنے سے روکنے کی بے سود کوشش کرنا۔ زہرہ میرے افقِ حیات پر ستارۂ صبح کی طرح نمودار ہوئی جس نے میرے حسیات خفتہ میں تحریک کی لہر دوڑا دی۔ یکایک مجھے یوں معلوم ہونے لگا کہ زہرہ گویا ایک پیکر مرمریں تھی۔ جسے میرے ہی ہاتھوں نے اپنے جذبات کی پذیرائی کیلئے پسندیدہ خیال بنا کر تراشا تھا۔ اس میں وہ تمام رعنائیاں جلوہ ریز تھیں جن سے آج تک میرے خیال کی دنیا منور رہی تھی۔ عورت جب عالم شباب میں قدم رکھتی ہے تو کائنات کی تمام رنگینیاں جو اس سے قبل فضا میں آوارہ ہوتی ہیں۔ اس کو اپنا مسکن بنا لیتی ہیں۔ اگر حسن کے منتشر اجزا کو یکجا دیکھنے کے متمنی ہو تو ایک جوان عورت تلاش کرو۔ پھول کی نکہت، موسیقی کی لے شراب کا نشہ، شاعر کا تخیل کیا ہے جو اس میں نہیں ہوتا۔ عورت اور اس پر شباب! شراب دو آتشہ سے بھی زیادہ تیز ہے جس کی حرارت مینا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ ایک سمندر ہے جس کی طغیانی کا کوئی کنارہ نہیں لیکن میں کہوں گا کہ ان تمام لطیف لوازمات کے ساتھ وہ ایسی ابتلا ہے جس کی تحریص ہلاکت کا دنیا میں کوئی حریف نہیں ہو سکتا۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ وہ عورت کی محبت میں انسان سے فرشتہ بن گیا؟ ہاں ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے ہیں جن کے لئے ارتکاب گناہ

کی سب سے بڑی محرک عورت ہی ہوتی ہے۔ انسانی جنگ وجدال کی تاریخ کی ورق گردانی کرو تو دیکھو گے کہ زمین پر نصف سے زیادہ خون عورت کی وجہ سے بہایا گیا ہے۔ کسی کافر حسینہ کا اپنی جادو بھری نگاہوں سے تمہیں دیکھ کر منسا ک آنکھوں سے دعوتِ محبت دینا کیا تمہیں ریزہ ریزہ کر دینے کے لئے کافی نہیں؟ اگر تم ہمالیہ پہاڑ کی طرح جامد و ساکن نہیں تو یقیناً ان نگاہوں کی خاطر جان پر کھیل جانا معمولی بات سمجھو گے۔ قدرت نے اس بظاہر نحیف و نزار ہستی میں وہ مقناطیسی قوت بھر دی ہے کہ بسا اوقات اس کی ابرو کے اشارہ اور لبوں کے تبسم پر ہم اپنی جانیں کھو دیتے ہیں۔ اس کی سحر کارِ محبت کے زیر اثر ہم ہپناٹزم کے معمولی معمول کی طرح اندھا دھند ایسے خوفناک کاموں میں کود پڑتے ہیں جن کا تصور حالت اصلی میں اعصاب میں تھرتھری پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا اس جنون یا جذبہ کو محبت کے نام سے پکارتی ہے۔ بعض کہتے ہیں محبت سلگتی ہوئی آگ ہے جو انسان کے اندر داخل ہو کر تپ دق کی طرح اس کی ہڈیوں کو پگھلا دیتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے خیال میں صحیح ہوں مگر میرا عقیدہ ہے کہ محبت سلگتی آگ نہیں۔ بلکہ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے جس کی زندگی اگرچہ مختصر مگر ہلاکت آفریں ہوتی ہے۔

جب اول اول زہرہ مجھ سے مصوری میں ملی تو وہ موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے والدین کے ہمراہ آئی ہوئی تھی۔ اس کی عمر بمشکل سترہ سال کی ہوگی اور ابھی الہ آباد کے زنانہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ میری اس سے ملاقات سیٹھ بھن کے مکان پر ہوئی جہاں وہ اور اس کے دیگر متعلقین شمولیت دعوت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہ میں اب بھی کہوں گا کہ زہرہ حسن وجمال کے لحاظ سے ہزاروں میں سے ایک تھی۔ دعوت سے قبل میرا اس کے خاندان کے کل افراد سے فرداً فرداً تعارف کرایا گیا۔ اور یوں میری اس کے گھر تک رسائی ہوگئی۔ ہم دونوں نوجوان تھے۔ طالب علم تھے۔ اس لئے چند دنوں میں بے تکلف ہو جانا کوئی عجب بات نہ تھی۔ یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ میں نے اس کے بعد ایک مہینہ اس کی صحبت میں کس سرور وانبساط کے ساتھ گزارا۔ میں نے پہلی مرتبہ محبت کی اور اس قلیل مدت میں محبت کی رنگینیوں سے خوب بہرہ اندوز ہوا میں حتی الامکان اس کے والدین کی دوررس نگاہوں سے بچ کر ہی اس سے ملا کرتا تھا۔ آہ وہ چوری چھپے کی ملاقاتیں شاید میں مرنے کے بعد بھی نہ بھول سکوں گا۔ مصوری میں ہمارا قیام عارضی تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ چند دنوں تک یہ پری مجھ سے چھن جائے گی۔ ان لذتوں سے کسی حرمان نصیب کی طرح یوں ہاتھ کھینچ لینا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے زہرہ سے مشورہ کر کے اس کے والدین تک یہ پیغام پہنچایا کہ اگر وہ مجھے اپنی غلامی میں قبول کرلیں تو اس سے بڑھ کر میرے لئے اور کوئی فخر نہیں ہو سکتا۔ زہرہ کے ہمت دلانے سے مجھے اپنی کامیابی کی امید پیدا ہو چلی تھی۔ مگر اس کے والد کے جواب نے اس امید کو بہت حد تک یاس میں تبدیل کر دیا۔ اُن کا جواب نہ اقرار تھا اور نہ صاف انکار ہی تھا۔ انہوں نے کہا کہ زہرہ کو ابھی

پڑھتا ہے اور اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں چنداں عجلت کی ضرورت نہیں۔ ہر چند کہ یہ جواب قطعی مایوس کن نہ تھا۔ مگر حقیقت حال سے میں جلد ہی آگاہ ہو گیا۔ دراصل زہرہ کے لئے کراچی کے کسی لکھ پتی سوداگر کا پیغام آ چکا تھا۔ اور زہرہ کے والدین وعدہ بھی کر چکے تھے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ زہرہ کو اس اندرونی نامہ و پیام کا علم تھا یا نہیں مگر جب پہلی مرتبہ میں نے اس سے کہا کہ "تمہارے والدین نے سیم و زر کی خیرہ کن چمک سے مرعوب ہو کر تمہیں کسی لکھ پتی کے محل کی زینت بنانے کا ارادہ کر لیا ہے اور مجھ نادار کی محبت کو ٹھکرا دیا گیا ہے" تو وہ اپنی حسین و کشادہ آنکھوں کو نمناک بنا کر، جو خدا جانے نم محبت سے آلودہ تھیں یا نم مسرت سے۔ بولی ہوں میں تمہیں سچے دل سے پیار کرتی ہوں میرے ماں باپ کو میرے دل پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ میرے جسم کو زبردستی دوسرے کے حوالے کر سکتے ہیں مگر جب تک میں زندہ ہوں یہ دل ہمیشہ تمہارا رہے گا"

اللہ اللہ کیسے پیارے اور کیسے امید افزا الفاظ تھے۔ جب زہرہ کے دل میں میرا خیال اس شدت سے جاگزین ہو چکا تھا تو اس عارضی مفارقت کا مجھے کوئی غم نہ ہونا چاہئے تھا۔ کیا ان افسوسناک واقعات کا جو بعد میں خود بخود پیدا ہوتے چلے گئے خفیف سے خفیف دھندلا سا خاکہ بھی میرے ذہن میں اس وقت موجود تھا؟ کیا اس کام کا جس کی تکمیل ستم ظریف قدرت نے میرے ہاتھوں کرائی ادنیٰ سا خیال بھی میرے دل میں موجود تھا؟ میں ان سوالات کا جواب یقیناً نفی میں دوں گا جس سے مجھے اپنی برات نہیں بلکہ اظہار حقیقت منظور ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عموماً وہ زبردست گناہ اور خوفناک جرائم جو اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کو بالکل دو حصّوں میں کاٹ کر ماضی و حال کو ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق کر دیتے ہیں۔ اور جن کے مہلک اثرات ہماری زندگی کو ایک جدید شاہراہ پر ڈال دیتے ہیں سابقہ غور و خوض کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ ایسے کایا پلٹ کر دینے والے خون آشام لمحات قدرت کے گوناگوں اور پراسرار حالات کے ماتحت اپنی بے پناہ قوت تخریبی کے ساتھ یک لخت اس تندی سے رونما ہوتے ہیں کہ ہماری قوت مدافعت فوراً ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک جان گداز لمحہ مجھے بھی اپنے سفر حیات میں پیش آیا اور صد افسوس کہ نفس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر میں نے جلد ہی شکست خوردہ فریق کی حیثیت اختیار کر لی۔ تعطیلات کے اختتام پر زہرہ واپس الٰہ آباد چلی گئی اور میں بمبئی آ گیا۔ مگر دل کا زخم جو محبت کی اولین ناکامی نے پیدا کیا بہت گہرا تھا۔ ابتدائی زندگی کے نقوش خواہ مسرت کے ہوں یا ملال کے ہمیشہ گہرے ہوتے ہیں اگر میں چاہتا تو زہرہ کے والد کے ان الفاظ پر جو انہوں نے میری التجا کے جواب میں کہے تھے اپنے تئیں فریب نفس میں مبتلا کئے رکھتا مگر اس کے بین السطور معانی مجھ پر بخوبی روشن ہو گئے تھے۔ آس تھی تو صرف زہرہ پر کہ شاید اسے رحم آ جائے اور وہ اپنے عہد مودت کو نبھائے۔ مگر جب

میرے پے در پے خطوط کا اس نے جواب تک نہ دیا تو یہ آس بھی ٹوٹ گئی۔ وقت کی روانی ہر شے کو اپنے ساتھ بہالے
جاتی ہے۔ غم وشادی کے جذبات بھی جو وقت کی زنجیر کے ساتھ ناقابل انفکاک طریقہ سے وابستہ ہیں وقت گزرنے پر فنا
ہوجاتے ہیں۔ میرے شوق کی آگ آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی۔ جذبۂ عشق میں پہلے کی سی حدت باقی نہ رہی۔ حتیٰ کہ میں
فارغ التحصیل ہوکر دنیوی کاروبار میں پھنس گیا۔

اس واقعہ کو آٹھ سال گزرجاتے ہیں۔ میں کسب معیشت کی الجھنوں میں مصروف ہوکر سب کچھ فراموش کر
چکا تھا کہ اچانک مجھے روزگار کے سلسلہ میں کراچی جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ کراچی پہنچے مجھے ایک ہفتہ ہؤا تھا۔ شام
کو یونہی گھومنے کے لئے میں بازار کی طرف نکلا۔ راستے میں جوہری کی دکان دیکھ کر کچھ خریدنے کا خیال آگیا۔ میں دکان
کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ سب سے زیادہ جاذب توجہ چیز جو سامنے آئی وہ ایک خاتون تھی جو دکاندار سے باتوں میں مصروف
تھی۔ پاؤں کی آہٹ سن کر دکاندار میری طرف متوجہ ہؤا اور ساتھ ہی اس خاتون نے منہ پھیرا۔ میں نے دیکھا کہ بیش قیمت
ملبوس اور نفیس ترین زیورات میں آراستہ زہرہ کھڑی تھی۔ وہی چکا چوند کردینے والا حسن۔ وہی قیامت نما شباب
وہی ہوش ربا کشیدہ قامتی۔ الغرض وہی مصوری والی زہرہ تھی جس طرح سورج کی اولین کرنیں سوتی دنیا میں کھلبلی مچاکر
جاندار و بیجان اشیا میں حیات تازہ کی لہر دوڑا دیتی ہیں بالکل اسی طرح زہرہ کی اس اتفاقیہ ملاقات نے میرے آٹھ سال قبل
کے جذبات واحساسات کو جنہیں میں خوابیدہ نہیں مردہ سمجھ چکا تھا اپنی معجز نمائی سے پھر زندہ کردیا۔ ایک لمحہ کے اندر
میں پھر اسی دنیا میں پہنچ گیا۔ میرا سینہ انہی آرزوؤں انہیں بے تابیوں کا محشرستان بن گیا۔ جوہری کی دکان میں تو
زہرہ سے چند منٹ ہی گفتگو ہوسکی جس سے اس کی جائے سکونت کا پتہ ملنے کے علاوہ اور صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ وہ اب
ازدواجی زندگی بسر کررہی تھی۔ اگلے ہی روز میں اس کے مکان پر پہنچا۔ مکان کا محل وقوع اور شاندار عمارت بظاہر کر
رہے تھے کہ اس کے مکین امیرانہ زندگی کے مالک ہیں۔ میں نے پہلی مرتبہ وہاں اس خوش نصیب شخص کو دیکھا جس کو قدرت
نے زہرہ ایسی نایاب نعمت بخشی تھی۔ کامران یہی اس کا نام تھا۔ ایک بلند قامت خوب رو ہنس مکھ نوجوان تھا۔ زہرہ
نے بہت تپاک سے مجھے پیش کرتے ہوئے نہایت سنجیدہ الفاظ میں تعارف کرایا۔ جس پر اس نے بہت مسرت کا اظہار
کیا۔ آہ بدنصیب کامران! اُسے اپنی خوش نصیبی کے عوض میں بہت زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔

قوانین اخلاقی سے کون واقف نہیں مگر ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اخلاقیات کا علم ہی کافی نہیں۔ وہاں تو
فولاد کے اعصاب کی ضرورت ہے۔ زہرہ سے مل کر میں ایک خطرناک مخمصہ میں پھنس گیا۔ کیا ایک منکوحہ عورت سے محبت
کرنا جائز ہے۔ میرے ضمیر نے جس میں ابھی تک قوت مدافعت موجود تھی لعنت کی آواز بلند کی۔ وہ کہتا تھا بس اب ان جذ د

سے متجاوز ہونا خدا اور بندوں کے نزدیک بُرا ہے۔ ایک ہفتہ میرے اندر نیکی و بدی کی خوفناک کشمکش جاری رہی۔ میں نے رضا و رغبت کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ میں اپنے کو آزمائش سے بچاتا رہا۔ میں نے فرصت کے اوقات کو مختلف کاموں سے پُر کر دیا کہ مبادا دماغ بے کار ہو کر گناہ کی دلفریب و دلکش ترغیب کا شکار ہو جائے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ کسی چیز کو یاد رکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اُسے بھول جانے کی کوشش کی جائے۔ میری مصنوعی و غیر مصنوعی مصروفیت کے کل اوقات میں زہرہ کا خیال میری روح کی عمیق ترین گہرائیوں سے شعلے کی طرح اٹھ اٹھ کر صبر و اجتناب کی تمام کوششوں کو جلا رہا تھا۔ آخر میری بودی کوششیں سیلاب خوردہ دیوار کی طرح جذبات کے اس تیز و تند طوفان کے سامنے مسمار ہو کر رہ گئیں۔ اب میں نے اپنے آپ کو دھوکا دینا شروع کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر چند گھڑی کے لئے میں زہرہ سے مل آؤں تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ وہاں کوئی جال تو بچھا ہی نہیں رکھا کہ میں پہنچتے ہی گرفتار ہو جاؤں گا مجھے اپنا مزاج مضبوط کرنا چاہئے کہ ایسی ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قابو پا سکوں۔ علاوہ ازیں اب وہ ایک غیر شخص کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بہت سی اہم ذمہ داریوں کی مالک بھی ہے۔ مجھے اپنی گفتگو اور دیگر حرکات میں سخت محتاط رہنا چاہئے" ایسے ہی اور بہت سے خیالات سوچ کر اور لمبی چوڑی تاویلیں کر کے میں اس کے ہاں پہنچ ہی گیا۔ سمجھ لو کہ اب میری داستان کا خونین باب شروع ہو گیا۔ کاش کوئی غیبی طاقت اس وقت میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا کر مجھے اصلیّت کا چہرہ دکھا دیتی۔ کوئی ندا میرے کانوں میں آتی اور حقیقت سے آگاہ کر جاتی۔ میں گرتا گرتا سنبھل جاتا اور اے کاش موت کا آخری وار ہی اس وقت میرا خاتمہ کر دیتا۔

عورت میں استقلال کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ وہ چاہے تو مجسم نیکی بن کر ہر آزمائش کا مضبوطی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔ وہ اپنے تئیں کل آفات سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ لیکن اپنی زندگی کی اولیں محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر اس کی پرامن زندگی میں اس کا سب سے پہلا چاہنے والا جس سے وہ کبھی اظہار محبت کر چکی ہے پھر نمودار ہو جائے تو یقین جانو وہ سب بندشوں سے آزاد ہو کر اسکی تابش نگاہ کے سامنے پھر قطرۂ شبنم کی طرح پگھل جائے گی زہرہ کی زندگی ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ میں اس میں دیمک بن کر داخل ہوا اور زیادہ وقت نہ گزرنے پایا تھا کہ تکمیل حیات کا وہی خوبصورت نمونہ کرم خوردہ ہو گیا۔ میں اس زمانہ کی جزئی تفصیلات میں نہ جاؤں گا۔ میں نہایت سرعت سے انجام کی طرف آرہا ہوں۔ زہرہ سے ملنا تھا کہ میرے جذبات لہریں لینے لگے۔ دبی ہوئی چنگاریاں شعلے بن بن کر بھڑکنے لگیں۔ زہرہ سے میں نے دیوانہ وار محبت شروع کی جس کا جواب اس نے بھی دیوانگی سے دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کامران میری آنکھ میں خار بن کر کھٹکنے لگا۔ میں اسے غاصب سمجھتا تھا۔ منزل کا مرانی تک پہنچنے کے لئے اس سنگ راہ کا ہٹا دینا ضروری تھا

محبت اور جنگ میں سب طریقے مستحسن ہیں۔ میں اس کا فیصلہ کرنے پر تل گیا۔ زہرہ پر تو گویا میں نے سحر کر رکھا تھا وہ ایک معمولی کی طرح میری ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھی۔ انسان سے شیطان بنتے دیر نہیں لگتی جب میں نے اس پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کیا تو پہلے تو وہ عمل جراحی کے اس مریض کی طرح جو کلوروفارم کی تیز بو کی تاب نہ لا کر شروع شروع میں سخت بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ بہت گھبرائی مگر نشہ قوی ہو جانے پر کلیتہً میرے اختیار میں تھی۔ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔ نہ وہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ سنتا ہے۔ آخر کئی روز کی چھان بین کے بعد میں نے وہ چیز حاصل کر ہی لی جس کی مجھے مدت سے تلاش تھی۔ یہ ایک مہلک زہر تھا جو نہایت خفیف مقدار میں انسانی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ لیکن مسموم شخص پر زہر خوری کا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ ہماری باہمی سازش سے کامران کو زہر دیا گیا اور چند گھڑی کے اندر وہ مر گیا۔ کامران کی ناگہانی موت نے شہر میں یقیناً ایک وسیع ہیجان پیدا کر دیا۔ مگر ہم نے یہ کہہ کر کہ حرکت قلب کے یکایک بند ہو جانے سے ایسا حادثہ پیش آیا۔ اپنے نزدیک گویا سب کی تسلی کر دی اب زہرہ آزاد تھی اور میں کھلے بندوں اس سے مل سکتا تھا۔ لیکن جب دشمن درمیان سے اٹھ گیا تو خود میرے ہی اندر اس کا ایک دوست پیدا ہو گیا میرا اک ایسا دشمن جس سے مجھے کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ میری حالت عجیب ہو گئی میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دنیا ایک سیاہ سایہ میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور عجیب الخلقت کالی کالی منحوس صورتیں اپنے لمبے لمبے دانت اور خونی آنکھیں نکال کر ہاتھ بڑھا بڑھا کر میرا گوشت نوچ لینا چاہتی تھیں۔ آتش جہنم کے لال لال شعلے دس دس گز بلند ہو کر ہوا کے جھونکھوں سے میری طرف بڑھ رہے تھے کہ مجھے جلا کر خاک سیاہ کر دیں میں برداشت نہ لا کر اس جاں گسل نظارہ سے تھرا گیا یہ میرا کیا حشر ہو گا ؟ میری زندگی کیونکر کٹے گی۔ میں نے اپنی خوشی کے لئے دوسرے کی خوشیوں کا خون کیا تھا۔ وہ خون اب میری گردن پر تھا۔ مجھے نجات کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ ہمدردی کی کہیں سے بھی توقع نہ تھی۔ اس بیچارگی کے عالم میں چند ضروریات کو ہمراہ لیکر ایک رات میں چپکے سے کراچی سے بھاگ گیا۔ اس وقت سے لیکر آج تک میں خانہ بدوش ہوں آج کہیں اور کل کہیں۔ لیکن میرے کان ہمیشہ کراچی کی جانب لگے رہے زہرہ میرے لئے رسوا ہوئی۔ اقدام گناہ میں میرے ساتھ شریک ہوئی لیکن میں نے اسے شکوک و شبہات کا ہدف بنا کر تنہا چھوڑ دیا۔ عورت جب محبت کرتی ہے تو اپنے چاہنے والے کے سامنے جان و دل خون کر کے رکھ دیتی ہے لیکن اس کی محبت کو ذرا ٹھکرا دو پھر دیکھو وہ کیونکر بھوکی شیرنی اور چھڑی ہوئی ناگن سے زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے اسے محبت کا انتقام کہتے ہیں۔ زہرہ نے جب دیکھا کہ میں نے اسے خراب کر کے عرش سے فرش پر پھینک کر دنیا کے سامنے عریاں ہدف ملامت بنا کر تنہا چھوڑ دیا تو وہ بھڑک اٹھی ایک ایسے انتشار قلب کے ساتھ جس میں اپنے

خراب کرنے والے کی تباہی کا عزم پنہاں تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پولیس کے سامنے جا کر کامران کے قتل کا اعتراف کرلیا اس کے اس طرز عمل سے چاروں طرف سنسنی پھیل گئی۔ اخبارات میں طوفان برپا ہوگیا۔ اس کے بیان کو پڑھ کر جو شروع سے اخیر تک تمام شرمناک واقعات پر مشتمل تھا لوگ انصاف انصاف پکارنے لگے اور ساتھ ہی حیرت و استعجاب سے اس عورت کو دیکھتے تھے جو اپنے نادر الوجود حسن و جمال کی رعنائیوں کے باوجود شیطان کی خالہ ثابت ہوئی تھی۔ حکومت نے میری گرفتاری کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ پولیس شکاری کتوں کی طرح میرا کھوج نکالنے میں مصروف ہے۔ پہلے تو میں نے چاہا کہ خود بخود جا کر اپنے تئیں اُن کے حوالے کردوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا مگر موت کے انتظار میں ایڑیاں کون رگڑے؟ عدالت کے سامنے ایک جم غفیر کے روبرو اپنے جرم کا اعتراف کرنا اگرچہ میرے نفس کے رہے سہے غرور کو تو ضرور فنا کردے گا مگر پھانسی پر چڑھ کر مرنا مجھے پسند نہیں۔ میں ابھی کیوں نہ اپنا خاتمہ کرلوں"؟

میں یہ الم انگیز بیان پڑھ چکا تو خوف و تاسف کی شدت سے بدن لرزنے لگا۔ کاغذ سرک کر میرے ہاتھ سے زمین پر گر گیا۔ اور وہ خوفناک الفاظ جنہیں میں ہمیشہ بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن جو بار بار یاد آکر مجھے ایک غیر فانی صداقت سے آگاہ کر جاتے ہیں، میرے کانوں میں گونجنے لگے۔

"گناہ کی مزدوری موت ہے"

عاشق بٹالوی (بی۔اے)

غزل

لے چکا اب میں ترے کوچے سے ٹل جانے کا نام ۔۔۔ کوہ کی ہمت نہ سیکھے گی پھسل جانے کا نام

کوئی پروانہ سے پوچھے کیا ہے اے حرماں نصیب! ۔۔۔ لو لگا کر شعلۂ آتش سے جل جانے کا نام

غافل اس دو روزہ ہستی پر عبث نازاں نہ ہو ۔۔۔ زندگی ہے آج آنے اور کل جانے کا نام

حشر کیا ہے؟ حشر اپنے سر پہ ٹوٹا بارہا ۔۔۔ کیا ہوا اے ظالم تری آنکھیں بدل جانے کا نام

زیست کیا ہے؟ کاوشِ پیہم دمادم اضطراب

موت کیا ہے؟ دل کی حالت کے سنبھل جانے کا نام

حامد علی خاں

اثرات

دنیا میں ہزاروں خوشیاں ہیں، یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم میں لیکن میرا بھی اک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والوں کا نے کعبہ نے بت خانہ ہے
ہاں! دو ہی سہارے ہیں اُنکے یا موت ہے یا پیمانہ ہے

بیگانۂ ہوش ہے "صہبائی" مستانہ سا مستانہ ہے
ہاں! باتوں میں کچھ شوخی ہے اور شوخی بھی رندانہ ہے

ہر شاخ جب اک مستانہ ہے ہر پھول جب اک پیمانہ ہے
توبہ پھر ایسے میں توبہ! جب فطرت ہی میخانہ ہے

گھنگھور گھٹائیں آئی ہیں رحمت بن بن کر چھائی ہیں
آباد ہوئے ہیں میخانے، سجدے میں ہر اک مستانہ ہے

وہ دل کہ مہکتا رہتا تھا عشرت کے رنگیں پھولوں سے
تقدیر کی غارت گریوں سے ویرانہ سا ویرانہ ہے

یوں داد وفا کی ہوتی ہے، یوں کرنے والے مرتے ہیں
اک داغ سا شمع کشتہ ہے خاکستر سا پروانہ ہے

کعبے میں یا بت خانے میں یہ بات کہاں میخانے کی!
جو کام ہے آزادانہ ہے جو بات ہے بیباکانہ ہے

کچھ فرق نہیں ہم مستوں کے کاشانے اور میخانے میں
کاشانہ ہی میخانہ ہے میخانہ ہی کاشانہ ہے

گو ایک گدائے مست ہوں میں لیکن اک مست الست ہوں میں
ہیں چاند اور سورج پیمانے، دنیا میرا میخانہ ہے

برسات کی چاندنی راتوں میں دیکھے تو کوئی "صہبائی" کو
لب پر بھی مناجاتیں لاکھوں، ہاتھوں میں بھی پیمانہ ہے

اثر صہبائی

خونناب مسرّت

اندلس کی خونیں تماشا گاہیں

رومۃ الکبریٰ کے متعلقات میں "کلوزیم" نام کی ایک عظیم الشان عمارت کی ویرانی اور شکستہ حالی اسکی قدامت پر دلالت کررہی ہے۔ کبھی وہ دن تھے کہ یہ رفیع اور خاموش جگہ ہزاروں پرشور اور خون آشام تماشائیوں سے معمور ہوتی تھی۔ رومی لوگ اپنے عروج اور اقبال مندی کے ایام میں اس کے اندر ہندوستان اور افریقہ کے جنگلوں سے پکڑے ہوئے وحشی اور خونریز درندوں سے بدبخت اور اجل گرفتہ انسانوں کو لڑاکر مسرور ہوتے اور ان خونی تماشوں سے اپنے جذبات بہیمانہ کو تسکین دیا کرتے تھے۔ مگر یہ ہزارہا سال ماسبق کے پارینہ افسانے ہیں۔

اس تہذیب اور ترقی کے دور میں بھی دانشکدۂ یورپ کے اندر ایک قوم موجود ہے جو اپنی فطری سبعیت سے ماضی کے ان یادگار خونی مناظر کو زندگی بخش رہی ہے۔ ملک اندلس میں "بیل کی لڑائی" دیکھنے کا مقبول عام رواج ہے۔ جری اور گرانڈیل سانڈوں کے گلے سنسان کوہستانی وادیوں میں آزاد چھوڑ کر لڑنے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ بچارے اس بے روک ٹوک زندگی میں جوان ہو کر اس قدر وحشی، مہیب اور خونخوار ہو جاتے ہیں کہ کوئی انسان حتیٰ کہ اُن کا تنہا نگہبان بھی اُن کے پاس جانے کی جرات نہیں لا سکتا اُن کی سرمستانہ دھاڑوں سے گردوپیش کی پہاڑیاں اور صحرا گونجا کرتے ہیں

اندلسی تشنگیٔ ذوق کو ان سانڈوں کے خون کی دھاروں سے زیادہ دنیا کی کوئی دوسری تفریح سیراب نہیں کر سکتی۔ رفیع و وسیع مستقل تماشا گاہیں "مجادلہ ثور" کے لئے بنائی گئی ہیں جن میں بیک وقت ہزاروں تماشائی سما سکتے ہیں۔ میڈرڈ آستانۂ سلطنت کی تماشا گاہ میں ساڑھے بارہ ہزار اور بلاد سیوائل اور ویلنسیا میں علی الترتیب گیارہ اور سترہ ہزار نشستوں کی بافراغت گنجائش ہے اور جس وقت تماشا شروع ہوتا ہے تو مجمع کے غٹ کے غٹ سے ان جگہوں کا چپہ چپہ پٹا ہوا ہوتا ہے۔ کہیں تل رکھنے کو بھی گنجائش نہیں ملتی۔

یہ تفریح گاہ اوپر سے کھلا ہوا ایک احاطہ ہوتا ہے جس کے عین وسط میں مصاف کا بیضوی دائرہ قائم کیا جاتا ہے اس مصاف کے گرداگرد دوہری فصیل کھڑی کی جاتی ہے کہ مبادا دوران جنگ میں غضبناک سانڈ ایک فصیل پھاند جائے تو دوسری اس کے اور نشستوں کے درمیان حائل رہے اور تماشائی خطرہ سے محفوظ ہوں۔ ان فصیلوں کے چاروں طرف

نشستوں کے دائروں کی باہم متوازی قطاریں یکے بعد دیگرے بتدریج بلند ہوتی اور احاطہ کے میدان میں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ تاکہ ہر تماشائی بغیر کسی دقت کے تماشے سے یکساں لطف اندوز ہو سکے۔

ایک تماشائی جس نے کئی مرتبہ یہ عجیب و غریب دنگل دیکھا ہے ذیل کی عبارت میں اس کی سرگذشت بیان کرتا ہے۔

منڈپ پہروں سے بے قرار اور مشتاق تماشائیوں کے ہجوم سے بھرا ہوا انسانی سروں کا متلاطم سمندر معلوم ہوتا ہے۔ وقتِ معین پر (علی العموم چار بجے شام) ایک عہدے دار کی سرکردگی میں جو زمانۂ متوسط کا عجیب الہیئت لباس پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اکھاڑے کے اندر ایک جلوس داخل ہوتا ہے جو تماشا دکھانے والوں کی متعدد ٹولیوں اور اُنکے پیچھے خچروں کی ایک یا دو قطاروں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں آگے کے تین خچروں پر خوبصورت جھولیں ڈھکی ہوئی ہوتی ہیں یہ جلوس فوجی بینڈ کی گت پر پاؤں ڈالتا ہوا اکھاڑے کا چکر لگا کے "میر مجلس" کو جو صدر دروازے کے بالمقابل اپنی مخصوص نشست پر متمکن ہوتا ہے۔ سپاہیانہ طریقہ پر سلامی دیتا ہے۔ ازاں بعد یہ سب کرتبی کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح اپنی اپنی جگہ لے لیتے ہیں۔ اب شہنائی بجتی ہے جس پر میر مجلس سابق الذکر عہدے دار کی طرف اپنی بلند نشست سے محبس کی کنجی پھینکتا ہے جس کو وہ اپنی قلغی دار ٹوپی کے اندر لپک لیتا ہے۔ اور محبس کے دروازے کا قفل اور پٹ کھولنے کیلئے بڑھتا ہے اور اپنا کام انجام دے کر فوراً ایک سمت کو کود کر الگ ہو جاتا ہے۔

ابھی چند لمحے نہیں گذرنے پاتے کہ شاندار سانڈ ایک پر عظمت انداز سے اپنی گردن اور دم کو اُوپر اٹھائے ہوئے اس دروازے سے اکھاڑے میں درانہ آتا ہے۔ اور یکایک بیچ میں ٹھٹک کر اور ہجوم کی طرف اپنا سر پھیر پھیر کے قوت کے زعم میں مبارز طلبی کے انداز سے تکتا ہے۔ اس موقع پر تماشائیوں کے مواج سمندر سے سامعہ سوز آوازوں کا طوفان امنڈتا ہے جو اپنے حلق پھاڑ پھاڑ کے، اپنی ٹوپیاں ہلا ہلا کے اسکی پذیرائی کرتے ہیں۔

اتنے میں سانڈ کی نظر ان کرتبی لوگوں کی ٹولی میں سے جو اکھاڑے کے اندر اسکے چاروں طرف کھڑی ہوتی ہے اچانک اپنے سب سے قریب کے آدمی پر پڑتی ہے اور معاً وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اس پر حملہ کناں جھپٹتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ آدمی اطمینان سے بیل کی آنکھوں پر اپنی عبا کے دامن کی جھپکی دیتا ہے اور نہایت سہولت سے ایک طرف کو اچھل کر اپنے حریف کی زد سے باہر ہو جاتا ہے۔ اب سانڈ اس کا پیچھا چھوڑ کر دوسرے پھر تیسرے اور اسی طرح ہر ایک پر پیاپے یورش کرتا ہے لیکن ہر ایک کرتبی اسی ترکیب اور ویسی ہی آسانی سے بچ جاتا ہے۔ بعض وقت سانڈ اپنے حملہ کی ناکامی سے جھنجھلا کے ایک ہی شخص پر اپنے اننشاک حملوں کا تار باندھ دیتا ہے۔ اس وقت وہ شخص پہلی فصیل پھاند کے پناہ لینے پر مجبور ہوتا ہے

اور وہ اس کام کو ایک پرند کی طرح اڑکر سہولت سے کرتا ہے۔

تماشے کا یہ مقام سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے! تماشا دکھانے والوں کی بھڑکیلی اور رنگا رنگ شوخ عبائیں۔ ترت پھرت حرکات و سکنات تتلیوں کی پرّان ٹکڑی کے مانند اُن کی جست و خیز اور رو ارو۔ جانور کا شجاعانہ انداز۔ اس کی چمکدار اور باریک اطلسیں جلد۔ بھرے ہوئے جوڑ بند۔ گول اور شاندار جسم۔ کتنا نظر فریب سماں ہوتا ہوگا لیکن یہ تمام کرتب بے خطر نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا بھی اتفاق پیش آجاتا ہے کہ اس پھرتی اور تیزی میں کسی کام کرنے والے کا قدم لڑکھڑا جاتا ہے۔ اور وہ گر جاتا ہے۔ اس دوران میں قہر آلود اور خشمناک سانڈ اپنے سینگ اس کے بدن میں پیوست کر دیتا ہے۔ یہ امکان اس تماشے کے لطف کی کیسی تکدر آمیز قساوت ظاہر کرتا ہے مگر اہل اسپین کے لئے یہ محض بازیچۂ اطفال ہے۔ اگر تماشے کی کسی ایک حالت کو طول ہو جائے تو وہ منظر کی یکسانی اور تکرار سے اکتا جاتے اور تماشے میں ایک نئی روح ڈالنے کو کسی جدید تغیر کے لئے غل اور پکار کرنے لگتے ہیں۔

اب دو سوار اکھاڑے کے اندر بڑھتے ہیں اور بیل کی توجہ اپنی طرف پھیرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جن گھوڑوں پر وہ سوار ہوتے ہیں اُن کا نہایت پتلا حال ہوتا ہے۔ اُن کے لئے قصائی کے کھونٹے سے زیادہ موزوں اور کوئی ٹھکانا نہیں مل سکتا۔ وہ یا تو اکثر اندھے کر دیئے جاتے ہیں یا اُن کی آنکھوں پر اندھیریاں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں تاکہ اپنی جگہ پر قائم رہیں اور سانڈ کے حملوں سے بدک نہ جائیں۔ ہر سوار کے ہاتھ میں نیزہ ہوتا ہے جس کا پھل صرف دو انچ تیز ہوتا ہے۔ حملوں سے محفوظ و مامون رکھنے کے لئے سواروں کے جسم پر ایک قسم کا دبیز چلتہ ہوتا ہے اور اپنی ٹانگوں میں وہ ایک آہنی زنجیرہ اور چمڑہ پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ سانڈ فی الفور ان میں سے ایک پر جھپٹتا ہے اور وہ اسے اپنے بھالے کی انی پر لیتا ہے۔ کبھی تو اس ترکیب سے جانور ٹل جاتا ہے اور کبھی جوشِ انتقام سے دیوانہ ہو کر نیزے کی پھال کی روک کے باوصف وہ سوار کو آ کر دبا لینا چاہتا ہے۔ ایسے نازک وقت میں سوار بمجبوری اپنے گھوڑے کو کاوا دیکر حملہ خالی دے دیتا ہے۔ بایں ہمہ یہ کام نہایت کٹھن ہے اور اگر خوش اسلوبی سے سرانجام نہ پائے تو بیل کے سینگ گھوڑے کے پیٹ میں ڈوب جاتے ہیں۔ اب دوسرا سوار سانڈ کو اپنی طرف متوجہ کر کے اپنے ساتھی کا معین ہوتا ہے۔ برہم سانڈ فوراً اس کی طرف ملیٹ پڑتا ہے اور جنگ کا سلسلہ یونہی برابر جاری رہتا ہے بعض دفعہ سینگ گھوڑے کی کسی نازک جگہ کو چھید ڈالتے ہیں تو وہ فوراً گر پڑتا ہے اور یونہی آناً فاناً اس کا دم خفا ہو جاتا ہے۔ نہیں تو وہ زخم خوردہ اور خون میں غلطاں لڑکھڑایا کرتا ہے۔ کبھی فرس اور فارس دونوں سینگوں پر صاف اٹھا کے زور سے زمین پر ٹپک دیئے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ خشمگیں سانڈ نے گھوڑوں کے پیٹ اس طرح چیر ڈالے کہ اُن کی [illegible] اور اوجھ باہر

لٹک آئے اور انہوں نے تڑپ تڑپ کر اسی وقت دم دے دیا لیکن ان کے سوار ایسی ردی حالت میں بھی ان کی پیٹھ پر سے نہ سرکے اسی طرح آسن جمائے غصہ ور بچار کے حملوں کو اپنے نیزوں پر لیتے اور رد کرتے رہے۔ اس جنگ کے گھمسان میں تمام مجمع شدت مسرت میں اپنی رعد آسا گرج سے دیوانہ وار انکی تحسین کر رہا تھا۔

اگر گھوڑا درازنہ ہو جائے تو زخم کے بغارے میں ایک مٹھی کوڈ ٹھونس دیا جاتا ہے تاکہ لہو تھم جائے اور اسکی جان چند مزید لمحوں کے لئے اٹکی رہ جائے۔ آخر کار جب وہ مرنے کیلئے ڈھلکنے لگتا ہے تو بغیر کسی پروا کے پاؤں رگڑنے کے لئے وقت احتضار اسی جگہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سوار کچھ وقفہ کیلئے غائب ہو جاتا ہے۔ اور جلد ہی دوسرے نئے جانور پر ایک نئی شان سے نمودار ہوتا ہے۔ بالاوسط ایک سانڈ کے مقابلہ میں چار سے چھ تک گھوڑے کھیت رہتے ہیں تقریباً پاؤ گھنٹہ میں سیلان خون سے سانڈ پست ہو جاتا ہے اور اپنے متواتر حملوں کی تکان سے چکنا چور ہو کر ڈگمگانے لگتا ہے اب یہ لابد ہوتا ہے کہ اس کو نئے سرے سے پھر برافروختہ کیا جائے۔ شہنائی پھر گونجتی ہے جس پر مجمع میں بڑی چیاؤں پیاؤں مچتی ہے۔ اتنے میں نئے تماشا کرنے والے اکھاڑے کے اندر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ دو شخص اپنے ہاتھوں میں تیر تھامے ہوئے مصاف کے اندر بڑھتے ہیں۔ ان تیروں کی خوبصورت اور خوشنما فیتوں اور کپڑے کے پھولوں سے تزئین کی جاتی ہے اور اگر سانڈ بالکل پژمردہ اور نڈھال ہو جاتا ہے تو ان تیروں میں آتشبازی کی پھلجھڑیاں وغیرہ بھی آویزاں کی جاتی ہیں۔

ایک کرتبی چند قدم ڈال کر سانڈ کے بالمقابل اپنے ہاتھوں میں تیر سنبھالے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ غریب اپنا سر ہلا کر جیسے ہی اس کی طرف دوڑتا ہے وہ تیر کا پیکان اس کی گردن کی ایک بالائی کروٹ میں کونچ دیتا ہے اور سہولت سے جست مار کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ تیر کی سری اس کی جلد میں اٹک جاتی ہے اور وہ بار آراستگی سے لٹک کر ترازو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی گردن میں دونوں طرف تیروں کی قطاریں پرو دی جاتی ہیں جن کے زخم کی لپک اور ٹیسوں سے وہ غریب جانور بری طرح بلبلاتا ہے۔ کودتا ہے۔ غصہ سے مٹی اڑاتا ہے۔ چاروں طرف بھاگتا ہے کہ کسی طرح ان موذی تیروں سے گلو خلاصی ہو جائے۔ بے تحاشا دھاڑتا ہے مگر سب لاحاصل۔ اس کی وہ خوبصورت جلد جو اکھاڑے میں داخل ہوتے وقت ساٹن کی طرح چمکتی تھی اب لہو میں لتھڑی ہوئی ہوتی ہے اس کی خونچکاں اور شعلہ بار آنکھیں اب مدھم پڑ جاتی ہیں۔ خشک و تشنہ زبان باہر لٹکنے لگتی ہے اور اس پر اس قدر سہراس چھا جاتا ہے کہ اب دق کر کے کسی مزید محاربہ کے لئے اشتعال دینا قطعاً ناممکن ہے۔ یکایک منظر کا رنگ پھر بدلتا ہے اور ایک نیا آدمی ایک ہاتھ میں تلوار پکڑے اور پینترے بدلتا ہوا مصاف میں داخل ہوتا ہے اور موقع تاک کے کوئی ایسا ہاتھ

دکھاتا ہے جس سے جانور زمین پر لڑھک جاتا ہے اور تھوڑی دیر ہاتھ پاؤں مار کر اس کی روح پرواز کر جاتی ہے اس طرح اس منظر کا اختتام ہو جاتا ہے ۔ تماشائیوں کی بھیڑ میں کھلبلی پڑ جاتی ہے ۔ تالیوں اور قہقہہ ہائے مسرت سے زمین و آسمان سر پہ اٹھا لئے جاتے ہیں ۔ اور اگر یہ آخری کرتب سلیقہ اور ہنرمندی سے دکھایا گیا ہے تو لوگ اپنی ٹوپیوں اور خواتین پھولوں اور گلدستوں کی اس سورما پر بارش کر دیتی ہیں ۔

اب خچر اکھاڑے کے اندر آتے ہیں اور ان کے اوپر لاد کر لاشیں باہر لے جائی جاتی ہیں ۔ خون کے تھانوں پر ریت بر کا جاتا ہے اور مصاف کو بالکل صاف کر دیا جاتا ہے ۔

شہنائی کی صدا پھر بلند ہوتی ہے ۔ اسی طریقہ سے ایک نیا سانڈ اکھاڑے میں دوڑتا ہے اور تمام اسی فسر دکن منظر کا جزوی ردوبدل کے ساتھ اعادہ کیا جاتا ہے ۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ تمام سانڈ اور گھوڑے کام آ جاتے ہیں ۔

یہ تماشا تہوار کے روز بالخصوص اتوار کو دکھایا جاتا ہے ۔ اس میں کم و بیش پانچ ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے ۔ اور اس کا منافع اسی شہر کے شفاخانہ میں دے دیا جاتا ہے ۔

اس قسم کے تماشے جو میڈرڈ سیوائل اور ویلنسیا میں ہوتے ہیں ان میں صرف ایک تماشے کے اندر بالعموم چھ سے لیکر آٹھ بیل تک اور بیس سے لیکر چالیس گھوڑوں تک کا خون بہایا جاتا ہے ۔ منظر ابتداً اتنا ہولناک ہوتا ہے کہ بغیر خوف اور جھجک کے نہیں دیکھا جا سکتا مگر رفتہ رفتہ عادت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ایک قسم کا لطف آنے لگتا ہے

محمد عبداللہ خاں خویشگی

آمد بہار

خوشی کے زمزمے گاتی ہوئی فصلِ بہار آئی ۔۔۔ گلستاں سے صدائے خندۂ گل بار بار آئی
چمن کے پتے پتے پر ہوئی انوار کی بارش ۔۔۔ گھٹا بن کر نوید رحمت پروردگار آئی
صبا مستی سے اٹھلاتی ہوئی پھرتی ہے گلشن میں ۔۔۔ ہنسی پھولوں کو اس پر آئی اور بے اختیار آئی

صدا بلبل کی آئی پے بہ پے صحنِ گلستاں سے
بہار آئی ، بہار آئی ، بہار آئی ، بہار آئی

حامد علی خاں

بقائے عشق

جو ہوتی عشق سے خالی تو رونق اسمیں کیا ہوتی
ضیائے عشق سے روشن ہے بزمِ عالمِ فانی
وجودِ عشق سے ہی زیب و زینت اس گلستاں کی
جنوں انگیز ہو جاتی وگرنہ اس کی ویرانی

فنا ہو جائے دنیا اور اس دنیا کی کل چیزیں
مگر باقی رہے کا عشق جو اک نورِ یزداں ہے
بنائے ہر دو عالم عشق پر رکھی ہے خالق نے
اسی کے دم سے قندیلِ مہ و انجم فروزاں ہے

جہاں میں جتنے رشتے ہیں وہ سارے ٹوٹ جائینگے
مگر یہ غیر ممکن ہے کہ ٹوٹے رشتۂ الفت
یہ وہ زنجیر فولادی ہے جو کاٹے نہیں کٹتی
اجل توڑے اسے اتنی بھلا اس میں کہاں طاقت

بنا ہوتی ہے گو ناکامیوں پر استوار اس کی
مآلِ عشق ہو سکتا نہیں جز راحتِ کامل
مثالِ آئینہ ہر قلب کو دی ہے جلا اس نے
دکھا دیتا ہے یہ عشاق کو مقصود کا ساحل

اظہر حسین زاہدی

مجاہدات

کیا ہوا گر میں ہلاکِ جستجو ہوتا رہا
اور پوشیدہ مری نظروں سے تو ہوتا رہا
وسعتیں کرتا گیا ذوقِ لطافت جس قدر
میں بعیدِ آرزوئے رنگ و بو ہوتا رہا
تار یوں تو بربطِ امید کے ٹوٹا کئے
ہمت افزا نغمۂ لا تقنطوا ہوتا رہا
وہ تبسم وہ میری وارفتگی کی ابتدا
یاد آ آ کر فریبِ آرزو ہوتا رہا
ازدیادِ عشق سے خودداریاں بڑھتی گئیں
بے نیازِ جلوہ ہائے آرزو ہوتا رہا

قدسیوں میں اسکی تقدیسِ محبت کا ہے شور
جو تمہارے عشق میں بے آبرو ہوتا رہا

روش صدیقی

باہمّت و کم ہمّت

دنیا باہمت شخص کو سراہتی ہے اور کم ہمت کو سرزنش کرتی ہے۔ کیوں؟ کہا جاتا ہے کہ وہ حوصلہ مند ہے۔ مصیبت کے وقت گھبراتا نہیں تکلیف کو چپکے چپکے سہتا ہے۔ یہ بزدل ہے صعوبت برداشت نہیں کرتا اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی دکھ دیتا ہے۔

بھلا اپنا برا کون چاہتا ہے؟ ہر شخص بھی اپنا بُرا چاہتا نہیں پھر بزدل اپنے پاؤں پر آپ ہی کلہاڑی کیوں مارنے لگا۔ وہ بیچارا تو اپنے سر پر پہاڑ گرتا دیکھتا ہے زلزلہ آتا محسوس کرتا ہے اور پاؤں تلے سے زمین سرک جاتی ہے پھر کس طرح نہ چیخے چلائے؟ خدا نے زبان دی ہے اُسے اور کان دیئے ہیں ہیں۔ وہ کیونکر نہ بولے ہیں کیونکر نہ سنائے اس کا کیا قصور کہ اور صاحب نطق و ہوش مصیبت پر بھی چپ سادھ لیں وہ خاموشی سے رشتہ جوڑ لیں اسے کیا پڑی ہے کہ موت کے آنے سے پہلے خاموش ہو جائے؟ کہئے اس کا کیا قصور اگر اوروں کو پہاڑ گرتا نظر نہ آئے۔ زلزلہ آتا محسوس نہ ہو اُن کی بصارت مختلف اُن کے احساس جُدا۔ خدا نے انہیں ویسا بنایا اسے ایسا۔ اُن کا نام قسمت ہی نے دلیر خاں رکھا کتنا ظلم ہے کہ انسانیت انہیں کو نحیف الدین کہے۔ دنیا میں تو بدقسمت ہیں ہی اب دنیا کے کہے پر خدا بھی انہیں چھوڑ دے؟ وہ خدا جو سنتے ہیں کمزوروں اور بدنصیبوں کا ساتھی ہے۔ فطرتِ انسانی اگر حوصلہ مندوں ہی کی مداح ہے تو کیا مشیت ایزدی بھی بزدلوں کی طرفدار نہیں؟ یہاں نہ سہی تو آگے چل کر بھی نہ ہوگی؟

بزدلوں کو کم از کم اس بات کے یقین میں پختہ اعتقاد اور مستقل مزاج ہونا چاہئے کہ خدا حوصلہ مندوں کے خلاف ہو نہ ہو اُن کے ساتھ ضرور ہے!!

بشیر احمد

جُدائی

مجھے ایک آخری کوشش کر لینے دو۔ میں ایک دفعہ پھر ہاتھ پاؤں مار لوں، اس کے بعد میں ہمیشہ کیلئے اس درد و کرب سے نجات پا جاؤں گا جس نے میرے مجروح دل کو اضطراب میں ڈال رکھا ہے۔ تم اپنے لئے اور محبت کیلئے مجھے ایک آخری لمبی آہ کھینچ لینے دو۔ اس کے بعد میں تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گا۔

غزل

گو میں ہوں تجھ سے دُور تری آرزو تو ہے
تیرا پتہ ملے نہ ملے جستجو تو ہے

مجھ کو ہے گُل سے ربط گلستاں سے اختلاط
تیرا سا کچھ تو رنگ ہے تیری سی بُو تو ہے

وہ آئیں یا نہ آئیں انہیں اختیار ہے
اے ذوقِ انتظار میں خوش ہوں کہ تُو تو ہے

بیداد سے سرشت تمہاری سہی، مگر
آمیختہ کچھ اس میں محبت کی خُو تو ہے

پروانے کی ہی موت پہ اے شمع مجھ کو رشک
تیرا شہیدِ ناز ترے رُوبرُو تو ہے

وحشت ہوائے دید میں رقصاں ہے اپنا دل
دیکھوں نہ دیکھوں اُس کو مگر آرزو تو ہے

رضا علی وحشت (کلکتہ)

امیر عبدالرحمٰن کا فیصلہ

نوشتۂ رڈیارڈ کپلنگ
۱۸۸۷ء

اعلیٰ حضرت عبدالرحمان خاں جی۔سی۔ایس آئی امیر افغانستان۔ علیا حضرت ملکہ انگلستان و قیصرۂ ہند کے وفادار دوست ایک ایسے عالی مرتبہ انسان ہیں جن کی عزت تمام صحیح الدماغ لوگوں کے دلوں میں ہونی چاہئے۔ اکثر والیان سلطنت کی طرح وہ بھی ویسی حکومت نہیں کر سکتے جیسی وہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی قبائے سلطنت ایک ایسی قوم کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو دنیا کی سب قوموں سے زیادہ سرکش تصور کی جاتی ہے۔ افغان کے دل سے ملک کے قانون اور بادشاہ کا تمام احترام اس وقت اٹھ جاتا ہے جب اُسے خود اپنا نفس بغاوت پر آمادہ کرتا ہے وہ طبعاً چور ہے۔ وہ موروثی طور پر قاتل ہے بلکہ اُسے تربیت ہی ایسی دی جاتی ہے کہ وہ آزادانہ اور وحشیانہ طریق پر بد اخلاق ہو اس کے باوجود عزت اور غیرت کے معاملہ میں اس کا کج مج تصور ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کی سیرت مطالعہ کے لئے ایک حیرت انگیز چیز ہے بعض اوقات وہ بغیر کسی وجہ کے لڑ پڑتا ہے خواہ پھر اس کے پرچے ہی اڑ جائیں۔ مگر بعض اوقات وہ لڑنے سے اس وقت تک محترز رہتا ہے۔ جب تک دوسرا اُسے دھکیلتا دھکیلتا کسی کونے کے اندر نہ ڈال دے۔ جس واقعہ کا مجھے یہاں ذکر کرنا ہے اس میں افغان کی اس بے دلیل منطق کا ذکر ہے۔ جو بھیڑیئے کو غریب جانوروں کے پھاڑ کھانے پر مجبور کرتی ہے۔

کچھ اس قسم کے لوگ ہیں جن پر اعلیٰ حضرت اس ایک ہی حربہ کو ہاتھ میں لے کر حکومت کرتے ہیں۔ جسے ان کی قوم کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یعنی موت کا خوف جو بعض مشرقیوں کے نزدیک عقل و دانش کا سرچشمہ ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر کا بس وہیں تک چلتا ہے۔ جہاں تک بندوق کی گولی مار کرتی ہے۔ لیکن چونکہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ کب ان کا بادشاہ ان کے درمیان آموجود ہوگا، اس لئے ان پر ہر وقت ایک قسم کا خوف مسلط رہتا ہے۔ اور چونکہ زمام سلطنت تمام تر اعلیٰ حضرت ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے اُن کی عزت تمام لوگوں کے دلوں میں غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی ہے۔ غلام حیدر سے جو افغان فوج کا کمانڈران چیف ہے۔ لوگ بجا طور پر خائف ہیں۔ کیونکہ اسے سولی دینے کے اختیارات حاصل ہیں۔ کابل کا تمام شہر گورنر سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں بھی موت و زیست کی قدرت ہے لیکن امیر افغانستان کی ذات ان وحشی قبائل کے لئے رئیس یا گورنر سے بہت زیادہ باہیبت واقع ہوئی ہے۔ ان کے الفاظ

سرخ قانون کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کے غصہ کی آندھی کے آگے انسان کی زندگی اپنے شجرے پتے کی طرح ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور ان کا انعام و اکرام خطرناک ہے۔ انہوں نے بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں اور تخت نشینی سے پہلے وہ مدتوں حیران و بے خانماں پھرے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی رعایا کے ہر طبقہ کے حالات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مشرق کے دستور کے مطابق ہر وہ مرد یا عورت جسے کوئی شکایت ہو یا جسے دشمن سے کوئی بدلہ لینا ہو حق رکھتا ہے کہ دربار میں حاضر ہو کر بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو کرے۔ یہ شخصی حکومت ہے۔ ایسی حکومت جیسی ہارون الرشید کی حکومت تھی جس کا آئین دنیا میں اب تک دائر و سائر ہے۔ اور اس وقت بھی دائر و سائر رہے گا جب انگریزوں کا دور گزرے مدتیں ہو چکی ہونگی۔

لیکن بادشاہ سے آزادانہ گفتگو کا حق بھی یقیناً خطرہ سے خالی نہیں۔ بادشاہ ایک آدمی کو اس کی صاف گوئی پر خوش ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اسی وقت ایک دوسرے شخص کی آزادہ روی اس کو تلوار کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ وہ تلوار جس کی دھار اسی کام کے لئے چمکتی رہتی ہے اور لوگ اُسے دیکھنا بھی یوں ہی چاہتے ہیں کیونکہ یہ اُن کا حق ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ امیر نے اپنا روزانہ کام انجام دینے کے لئے بابر باغ کو منتخب کیا۔ جو شہر کابل سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ ان کے سامنے ایک ہلکی سی میز رکھی تھی۔ اور اس کے اردگرد کھلی ہوا میں تمام امرا و وزرا درجہ بدرجہ جمع تھے۔ درباری اور جاگیردار ——— خاندانی لوگ، وہ لوگ جو دوسروں کا خون چوس چوس کر پلتے ہیں اور پھر جن کا خون بادشاہ کی طرف دیکھ دیکھ کر خشک ہوتا ہے ——— ایک بے قاعدہ سا حلقہ باندھے میز کے گرد کھڑے تھے۔ اور کابل کے باغوں کی ہوا ان کے سروں پر چلتی تھی۔ تمام دن پسینہ میں تر اور ہرکارے خط لے لے کر آتے رہے کہ فلاں ضلع میں بغاوت ہو گئی فلاں مقام پر ایک سازش نشو و نما پا رہی ہے۔ فلاں جگہ قحط پڑ گیا۔ فلاں رئیس نے قرضہ ادا نہیں کیا۔ یا فلاں مقام پر سڑک کے اوپر خزانہ پایا گیا۔ دن بھر اعلیٰ حضرت ان پیغامات کو پڑھتے رہے۔ ان میں سے ایسے خطوط جن کا زیادہ مخفی رکھنا ضروری نہ ہوتا اسی وقت ان عمال کے حوالے کر دیئے جاتے جن سے وہ متعلق ہوتے یا کبھی کبھی کسی رئیس کو بلا کر اس سے بعض امور کے متعلق جواب طلب کیا جاتا۔ پھر وہ پُر ہیبت سر جس پر سیاہ رنگ کی استرخانی ٹوپی رکھی ہوتی ایک خوفناک انداز سے جنبش میں آتا اور وہ رئیس پھر اپنی جگہ پر جا کھڑا ہوتا اسی دن سہ پہر کے قریب ایک عورت آئی اور اس نے اپنے خاوند سے طلاق حاصل کرنے کا مطالبہ کیا۔ وجہ یہ بتائی کہ اس کے سر پر بال نہیں ہیں۔ امیر نے دونوں کے بیانات سنے اور عورت کو حکم دیا کہ وہ اپنے خاوند کے سر پر دہی ڈالے اور پھر اُسے اس وقت تک چاٹتی رہے کہ اس کے سر پر بال اُگ آئیں۔ اور اُسے طلاق لینے کی ضرورت نہ پڑے اس پر تمام دربار ہنس پڑا اور وہ عورت اپنے بادشاہ کو زیر لب صلواتیں سناتی

ہوئی رخصت ہوگئی۔ لیکن جب شفق نمودار ہو رہی تھی اور دربار کی کارروائی سست سی پڑ گئی تھی اس وقت بادشاہ
کے سامنے ایک کانپتے ہوئے وحشی کو لایا گیا۔ مکوں اور گھونسوں سے لوگوں نے اس کا بُرا حال کر رکھا تھا لیکن وہ مضبوط
اور طاقتور آدمی تھا اس نے تین روپے چرائے تھے۔ یہ معمولی بات تھی۔ مگر اعلیحضرت اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کے
لئے خود مواخذہ کرتے ہیں۔

اعلیحضرت ۔ تم نے چوری کیوں کی؟

چور ۔ میں غریب تھا اور مجھے کسی نے کچھ نہ دیا۔ میں بھوکا تھا۔ اور میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔

اعلیحضرت ۔ تم نے مزدوری کیوں نہ کر لی؟

چور ۔ اے غریبوں کو پالنے والے! مجھے مزدوری نہیں ملی اور میں بھوک سے مر رہا تھا۔

اعلیحضرت تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے شراب کے لئے۔ نفس پرستی کے لئے سست رہنے کے لئے چوری کی۔ بھوک
کے لئے چوری نہیں کی۔ کیونکہ جو شخص چاہے اسے اپنے قوت لایموت کے لئے مزدوری مل سکتی ہے۔

قیدی نے اپنی آنکھیں جھکائیں۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی دربار میں حاضر ہو چکا تھا۔ اور وہ اس لہجے کو پہچانتا تھا
جو موت کا حکم دیتے وقت امیر کی گفتگو میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

اعلیحضرت ۔ ہر شخص کو مزدوری مل سکتی ہے۔ اس حقیقت کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے۔ اس لئے کہ میں خود بھوکا رہا
ہوں مگر تمہاری طرح نہیں۔ حرامی پلے۔ بلکہ قسمت کے انقلاب اور خدا کی مرضی کے ماتحت ایک شریف اور
دیانت دار انسان کی طرح۔

امیر کو اور طیش آگیا اور اس نے اپنی تلوار کے دستے کو اپنی کہنی سے ایک طرف ہٹا کر اپنے عمائد سلطنت سے جو
ایک قطار کے اندر کھڑے تھے مخاطب ہو کر کہا۔

تم نے اس ابن الکذب کی باتوں کو سن لیا؟ سنو میں تمہیں ایک سچی کہانی سناتا ہوں۔ میں بھی ایک مرتبہ بھوکا مر
رہا تھا۔ بھوک کی شدت سے میری آنتیں سکڑ رہی تھیں اس لئے میں نے اپنی پیٹی کو پیٹ پر کس کر باندھ رکھا تھا اور
میں اکیلا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا جس نے میرے ان بُرے دنوں میں میری رفاقت سے کبھی
منہ نہ موڑا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب دشمن میری جان کے درپے پھرتے تھے اور جب میں ابھی اس تخت پر متمکن نہیں
ہوا تھا۔ بلکہ قندھار کی گلیوں میں ایک بے خانماں کتے کی طرح بھٹکتا پھرتا تھا جو نقدی میرے پاس تھی وہ برف کے ایک تودے کی طرح
گلتی گئی گلتی گئی یہاں تک کہ . . . . . امیر نے اپنی ہتھیلی حاضرین کے سامنے کھول دی۔ اور رروز بروز مین زار و نزار

ہم ہو کر اپنے اس مصیبت و ابتلا کے رفیق کے پاس واپس جاتا رہا اور خدا ہی جانتا ہے کہ ہم دونوں یہ دن کیونکر کاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے اپنا بہترین لحاف لیا ...... ریشم اور اس پر ایران کا اعلیٰ درجہ کا کام بنا ہوا۔ ایسا جیسا آج کل کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔ گرم، اور دو آدمیوں کے اوڑھنے کے قابل۔ اور یہی ایک چیز تھی جو ہمارے پاس موجود تھی۔ میں اس کو ایک ساہوکار کے پاس لایا جو پاس ہی ایک گلی میں رہتا تھا۔ اور اس پر تین روپے مانگے۔ اس نے مجھ سے کہا ... میں جو آج بادشاہ ہوں "تم چور ہو" میں نے کہا "مگر ایک عالی خاندان کا فرد۔ ایک شہزادہ مگر بھوکا ہوں" اس نے کہا "ہاں ہاں۔ آوارہ گرد منگتوں کا شہزادہ۔ مگر میری جیب میں اس وقت کچھ نہیں۔ میرے محرر کے ساتھ جاؤ اور وہ تمہیں میرے گھر سے ڈھائی روپے دے دیگا۔ اور اس سے زیادہ میں تمہیں ہرگز نہ دوں گا۔ میں محرر کے ساتھ ساہوکار کے گھر پر گیا ہم دونوں راستے میں باتیں کرتے رہے اور اس نے مجھے ڈھائی روپے دے دیئے۔ ہم کچھ دن تک اس پر گزران کرتے رہے۔ مگر جب ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہ رہا تو ہم پر نہایت سختی گزرنے لگی۔ اس کے بعد اس محرر نے مجھ سے کہا ——— اور وہ ایک نیک دل نوجوان تھا "میرا خیال ہے کہ ساہوکار اس لحاف پر ابھی تمہیں کچھ اور بھی دے دیگا اور اس نے خود مجھے دو روپے اور پیش کیے۔ میں نے ان کو واپس کر دیا اور کہا "نہیں ان کے بدلے تم مجھے کچھ کام مہیا کر دو اور میں۔ ہاں میں عبدالرحمان امیر افغانستان روزانہ ایک قلی کی طرح کام کرتا رہا۔ اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھاتا رہا۔ اپنے ہاتھوں کو زخمی کرتا رہا اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے چار آنے روز کماتا رہا۔ لیکن یہ حرامخور اسے چوری کے سوا چارہ ہی نہیں؟ کامل ایک سال اور چار مہینے تک میں یوں ہی کام کرتا رہا اور کسی میں جرأت ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں؟ کیونکہ میرے پاس شہادت موجود ہے اور وہ شہادت اسی محرر کی ہے جو اب میرا دوست ہے۔

اس کے بعد امیر کے بجائے رئیسوں اور سرداروں میں سے ایک شخص کھڑا ہوا جس کا تمام لباس حریر کا تھا اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "خدا کی قسم یہ سچ ہے۔ کیونکہ میں جو خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور امیر کی عنایات سے تمہارے جیسا ہی ایک سردار ہوں ایک زمانے میں اس ساہوکار کا محرر تھا"

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی پھر امیر نے ایک غضبناک آواز میں قیدی کو جھلا کر بلایا اور اس پر نفرت بھیجی یہاں تک کہ "دار آرید" کی ہیبت انگیز آواز نے عدالت کا فیصلہ سنا دیا۔

چور کو وہاں سے لے گئے۔ اور اس کے بعد پھر اسے کسی نے نہ دیکھا۔ دربار کا سکوت ٹوٹ گیا۔ لوگ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ خدا اور رسول شاہد ہیں یہ شخص کامل انسان ہے۔

منصور احمد

انتباہ

بوالہوس! کیوں شکوہ سنج گردشِ تقدیر ہے
چھوڑ یہ ہرزہ سرائی فکر کر کچھ کام کی

شکوۂ قسمت سے تیرا کام بن سکتا نہیں
کچھ نہیں بنیاد تیرے اس خیالِ خام کی

اقربا اندوہگیں ہیں سُن کے تیری گفتگو
غیر ہنستے ہیں ترا حالِ پریشاں دیکھ کر

دیکھ آنکھیں کھول کر نیرنگیٔ دورِ زماں
لے سکوں کا درس رنگِ بزمِ امکاں دیکھ کر

یہ نہیں ممکن کہ بر آئے تری ہر آرزو
کامیابِ آرزو ہونا بہت دشوار ہے

سعیٔ پیہم لازمی ہے کامیابی کے لئے
عقل سے لے کام کوشش کر، اگر ہشیار ہے

بندۂ حرص و ہوا بنتا ہے آخر کس لئے؟
بے خبر! واقف نہیں کیا حرص کے انجام سے

کامیابی کی تمنا ہے اگر دل میں ترے
ہاتھ اُٹھا لے اپنا تو ہر آرزوئے خام سے

پھر تجھے شکوہ نہ ہوگا گردشِ ایام کا
خود بخود کھِلنے لگے گی پھر ترے دل کی کلی

مطمئن ہو جائے گا جب تیرا قلبِ مضطرب
چین سے کٹ جائیگی تیری دو روزہ زندگی

نوائے راز

وہ آنکھ سے اوجھل ہے مگر دل کے قریں ہے
مجھ کو ہے یقیں اور بڑی چیز یقیں ہے

میں کون ہوں اور کیا ہوں خبر مجھ کو نہیں ہے
ہاں عرشِ بریں سجدہ گہِ خاک نشیں ہے

دنیا کے مناظر بھی بظاہر ہیں نظر میں
دل میرا کہیں اور خیال اور کہیں ہے

غافل! ہے گراں ارز یہ ایمان کی دولت
ہشیار! کہ بت خانۂ دنیا میں مکیں ہے

ہر غنچہ و گُل شوق میں ہے گوش بر آواز
اے مرغِ چمن تو ہی سحر خیز نہیں ہے

آجائے گا اک روز نظر جلوۂ خورشید
سینہ میں اگر تیرے نہاں ماہ مبیں ہے

کیوں دل میں اٹھا کرتا ہے طوفانِ تمنا
اس راز سے خود رازؔ بھی آگاہ نہیں ہے

ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

انجامِ عیش

حامد ایک دولتمند رسالدار کا لڑکا تھا۔ اس کا باپ خاں بہادر محمود علی خاں اپنے خاندان میں خاص عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ گھر میں ماماتیں اصیلیں اور ڈیوڑھی پر نوکر چاکر خدا کا دیا سب ہی کچھ تھا۔ محمود خاں کو دو گاؤں بھی اپنے والد کے ترکہ میں ملے تھے اور تین سو روپے ماہوار کی پنشن بھی سرکار انگریزی سے تھی۔ اُس نے دورانِ ملازمت میں جب کہ اس کی تنخواہ چھ سو روپے ماہوار تھی کافی روپیہ پس انداز کر لیا تھا اور اب اس کی مجموعی آمدنی نو سو روپے ماہوار تھی۔ وہ بارہ بنکی میں نہایت عیش و عشرت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

حامد محمود خاں کا اکلوتا بیٹا اور تمام گھر کا چشم و چراغ تھا۔ سالدار نے حامد کو ذرا ہوش سنبھالتے ہی مقامی اسکول میں انگریزی تعلیم دلانے کی غرض سے داخل کرا دیا اور ایک چھوڑ دو ماسٹر مکان پر پڑھانے کے لئے ملازم رکھے گئے لیکن بدقسمتی سے حامد کچھ ایسا بدشوق اور کند ذہن واقع ہوا تھا کہ اول تو پڑھنے سے ایسا لرزتا جیسے قصاب سے بکری اور دوسرے جو کچھ طوعاً و کرہاً پڑھتا بھی وہ یاد نہ رہتا۔ ادھر ماسٹر پڑھا کر اٹھا، اُدھر حامد کھیل کود میں مصروف ہوگیا۔

محمود خاں نے ہر چند کوشش کی کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہو جائے اور محض جاہل نہ رہے اس نے حامد کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اور اس کی تعلیم پر روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔ وہ حامد کو بی۔ اے پاس کرنے کے بعد فوج کے کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز المرام دیکھنے کا متمنی تھا لیکن افسوس ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سخت کوشش کے باوجود وہ حامد کو ساتویں جماعت تک پڑھانے میں کامیاب ہوا۔ ساتویں جماعت میں فیل ہو کر حامد نے پڑھنا لکھنا قطعی ترک کر دیا۔ وہ سخت بددل ہوگیا اور پڑھنے لکھنے پر موت کو ترجیح دیتا محمود خاں رسالدار نے ہر ممکن کوشش کی کہ حامد سلسلۂ تعلیم جاری رکھے لیکن حامد نے صاف کہہ دیا کہ اس معاملہ میں اگر مجھے زیادہ مجبور کیا گیا تو میں کسی نہ کسی دن خودکشی کر لوں گا۔ قہر درویش بر جان درویش بوڑھا باپ مجبوراً خاموش ہو رہا اور حامد کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

حامد جس کے مزاج میں پہلے ہی سے آوارگی سمائی ہوئی تھی اب تعلیم کی پابندیوں سے آزاد تھا۔ غیر مہذب سوسائٹی میں نشست و برخاست ہونے لگی۔ چوسر، گنجفہ اور پچیسی وغیرہ اس کے دن رات کے مشاغل تھے۔ محمود خاں بیٹے کو ان ناشائستہ حرکات سے روکنے کی کوشش کرتا اور بہت کچھ سمجھاتا بجھاتا لیکن وہ ایک نہ سنتا بلکہ اس پر پند و نصائح کا الٹا اثر ہوتا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ آوارہ ہوگیا۔ حلقۂ احباب وسیع ہونے کے ساتھ دیگر مشاغل میں بھی اضافہ ہوتے لگا رات کو

تھیٹروں اور سینما کمپنیوں کی سیر ہوتی اور دن کو کبھی مے خانے اور کبھی طوائفوں کے بالاخانوں کی رونق بڑھائی جاتی۔

اکثر اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ غریب لوگ جو نان شبینہ کے بھی محتاج ہوتے ہیں بہت زیادہ صاحب اولاد ہوتے ہیں برعکس اس کے جہاں مال و دولت کی بہتات ہو وہاں اولاد کی کمی دیکھنے میں آتی ہے یعنی اکثر متمول اشخاص لاولد ہوتے ہیں اور اگر اولاد ہوئی بھی تو وہ ایسی نالائق ہوتی ہے کہ والدین کیلئے اُن کا وجود سوہانِ روح بن جاتا ہے۔

اس شخص سے زیادہ خوش قسمت کون ہوسکتا ہے کہ جس کے پاس مال بھی ہو اور اولاد بھی محمود خاں بھی ایسے ہی چند خوش قسمت اشخاص میں سے تھا۔ لیکن باوجود اس خوش قسمتی کے بدقسمت تھا۔ کیونکہ اس کا اکلوتا بیٹا جو آیندہ ڈیڑھ لاکھ کی جائداد کا وارث ہونے والا تھا نالایق اور بدچلن تھا۔ اور یہی غم اس کو دن رات گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہا تھا

محمود خاں عالم جوانی میں ایک نہایت خوشرو، تنومند اور قوی الجثہ انسان تھا۔ قد لانبا۔ آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی بازو مضبوط جن پر مچھلیاں ابھری ہوئیں سینہ خوب چوڑا چکلا۔ چہرہ سرخ و سفید جس سے دلیری کے آثار نمایاں تھے اب یہ حالت تھی کہ باوجود پچاس برس کا سن ہونے کے وہ سو برس کا بڈھا معلوم ہوتا تھا اُسے حامد کی بداعمالیاں ایک آنکھ نہ بھاتیں اور ہر وقت اس کے دل میں یہی اور صرف یہی خلش رہتی کہ اگر اس کے جانشین کی حالت جلد درست نہ ہوئی تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ بوڑھے باپ کی وفات کے بعد تمام مال و دولت جو جائداد اور نقد روپے کی شکل میں ہے تھوڑے ہی عرصہ میں حامد کے ہاتھوں برباد ہوجائیگی اور حامد نہ صرف کوڑی کوڑی کو محتاج ہوجائیگا بلکہ تمام خاندان کو نکبت و فلاکت کے دریا میں ڈبودے گا۔

رفتہ رفتہ ان تفکرات کا اثر بوڑھے رسالدار کے دل و دماغ پر ایسا بُرا پڑا کہ وہ رنج و غم سہتے سہتے سوکھ کر کانٹا ہوگیا کمر خمیدہ ہوگئی۔ چہرہ پر جھریاں پڑگئیں اور زردی چھاگئی اور بازوں کی قوت زائل ہوگئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا برسوں کا بیمار ہے۔

سردی کا موسم تھا نو بجے کا وقت ہوگا کہ رسالدار محمود خاں اپنے مردانہ کمرہ میں حسب معمول ایک کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ پاس کی میز پر کچھ کاغذات اور متعدد اردو و انگریزی رسائل و اخبارات منتشر پڑے تھے۔ کمرہ میں انگیٹھی جل رہی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہورہا تھا۔ برابر والی کرسی پر اُن کے قدیم دوست خاں صاحب احمد علی صوبہ دار بیٹھے تھے۔ ملکی معاملات کے متعلق کچھ تبادلۂ خیالات ہورہا تھا کہ ملازم نے اتنے میں چاء حاضر کی رسالدار نے حقہ کی منہنال میز کے کنارے پر ٹیک دی اور دونوں چاء پینے لگے۔ دونوں چاء آہستہ آہستہ پیتے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ ابھی نصف چاء بھی ختم ہونے نہ پائی تھی کہ دفعتہً رسالدار کے ہاتھ کو لغزش ہوئی۔ چاء کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر چور چور ہوگیا صوبہ دار احمد علی ابھی تک اسی استعجاب میں تھے کہ یہ کیا ماجرا

کہ اتنے میں رسالدار بائیں جانب کو یکایک جھکے اور دھڑام سے نیچے فرش پر آ رہے وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ پاؤں کرسی میں الجھکر رہ گئے اور سر اُگالدان پر ٹنک گیا ورنہ نہ معلوم غریب کے کس قدر چوٹ لگتی

صوبہ دار گھبرا کر اُٹھے اور نوکر کی مدد سے فوراً رسالدار کو سنبھالا اور زنانخانہ میں پہنچا دیا اور خود موٹر پر سوار ہوکر طبی امداد حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوگئے اور پندرہ منٹ کے بعد مسٹر اسٹوک سول سرجن کو ہمراہ لیکر واپس آگئے۔ مسٹر اسٹوک نے بڑی توجہ سے معائنہ کیا۔ مریض بے ہوش تھا تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو سول سرجن نے کچھ دریافت کرنا چاہا لیکن رسالدار کی زبان قوت گویائی سے عاجز تھی۔ اس نے جواب دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ پھر بیہوش ہوگیا۔ پینتالیس منٹ کے بعد دوبارہ ہوش آیا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے بولنے کیلئے سخت جدوجہد کی لیکن زبان بے قابو تھی۔ تاہم چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ لڑکھڑائی ہوئی زبان سے دھیمی آواز میں ادا کئے لیکن انہیں حاضرین میں سے کوئی بھی سمجھ نہ سکا۔

سول سرجن نے بتایا کہ رسالدار صاحب پر فالج گرا ہے اور اُن کے بائیں ہاتھ پاؤں کی حرکت بند ہوگئی ہے۔ نیز قلب پر بھی اس کا پُورا پُورا اثر ہے اس لئے حالت خطرناک ہے۔

دوسرے دن مسٹر ذاکر حسین اسسٹنٹ سرجن جو اپنے تجربہ کے باعث مسیح وقت کہلاتے تھے علاج کے لئے بلائے گئے۔ انہوں نے بڑی سرگرمی اور جان توڑ کوشش سے علاج کیا۔ صبح۔ دوپہر اور شام دن میں تین تین مرتبہ آتے۔ دست وپا میں کئی کئی انجکشن بھی کئے لیکن ع مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی۔ حالت روز بروز بدسے بدتر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن شب کو گیارہ بجے سے غشی طاری ہوگئی۔ گویا کہ یہ غشی ہی پیغام اجل تھی جس نے صبح پانچ بجے مرغ روح کو قفس عنصری سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔

صبح کے وقت آفتاب عالمتاب نے پردۂ تاریکی کو چاک کرکے سر نکالا اور اپنی سنہری کرنوں سے اہل دنیا کو پیغام بیداری دیا۔ رسالدار کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ کچھ آدمی مردانہ نشست گاہ میں بیٹھے رسالدار کی تجہیز و تکفین کا انتظام کر رہے تھے۔

حامد گھر میں موجود نہ تھا اُسے خبر نہ تھی کہ اس کا باپ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگیا ہے۔ وہ حسب معمول دس بجے اپنی منظور نظر بی حشمت جان کے بالاخانے سے آیا۔ دروازہ پر ایک ہجوم دیکھکر حیران سا ہوگیا۔ ایں! یہ کیا قصہ ہے"؟ اس نے دل میں کہا۔ لوگوں نے اُسے بتایا کہ صبح پانچ بجے تمہارے والد کا انتقال ہوگیا ہے۔

انتقال! اچھا تو کیا ابا جان کا آج صبح انتقال ہوگیا۔ اس کی پیشانی کی رگیں پھول گئیں اور چہرہ پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تاہم اس نے اس جوش مسرت کو بہت کچھ دبانے کی کوشش کی اور بظاہر دنیا سازی کے لئے خود کو مغموم بنا لیا۔

دو بجے کے قریب رسالدار کو گلاب شاہ کے تکیہ میں سپرد خاک کیا گیا اور میت کی آخری رسوم ادا کرنے کے بعد سب لوگ واپس آ گئے ۔

(۲)

حامد اب قطعی طور پر آزاد تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی والدہ سے بکسوں کی چابیاں طلب کیں۔ جب بیکس اور بیوہ ماں نے چابیاں دینے میں کچھ پس و پیش کیا تو حامد نے ماں کو سخت سست کہکر سختی سے مطالبہ کیا غریب ماں نے ڈرتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چابیوں کا گچھا حامد کی جانب پھینک دیا۔ حامد نے تمام بکسوں کا جائزہ لیا کسی میں کتابیں تھیں۔ کسی میں گاؤں کے کاغذات۔ کوئی بکس کپڑوں سے پر تھا اور کسی میں چینی کے ظروف بھرے ہوئے تھے اب تجوری کی باری تھی۔ چنانچہ کھولی گئی اس میں دو ہزار کے نوٹ اور تین ہزار کی اشرفیاں تھیں۔ مزید تلاش کے بعد تجوری کے دوسرے خانہ میں ایک کتاب نظر پڑی اس نے جلدی سے اُسے نکالا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ یہ کتاب امپیریل بنک کی تھی اور اس میں ۲۰ ہزار روپے کی رقم درج تھی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا "اوہو ۔ بیس ہزار روپیہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس وقت میں پچیس ہزار نقد روپے کا واحد مالک ہوں۔ بس اب کیا ہے۔ اب تو مزے ہی مزے ہیں"

بنک کی کتاب اور نقد روپے پر قابو پانے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ باپ کی زندگی میں تو وہ چھپا چوری اپنے محبوب مشاغل میں وقت بسر کرتا۔ لیکن اب کس کا خوف تھا۔ بوڑھا باپ مر چکا تھا۔ آزادی میسر تھی اور روپیہ ہاتھ میں۔ خوب دھڑلے سے کھلم کھلا عیاشی ہونے لگی۔ بی حشمت جان کی فرمائش پر دس ہزار کی ایک اعلیٰ درجہ کی موٹر خریدی گئی جس میں بی حشمت اور حامد بیٹھ کر سیر و تفریح کیا کرتے۔

حامد شب و روز حشمت جان کے مکان ہی پر پڑا رہتا شراب و کباب کے دور پر دور چلتے اعلیٰ درجہ کی ولایتی شراب دو دو درجن بوتلیں ذخیرہ میں جمع رہتیں۔ وہ نشے میں ہر وقت مخمور رہتا۔ خوشامدی دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی جو کھانے پینے کے لالچ سے "جی حضور، جی حضور" کرتے رہتے تھے۔

رمضان شریف کا مہینہ اختتام پر تھا۔ عید کے دن قریب تھے۔ بی حشمت جان نے حامد سے کہا عید کے آٹھ دن باقی رہ گئے ہیں۔ آپ نے ابھی تک میرے لئے کپڑے نہیں بنوائے اور نہ ابھی تک زیور ہی خرید کر لائے۔ دیکھئے وقت بہت کم باقی رہ گیا ہے۔ میری فرمائشیں بہت جلد پوری ہونی چاہئیں"

حامد "بہت اچھا حضور آپ فکر نہ کریں میں نے سوچا تھا کہ عید سے ایک دن پہلے آپکی مطلوبہ اشیا بہم پہنچا دوں گا لیکن آپ کو اطمینان نہیں تو کل ہی سب انتظام ہو جائے گا"

دوسرے دن بی حشمت جان اور حامد موٹر میں بیٹھ جوہری کی دکان پر پہنچے۔ جوہری نے ہر قسم کے زیورات دکھائے بی حشمت جان نے ایک طلائی مرصع چندن ہار۔ ایک جھومر۔ ایک جوڑا کنگن اور دو ہیرے کی انگشتریاں جن کی مجموعی قیمت پانچ ہزار روپے تھی خریدیں۔ حامد نے جوہری کو فوراً امپیریل بنک کے نام پانچ ہزار کا چک کاٹ دیا۔ وہاں سے پارچہ فروش کی دکان پر پہنچے یہاں پانچ سو روپے کی ایک بنارسی ساڑھی اور دو سو روپے کے دیگر پارچات خریدے گئے۔ یہ سات سو روپیہ بھی بنک کے ذریعہ سے ادا کیا۔ اور مکان کو واپس آ گئے

رمضان کی ۲۹ تاریخ تھی۔ شام کو شہر میں شور و غل بلند ہوا "چاند ہو گیا۔ چاند ہو گیا" رات گزری صبح ہزاروں مسرتیں اور لاکھوں خوشیاں اپنے دامن میں چھپائے نمودار ہوئی۔ ہر خرد و کلاں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق صاف ستھرے عمدہ اور نئے لباس میں ملبوس نظر آ رہا تھا۔ عید گاہوں اور مساجد میں نمازیں ادا ہونے لگیں۔ اور لوگ سیر و تفریح میں مشغول ہو گئے۔

شام کا وقت تھا کوئی پانچ بجے کا عمل ہو گا۔ یکایک لوگوں کی نظریں ایک قیمتی موٹر پر پڑیں جو فرّاٹے بھرتی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ جوبلی پارک کی جانب جا رہی تھی۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس موٹر میں بی حشمت جان تھیں جو حامد کے ساتھ باغ کی سیر کو جا رہی تھیں۔

حشمت جان شہر کی طوائفوں میں سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت تھی۔ گویا کہ صناع قدرت نے اپنے دست خاص سے اُسے بنایا تھا۔ وہ نہ صرف بارہ بنکی ہی میں اپنے حسن و جمال کیلئے مشہور تھی بلکہ دیگر شہروں میں بھی اس کے حسن خداداد کی خاص طور پر شہرت تھی۔ اس پر حامد جیسے رئیس کی منظور نظر نہایت قیمتی اور زرق برق لباس میں ملبوس اور مرصع زیورات سے آراستہ ۱۹ سالہ نوجوان عورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پری ہے

موٹر چوک بازار کے موڑ سے گزر کر کنگ روڈ پر جانا چاہتی تھی کہ ادھر سے ایک لڑکا بائیسکل پر سوار آ رہا تھا اور وہ چوک بازار کی طرف آنا چاہتا تھا کہ موٹر پر یکایک سائیکل اور موٹر کی ٹکر ہو گئی۔ لڑکا سائیکل سمیت گر گیا۔ موٹر اس پر سے گزر گئی۔ سائیکل چور چور ہو گئی۔ لڑکا بری طرح زخمی ہوا۔ لوگ دوڑ پڑے بازار میں شور مچ گیا۔ پولیس نے بڑی مشکل سے موٹر روکی لطف یہ کہ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور حامد کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہوا۔ کیونکہ آج عید کا دن تھا اس لئے حشمت و حامد معمول سے زیادہ شراب پئے ہوئے تھے۔ اتنی زیادہ کہ از خود رفتہ ہو رہے تھے۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ حامد موٹر بھی خود ہی چلا رہا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ہمیشہ ڈرائیور ہی موٹر چلایا کرتا تھا۔

موٹر تھانہ میں لائی گئی اور لڑکے کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ پولیس نے بی حشمت جان اور حامد۔ نیز بازار کے دکانداروں،

کے بیانات قلمبند کر کے حامد و حشمت دونوں کو حوالات میں بند کر دیا۔

اس واقعہ کی اطلاع حامد کی والدہ کو بھی ہوئی۔ یہ اندوہناک خبر سُن کر وہ فرطِ غم سے بیہوش ہو گئی۔ گھر میں ایک شور بپا ہو گیا۔ آخر کار صوبہ دار احمد علی خاں کو بلایا گیا اور ان سے حامد کو ضمانت پر چھڑالانے کی استدعا کی گئی۔ انہوں نے حامد کی بداعمالیوں کے باعث ٹال دینا چاہا اور صاف تو نہیں بلکہ مہمل الفاظ میں انکار کرنے لگے۔ حلیمہ شفقتِ مادری سے بیقرار ہو کر زار و قطار رونے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر صوبہ دار کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے اور مرحوم دوست رسالدار کی تصویر اُن کی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ صوبہ دار نے تسلّی دی اور حامد کو دس ہزار کی ضمانت پر تھانہ سے لے آئے۔

لڑکا چونکہ بری طرح زخمی ہوا تھا اس لئے جانبر نہ ہو سکا اور پانچویں دن فوت ہو گیا۔

حامد کا مقدمہ شروع ہوا۔ بیوہ ماں کے پاس خرچ کرنے کے لئے کوئی رقم موجود نہ تھی۔ کیونکہ جو کچھ اثاثہ تجوری میں محفوظ تھا وہ اور بنک کے ۲۰ ہزار جملہ ۲۵ ہزار روپے کی گرانقدر رقم صرف چھ ماہ کی قلیل مدت میں حامد نذرِ عیاشی کر چکا تھا اب ماں کے پاس صرف سات ہزار کا زیور تھا جسے بادل ناخواستہ فروخت کر کے مقدمہ پر صرف کیا گیا۔

مقدمہ نے طول کھینچا اور یہ رقم بھی تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو گئی۔ ہر پیشی پر ایک ہزار روپیہ ایک انگریز بیرسٹر کو اور پانچ سو روپے دوسرے بیرسٹر کو دیا جاتا۔ آخر کار مجبوراً ایک گاؤں ۲۰ ہزار میں فروخت کرنا پڑا۔ مقدمہ سات ماہ تک جاری رہا بالآخر عدالت نے حامد پر فردِ جرم لگا دی اور بی حشمت جان کو بری کر دیا۔

دو بجے کا وقت ہو گا کمرۂ عدالت لوگوں کے ہجوم سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سب کے کان آج عدالت کا فیصلہ سننے کیلئے لگے ہوئے تھے کہ اتنے میں جج نے تجویز پڑھنا شروع کی اور جرم کی نوعیت بتاتے ہوئے حامد کو سات سال قید بامشقت اور پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کا حکم سنا دیا گیا۔

سزا کا حکم سننے کے چند ہی روز بعد حامد کے بعض عزیزوں نے ہائیکورٹ میں اپیل دائر کیا۔ تین ماہ تک اور مقدمہ جاری رہا اس کے مصارف کیلئے دوسرا گاؤں بھی فروخت ہو گیا۔ اس اپیل کی کامیابی کے لئے سخت کوشش کی گئی۔ روپیہ پانی کی طرح بہا دیا گیا۔ آخر کار ان سب مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہائیکورٹ نے مدّت قید میں کچھ تخفیف کر دی یعنی بجائے سات سال کے چار سال قید بامشقت اور پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا بحال رکھی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں چھ سال قید کا حکم صادر ہوا۔

رقم جرمانہ داخل عدالت کر دی گئی اور حامد کو پابہ زنجیر لکھنؤ کے سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔

آہ جب غریب اور بیکس ماں نے یہ اندوہناک خبر سنی تو وہ غش کھا کر دھڑام سے زمین پر گر پڑی دیر تک بیہوش پڑی

رہی اور جب کسی قدر ہوش آیا تو اس نے فرط غم سے اپنے بال نوچ ڈالے اور سینہ کوبی کرنے لگی۔ اس کے ماتم سے اہل محلہ کے قلب چاک ہوئے جاتے ہیں۔

تین ماہ تک حلیمہ بیٹے کے غم میں شب و روز مصروف آہ و بکا رہی۔ اُسے دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ غذا قریب قریب ترک ہو چکی تھی۔ آنکھوں سے نیند رخصت ہوگئی۔ گویا کہ نیند کو بھی نیند آگئی۔ عزیزوں نے حلیمہ کو سمجھانے اور اس کا دل بہلانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ اس کی خلش اور گریہ وزاری روز بروز بڑھتی ہی جاتی اور کسی کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر اس کے قلب مضطر پر نہ ہوتا۔ وہ کہتی کہ ہائے میرا پیارا حامد! میرا اکلوتا بیٹا حامد!! آہ میرے ناز پروردہ حامد کو چار برس کی قید اور پھر وہ بھی بامشقت۔ اس پر کیا گذرتی ہوگی اور وہ کیونکر جیل کی سختیاں اور مصائب برداشت کرسکے گا۔ اس کی قید کے چار سال میرے لئے چالیس سال سے کم نہیں۔ میں کیونکر زندہ رہوں گی۔ نہیں نہیں اب میں زندہ نہیں رہ سکتی آہ اے آسماں تو کیوں اتنا سخت دل اور بے رحم ہوگیا ہے۔ مجھ بے کس پر پھٹ اور میری زندگی کا خاتمہ کردے۔ اے زمین تو بھی بڑی سنگدل ہے تجھے بھی میری اندوہگین حالت پر کچھ ترس نہیں آتا۔ ہاں تو ہی اتنا سلوک کرکہ شق ہوجا اور مجھے اپنی آغوش میں لیکر ابدی نیند سلادے۔

انسان ضعیف البنیان جو غذا کا کیڑا ہے اور نیند جو انسانی صحت کے لئے جزو لاینفک ہے کئی ماہ تک متواتر میسر نہ ہو تو کوئی کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ حلیمہ رفتہ رفتہ بیٹے کے غم میں گھلتی گئی اور سخت نحیف و ناتوان ہوگئی تین ماہ کی مسلسل بیداری اور گریہ وزاری کے بعد ایک رات خدا جانے کیا بات تھی جو حلیمہ کی ذرا آنکھ جھپک گئی۔ آنکھ جھپکتے ہی جیل خانہ کی بھیانک عمارت حلیمہ کے سامنے تھی یہ دوڑی اور جیل کی کوٹھڑیوں کو دیوانہ وار جھانکتی پھری۔ وہ اس جدو جہد میں کامیاب ہوگئی اس نے دیکھا کہ اس کا لخت جگر ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ایک بھاری چکّی سے کوئی چیز پیس رہا ہے۔ چکّی اس قدر وزنی ہے کہ حامد بمشکل اُسے چلاتا اور زور نہ پاکر رک رک جاتا ہے اس کا سانس پھولا ہوا ہے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں حامد کی یہ مصیبت اور بے چارگی دیکھ کر حلیمہ کا کلیجہ پھٹ گیا۔ وہ دیوانہ وار بڑھی اور جھٹ حامد کو "ہائے میرے بچے" کہہ کر سینے سے چمٹا لیا دفعتہً آنکھ کھل گئی۔ اب نہ جیل کی کوٹھڑی تھی نہ حامد۔ البتہ رات کے خوفناک سناٹے میں صرف گھڑیال ہی ٹک ٹک کر رہا تھا۔ حلیمہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی "ہائے میرا بچہ۔ ہائے میرا حامد" اسکی زبان پر تھا۔ اٹھتی اور پچھاڑیں کھا کھا کر گر پڑتی آخر کار وہ بیتابانہ دروازہ کی جانب دوڑی تاکہ کمرہ سے باہر نکل کر جیل خانہ کی جانب روانہ ہوجائے اور کسی طرح اپنے پیارے حامد کو اپنے سینے سے لگالے۔ ناگاہ اُس نے کرسی سے ٹھوکر کھائی اور دیوار سے ایسی ٹکّر لگی کہ سر پھٹ گیا وہ چکرا کر گری اور گرتے ہی اس کی روح جسم خاکی سے پرواز کرگئی۔

(۳)

وقت گذرتے کیا دیر لگتی ہے۔ چار سال گذر گئے۔ اور جس طرح بھی ہوسکا جوں توں کرکے حامد نے چار سال کی مدت جیل کی چاردیواری میں گذار دی۔ اب وہ رہا ہوچکا تھا۔ اسکی شکل وصورت بالکل بدل چکی تھی۔ چہرہ جو کبھی چاند کی طرح چمکتا تھا سیاہ ہوگیا۔ اور اس پر مصائب وآلام نے جھریاں ڈال دیں۔ داڑھی بہت لمبی ہوگئی جسم پر کپڑے کثیف اور کہنہ جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔

جیل کے پھاٹک سے نکلتے ہی وہ اپنی محبوبہ بی حشمت جان کے مکان پر پہنچا جس کی یاد جیل میں بھی اُسے بیقرار رکھتی تھی۔ دیکھا کہ ایک بیم وشحیم سیٹھ صاحب بی حشمت جان کے پہلو میں ایک ایرانی قالین پر رونق افروز ہیں۔ چند خوشامدتے ادھر اُدھر بیٹھے ہیں اور بی حشمت جان اپنے سریلے اور دلکش نغموں سے حاضرین کو محظوظ کر رہی ہیں۔

حامد بھی ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ گانا ختم ہوا تو شراب کا دور چلنے لگا۔ لیکن بی حشمت جان نے حامد کو نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اسی اثنا میں حاضرین میں سے ایک شخص حامد سے یوں ہمکلام ہوا۔

شخص ۔ "آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں"

حامد "اس کا جواب بی حشمت جان دیں گی"

مرزا نے بی حشمت جان کو مخاطب کرکے دریافت کیا:۔

"کیوں بی آپ ان کو جانتی ہیں کہ یہ کون ہیں اور یہاں کیوں بیٹھے ہیں"؟

حشمت جان ۔ نہیں میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے اور یہاں کیوں بیٹھا ہے۔

حامد ۔ بی حشمت جان کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا میں ہوں "حامد"۔

حشمت جان ۔ حامد! کون حامد؟ میں نے اس شکل کے انسان کو کبھی نہیں دیکھا۔

حامد نے اپنی تمام سرگذشت اختصار کے ساتھ دہرائی اور بتایا کہ جیل کی سختیوں اور تکلیفوں کے باعث میرا حلیہ بدل گیا ہے۔ اور میں وہی حامد ہوں جس کا تعلق تم سے دو سال تک متواتر رہا ہے اور جس نے تمہیں علاوہ قیمتی زیورات کے دس ہزار کی ایک موٹر بھی خرید دی تھی۔

نشۂ مئے سے مخمور حشمت جان نے مرزا کو مخاطب کرکے کہا۔

"مرزا جی یہ شخص کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے اسکو ابھی مکان سے باہر نکال دو"

قبل اس کے کہ مرزا حامد کو نکالنے کا اقدام کرے حامد نے ایک سرد آہ کھینچی اور بالاخانہ سے نیچے اتر آیا اسکی آنکھوں

میں دنیا تاریک تھی اور اس حشمت جان نے جس کی خاطر اس نے اپنا مال و دولت اور عزت و وقعت سبھی کچھ کھو کر یہ روز بد دیکھا تھا آج ایسی سرد مہری اور بے وفائی کا ثبوت دیا کہ کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے اور جگر پارہ پارہ ہو گیا۔

اب حامد کو اپنا مکان یاد آیا اور وہ اندر داخل ہونا چاہتا ہی تھا کہ ایک شخص نے گردن میں ہاتھ ڈال کر اُسے ڈیوڑھی کے باہر کر دیا اور مارنے پیٹنے پر آمادہ ہو گیا۔ شور و غوغا سن کر اہل محلہ دوڑ پڑے لوگوں کا اژدحام ہو گیا۔ دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا اور کمزور آدمی جس کے چہرہ سے حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے کئی آدمیوں کے نرغہ میں ہے۔

ایک شخص۔ ارے بھئی ممتاز علی کیا قصہ ہے؟

ممتاز علی۔ خان صاحب یہ شخص دن دہاڑے ہمارے مکان میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ چور ہے چور۔

دوسرا۔ یار یہ چور تو معلوم نہیں ہوتا اس کے چہرہ سے تو شرافت ٹپکتی ہے۔

تیسرا۔ چور نہیں تو اور کون ہے۔ بلا وجہ پرائے مکان میں در آنے کے کیا معنی؟

چوتھا۔ بھئی دن میں تو کسی کو اس طرح چوری کرتے دیکھا نہیں اور نہ کسی کی اتنی جرات ہو سکتی ہے۔ ضرور یہ کوئی دیوانہ ہوگا

حامد حیران و ششدر تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ میرا مکان نہیں؟

ایک اور معمر شخص نے آگے بڑھ کر کہا "آخر اس سے بھی تو پوچھنا چاہئے کہ تو کون ہے اور مکان میں کیوں داخل ہونا چاہتا تھا۔

"کیوں بھئی تم کون ہو اور اس طرح دلیری کے ساتھ پرائے مکان میں داخل ہونے کا کیا مطلب ہے"؟

حامد نے اس بوڑھے کو پہچان کر کہا "چچا میں حامد ہوں۔ رسالدار محمود خاں کا لڑکا۔ کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا میں آج ہی چار سال کے بعد لکھنؤ جیل سے رہا ہوا ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں جو مجھے میرے آبائی مکان میں داخل ہونے سے روکتے ہیں"؟

میر چھدن ۔ "او ہو تم حامد ہو رسالدار صاحب کے لڑکے" یہ کہہ کر میر صاحب آگے بڑھے اور حامد کو سینے سے لگا لیا۔ حامد نے جو ایک ہمدرد پایا اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میر چھدن نے اُسکو تسلی دی۔ تمام لوگ حیران و متاسف تھے کہ اتنے بڑے امیر کبیر کے ناز پروردہ بیٹے حامد کی انقلاب زمانہ کی بدولت یہ کیفیت ہے کہ آج لوگ پہچان بھی نہیں سکتے

میر چھدن محلہ کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے اور سب اہل محلہ انہیں چچا کہا کرتے اور ادب سے پیش آتے۔ حامد بھی چچا ہی کہا کرتا تھا۔ حامد نے کہا:-

"چچا یہ کون لوگ ہیں جو میرے مکان میں رہتے ہیں۔ کیا میری والدہ مکان میں موجود نہیں"

میر چھدّن آہ سرد بھرتے ہوئے۔ ہائے افسوس! بیٹا حامد کس دل سے کہوں کہ یہ مکان اب تمہارا نہیں رہا اور نہ تمہاری والدہ اس دنیا میں موجود ہیں تمہاری والدہ کو تقریباً چار سال ہوئے کہ فوت ہوگئیں۔ تمہاری قید کا انہیں اس قدر عظیم صدمہ ہوا کہ ابھی تمہیں تین ہی ماہ جیل میں گذرے ہونگے کہ وہ تمہاری مفارقت کی تاب نہ لاکر اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں۔ اور یہ مکان انہوں نے تمہاری زندگی ہی میں تمہارے مقدمہ کے مصارف ادا کرنے کے واسطے فروخت کر دیا تھا۔

حامد نے جب والدہ کے انتقال اور مکان فروخت ہونے کا حال سنا تو وہ اپنی خانہ ویرانی پر فرطِ الم سے چیخیں مار مار کر رونے لگا تاہم سب نے بہت کچھ اس کی تشفی کی۔

حامد۔ چچا۔ تو والدہ صاحبہ نے مکان کیوں فروخت کیا۔ گاؤں کیوں نہ بیچ ڈالا"

میر چھدّن۔ گاؤں! گاؤں تو پہلے ہی فروخت ہو چکے تھے۔

حامد۔ حیران ہوکر۔ کیا دونوں گاؤں فروخت ہو گئے۔

میر چھدن۔ جی ہاں دونوں۔

حامد۔ اور ان کا کئی ہزار کا زیور کیا ہوا؟

میر چھدن۔ وہ زیور بھی تمہارے مقدمہ ہی کی نذر ہوگیا۔ افسوس حامد تم بہت ہی بدقسمت واقع ہوئے ہو۔ نہ صرف اپنی بربادی بلکہ خاندان بھر کی تباہی کے ذمہ دار تم اور صرف تم ہی ہو۔

حامد نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر آسمان کی جانب حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور پھر شرم سے سر جھکا کر اپنی بے بسی پر خاموش ہو رہا۔

میر چھدّن حامد کو اپنے مکان پر لے آئے۔ اس رحم دل انسان نے حامد کو غسل کرایا خط بنوایا اور کپڑے بدلوائے اور ایک کمرہ میں رہنے کو جگہ دی۔ وہ حامد کو اپنے ہمراہ کھانا کھلاتا اور اس کی دلجوئی میں مصروف رہتا۔ لیکن حامد کی نظروں میں اب دنیا تاریک تھی وہ اپنی زندگی سے بیزار تھا اور اس کو اپنا سر اپنے کاندھوں پر ایک بار گراں معلوم ہوتا۔ اس کا تمام نشہ اب ہرن ہو چکا تھا اور اُسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ والدہ کی وفات اور تمام جائداد۔ مکان اور زیور وغیرہ کا فروخت ہو جانا سب کچھ اسی کے باعث ہوا۔

اسے اپنے گذشتہ عیش و راحت کے ایام یاد آگئے حشمت جان کی بے وفائی کی تصویر اسکے سامنے تھی۔ وہ سخت

متاسف تھا کہ جس عورت کی خاطر میں نے اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی مول لی اور خانہ ویران ہوا کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا اسے سب کچھ کھو کر بھی اپنا نہ پایا

انہی تفکرات میں وہ شب و روز غلطاں و پیچاں رہتا اور اس کی حالت غم کھاتے کھاتے نہایت ابتر ہو گئی۔ آخر کار وہ سل کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا۔ ایک تو وہ پہلے ہی سے کمزور و ناتوان تھا۔ اب ہر روز منہ سے خون کی کلیاں آتے آتے اس کی حالت نازک ہو گئی۔

(۴)

میر چھدن نے کئی دن حامد کا علاج کیا مگر آرام کی شکل نظر نہ آئی۔ یہ بیچارے ایک سادہ وضع کے بزرگ اور متوسط درجہ کے آدمی تھے۔ ان کو ڈاک خانہ سے پنتالیس روپے ماہوار پنشن اور بیس روپے ماہوار دکانوں کا کرایہ آتا۔ اور بس صرف یہی پینسٹھ روپے کی کل آمدنی تھی۔ اس میں دو لڑکیاں۔ ایک لڑکا۔ ایک ماں اور ایک بیوی اور ایک خود۔ چھ آدمیوں کا خرچ پورا کرتے تھے۔ میر صاحب اب حامد کی تیمارداری اور مہمان نوازی کے زیادہ متحمل نہ ہو سکے۔ وہ ان کے ایک رشتہ دار نیاز علی خاں کے پاس گئے اور حامد کی کل کیفیت بیان کر کے استدعا کی کہ آپ حامد کو اپنے مکان پر بلا لیں میں خود غریب آدمی ہوں اور اب میں زیادہ مصارف کا متحمل نہیں سکتا۔

دوسرے دن حامد نیاز علی خاں کے مکان پر پہنچا دیئے گئے۔ دو ہفتہ تک حامد کی وہاں معمولی طور پر مہمان نوازی اور تیمارداری ہوتی رہی۔ لیکن پھر سرد مہری اور تغافل کا برتاؤ ہونے لگا۔ آخر کار حامد نے جب دیکھا کہ نیاز علی خاں کے یہاں کوئی اس کی بات بھی نہیں پوچھتا اور کئی کئی دن دوا تو کیا کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں ملتا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ مفلس و قلاش ہے اور افلاس کے باعث وہ پہلے جیسا حامد نہیں ہے۔ بی حشمت جان کی بے وفائی کے بعد عزیزوں کی طوطا چشمی اور بد سلوکی نے اُسے خون کے آنسو رلائے۔ بالآخر اس کی رگِ حمیت جوش میں آئی اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ وہ نیاز علی خاں کے در پر اس ذلت کے ساتھ نہ پڑا رہے۔ وہ فوراً بستر سے اٹھا اور افتاں و خیزاں مقامی ہسپتال میں جا پڑا۔ جہاں سوا مہینہ اس کا علاج ہوتا رہا۔ لیکن مرض میں بجائے تخفیف کے اضافہ ہو گیا۔ آخر کار اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد اور جسم پوست و استخواں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ اب اس میں اُٹھنے بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی۔ ضعف و ناتوانی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ قوتِ گویائی بھی جواب دے چکی تھی اس حالتِ کرب و اضطراب میں اس نے اپنی شفیق ماں کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک نہایت ہی خوبصورت اور وسیع باغ کے عالی شان محل کے دریچہ میں بہت ہی اعلیٰ قسم کا لباس زیب تن کئے بیٹھی ہے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور حامد سے کہہ رہی ہے کہ "بیٹا حامد! میں تیرے صدقے۔ تجھ پر قربان۔ خدا را

جلد میرے پاس آ کہ مجھے تاب مفارقت نہیں۔ آ۔ آ۔ جلد آ۔ میرے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے آ۔ میرے جگر کے ٹکڑے جلد آ۔ کہ تجھے اپنے سینے سے لگا لوں۔ اور آنکھوں کو ٹھنڈا کروں۔

حامد چاہتا تھا کہ دوڑ کر اپنی ماں کے قدموں پر گر پڑے اور اپنی درد انگیز اور روح فرسا داستان الم رو رو کر سنائے لیکن اچانک اس کے سرہانے کچھ کھٹکا ہوا۔ ایک چوہا اس کے سرہانے والی میز پر رکھے ہوئے پیالے سے دودھ پینا چاہتا تھا کہ پیالے کا سرپوش زمین پر گر گیا اور اس کی آواز سے حامد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر اپنی والدہ کو اپنی کمزور اور نیم وا آنکھوں سے تلاش کیا لیکن ہال میں مریضوں کے کراہنے کی آواز کے سوا اور کیا رکھا تھا۔ حامد کے منہ سے ایک چیخ نکلی جو کمرہ کی فضا میں گونج گئی۔ اور "ہائے میری پیاری اماں" کے الفاظ کے ساتھ اس کی روح اُس کے جسم سے جدا ہوگئی۔

آج خان بہادر محمود خاں رسالدار رئیس بارہ بنکی کے اکلوتے بیٹے کی لاش ہسپتال میں بے گور و کفن پڑی ہے اور بجز بے کسی کے کوئی اتنا بھی نہیں کہ دو آنسو بہائے فاعتبروا یا اولی الابصار آہ عجیب انقلاب زمانہ ہے ؎

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اشفاق احمد بریلوی

غزل

نہ پوچھو کیا بنی ہے جان پر مشکل سی مشکل ہے
نہ قابو اس ستمگر پر نہ آپے میں مرا دل ہے

محبت میں نہیں ہے خیر اب دل کی سمجھ لینا
لہو کا کوئی قطرہ بھی اگر اشکوں میں شامل ہے

بھلا مجنوں یہ کیا اندھیر ہے آنکھیں تو کھول اک دن
بگولا تو جسے سمجھا ہے وہ لیلیٰ کا محمل ہے

تمہیں کیا واسطہ ہے قصرِ سنگیں سے ادھر آؤ
تم ایسے نازنینوں کا تو گھر عشاق کا دل ہے

کبھی تو دیکھ سایہ ڈال کر روئے منور کا
کہ ساقی ساغرِ مے تجھ سے رشکِ ماہ کامل ہے

لبوں پر ہچکیاں آنکھوں میں دم چہرے پہ مایوسی
سمجھ لے بس یہی صادق تری الفت کا حاصل ہے

صادق ایوبی

شاعر اور ابرِ بہار

ہیں بے خودی کی مے سے ہم ہوشیار دونوں
کیفِ شرابِ الفت کے رازدار دونوں
آ مل کے روئیں ہم تم ابرِ بہار دونوں

تو سامری چمن کا، آذر ہوں میں وطن کا
دامن ہے تو سمن کا ہیں داغ انجمن کا
آ مل کے روئیں ہم تم ابرِ بہار دونوں

گر تو ہے گل بدامن، ہیں ہوں چمن بدامن
تو بجلیوں کا مسکن، ہیں بجلیوں کا خرمن
آ مل کے روئیں ہم تم ابرِ بہار دونوں

لیلائے دل سے خالی سینے کا میرے محمل
ہے قافلہ ترا بھی نا آشنائے منزل
آ مل کے روئیں ہم تم ابرِ بہار دونوں

ہیں جاں کی تیزیوں سے ہم بیقرار دونوں
ہو جائیں آ کسی پر رو کر نثار دونوں
آ مل کے روئیں ہم تم ابرِ بہار دونوں

محمد جنید

غزل

مرے دردِ غم کو نہ پوچھئے مجھے چین ہے نہ قرار ہے
ہے خزاں رسیدہ ریاضِ دل مجھے کیا امیدِ بہار ہے

مرے دل کا غنچہ کھلے اگر تو شگفتہ باغ ہو سر بسر
مرے عیش و غم کے یہ عکس ہیں نہ خزاں ہے یاں نہ بہار ہے

یہ شباب و حسن غلط غلط وہ قصور و حور بجا بجا
مگر اس کا کوئی جواب دے کہ یہ نقشہ کس کا ابھار ہے

اسے ڈھیر خاک کا جانکے نہ مٹا کہ پھر نہ ملے گا یہ
یہ نشان راہ ہے بے خبر کسی راہ رو کا مزار ہے

جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرقِ مجاز ہے وہی نور ہے وہی نار ہے

جنہیں ہے تلاش سکونِ دل جو ہیں صلح کل وہ ہیں مردہ دل
کہیں لڑ پڑے کہیں کٹ مرے یہی زندگی کی بہار ہے

تجھے بخشنا ہے تو بخش دے یہ حساب کیا یہ کتاب کیا
ہیں مرے گناہ تو اس قدر کہ نہ جن کی حد نہ شمار ہے

شمس الدین احمد ایم اے۔ بی ایل

محفلِ ادب

پُورب کا ایک دیہاتی گیت

ہمیں یہ دیکھ کر حیرت و استعجاب ہُوا ہے کہ کس طرح گاؤں کی ناتعلیم یافتہ عورتوں نے اپنے دل کی بات ایسے گیتوں میں کہہ دی ہے جنہیں سُن کر بلند پایہ شاعر بھی وجد کرنے لگے۔ اُن میں لفظ نہیں لیکن جذبات ہیں۔ اور درد ہے۔ اور تاثیر ہے۔ ذیل میں ہم ایک گیت کا ترجمہ کرتے ہیں جو پورب کی دیہاتی عورتوں کو بہت مقبول ہو رہا ہے، اور جس میں انہوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے:-

بہو ساس سے کہتی ہے میں دیکھ رہی ہُوں کہ دو آدمی ہمارے مکان کی طرف آ رہے ہیں ان میں سے ایک گورا ہے دوسرا سانولے رنگ کا۔ گورا میرا بھائی ہے، سانولا شوہر۔ مجھے حکم دے میں اُن کے لئے کیا کیا چیز پکاؤں۔

ساس جواب دیتی ہے

بہو! بتھوے کا ساگ کاٹ لا۔ مونگ کی دال بنا لے اور مہین چاولوں کا بھات پکا لے۔

سالا بہنوئی کھانے بیٹھے۔ یکا یک سالے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہنوئی نے پوچھا تمہیں اپنی ماں کے ہاتھ کا کھانا یاد آ گیا ہے۔ یا بیوی کی میٹھی میٹھی باتوں کا خیال آ گیا ہے؟

سالے نے کہا۔ مجھے نہ تو ماں کے ہاتھ کا کھانا یاد آیا ہے نہ بیوی کی میٹھی میٹھی باتوں کا خیال آیا ہے۔ مجھے رونا اس بات پر آتا ہے کہ چاند جیسی بہن تم کو دی تھی۔ مگر تم نے اُسے اتنا جلایا اتنا ستایا کہ وہ جل جل کر کوئلہ ہو گئی ہے۔

بہن بولی۔ بھیّا میرا حال سننا ہو تو مالن کی لڑکی سے پوچھو وہ تم سے سب کچھ کہے گی۔ بھیا! میں دھان نہیں کوٹتی من کوٹتی ہوں۔ میں آٹا نہیں پیستی، من پیستی ہُوں اور من کی رسوئی بناتی ہُوں۔ سب کو کھلاتی ہوں۔ سب کو پلاتی ہُوں۔ اور جو بچ رہتا ہے اس میں سے بھی نند کے لئے رکھنا پڑتا ہے۔ چرواہے کو دینا ہوتا ہے۔ اور کتے بلی کو بھی ٹکڑا دینا پڑتا ہے میں بھی اسی کھانے سے آدھا پیٹ بھر لیتی ہُوں۔ یہ کھانے کا حال ہے پہننے کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ پہلے سب کے کپڑے بنتے ہیں اور ان میں سے جو کپڑا اکا دکا بچا رہتا ہے تو وہ میرے حصہ میں آتا ہے اس سے نند کی اوڑھنی اور دیور کی کرتی تیار ہوتی ہے۔۔۔ اور پھر بھی کچھ بچ رہے تو وہ میرے حصہ میں آتا ہے۔

بھائی نے یہ سنا تو آہ سرد بھر کر کہا۔ ہائے لوہا لوہار کی دکان میں جل رہا ہے۔ اور میری بہن سسرال میں جل رہی ہے۔ میرا دل بیتاب ہوا جاتا ہے۔

بہن نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا۔ بھیّا! میرا دکھ درد میری بھابی سے نہ کہنا۔ ورنہ وہ میری ماں کو طعنے مارے گی نہ یہ باتیں میری ماں سے کہنا ورنہ وہ میرے غم میں سینہ کوبی کر کرکے مرجائے گی۔ اے بھیّا میرے رنج وغم کی یہ المناک کہانی میرے باپ سے بھی نہ کہنا ورنہ وہ گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر سر نہ اُٹھا سکے گا۔ نہ یہ باتیں میری بہن سے کہنا ورنہ وہ اپنے سسرال نہ جائیگی۔ اے بیرن! میری یہ تکلیفیں اس چودھری سے کہنا جس نے میرا ناتا مانگا تھا۔ یہ دکھ اس برہمن سے کہنا جس نے میرا بیاہ کرایا تھا اور اس کی بھی کیا ضرورت ہے؟ بہتر یہی ہے کہ میرے جلے دل کی ان آہوں کی گٹھڑی باندھ لو اور ندی میں پھینکتے جاؤ۔

اس گیت میں کتنا سوز ہے کتنا درد۔ پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے ہندوستان کے عام گھروں کی یہی حالت ہے۔ بہوؤں کو ایک دکھ نہیں ہزار دکھ ہیں کھانے پینے کا دکھ۔ اوڑھنے پہننے کا دکھ۔ طعنے بازی کا دکھ۔ مارپیٹ کا دکھ کہاں تک شمار کریں معصوم عورتیں چپ چاپ یہ مظالم برداشت کرتی جاتی ہیں۔ مرد ایسے ستم کبھی برداشت نہ کرسکتے۔

اس گیت میں صرف عورت کی تکلیفوں ہی کا ذکر نہیں دو اور خوبیاں بھی ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اُسے اپنے گھر کا کتنا خیال ہے۔ اپنے بھائی سے کہتی ہے یہ کہانی میری ماں سے نہ کہنا۔ رنج وقلق ہوگا۔ باپ سے نہ کہنا۔ اس کا سر شرم سے وندامت سے جھک جائیگا اسکی شکایت تو چودھری برہمن سے ہے۔

دوسری خوبی ہے۔ عورت کی قوت برداشت! بھائی سے کہتی ہے تم کسی سے کچھ نہ کہنا۔ یہ سب دکھ درد گٹھڑی میں باندھ کر دریا میں غرق کرتے جانا میں یہ سب برداشت کرلوں گی۔ گھر کے آدمی مفت میں کیوں رنجیدہ ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ گیت کس نے بنایا۔ کیا کسی علم عروض کے ماہر شاعر نے؟ یا کسی راگی نے؟ نہیں۔ یہ قدرت کا راگ ہے۔ یہ آہ وزاریاں عورت کے ہونٹ چیر کر از خود فضائے عالم میں منتشر ہوگئی ہیں۔ مصیبت زدہ عورتوں کی پکار پر جب کسی نے کان نہ دئیے تو ان کے دل کا بار ہلکا کرنے کے لئے شاعری نے اُن کے لیے یہ گیت خود موزوں کردیا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جب پڑوس میں ایک مصیبت زدہ عورت مرد کے مظالم سے تڑپ رہی تھی۔ تو ہمارے قومی شاعر رخساروں اور آنکھوں کی خوبصورتی کا بیان کرنے کیلیئے گلستاں کے پھولوں اور آسمان کے تاروں کی تعریف میں لغات کے حسین ترین الفاظ تلاش کر رہے تھے۔ اور نئی ترکیبوں اور نئی بندشوں کے خیال میں محو تھے۔

سرسوتی الہ آباد (ہندی)

شاعر کی زندگی

دکن میں ایک کہانی مشہور ہے کہ کسی برہمن کا ایک لڑکا تھا جس کا نام شارد تھا - یہ لڑکا بڑا ہنس مکھ - ملنسار شریف او حلیم تھا، مگر اس کی بیوی سخت گیر اور بدمزاج تھی اور شارد کے وقت کا ایک ایک لمحہ رنجیدگی اور اشکباری میں گزرتا تھا۔

آخر تنگ آکر شارد گھر سے باہر نکل گیا اور ایک بن میں جاکر اپنے جسم و روح کی کامل قوتوں سے عبادت کرنے لگا۔

کئی سال کے بعد دیوتا اس کے سامنے ظاہر ہوا اور بولا ” میں تجھ سے خوش ہوں مجھ سے بر مانگ “

” مہاراج ایسا بر دیجئے کہ میں دنیا کے لئے تو ہمیشہ زندہ رہوں لیکن اپنی بیوی کیلئے مرجاؤں “

” شارد! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک تو آدمی کے لئے مرجائے، دوسرے کے لئے زندہ رہے۔ کوئی اور بر مانگ “

” جو کچھ مانگنا تھا مانگ چکا “

” بہت اچھا تو شعر کہہ - تیری آرزو بر آئے گی “

اور دیوتا نے شارد کو گیارہ قسم کی بحریں بتائیں جو آج کل کی شاعری کا بنیادی پتھر ہیں۔

شارد نے چند ہی سال میں نہایت بلند پایہ نظمیں کہیں اور اس کے بعد مرگیا - اس کی بیوی بیوہ ہوگئی - مگر وہ دنیا کیلئے ابھی تک زندہ ہے -

مادھری لکھنؤ (ہندی)

بس میں ہوتے آئے بھگوان بھگت کے

تم کھڑے میری طرف دیکھتے ہو - اور میں اس سے بے خبر کھیل کود میں منہمک رہتا ہوں۔

بارش ہوتی ہے اور میں اس میں نہاتا ہوں - پھول کھلتے ہیں اور میں ان میں ہنستا ہوں - کوئل اپنے لطیف نغمے چھیڑتی ہے اور میں ان میں لہراتا ہوں - نسیم پھولوں کو گدگدی کرتی ہے اور میں اس میں لوٹ پوٹ ہوا جاتا ہوں مگر مجھے یہ دھیان نہیں آتا کہ تو میرا انتظار کر رہا ہے - میں تیرے پھولوں سے کھیلتا ہوں اور تیری پروا نہیں کرتا مگر تیری کرم کی آنکھ میں غصے کی سرخی نہیں آتی

قدرت اپنے مناظر کی دل کشی نہیں چھوڑتی میں اپنے دل کے ذوق نہیں چھوڑتا - اور تو دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا ہے - اور مسکراتا ہے -

یکایک میرا دل اچاٹ ہو جاتا ہے میں زندہ و رقصاں قدرت کے حسین کھلونے اٹھا کر پرے پھینک دیتا ہوں اور

اپنا کرتا جھاڑ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور بلند آواز سے پکار رہا ہوں تو کہاں ہے ؟

تو یہ سنتا ہے اور دوڑتا ہوا میرے پاس چلا آتا ہے میں کہتا ہوں تو اب تک کہاں تھا

تو مسکراتا ہے اور جواب دیتا ہے میں اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب تو ان کھلونوں کو چھوڑ کر مجھے پکارے

اور میں آکر تجھے اپنی گود میں اٹھا لوں ۔

میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں مگر تو صرف مسکراتا ہے

کسم ببئی (گجراتی)

گجراتی کا لٹریچر

گجراتی کا لٹریچر روز بروز بڑھ رہا ہے مگر عمدہ کتب کی ابھی بہت کمی ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کی طرف ہمارے مصنفوں نے ذرا بھی دھیان نہیں دیا ۔ حالانکہ اسکی طرف سب سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیئے تھی ۔

کیا یہ شرم و افسوس کی بات نہیں کہ گجراتی کتابوں کا بیشتر حصہ دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ ہے اور پھر وہ بھی اعلیٰ درجہ کا نہیں اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض پیشہ ور مترجم پیدا ہو گئے ہیں ان کا کام محض یہ ہے کہ دن رات ترجمہ کرتے رہیں ۔ اس کے بغیر اُن کا گزارہ نہیں ہوتا ۔ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے ۔ ان کا پبلشر کتابیں مانگتا ہے اور انہیں کم سے کم قیمت ادا کرتا ہے ۔ وہ کوئی کتاب جو اتفاق سے اُن کے ہاتھ آجائے اٹھا لیتے ہیں ۔ اور اس کا ترجمہ شروع کر دیتے ہیں ۔ کتاب کی عمدگی کا کوئی سوال نہیں ۔ سوال یہ ہے کہ پندرہ بیس پچیس دن میں کتاب تیار ہو جائے اور وہ پبلشر کے سامنے جا کھڑے ہوں ــــــــــ ورنہ گھر کے مصارف کیسے چلیں گویا دال بھات ہمارے لٹریچر کو تباہ و برباد کرتا چلا جا رہا ہے ۔ ہمارے گھر میں ایک بچھو نکل آئے ، تو ہمارے کلیجے دہل جاتے ہیں مگر ہمارے ملک میں جو خوفناک سانپ چھوڑے جا رہے ہیں ان کی طرف سے ہماری آنکھیں بالکل بند ہیں موجودہ گجرات کی سب سے بڑی خدمت جو ہم سرانجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان پیشہ ور مترجموں سے ترجمہ کا کام چھین لیں اور ان کو اس متبرک قومی کام کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہ دیں ۔

دوسری کمی ہمارے لٹریچر میں یہ ہے کہ ہمارے مصنف طبعزاد کتابیں بہت کم تعداد میں لکھتے ہیں ۔ اور جو لکھتے ہیں اُن کا شمار بھی درجہ اول میں نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کا موجب بھی وہی بخیل پبلشر ہیں ۔ وہ دل کھول کر حوصلہ افزائی نہیں کرتے ۔ مصنف اپنے اطمینان و سکون سے کتاب تصنیف نہیں کرتا کتاب اچھی تیار نہیں ہوتی پبلشر کو ارزاں کتب پائیں

اُن میں لٹریچر ہو یا نہ ہو۔ اس سے اسے کوئی غرض نہیں لہٰذا ضرورت ہے کہ حقیقی طور پر ادب کے شیدائی امرا تالیفوں کے طبع کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیں اور اعلیٰ درجہ کے مصنفوں کو معقول معاوضہ دیکر اعلیٰ درجہ کی کتب تیار کرائیں۔

جام جمشید بمبئی (گجراتی)

آنسو

اے آنسو کے قطرے تو کبھی بیکار پانی بن کر چپ چاپ بہ جاتا ہے اور تجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ کبھی تیری قدر و قیمت بہترین موتیوں سے بھی بڑھ جاتی ہے اور لوگ تجھ پر جی جان سے فدا ہونے کو اپنی خوش نصیبی تصور کرتے ہیں۔

کبھی تو پھولوں کی حسین و جمیل پنکھڑیوں کے اوپر شبنم کا قطرہ کہلاتا ہے۔ کبھی کالے بادلوں میں روشن تارا!

کبھی تجھے دیکھ کر انسانی سینہ میں محبت کے جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ کبھی تجھے دیکھ کر انسان کا دل خوف سے لرز جاتا ہے۔

کبھی تو الفت کا پیامبر ہے۔ کبھی قہر کا شعلہ۔ کبھی تو دنیا کی بہترین شیرینی بن جاتا ہے۔ کبھی مہلک ترین زہر۔ مگر تجھے پانی میں آگ لگانے کا ہنر کس نے سکھایا؟

پربھات کلکتہ (بنگالی)

آگے، آگے، اور آگے

یہ روحانی دنیا کا قانون ہے۔ یہ دماغی دنیا کا قانون ہے۔ یہ مادی دنیا کا قانون ہے۔ جو شخص اس پر عمل نہیں کرتا وہ آسمانی بادشاہت کا باغی ہے

ہمیشہ آگے بڑھو۔ اپنے آپ کو بلند اٹھانے کیلئے آگے بڑھو۔ اپنے آپ کو بلند اٹھانے کیلئے خداوند خدا کی متبرک مرضی کو پورا کرنے کے لئے اور اس کے جاہ و جلال کو اور لافانی دبدبہ کو روشن کرنے کے لئے آگے بڑھو۔

گناہوں سے نفرت کرنے کے لئے مگر گنہگار کو سینہ سے لگانے کیلئے خدا کے قوانین کی روح کو شناخت کرنے کیلئے اور مذہبی راہنماؤں کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کیلئے دل و جان کی تمام سرگرمیوں سے آگے بڑھو۔

دنیا کی، دنیا کے دماغ کی اور دنیا کی روح کی ترقی کے لئے برابر بڑھتے جاؤ۔ کہیں بھی نہ رکو۔ تکان کا خیال اپنے دماغ پر حاوی نہ ہونے دو۔ نیت کی موت کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دو۔ یہ دونوں تباہی کی بیٹیاں تمہارا رستہ روکنے کیلئے شیطان نے مقرر کی ہیں۔ ان کے خوبصورت الفاظ پر نہ جاؤ۔ ان کی حسین آنکھیں نہ دیکھو۔ ان کے محبوب اشارے تمہیں تمہارے ارادہ

سے منزل ز ل کر دیں گے ۔کہیں نہ رکو، کہیں مت ٹھہرو۔ منزل مقصود ابھی دُور ہے اور دن ختم ہو رہا ہے۔ آگے چلو آگے چلو اور آگے چلو۔

محبت کی حکومت قایم کرنے والو! تمہارے راج کو محبت کی دولت کی ضرورت ہے اور محنت کرو اور کوشش کرو اور ہتھیلیاں بھر بھر کر اپنے شہنشاہ کے قدموں میں انڈیل دو۔ **آلو میگزین** (لندن)

شادی اور محبّت

شادی کے لئے محبت اتنی ہی لازمی ہے جتنی سورج کے لئے روشنی کی۔ اور شادی محبت کے بغیر اتنی ہی ناکارہ ہے جتنا سورج بغیر روشنی کے

محبت شادی کی روح ہے ۔

لیکن ہماری شادیوں میں محبت عنقا ہے اور کہیں کہیں صحرا کے درختوں کی طرح نظر آتی ہے تو غنچہ دل شگفتہ ہو جاتا ہے ۔لیکن صحرا کے درخت کتنے ہیں بہت تھوڑے ۔

ہماری شادیوں میں شادی سے پہلے محبت ہوتی ہے اور اس محبت کی بنیاد ہوتی ہے دل چھیننے کا خیال ۔ یہ خیال یہ جذبہ ہماری محبت کا مرکز ہے

شادی ہو جاتی ہے جذبہ ختم ہو چکتا ہے ۔محبت مرجاتی ہے اور اسکے بعد جب ہم کو محبت کی سخت ضرورت ہوتی ہے ۔تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارا محبت کا پیمانہ خالی ہو چکا ہے ۔

ہم باہر کی طرف بھاگتے ہیں ،لیکن مایوسی وہاں بھی ساتھ جاتی ہے ۔

کیا امریکہ کے ہوشمند اور تعلیم یافتہ ایڈرس اس کا علاج نہ سوچیں گے **لو اینڈ میرج** (امریکہ)

کالی ناگن

بو آدھی رات کی رانی ہے اور پرجا جس کی جاتی ہے — اک بانکا تاج دھرے سر پر وہ کالی ناگن آتی ہے

ہے اس کی اک اک ہال میں گت ، ہے اسکی ساری چال رت — ہر جنبش پر بالی کی کمر بل کھاتی لچکی جاتی ہے

یا ہے وہ امنگ جوانی کی اور راہیں چھیلی ترتی ہے — یا موج ہے بہتے پانی کی اور اہلی گہلی پھرتی ۔ ہے

کچھ شرم ہے کچھ خود آرائی ہے نشۂ مے کی انگڑائی
بن بن البیلی گھلتی ہے اُٹھ اُٹھ متوالی گرتی ہے

دو نین کٹورے زہر بھرے آنکھوں آنکھوں میں ڈستی ہے
جو آیا زد میں پھر نہ ہلا وہ ظالم سحر کی بستی ہے
قاتل تیور کافر چتون اک کالی بجلی سارا بدن
یا کرشن کا اودا جوبن ہے یا پاربتی کی مستی ہے

وہ حسن سیاہ کی بن کے سنان سینوں کے پار گزرتی ہے
پر آپ مہک پر ہے قربان اور اچھے راگ پہ مرتی ہے
کف منہ میں ہیں مجنونانہ اور ساری ادائیں مستانہ
بے تاب ہے عشق کی سوزش سے دم دم پھنکارے بھرتی ہے

علم الحیات کا ایک نامعلوم راز

نخزمایہ (PROTOPLASM)

حیاتیات کے ماہروں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمام جاندار اجسام ایک، نہایت ہی غیر قائم اور نازک مادہ سے بنے ہوئے ہیں جسے انھوں نے نخزمایہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس جاندار مادہ کی حقیقت کیا ہے ممکن ہے کہ اس کے مزید کیمیائی اور طبیعی خواص معلوم ہونے پر ہمارے معلومات میں اضافہ ہو، اس وقت تو ہم اس کی حقیقی ترکیب سے بالکل ناواقف ہیں۔

نخزمایہ ایک ایسا غیر قائم مادہ ہے کہ امتحان کرنے پر مر جاتا ہے، لہٰذا زندہ نخزمایہ کا امتحان کرنا ناممکن ہے مردہ نخزمایہ کا امتحان کیا گیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس میں پروٹینس (Proteins) کاربوہیڈریٹس شحمیات اور کچھ غیر نامیاتی اجزا کا ایک پیچیدہ آمیزہ ہوتا ہے۔ اور ۷۰، ۹۰ فی صدی پانی بھی شامل ہے، جہاں جمعفرق[1] کے کاروبار ہوتے رہتے ہیں جب کسی خلیہ[2] (جسے انگریزی میں سل کہتے ہیں) کے مادہ کو رنگ کر جما دیا جاتا ہے اور خوردبین میں دیکھا جاتا ہے تو ایک پیچیدہ جالدار اور ریشہ دار ساخت دکھائی دیتی ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ اس کی اصلی ساخت نہیں، بلکہ مردہ ساخت ہے یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ جانوروں کی حرکات اس مادہ میں کیمیائی اور طبیعی تبدیلیوں کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں۔

---

[1] اس میں وہ عمل شامل ہیں جن کی وجہ سے جاندار جسم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ عمل بھی جو فضلاتی مادہ کو علیحدہ کر کے خارج کرتے ہیں۔
[2] یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جاندار جسم کئی چھوٹے چھوٹے خانوں پر مشتمل ہے، ہر ایک کو سل یا خلیہ کہتے ہیں۔

پروفیسر ٹامسن لکھتے ہیں کہ یہ مناسب ہوگا کہ کسی ایک جاندار مادہ کو نخزمایہ نہ کہیں۔ کیونکہ عزیزی مظاہر کا انحصار کئی پیچیدہ مادوں کے باہمی عمل پر ہوتا ہے۔

بس یہی ہماری تحقیق ہے جس پر ہم نازاں ہیں، جب اصلی جز یعنی "جان" جسمی مادہ سے غائب ہوجائے اور ہم اس مردہ مادہ کی تحقیق میں اپنا سر کھپائیں تو کیا فائدہ، علمائے سائنس کو تو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اس اصلی جز تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس وجہ سے کہ بنانے والے نے اس کو اپنے قبضہ میں رکھا ہے، اگر یہ راز بھی انسان کو معلوم ہوجائے تو پھر اونسی چیز باقی رہ سکتی ہے، باوجود اتنی نزاکت کے جاندار جسم آسانی کے ساتھ برباد نہیں ہوسکتا، اس کے برخلاف بہتر سے بہتر انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی مشین بھی جس کی بناوٹ میں مضبوط سے مضبوط چیزیں استعمال کی جاتی ہیں نسبتاً بہت جلد جواب دے دیتی ہے۔ اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ انسانی کاروبار اور قدرت کے کاروبار میں کتنا بڑا فرق ہے،

معارف (اردو)

بیسویں صدی کی کلوپیٹرا

ہنگری کے پایہ تخت بوڈاپسٹ میں ایک عورت ہے جو اپنے حسن وجمال اور خوش ادائیوں کے لحاظ سے ممکن ہے کلوپیٹرا سے کم ہو مگر اپنی سحرکاریوں اور ستم رانیوں کے اعتبار سے غالباً کچھ زیادہ ہی نکلے گی۔ کیونکہ کلوپیٹرا کی قربانگاہ حسن کو اتنی قربانیاں نصیب نہیں ہوئیں، جتنی اس ماہ پرکالہ کو بسر آچکی ہیں۔ یوں تو ہر نوجوان شخص جس کی نگاہ اس پر پڑتی ہے ہیک نگاہ فریفتہ ہوجاتا ہے لیکن یہ صرف اس شخص کی شیفتگی کو قبول کرتی ہے جو ان میں سب سے زیادہ بہتر نمونہ حسن وشباب ہوتا ہے اور ٹھیک اس وقت جب کہ حسن کی نوازشیں اور اس کے الطاف مرد کو دیوانہ بنا دیتے ہیں یہ اپنے محبوب شکار کے سامنے زہرآلود جام شراب پیش کرتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ میں خود بھی تیرے عشق میں جان دے دوں گی۔ وہ غریب جو حقیقتاً دیوانہ جمال اور مسحور حسن ہوتا ہے، جوش محبت میں زہر کے گھونٹ حلق سے اتار لیتا ہے اور یہ اپنے جام کو زمین پر ٹپک کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور اس وقت تک کہ اس کے محبوب یا عاشق کا دم نہیں نکل جاتا نزع کی تمام تکالیف نہایت اطمینان سے دیکھا کرتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔ جب وہ چھ نوجوانوں کو زہر دے کر مار چکی ہے اور ساتویں کی باری آئی تو اس نے انکار کیا اور حکومت کو جاکر آگاہ کردیا۔ سنا جاتا ہے کہ حکومت نے اس قتالہ کو گرفتار کرلیا ہے اور تحقیق واقعات ہو رہی ہے۔

نگار (اردو)

نقوشِ محبّت

محبّت ایک ناقابلِ اظہار قلبی کیفیت کا نام ہے

محبّت دماغی کاوشوں کی رہینِ منت نہیں ہوتی۔

محبّت میں اگر خودداری نہ ہو تو وہ محبت نہیں تملق ہے

محبّت کی انتہا دو روحوں کا مل کر ایک ہوتا ہے۔

کبھی کبھی اثنائے محبت میں محبت کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور وہ محبت کی سب سے زیادہ لطیف حالت ہو

محبت ایک بہترین عبادت ہے اگر آرزوؤں کا جزو اس میں سے علیحدہ کر دیا جائے

محبت اگر غوری جذبہ کے ماتحت ہے تو بوالہوسی ہے۔

محبت دنیا کی کش مکش سے بے نیاز ہو جانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

شادی محبت کے سکرزا جذبہ کی بربادی کی ایک کوشش ہے۔

محبّت خود ایک مکمل مذہب ہے۔

ہر شخص محبت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا

محبت دو برابر کی لطیف روحوں میں پیدا ہو سکتی ہو۔

حسن ظاہری آغاز محبت کا صرف ایک ذریعہ ہو سکتا ہو۔

محبت انسان ہونے کی مکمل دلیل ہے

ایک تنگ دل انسان محبت نہیں کر سکتا۔

محبّت خود حسن پیدا کر دیتی ہے

محبت ایک ابدی اتحاد ہے

محبت کی قیمت صرف آنسو ہو سکتے ہیں۔

محبت کا داعی محبت کا حامل نہیں ہوتا۔

محبت میں اعتماد پیدا ہو جانا اسکی تکمیل کی دلیل ہے

محبت کوئی راز نہیں لیکن اس کا اظہار تنگ ظرفی کا ثبوت ہے۔

محبت اندھی نہیں بلکہ بصیرت افروز ہوتی ہے

محبت بیماری نہیں بلکہ صحتِ روحانی کا ثبوت ہو

محبت میں رقابت کا احساس تنگ نظری ہے۔

محبت تعینِ آرزو سے بے نیاز ہے۔

علی گڈھ میگزین (اردو)

نئی کتابیں

قاموس المشاہیر - مرتبہ حضرت نظامی بدایونی - کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ یہ کتاب لغات کے طور پر بہ اعتبار حروف تہجی مرتب کی گئی ہے اور اس میں مشاہیر عالم کے متعلق مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں - نہایت مفید کتاب ہے ہر کتب خانے میں موجود رہنی چاہیئے دوسری جلد جو اسوقت پیش نظر ہے آہیں ش سے ی تک کے تحت کے الفاظ جمع ہیں اسکا حجم بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحے ہے - دونوں جلدوں کی قیمت بارہ روپیہ مقرر ہے - مینیجر صاحب نظامی پریس بدایوں سے طلب فرمایئے -

قواعد اردو - مؤلفہ مولوی عبدالحق صاحب بی، اے اس کتاب کے محاسن کی تفصیل کی ضرورت نہیں مولف کا نام ہی اسکی خوبیوں کی کافی شہادت ہے - یہ قواعد اردو کی بہترین کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ ہر شخص جسے اردو زبان سے دلچسپی ہے اس سے مستفید ہو حجم ۴۰۰ صفحے - مجلد خوبصورت قیمت ؏ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے طلب فرمایئے -

فغانِ آرزو - جناب انور حسین صاحب آرزو لکھنوی جانشین حضرت جلال کا مجموعۂ کلام ہے - غزلیات رباعیات قطعات وغیرہ شامل ہیں - پڑھنے کے قابل ہے حجم ۲۹۵ صفحے لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ قیمت عمر اودھ بوٹ اینڈ شو کمپنی نظیر آباد لکھنؤ سے طلب فرمایئے -

مثنوی خواب و خیال مجلد - مصنفہ خواجہ محمد میر اثر - برادر خرد حضرت میر درد یہ کتاب انجمن ترقی اردو کے نامور سکرٹری مولوی عبدالحق صاحب بی، اے کی تالیف ہے - اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کیلئے ایک بے نظیر تحفہ ہے حجم ۳۵ صفحے کاغذ وغیرہ نہایت عمدہ قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے طلب فرمایئے -

کلامِ کیفی - حضرت کیفی مرحوم حیدرآبادی کا مجموعہ کلام ہے کاغذ لکھائی چھپائی اچھی ہے قیمت ۸ر کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد دکن سے طلب فرمایئے -

حیاتِ کیفی حضرت کیفی مرحوم کے حالاتِ زندگی قیمت ۲ر مندرجہ بالا پتہ سے طلب فرمایئے -

ہندوؤں کے تیوہار - حجم ایک سو صفحے کاغذ لکھائی چھپائی اچھی سرورق خوبصورت - قیمت درج نہیں لالہ بالکشن صاحب تبرہ بی، اے پلیڈر ملتان مولف کتاب سے طلب فرمایئے - قابل دید ہے -

انتخاب کلام میر مجلد - حجم ۲۰۰ صفحے میر کا کلام اور پھر مولوی عبدالحق صاحب بی اے کا انتخاب سونے پر سہاگہ ہے ، یہ کتاب ہر کتب خانہ میں موجود ہونی چاہیئے - کاغذ وغیرہ نہایت عمدہ قیمت ؏ روپے - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے طلب فرمایئے -

فہرست مضامین

بابت ماہ اگست ۱۹۲۷ء

تصاویر

۱ - ساربان حجاز - صحرائے حجاز کا ایک دلکش نظارہ ہے۔

۲ - وقت، موت اور مکافات عمل - یہ ایک اعلیٰ درجہ کے مغربی مصور روسی کی بہترین تصویر ہے وقت ایک مضبوط اور طاقتور آدمی ہے اسکے دائیں ہاتھ میں ایک درانتی ہے جس کے ساتھ وہ ظلم سے نہیں بلکہ نہائت بے توجہی سے انسان، اسکے غم اور مسرت اور تمام دوسری اشیا، کو کاٹتا چلا جاتا ہے - وہ بے تکان گذرتا جا رہا ہے اور کسی چیز کی اصلاح یا بچاؤ کیلئے نہیں رکتا موت ہر فانی چیز پر اپنا دست قضا دراز کرتی ہوئی وقت کے ساتھ خاموش چلی جا رہی ہے - اُن کے پیچھے جزا و سزا یا مکافات عمل چلی آتی ہے - اُس نے ایک ہاتھ میں عدل کی ترازو سنبھال رکھی ہے اور دوسرے ہاتھ میں ایک تلوار، جو ظلم اور زیادتی کی سزا دیتی ہے - یہ تصویر، تقدیر انسانی کے ازلی و ابدی حقائق کو نہائت خوبی کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔

جہاں نما

افغانستان کا دورِ ترقی

"کرنٹ ہسٹری" نے افغانستان کی موجودہ ترقیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر امان اللہ خان اپنے ملک کو مہذب ممالک کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے لئے غیر معمولی سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انہوں نے جاپان کو اپنے لئے دلیل راہ بنایا ہے۔ اور سابق شہنشاہ جاپان متسوہیٹو کی طرح ہر صیغہ میں اصلاحات کا باب کھول دیا ہے +

اعلیحضرت ترقی کی دوڑ میں نہائت سبک پا واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے افغانستان کو مغربی ممالک کے قدم بقدم چلانے کیلئے کثیر التعداد ترکوں کو اپنی ملازمت میں لے رکھا ہے۔ افغانی افواج کو ترک ہی قواعد سکھاتے ہیں۔ صیغۂ مالیات بھی ترکوں کے ماتحت ہے ترکوں کے علاوہ امیر نے دوسرے مغربی ممالک کے لوگوں کو بھی اپنے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ صنعت و تجارت کے صیغہ کی نگرانی امریکنوں اور جرمنوں کے سپرد ہے۔ البتہ کوئی روسی یا برطانوی شخص امیر کا ملازم نہیں۔ کیونکہ امیر کو اُن سے خطرہ ہے۔ غیر ملکی لوگ غیر سرکاری طور پر بھی افغانستان کی ترقی میں مصروف ہیں۔ چنانچہ "شرکت المان" کے نام سے ایک بہت بڑی جرمن فرم نے افغانستان کی تجارت کی تمام درآمد اور برآمد کا اجارہ لے رکھا ہے۔ ایک اور جرمن کمپنی نے قیمتی دھاتوں کے اجارہ کے لئے درخواست کی ہے۔ جو امیر کے زیر غور ہے۔ آثار قدیمہ کے فرانسیسی ماہروں نے مسٹر فوچر کی سرکردگی میں یونانی و باختری تہذیب کے آثار کی کھدائی کے لئے تیس سال کا اجارہ لے لیا ہے +

امیر کو ملکی صنعت و حرفت کے تحفظ کا بہت خیال ہے۔ قرآن۔ مذہبی کتابوں نیز اسلحہ کے سوا باقی ہر چیز پر بہت بڑے بڑے محصول عائد ہیں۔ عطر، تیل، غازہ، کالر، نکٹائی، رومال، وغیرہ پر ۱۰۰ فیصدی محصول مقرر ہے +

نظام حکومت میں بھی بہت کچھ اصلاح کی گئی ہے۔ کابل، قندھار، افغانی ترکستان، ہرات اور بدخشان کے پانچ صوبوں میں جن پر امیر کی سلطنت مشتمل ہے وہ کسی قسم کی بدنظمی گوارا نہیں کرتے۔ اور بے انصافی اور ظلم کا شدید طور پر احتساب کرتے ہیں امیر نے دو باب حکومت قائم کر رکھے ہیں۔ جن میں سے ایک امراء پر مشتمل ہے اور دوسرا عوام پر۔ انہوں نے دو مجالس بھی قائم کر رکھی ہیں۔ ایک "دربار شاہی" کہلاتی ہے۔ اور دوسری "مجلس خوانین ملکی" عدالت کے صیغے میں انصاف کے لئے قاضی (ڈسٹرکٹ جج) مقرر ہیں۔ اور اُن کے ماتحت کوتوال (مجسٹریٹ) ہیں۔ ہر قسم کے فیصلوں کا آخری مرافعہ امیر کے حضور میں پیش ہو سکتا ہے۔ قدیم

ایشیائی حکمرانوں کی طرح غازی امان اللہ خان نے بھی ایک دن مقرر کر رکھا ہے۔ جب رعایا کا ہر فرد کسی قسم کی روک ٹوک کے بغیر اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کر سکتا ہے +

امیر ایک طرح سے ماہر السنہ بھی ہیں۔ پشتو (عوام کی زبان) اور فارسی (درباری زبان) کے علاوہ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان میں بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ مخلوط مغربی اور شرقی وضع کا لباس پہنتے ہیں۔ لیکن اس بات کا انہیں خاص طور پر اہتمام ہوتا ہے کہ جو کپڑا وہ پہنیں خالص افغانی ساخت کا ہو +

ہمارا تیسرا پھیپھڑا
جسم انسانی کے ۷۰ لاکھ مسام

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا۔ کہ ہمارے نظام جسمانی میں پھیپھڑے دو نہیں بلکہ تین ہیں۔ یہ تیسرا پھیپھڑا ہمارے جسم کے مسام ہیں۔ جن کی اہمیت باقی دو پھیپھڑوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ ایک اوسط درجہ کے نوجوان آدمی کے جسم میں ۷۰ لاکھ مسام ہوتے ہیں۔ جو بالکل بے حقیقت ہونے کے باوجود اگر ایک قطار میں رکھ کر پھیلائے جائیں تو ۲۷ میل میں سمائیں ان میں سے ہر سوراخ نہائت اہم کام کر رہا ہے۔ مسامات خون کے فاسد مادہ کے اخراج کا اور اس کو تازہ ہوا بہم پہنچانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ جس کے بغیر خون زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ان ۷۰ لاکھ مسامات میں سے ایک بھی صحت کو خطرہ میں ڈالے بغیر بند نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی شخص کے جسم پر گاڑھا وارنش کر دیا جائے۔ تو وہ بہت جلد مر جائے۔ پیرس کی ایک رقاصہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک شب اپنے جسم پر سنہرا وارنش کر کے رقص خانے میں گئی۔ لیکن اسی شب اس کا انتقال ہو گیا۔ انسان ایک ہی پھیپھڑے کے ساتھ کئی سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر جسم کے ½ حصہ کے مسام بھی بند ہو جائیں۔ مثلاً جلنے وغیرہ سے، تو انسان مر جاتا ہے۔ جب تم پانی پیتے ہو تو یہ انتڑیوں اور مساموں کے ذریعہ سے ردی مادہ کو ساتھ لے کر خارج ہو جاتا ہے۔ اسی لئے زیادہ پانی پینا مفید سمجھا جاتا ہے۔ پانی جسم کو اندرونی غلاظتوں سے بھی اسی طرح پاک کر دیتا ہے۔ جس طرح بیرونی ناپاکیوں کو دھو ڈالتا ہے۔ لیکن اگر پسینے اور فاسد گیسوں کے اخراج کے لئے جسم کے مسام صاف نہ ہوں۔ تو پھر یہ مزید کام بھی پھیپھڑے کو کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح اگرچہ ایک خاص وقت تک صحت کو نقصان نہیں پہنچتا۔ لیکن آخر پھیپھڑا اس زائد کام کی تاب نہیں لا سکتا۔ اور عموماً غلیظ رہنے والا شخص بیماری کا شکار ہو جاتا ہے +

ایک ماہر ڈاکٹر کا قول ہے کہ ہر روز نہانا صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جسمانی مسامات فاسد مادوں کے اخراج کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ مسامات کے ذریعے سے جو فاسد مادے جسم سے گیس اور پانی کی شکل میں ہر روز خارج ہو جاتے ہیں۔ اُن کا وزن تیس اونس کے قریب ہوتا ہے۔ یہ مقدار اُن ردیات سے تقریباً دگنی ہے۔ جنہیں پھیپھڑے ایک دن میں خارج کرتے ہیں۔

مصافحہ

بیماری کا ایک بہت بڑا ذریعہ

بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہو گا۔ کہ مصافحہ جو دوستی کی علامت ہے۔ درحقیقت سب سے بڑی دشمنی ہے۔ مصافحہ متعدی بیماریوں کے پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ عام لوگوں کو صفائی کا بہت کم خیال ہوتا ہے۔ اُن کے ہاتھ ناک اور منہ کی خارج شدہ رطوبات سے بالعموم آلودہ رہتے ہیں۔ جن میں بیماری کے جراثیم بکثرت موجود ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے دوست سے ہاتھ ملاتا ہے تو یہ جراثیم اس کے ہاتھوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ کھانے کے وقت اِن ہاتھوں کو منہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اور جراثیم اس کے جسم میں داخل ہو کر مختلف قسم کی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسان دوستی کے پردے میں ایک دوسرے سے دشمنی کر رہے ہیں۔

ہندوستان

قدیم اور جدید

سر فریڈرک وائٹ سابق صدر مجلس وضع قوانین ہند نے "کرنٹ افیئرز" میں ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک دلچسپ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر اشوک جو آج سے دو ہزار سال قبل ہندوستان پر حکمران تھا۔ زندہ ہو کر پٹنہ میں آجائے، یا اکبر جو انگلستان کی ملکہ الزبتھ کا مغل ہمعصر تھا۔ اپنے شاندار مقبرہ سے اُٹھکر ہندوستان کو دیکھے تو ان کو اس ملک میں بہت زیادہ اجنبیت محسوس نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کو ہندوستان میں اس سے بہت کم تغیر نظر آئے گا۔ جتنا الزبتھ کو انگلستان میں محسوس ہو۔ اکبر کو وہی ہندوستان نظر آئے گا جس کا نقشہ رڈیارڈ کپلنگ نے اپنے ناول "کم" میں پیش کیا ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کی عام زندگی اَب بھی ویسی ہی ہے۔ جیسی اُس کے زمانہ میں تھی۔ وہاں

گرد آلود سڑکوں پر اب بھی اسی طرح چھکڑے چلتے ہیں۔ اُن کے پہیوں کی چیختی ہوئی آوازیں اور بیلوں کی گھنٹیوں کا ٹن ٹن اب بھی وہی ہے۔ گداگر اور مقدس راہب اب بھی ہندوستان کی سڑکوں پر کچکول اور عصا ہاتھوں میں لئے پھرتے نظر آتے ہیں +

لیکن کچھ دیر کے بعد اُسے ایک بہت بڑا انقلاب نظر آئے گا۔ جو موٹر اور چھکڑے کے فرق کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ اہم ہوگا۔ یہ فرق نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہاتھ ہی اُسے ناپ سکتے ہیں۔ لیکن جو کان شنوا ہیں انہیں دُور سے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ کی طرح یا سمندر کی دُور افتادہ موجوں کی دھیمی دھیمی آوازوں کی طرح ایک شور سنائی دے گا۔ یہ روح کی بیداری کا شور ہے +

خالص سیاسی شورش کو ہم ایک آنی چیز کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ اور عناصر بھی شامل ہیں۔ جن کی موجودگی میں ایک اہم انقلاب کے متعلق پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ تعلیم عامہ سیاسی بیداری کا باعث ہو رہی ہے۔ اقتصادی ہیجان موجودہ نظام معاشیات کی خانہ براندازی پر تلا ہوا ہے۔ عورتوں کی بیداری نے قدیم رواج کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اور ایشیا بھر میں انقلاب کی جو روح سرائت کر گئی ہے وہ ایک نشاۃ الثانیہ کی خبر دے رہی ہے +

چین کی نشاۃ الثانیہ

چینیوں کا قومی گیت

محققین کے نزدیک چین کی تہذیب سب سے زیادہ قدیم ہے اور ایک لحاظ سے خاص طور پر ممتاز بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس تہذیب کی پیدائش اور نشو و نما اپنے وطن کے گہوارہ میں ہوئی اور دوسرے ممالک کے تہذیب و تمدن کی طرح یہ کسی بیرونی تہذیب کے اثر کا نتیجہ نہ تھی۔ ایشیا کا یہ قدیم ترین مہذب ملک ایک عرصہ سے یورپ کی حرص و آز کا جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔ اور اس کی بیداری کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن گذشتہ ۱۷ سال کے عرصہ میں چین نے ایک حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ کوئی دوسرا ملک سو سال میں بھی اس قدر ترقی نہ کر سکتا تھا۔ چین کی بیداری جس قدر سریع ہے۔ اتنی ہی زیادہ اہم بھی ہے۔ موجودہ آویزش میں چینیوں نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ بیداری کی جو روح چین میں اس وقت سرگرم عمل ہے وہ چینیوں کے اس قومی گیت میں رواں نظر آتی ہے۔ جس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"اے آزادی، جو اس زمین پر خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ تو امن کے ساتھ شریک ہو کر دنیا کو بہشت بنا دیگی +

آ اے آزادی آ اور اس زمین پر حکومت کر +

ہم تجھے اپنی دوزخ سے بدتر غلامی کا واسطہ دے کر کہتے ہیں - کہ آ اور اپنے نور سے اِس آگ کو بدل دے +

اے سفید رنگ یورپ! تو قدرت کی نٹ کھٹ بیٹی ہے +

شراب، کباب، روٹی ہر چیز بہ افراط تجھے حاصل ہے لیکن میں آزادی کو اپنی عروس بنانے کی فکر میں ہوں۔ مجھے دن رات یہی خیال ہے +

میں اپنے وطن کو مشکلات میں گھرا ہؤا دیکھتا ہوں - لیکن آہ آزادی! بے وفا آزادی تو میرے ہاتھ نہیں آتی +

آہ میرے بھائی بند سب غلام ہیں - حالانکہ تمام دنیا خوش حال ہے +

ہوا کتنی پیاری ہے، شبنم کتنی حسین ہے - پھول بہشت کا نقشہ دکھاتے ہیں - دنیا کے چمن میں بہار آ رہی ہے - لوگ بادشاہ بن رہے ہیں - لیکن ہم پر مصیبت کے بادل چھائے ہوئے ہیں +

پیکنگ میں اب تک ہمیں سرمایہ داروں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے +

آہ آزادی! تو مر گئی - اب ایشیا صرف ایک بہت بڑا صحرا ہے +

اِس صدی میں ہم ایک نئی زندگی کے لئے بیدار ہو رہے ہیں - ہم زمین و آسمان میں انقلاب پیدا کر دینگے خدا کرے کہ ہمارے دل میں آزادی کے شوق کی لہریں "کو انگ منگ" اور "ہمالیہ" کی چوٹیوں سے بھی بلند ہو جائیں +

اے واشنگٹن! اور اے نپولین! تم دونوں آزادی کے دیوانے تھے - کاش تمہاری روح تمام ایشیا میں حلول کر جائے +

ہن ین ہمارے باپ! ہماری راہنمائی کر - اے آزادی کی روح آ اور ہماری حافظ و ناصر بن +

مشاہدات

ہر نفس یہ کس کے جلوے کی خبر پاتا ہوں میں؟ — شکر کے سجدے میں بینائی کا سر پاتا ہوں میں

ابرِ فطرت میں تڑپتی ہے یہ کس کی برقِ ناز؟ — خیرہ پہنائے دو عالم کی نظر پاتا ہوں میں

سامنے آتی ہیں جب صبحیں برافگندہ نقاب — دل میں یہ کس کے تبسّم کا اثر پاتا ہوں میں؟

ہر کلی میں دیکھتا ہوں ایک چشمِ نیمباز — ہر چمن کو اِک بہشت مختصر پاتا ہوں میں

ایک اک پتّہ ہے مکتوبِ عروسِ رنگ و بو — باغ میں ہر شاخ کو پیغامبر پاتا ہوں میں

چرخ پر ایک ایک تارے میں جھلکتا ہی شباب — خاک کے ایک ایک ذرّے میں نظر پاتا ہوں میں

نقطہائے نور پر ہیں تیرگی کے دائرے — ظلمتوں میں گردشِ شمس و قمر پاتا ہوں میں

نور تو ہے خیر اک مانی ہوئی تابندگی — نار کو بھی مہ جبین و سیمبر پاتا ہوں میں

خاک کے تودوں پہ ہے معمارِ عالم کی نگاہ — ہر قدم پر ساز و برگِ بام و در پاتا ہوں میں

کانپنے لگتے ہیں جب تارے بساطِ چرخ پر — عالمِ اسباب کو زیر و زبر پاتا ہوں میں

خاک سے جس وقت اُٹھتی ہے جبینِ انکسار — فقر کے قدموں پہ دارائی کا سر پاتا ہوں میں

ناخنِ غم چھیڑتا ہے جب رگِ جاں کا ستار — دل میں لیلائے طرب کو جلوہ گر پاتا ہوں میں

تکیہ گاہِ ناز میں جس وقت رکھتا ہوں قدم — اِس کرے کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں

دل میں جب آتا ہے صانع کے مصالح کا خیال — عیب کی فطرت کو لبریزِ ہنر پاتا ہوں میں.

عشق سے پہلے جو دل تھا اک مکانِ تنگ و تار — اب اُسی دل کو محیطِ بحر و بر پاتا ہوں میں

زاہدوں کی رُوح جس کی تاب لا سکتی نہیں — اُس سراپا ناز کو پیشِ نظر پاتا ہوں میں

دیکھتا ہوں جس قدر گہری نظر سے بار بار — حُسن کو پہلے سے کچھ پاکیزہ تر پاتا ہوں میں

ہر نظر رُخ پر دکھاتی ہے اک آب و تابِ نو — ہر نفس، جلووں میں اک شانِ دگر پاتا ہوں میں

ثبت ہے تصویر کے رُخ پر مُصوّر کا جمال — آئینے میں جلوۂ آئینہ گر پاتا ہوں میں

تہ میں کیا جلوے ہیں، اُنکی شرح تو ممکن نہیں — سطحِ دریا پر بھی اک موجِ گہر پاتا ہوں میں

دوڑتا ہے نبضِ خس میں برقِ سوزاں کا لہو — سینۂ شبنم میں طوفانِ شرر پاتا ہوں میں

اشتیاقِ اوج میں ہیں ناتراشیدہ صنم — پتھروں میں جُنبشِ صد بال و پر پاتا ہوں میں

عقل کا ہر کلیہ بے اصل آتا ہے نظر — عشق کے ہر مسئلے کو معتبر پاتا ہوں میں

ناخنِ حکمت پہ کرتا ہوں بھروسا جس قدر — عُقدۂ اسرار کو پیچیدہ تر پاتا ہوں میں

بستۂ یک آرزوئے مُشترک ہے کائنات — کس قدر اضداد کو شیر و شکر پاتا ہوں میں

راہِ حق ہی میں نہیں ہیں حُسن کے نقشِ قدم — گمرہی کو بھی کسی کی رہ گزر پاتا ہوں میں

پھر تعجب کیا، کہ اِس تر دامنی کے باوجود
جوشؔ کو منجملۂ اہلِ نظر پاتا ہوں میں

شبیّر حسن جوشؔ

فلسفی

ایک سیرت کا مطالعہ

اس کی طبیعت میں سوچنے کا مادہ تھا اور اس کے خمیر میں سستی کا عنصر غالب۔ ان دونوں چیزوں کے اکٹھا ہو جانے نے اسے فلسفی بنا دیا تھا۔ محبوب ترین مشغلہ اس کے لئے یہ ہوتا کہ آرام کرسی پر دراز ہو کر زندگی کے دقیق ترین مسائل پر اپنی رائے کا نہایت شرح وبسط سے اظہار کرے۔ خیالات کا ہیجان اسکے دماغ کو ہمیشہ ایک کھولتے ہوئے پانی کے برتن کی طرح سکون سے محروم رکھتا وہ تنہائی میں ان کا ایک لامتناہی تار بنتا اور انجمن میں ان کے ساتھ کھیلتا، ان کو اپنے دوستوں کے سامنے اچھالتا گھماتا اور اس بازیگری میں اس قدر منہمک ہو جاتا کہ اس کے خیالات اس کے لئے کٹھ پتلیوں کی بجائے ذی حس ہستیاں ہو جاتے اور اس کو اپنی رو میں بہائے جاتے۔ ایسی حالت میں وہ مبالغہ کرتا لیکن اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ تصنع کا مرتکب ہوتا لیکن بلا ارادہ۔ گفتگو کا سرور اس کو اس کے گرد وپیش کے تنگ ماحول سے نکال کر کسی عالم خیال میں پہنچا دیتا۔ جہاں وقت اور موقع کی بندشیں اُسے فراموش ہو جاتیں۔۔۔۔۔۔۔

شام کے پانچ بجے وہ اپنی نیند سے بیدار ہوا لیکن نہ از خود بہت سی کتابیں۔ کاپیاں۔ قلم۔ دوات اور مختلف آلات حرب جو پاس کی میز پر رکھے ہوئے تھے اس کے اوپر پھینکنے پڑے آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا کہ میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کے اس بے وقت سونے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہا ہوں اُس نے فوراً ایک کتاب اٹھالی اور اسکو ایک منٹ تک نہایت غور سے پڑھنے کے بعد کہا۔

ہاں، میں اس کتاب کو کئی گھنٹے سے پڑھ رہا ہوں۔ ابھی ابھی تھوڑی سی غنودگی آگئی تھی۔ کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹنے والی تھی کہ تم آگئے۔ لیکن اس ایک منٹ کی غنودگی میں بھی میں برابر کتاب کو، اپنے خیال کے مطابق، پڑھتا رہا"

میں نے صاف گوئی سے اس کی تردید کی "جھوٹ اور سراسر جھوٹ"۔ بہت دیر ہوئی میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اس وقت بھی آپ خواب ناز میں تھے۔ لیکن آپ اس کا اعتراف کیوں کرنے لگے؟ آپ تو اپنے خیال میں کتاب گر جانے کے بعد بھی ہیگل کے فلسفہ کی تصحیح وتنقید میں مصروف ہونگے"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں اپنے اس جھوٹ کا تجزیہ کر کے تمہیں اس کی اصل بتاتا ہوں۔ آخر آدمی جھوٹ کیوں بولتا۔

ہے ؟ میں نے مایوسانہ صبر کے ساتھ کرسی اپنی طرف کھینچی اور اس پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب فلسفہ شروع ہو گیا ہے۔ اور اسے ہوش میں لانے کا کوئی طریقہ نہیں، کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی فلسفی مزاج اور مردم بیزار کیوں نہ ہو اپنے عیوب کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی وہ عیوب جن کو وہ واقعی عیوب سمجھتا ہے ورنہ بعض کمزوریاں تو ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان مزے لے لے کر ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ اُن سے اپنی ایک درپردہ خودستائی منظور ہوتی ہے میں جانتا ہوں کہ تمہیں میرا دوپہر کا سونا پسند نہیں۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہ ایک ایسی عادت بلکہ کمزوری ہے جسے عوام الناس اپنی فطرتی تنگ نظری سے قابل اعتراض سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے یہ کہہ دیا کہ میں بالکل نہیں سویا ممکن ہے لفظی معنوں میں میرا ایسا کہنا حقیقت نہ ہو یعنی عوام الناس کے نقطہ نظر سے سچ نہ ہو۔ لیکن میرا یہ جواب اور میرا یہ جھوٹ تمہارے سچ سے زیادہ مفید اور قابل قدر ہے۔ اگر تم میں یہ توفیق ہوتی کہ تم اس کو مان لیتے، اس کو قبول کر لیتے تو تمہیں اس سے کیا نقصان پہنچتا ؟ محض یہ ہوتا کہ تم اس کوفت سے بچ جاتے جو تمہیں سچ پر بے ضرورت اصرار کرنے سے ہوئی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ میرا یہ جھوٹ اخلاقاً سچ سے بدتر نہیں۔ اور ذہناً سچ سے زیادہ وقیع ہے۔ بہت سے بیوقوف دنیا میں سچ بولتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ان میں اخلاقی اور روحانی قوتیں ضرورت سے زیادہ تقویت پا گئی ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ان میں فطرت نے اتنی قابلیت ہی نہیں دی کہ قابل وثوق جھوٹ بول سکیں۔ عقل کے دیوالیہ پن کی پردہ داری کرنے کے لئے وہ راست گوئی کے پردے کے پیچھے پناہ لیتے ہیں۔ اور پھر متدین اور ثقہ بن کر دنیا کے سامنے اپنی نیکی کا اظہار کرتے ہیں اور خدا کی مخلوق پر نیکی کی آڑ میں ایک جابرانہ حکومت قایم کرتے ہیں۔ میں جھوٹ بولتا ہوں تو دماغی قابلیت کی بدولت اور اس کی وجہ سے اکثر نازک اور دشوار گذار مواقع ہموار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد رات کی تاریکی میں جب میرا اور میرے خدا کا دوبدو سامنا ہوتا ہے تو کبھی کبھی انسانی کمزوری سے مغلوب ہو کر تائب بھی ہو لیتا ہوں۔ تم سچ بولتے ہو تو خدا کے سامنے بزعم خود سرخرو ہو کر جاتے ہو۔ میں دنیا کے سامنے بھی اس عجز اور خاکساری سے رہتا ہوں جو انسان کے شایان شان ہے۔ اور دوسروں کے سامنے اپنی نیکیوں کا چرچا کر کے ان کی زندگی کو دشوار نہیں بناتا۔ فطرت . . . . . . میں نے ایک تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر شست لگائی اور اس حکمت عملی سے وہ فطرت پر گفتگو نہ کر سکا میں نے کہا "آخر تمہارا ارادہ حمام جانے کا ہے یا نہیں۔ پانچ بجا چاہتے ہیں آپ کی فلسفہ طرازی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ اب آپ چلیں گے یا نہیں۔ اٹھئے ورنہ بندہ رخصت"

"اچھا تمہیں بتاؤ کہ حمام جانے سے کیا فائدہ ؟ میں بچپن سے آج تک کچھ اپنی والدہ صاحبہ کی قدامت پرستی کے طفیل کچھ عوام الناس کی اوہام پرستی کے خوف سے سینکڑوں مرتبہ نہایا ہوں گا لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے مجھے

کیا فائدہ ہؤا۔ آدمی کو ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ اس کو اس کام کرنے سے کیا فائدہ ہوگا (میں کھڑا ہوگیا، لیکن اس نے درخواست کی کہ صرف دو منٹ کے لئے بیٹھ جاؤں تاکہ نہانے کی "اخلاقیات" کا پہلے فیصلہ ہوجائے) میں جب تھیٹر یا سینما جاتا ہوں یا فلسفہ کی کتاب پڑھتا ہوں تو میرے تجربہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب میں لوگوں کو خلوص سے عبادت کرتے ہوئے یا محفل رقص و سرود میں جوق جوق جاتے ہوئے دیکھتا ہوں یا خود کبھی بھولا بھٹکا وہاں پہنچ جاتا ہوں تو میں اس بات کا مطالعہ کرتا ہوں کہ انسان خود فراموشی کے لئے کیا کیا ترکیبیں سوچتے ہیں۔ میرے لئے اتوار کو گرجا اور شام کے وقت آباد شراب خانے ایک ہی مسئلہ کے دو حل ہیں۔ بعض لوگ تو وہاں عادتاً جاتے ہیں جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن بعض لوگ جو فی الواقع ایمانداری اور صداقت غرض سے وہاں جاتے ہیں ان کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ چند لمحوں کے لئے خدا کی یاد میں یا شراب کے دور میں اپنے سے اور اپنے ماحول سے آزادی حاصل کریں۔ میں غالب کی دقت نظر کا نہایت معترف ہوں مجھے یقین ہے کہ دنیا محض ایک گونہ بیخودی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ خدا کی قسم اگر شراب پینے میں چند اضافی نقصان نہ ہوتے تو میں اس کو وہی درجہ دیتا جو ایک زاہد کی طاعت گذاری کو۔ لیکن بحالت موجودہ عبادت قابل ترجیح ہے۔ کیونکہ آدمی کتنی ہی عبادت کیوں نہ کرے دوسروں کو نقصان نہیں پہنچاتا لیکن جنت میں جب کہ شراب کے نقائص جو اس کی فطرت کا جزو لازم نہیں بلکہ انسانی فعل کے ناقص ہونے کی شہادت ہیں دور ہوجائیں گے تو وہاں شراب طہور عبادت کی جگہ لے لے گی۔ ہاں تو معاف کرنا میں کیا کہہ رہا تھا؟ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی! (میں نے ایک مصنوعی سنجیدگی سے یاد دلایا کہ وہ نہانے کے خلاف عقلی اور اخلاقی دلائل بیان کر رہے تھے) اچھا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ حمام جانے سے کون سا تزکیہ نفس ہوتا ہے عقل کو فروغ ملتا ہے یا اخلاق کو تقویت ہوتی ہے۔ آخر مجھے کیا فائدہ کہ میں حمام جاؤں" میں نے بات کاٹ کر کہا" اچھا خدا حافظ انشااللہ شام کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔ اس وقت تک آپ اس مسئلہ پر اپنا مقالہ مکمل کر چکے ہوں گے اور میں بھی نہانے کے بعد اس کو غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے جانچ سکوں گا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسے سیاسیات میں کافی دخل ہے اور اسکی اکثر رائیں اور فیصلے غیر معمولی دوربینی اور فطرت انسانی کے پرتجربہ مطالعہ پر شہادت دیتے ہیں۔ لیکن وہ سیاسیات عام طور پر ان واقعات اور حالات پر مبنی نہیں ہوتیں جن کو عوام الناس بطور حقیقت کے پوجتے ہیں۔ وہ شاعری، فلسفہ اور نفسیات کا ایک مرکب ہوتا ہے جو کم از کم دلچسپی سے ہرگز خالی نہیں ہوتا۔ اور اسکی اعجوبہ پسندی، اور شاہراہ عام سے نظرتی گریز کو ظاہر کرتا ہے۔ دعاوی دلیل کے تابع ہونے ضروری نہیں۔ ان کی حمایت میں اکثر اعلیٰ ادبی درجے کے اشعار کافی ہوتے ہیں! کیونکہ وہ صداقت پر وجدانی طور سے محیط ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک روز حسب معمول قسمت کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ بحث سے میری مراد یہاں وہ گفتگو ہے جو زیادہ تر یک طرفہ ہوتی ہے اور عام بات چیت کی "لے دے" سے آزاد! ان کی رائے میں انسان اپنے ماحول کا بندہ ہوتا ہے۔ اور اس کو اپنے اعمال پر کچھ زیادہ قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ کہنے لگے میں کسی انسان پر خفا یا ناراض نہیں ہوتا میں ان کو محض رحم کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اپنے اپنے پنجروں میں بند، ناچار پرندے ہیں۔ جو دل خوش کرنے کے لئے گھونسلے بنانے کے واسطے تنکے چنتے ہیں۔ صحرا کے بھٹکے ہوئے مسافر ہیں جو پیاس کی شدت سے تنگ آکر ہر سراب کو چشمۂ آب سمجھتے ہیں اور اسی سے اپنی پیاس بجھانی چاہتے ہیں۔ ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ان کی اس بیکسانہ جدوجہد پر ہنسیں یا خفا ہوں یا اس کا مضحکہ اڑائیں۔ یہ لوگ جو اتفاق کی گردش سے روزی کمانے کی سردردیوں اور دنیا کے تلخ تجربوں سے محروم رہ جاتے ہیں اپنا فرصت کا وقت گذارنے کے لئے دنیا کی اصلاح اور بہبودی کے لئے تدبیریں سوچتے ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ مختلف طرح کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، ہنگاموں کی بنا ڈالتے ہیں مجھے ان پر ہنسی آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ ان کا وقت ان مشغلوں میں کسی قدر دلچسپی سے گذر جاتا ہے۔ دنیا کو اور کیا فائدہ ہوتا ہے۔ اگر تم سوچو تو ان تمام تحریکات کا جوانہ جو آج کل بنی نوع انسان کی قسمت سنوارنے کے لئے جاری ہیں سوائے اس کے کیا ہے کہ تحریکات کے بانیوں کو ایک پر لطف کھیل ہاتھ آگیا ہے۔ ان کیلئے خود فراموشی کا یہی ایک وسیلہ ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ کیا بے سود حماقت ہوسکتی ہے کہ دنیا کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ آخر خدا کے ذمے بھی کوئی خدمت باقی رہنی چاہیئے یا نہیں۔ اگر وہ خود بھی دنیا کو موجودہ حالت سے بہتر نہیں بنا سکا تو یہ ضعیف مقدرت ہستیاں کیا کر سکتی ہیں۔ عوام الناس کو ہر نیا کھلونا جام جہاں نما معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ چند دن میں ٹوٹ کر انسانی حماقتوں اور ناکامیوں کی فہرست میں ایک اضافہ ہو کر رہ جاتا ہے اور بس۔ انکی مثال بالکل پہاڑ کو در زرہ ہونے کی ہے۔ بعد مشقت بسیار ایک چوہا پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی یا تو بیجان یا چند روزہ عمر کا! انسان بالکل مجبور ہے اور اپنی فطرت اور ماحول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ میں تو اسے اس کے اعمال کا جواب دہ ہی نہیں سمجھتا۔ آزادی۔ آزادی عمل کیا چیز ہے؟ (وہ نہایت اونچی آواز سے گفتگو کر رہا تھا اور ہاتھ پر ہاتھ مار رہا تھا۔) محض ایک نظر کا دھوکا ہے۔ فطرت کا فریب ہے۔ فطرت چاہتی ہے کہ انسان مشغول رہے۔ محنت و مشقت کرتا رہے۔ اپنے خیال میں دنیا کو سنوارا کرے۔ اس لئے اس نے ہم لوگوں کو اس خوش گوار غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ اپنی کوشش سے جو چاہیں کر سکتے ہیں اور بس! انسانوں کی لاتعداد نسلیں اور ہر نسل کے لاتعداد افراد محض اس ذرا سے مغالطہ کی وجہ سے اپنی تمام زندگی ان تھک کوششوں میں بسر کرتے ہیں۔ مگر پھر اس نے اپنے خیالات کی باگ دوسری جانب موڑی) مگر پھر بھی سوچتا ہوں تو انسان کی بھلائی اور اس کی زندگی کی یکسانیت

اور بے مزگی کو دور کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ جب زندگی بہرحال کسی نہ کسی مغالطہ یا فریب میں بسر ہونی ہے تو کیوں نہ کوئی شیریں فریب پیدا کیا جائے۔ اس کے بغیر نہ کوئی فلسفی زندہ رہ سکتا ہے نہ معمولی آدمی۔ فرق اس قدر ہے کہ فلسفی جانتا ہے کہ میں ایک دھوکے میں مبتلا ہوں، ضرورت ہو تو دھوکا پیدا کر سکتا ہے لیکن ایک معمولی آدمی اس دھوکے میں بالکل منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کا نشہ جوانی کا سا نشہ ہوتا ہے جو کم از کم اس وقت ایک دائمی کیفیت معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس تقسیم میں فلسفی زیادہ اچھا رہتا ہے یا غیر فلسفی۔ آرٹ کے نقطۂ نظر سے غالباً غیر فلسفی شخص کی حالت زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی تمام شخصیت ہر آنے والی کیفیت (mood) میں ضم ہو جاتی ہے۔ اسے نہ اس کیفیت سے پہلے کی کوئی چیز یاد رہتی ہے۔ نہ اس کے بعد کسی چیز کا خیال ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو انسان کس چیز کا بنا ہوا ہے۔ مٹی کا؟ نہیں انسان مٹی سے زیادہ ذہنی کیفیات کا بنا ہوا ہے۔ اور اس کی تمامتر کوشش یہی ہوتی ہے کہ جو کیفیت اچھی معلوم ہو اسے مستقل بنا دے۔ اس کے مقابلہ میں ایک فلسفی کو لیجئے (اسے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرکے "فلسفیوں" اور "عام آدمیوں" کی حالت کا مقابلہ کرنے میں خاص لطف آتا تھا "فلسفی" کی مختصر تعریف کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کی خصوصیات خود اس ہی کے بیان سے ظاہر ہو جائیں گی) اس کو یہ فائدہ ہے کہ وہ کسی ذہنی کیفیت کا یا کسی فریب کا غلام نہیں بن جاتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب فطرت کی چالاکی ہے۔ وہ یقیناً ہر فریب سے لطف اندوز ہوتا ہے لیکن جانتا ہے کہ وہ ایک عارضی چیز ہے جب وہ اس سے چھین لیا جاتا ہے تو اُسے کوئی مایوسی یا رنج نہیں ہوتا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو کوئی امید نہیں رکھتے۔ کیونکہ انہیں کبھی ناامیدی نہیں ہوگی۔ اور فلسفی کی سب سے بڑی شان امتیازی یہی ہے کہ اسے کوئی امید نہ ہو! اور یہی وجہ ہے کہ ایک بلند مرتبہ خود دار فلسفی جو صحیح معنوں میں (جبریہ عقائد کا پیرو) ہوتا ہی ایک طرح سے فوق الانسان ہستی کا ہم مرتبہ ہو جاتا ہے وہ نہ خدا سے کسی چیز کا طالب ہے نہ دنیا سے نہ اپنے ابنائے جنس سے اس کی ہستی عالم اسباب میں ایک عجیب مظہر ہے جسکو محض ایک اعجوبۂ روزگار کہا جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی طبیعت یا رویہ ہر شخص کے لئے موزوں ہے نہیں ۹۹ فی صدی بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ لوگوں کیلئے اوسط درجہ کے انسان کی سی زندگی غنیمت ہے جس میں رنج اور خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈرامے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ امیدیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ خدا اور بندوں کے سامنے دست سوال دراز رہتا ہے لیکن جب خدا تعالیٰ کی ناقابل فہم مصلحت کوئی ایسی ہستی پیدا کر دے جو ان قیود اور بندشوں سے آزاد ہو تو ہم کو چاہئے کہ ہم اس کی عزت کریں۔ اور جب اس کے پاس سے گذریں تو مودبانہ خاموشی کے ساتھ گذر جائیں کیونکہ اس کی مٹی ہماری مٹی سے مختلف ہے۔ مجھے دیو جانس کلبی بہت پسند ہے جب سکندر اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے پوچھا کہ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں تو دیو جانس نے جواب دیا کہ تم ایک طرف کو ہٹ کر کھڑے ہو سکتے ہو تا کہ

مجھ پر سورج کی روشنی پڑ سکے"!

تب ہیں بیٹھے ہوئے اس قدر استغنا کا جواب دینا صرف ایک فلسفی ہی کا کام ہے نہ اسکو کوئی خواہش تھی، نہ امید نہ کوئی غرض۔ پھر وہ کیونکر سکندر کا احسانمند ہوتا۔ یوں تو ہم سب ایک حد تک اپنی ضروریات کی وجہ سے اپنے ماحول کے بندے ہیں لیکن ایک فلسفی مزاج آدمی اپنی ضروریات کو کم کرکے اس بندگی کو بھی کم کردیتا ہے۔ کیونکہ سادگی غلامی کو کم کرنے کا ایک طریقہ ہے"۔

اسے اس قسم کے جملوں میں خاص لطف آتا تھا۔ وہ اس وقت تک گفتگو کے سلسلے کو ختم نہ کرتا تھا جب تک کہ اس تمام مضمون کو ایک مختصر اور موثر مقولہ کی صورت میں مجتمع کرکے پیش نہ کرسکے اس کی گفتگو کا مآل کار اسی قسم کے جملے ہوتے تھے جن سے وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ مجھے اس کے اس قسم کے اکثر جملے یاد ہیں اور وہ دراصل ایک صاحبِ فکر و دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

(۱) زبان سب سے بڑا دھوکا ہے۔

(۲) ہم گفتگو صرف اس چیز کے متعلق کرتے ہیں جسے ہم جانتے نہیں۔

(۳) شور اس لئے نہیں مچایا جاتا کہ خوشی ہوتی ہے بلکہ خوشی اس لئے ہوتی ہے کہ شور مچایا جاتا ہے۔

(۴) فلسفہ ایک دوا ہے۔ صحت مند آدمی کے لئے ضروری نہیں۔ لیکن اس کو پاس رکھنا چاہئے تاکہ بیماری کے وقت کام آئے۔

اس آخری خیال کو وہ اکثر گفتگو میں لاتا اور اس کے نتائج کو دکھاتا تھا۔ اس کے خیال میں فلسفہ کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس کی مدد سے انسان خوشی اور غم کی بندشوں سے آزاد ہو جائے۔ یعنی جہاں تک ممکن ہو۔ خوشی کو زیادہ اہمیت دے نہ رنج کو بلکہ اگر ہو سکے تو ان واقعات کو جو خوشی یا رنج کا باعث ہوتے ہیں سوچنے کا بہانہ سمجھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے تم ہر ذراسی خوشی پر بے انتہا مسرور ہوتے ہو اور ذرا سے رنج سے طبیعت کا توازن کھو بیٹھتے ہو، برخلاف اس کے ایک فلسفی اس مد و جزر سے محفوظ (یا محروم) رہتا ہے۔ کوئی شادمانی اس کو غیر معمولی طور پر مسرور نہیں کرتی، نہ کوئی مصیبت اس کے اطمینان قلب کو بالکل متزلزل کرسکتی ہے۔ وہ ایک عمیق سمندر ہے جس پر چند فٹ سے زیادہ اونچی لہریں نہیں اٹھتیں۔ جہاں وہ درد و الم کی انتہائی منازل سے محفوظ ہے۔ وہاں اس کو بے لگام مسرت کی گھڑیاں بھی میسر نہیں ہوتیں اس کے لئے زندگی کے وہ روزانہ واقعات جو عوام الناس کیلئے غم و شادی کا سرچشمہ ہوتے ہیں، ذاتی طور پر مساوی ہیں ان کی صرف اتنی اہمیت ہے کہ وہ انکے ڈھانچے پر اپنے خیالات کی صنعت کاریاں دکھاتا ہے۔ مثلاً ایک نہایت ہی عام واقعہ لو یعنی ایک بچے کی پیدائش اس سے

زیادہ عام بات دنیا میں کیا ہوگی ؟ لیکن یہ غیر اہم واقعہ ہی بچے کی ماں کے لئے ایک مسرت ابدی کا سرمایہ دار بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس بچے کی موت جو دکم ازکم ہندوستان جیسے پس راہ ملکوں میں!) اتنی ہی عام ہے۔ ماں کے لئے اتنا پر درد حادثہ ہے کہ انتقام پسند فطرت اس سے زیادہ خوفناک عذاب پیدا نہیں کر سکتی لیکن فلسفی کے لئے دونوں واقعات کی اہمیت بہت کچھ جداگانہ، اور اگر میں ایک خود ساختہ لفظ استعمال کر سکوں، تو متوسطانہ ہے۔ بچے کی پیدائش اسے اتنا مسرور نہیں کرتی کہ وہ اضطراری حرکات سے اپنی مسرت ظاہر کرنے لگے۔ وہ محض ایک بیرونی اور خارجی واقعہ ہے جس کا اثر اس کی ذات پر اتنا ہوتا ہے کہ وہ یہ سوچے کہ دنیا میں ایک کھانے والا اور پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی پیدائش اس کی پہلی اور مہلک ترین اجتہادی غلطی ہے۔ کیونکہ یہ بڑا ہو کر اپنی زندگی کو برباد کرے گا اور مرتے وقت پیدا ہونے ہی کو سرے سے ایک برا سودا سمجھے گا۔ بچے کی موت بھی اس کے لئے ایک پیغام الم نہیں۔ دعوت تفکر ہے۔ وہ انسانی عنصر کو نظر انداز کر کے موت اور اس کی ماہیت پر غور کرتا ہے۔ اور اس ستم رسیدہ ماں کی دماغی حالت کا تجزیہ کرتا ہے جو اس فطرتی واقعہ پر اپنا اطمینان قلب کھو بیٹھتی ہے۔ اس لئے دونوں کے لئے زندگی اور اس کی مصیبت اور خوشی مختلف معنی رکھتے ہیں۔ دونوں کے لئے اپنی اپنی کمیوں کے بدل موجود ہیں ۔۔۔۔۔۔"

جب مجھے کسی بچے پر پیار آتا ہے تو اس میں خود غرضی کا ایک نقاب پوش شائبہ ضرور ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ میں اس معصوم اور انجان ہستی کو دیکھ کر اپنے بچپن کی تصویروں کو چشم تصور کے سامنے لا سکتا ہوں۔ مجھے اس سے ہمدردی ہوتی ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کس طرح دن بدن زندگی کی تلخ حقیقتیں اس عیش نصیب کی مسرت پر حملہ آور ہوں گی۔ مجھے اس کی جنت لاعلمی کا اپنی حالت سے مقابلہ کر کے اس پر رحم آتا ہے لیکن انسانی فطرت کی چالاکی اسے بچے پر پیار کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ کائنات کے تمام کھلونوں میں بچہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے جب میں کبھی دنیا کو دوبارہ تعمیر کرنے کے شیریں خواب دیکھتا ہوں تو مجھے اس کی تعبیر محض ایک معصوم بچہ کی صورت میں نظر آتی ہے جو دنیا کی آلائشوں سے پاک ہے۔ اور جس میں ہر قسم کی طاقتیں اور ممکنات موجود ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خواب کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن اسی وجہ سے میں ان پر اپنا وقت صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا!"

اس قسم کے لوگ دنیا میں اپنے لئے کوئی راستہ نہیں بنا سکتے۔ وہ اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہوتے ہیں ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ گویا ان کو "ہوا پر ضائع کرتے ہیں" اور کوئی کارنامہ اپنے پیچھے ایسا نہیں چھوڑتے جو ہر شخص دیکھ سکے اور تعریف کر سکے۔ لیکن ایسے لوگوں کی صحبت بجائے خود ایک تعلیم ہے اور دنیا کی حقیقی دولتمندی اور رفعت کا انحصار ان ہی کی شخصیت پر ہے۔

غلام السیدین

رُباعیات

(۱)

رحمت میں عیاں ہے تیری رحمت یارب
کلفت میں نہاں ہے تیری الفت یارب
تو ساتھ ہے جب تو دُکھ درد بھی سُکھ ہے
غم بھی ہے مرے لئے مسرت یارب

(۲)

ہر رنج کو ہنس کے ٹال دیتے ہیں جو
ہر نیزہ پہ جان ڈال دیتے ہیں جو
دُنیا کے چمن میں گُل بداماں ہیں وہی
جی سے خلش نکال دیتے ہیں جو

(۳)

مانا کہ ہے عشق کا فسانہ ذہنی
کارندہ ہے عقل کا کارخانہ ذہنی
دُنیا کو بنایا اُس نے ذہنی لیکن
شاید کہ ہو عقل کا بہانہ ذہنی

(۴)

کُچھ لطف نہیں جہاں کی آبادی میں
کُچھ لطف نہیں یہاں غم و شادی میں
اس قید سے دُور دُور رہئے اے دل
خوشیاں ہیں ہزار اپنی آزادی میں

بشیر احمد

نئی تاریکی

ایک صاحب کی نسبت مغلستان کا روپیہ حال ہی یورپ برباد کر کے آئے ہیں سننے میں آیا ہے کہ اب وہ یہاں کی کسی بات کو پسند ہی نہیں کرتے۔ دراصل وہاں اور یہاں میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ یورپ میں جنگ عظیم ہو کر کچھ تاجدار معزول ہوتے ہیں تو یہاں بھی کبھی کبھار کسی ممتاز راجہ سے استعفا طلب کر لیا جاتا ہے۔ یورپ میں بڑے بڑے سٹرائیک کر کے حقوق کی نگہداشت کی جاتی ہے تو یہاں بھی گاہے ماہے ایک چھوٹا سا سٹرائیک چند غریب راہگیروں کو بے روزگار بنا دیتا ہے۔ یورپ میں پارلیمنٹیں قوانین بناتی ہیں تو یہاں بھی ناپسندیدہ قوانین کے برخلاف اسمبلی تجاویز پاس کر دیتی ہے۔ مانا کہ یہاں تعلیم عام نہیں مگر پڑھے ہوئے کو بھلا دینا تو عام ہے اور دنیا کے چرچوں میں مغلستان کا اتنا حصہ بھی غنیمت ہے۔ جسے اس سے کچھ زیادہ توقع ہو اُسے بزرگوں کا وہ قول یاد کر لینا چاہئے ع

طمع را سہ حرف است وہر سہ تہی

روحانی ترقی میں بھی گورستان کا نمبر بہت پیچھے نہیں۔ چند دن کی بات ہے کہ ملیریے اور طاعون کا الزام ایک بیکس بڑھیا مسماۃ تقدیر کے سر تھوپا جاتا تھا۔ اب مسلمہ طور پر مچھر اور چوہوں کے پسّو مجرم گردانے گئے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گھروں کی اور دائیوں کی صفائی پر اصرار ہے اور دنیا کی کل چلانے والے کو اس کے اپنے پرانے کام میں انسانی تدبیر و تائید سے مدد دی جا رہی ہے۔ اس لئے از روئے انصاف یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حضرت جن کا ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے اعتراض کرنے میں حق بجانب نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہ صاحب بجائے اس کے کہ اپنے خیالات کو حسب دستور ایک مطبوعہ سفرنامے میں پیش کر کے نقادان معاشرت کو موقع دیتے کہ وہ حب الوطنی کا ثبوت دیں ایک نئی طرز تحریر کے بانی ہونے کے خواہشمند ہیں یعنی اس طرح کہ ان کا ایک قلمی رسالہ جس کا نام نئی تاریکی ہے علم دوست طبقوں میں چکر لگا رہا ہے اس رسالہ میں کسی خاص مبحث پر مدلل تحریر نہیں بلکہ جرمن فلاسفر نیٹشا کی طرز میں مختلف مضامین پر مختصر نوٹ ہیں جن میں سے چند نوٹ ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

"عقائد شماری کا لب لباب یہ ہے کہ جن کے پاس زر نہیں، زور نہیں، اُن کے پاس خدا ہے اور جن کے پاس زر زور دونوں ہیں وہ خود خدا ہیں۔ اور سطحی یا حقیقی مساوات سے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ خوش ہیں"۔

"مذہبستان میں خوشی حرام ہے"

"امرت سری اور کشمیری قالینیں یورپ اور امریکہ میں بہت خریدی جاتی ہیں۔ پاؤں پڑنے میں مفلستان لاثانی ہے"

"وہ کارخانہ جس میں امریکہ کے ڈالر لوٹنے کیلئے سوامی اور مولوی بنانے کی مشین چل رہی ہے جلدی بند ہوجائیگا سوامی اور مولوی دونوں دروغ بافی میں پورے ماہر ثابت نہیں ہوئے"

"امریکہ بہت بڑا کارساز ہے۔ ایشیائی شاعر کی پیشگوئی۔
کارساز ما بفکر کار ماست
اب پوری ہوئی ہے۔ کیا اس شاعر کو موٹر کار کا علم تھا؟"

"جس ملک میں موت کے بعد آرزوئیں پوری ہونے کی آرزو ہو وہاں زندگی موت ہے۔ شانتی کی شراب کا نشہ جدوجہد کی ترشی اتار سکتی ہے مگر وہ غفلت کی بھنگ جو آج کی خوشی کل پر ڈال دے سم قاتل ہے۔"

دنیا کے ہر چڑیا گھر میں اجازت ہے کہ تماشائی خوبصورت چڑیا کی تعریف کرے مگر ایک وسیع جانور خانہ ایسا بھی ہے جہاں حسینہ کو اس کا دل خوش کرنے کیلئے حسینہ کہنا، اسکی اداؤں کی اس کے لباس کی داد دینا اور داد دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا کہ وہ اس منحوس جانورستان کی نحوست کو کچھ کم کرے ممنوع ہے۔ اس وحشستان میں اعتراف حسن کے متعلق ایک ہی قانون ہے
نہ دیکھو نہ دکھاؤ۔ نہ سنو نہ کہو
زندگی نفی کی چار زنجیروں میں مقید ہے۔"

مزید اقتباسات کی ضرورت نہیں۔ مندرجہ بالا نقل کردہ اقوال میں سے جس قول پر بھی غور کیا جائے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ صاحب تحریر کو ایشیائی طرز معاشرت سے عناد ہے۔ مثلاً اس آخری نوٹ پر غور کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا منشا یہ ہے کہ اگر موقع ملے تو ہر شخص کو حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ نیک نیتی سے اپنی منکوحہ کے علاوہ بھی صنف

نازک کی بہار حسن کی کھلم کھلا داد دے گویا حسین بننے کی کوشش کو اعمالِ حسنہ میں نمبر اول جگہ دی جائے اور سوسائٹی رفتہ رفتہ یہ رنگ اختیار کرے کہ بیویاں بجائے نیک بننے کی کوشش کرنے کے حسینہ بننے کی کوشش کریں مگر کون نہیں جانتا کہ اس قسم کے انقلابی مسائل ایشیائی تہذیب کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ایشیائی عقاید خودنمائی کو بدترین عیوب میں شمار کرتے ہیں۔اسی لحاظ سے ایشیا جتنی بھی کوشش حسن کے قلع قمع کرنے میں کرے وہ کم ہے بلکہ اگر اس مضمون کے بعید طوالت ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہیں کہ تمام ایشیائی تواریخ کی کلید ایک جملہ میں ہے اور وہ یہ ہے :-

"حسن کو جہاں دیکھو مٹاؤ"

یہی وجہ ہے کہ اچھے اچھے مندروں میں گوبر کا استعمال کیا جاتا تھا اور اچھی اچھی مسجدوں میں پیلے تہمد برا جتے تھے۔اس ضرورت نے ایشیائی مجددوں کو مجبور کیا کہ گو دراصل حسن ظاہر اور حسن باطن میں کوئی فرق نہیں مگر مصنوعی طور پر اس فرق کو ایسا استوار قائم کردیا جائے کہ جب تک ایک بھی حقیقی ایشیائی زندہ رہے وہ کبھی حسن صورت کو فروغ پانے نہ دے باقی اقوال پر مفصل تبصرہ کی ضرورت نہیں مگر مثال کے طور پر "آج کی خوشی کل پر نہ ڈالو" والے مسئلہ پر اگر غور کیا جائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ یہی کہ روزانہ زندگی کے بجائے خود بھی کچھ معنے ہیں اور یہ ایک آنے والی زندگی کے لئے محض تیاری نہیں ہے۔ اس قسم کے مجرب اخلاق مجربات پر خامہ فرسائی عبث ہے۔ روز روز خوش رہنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ماہران روحانیت ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ ثابت کر چکے ہیں کہ گریہ نیم شبی انسانی زندگی کی معراج ہے اور جسے اس طرف بڑھنا ہو وہ جلے اور جلائے روئے اور رلائے۔

اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلط انگریزی تعلیم کے باعث بعض لوگوں کے دلوں میں یہ بیہودہ خیال جاگزین ہو گیا ہے کہ ہم لوگ دراصل اپنے لئے زندہ ہیں۔ اس نئے الحاد کا حکمی علاج یہی ہے کہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا جائے کہ ہرگز ہرگز ہم لوگ اپنے لئے زندہ نہیں بلکہ ہم اپنے بزرگوں کے لئے زندہ ہیں۔ یہ امر بالکل الگ ہے کہ نہ اُن کو ہماری ضرورت ہے اور نہ ان کو ہمارا پتہ ہے۔ نہ انہیں کچھ ہماری پروا تھی۔

فلک پیما

تخلیقِ موسیقی

مسلط ظلمتوں کی وحشتیں تھیں روزِ روشن پر
بگولے اُڑ رہے تھے وسعتِ ہستی کے دامن پر

غمِ تاریک تھی دنیا عناصر کے تعطل سے
بھیانک سنسنی سی چھا رہی تھی حسنِ ایمن پر

صبا کی جنبشوں سے ہوک کی آواز پیدا تھی
چمن میں کوششِ گفتار تھی مجبور شیون پر

مذاقِ زندگی ناآشنائے حسنِ فطرت تھا
اداسی حکمراں تھی رونقِ ہستی کے گلشن پر

یہ حیرت خانۂ تقدیر بے کیفِ ترنم تھا
یہاں کا ذرہ ذرہ تشنۂ ذوقِ تبسم تھا

یکایک نور کے بادل امنڈتے ہیں فضاؤں میں
برس جاتے ہیں نغمہ بن کے جو ہستی کے دامن پر

جہاں بزمِ چراغاں ہے ترانوں کی تراوش سے
فدا شانِ تجلّی ہے جبینِ صبحِ روشن پر

نسیمِ صبحدم لبریز ہے صہبائے مستی سے
خمار آگیں فضائیں جھومتی ہیں اپنے جوبن پر

مذاقِ نغمہ پاشی نے گلوں کو زندگی بخشی
تبسّم کی جھلک پیدا ہوئی لب ہائے سوسن پر

چمن والوں نے رازِ شوکتِ حسنِ نمو پایا
تخیل لے اڑا ادراک کو رفعت کے توسن پر

یہ کس کے حسن کی شادابیاں مخمورِ نازش ہیں
کہ اک سحرِ پریشاں کیف سا چھایا ہے گلشن پر

ترنم! ہاں یہ سحرِ نغمۂ سازِ ترنم ہے
کہ جس سے زندگی اک پیکرِ موجِ تبسم ہے

تصدق حسین خالد۔ ایم، اے

دنیا کی مذہبی و معاشرتی تاریخ پر ایک نظر

اور اہل بہاء

جناب محترم میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر رسالہ ہمایوں لاہور نے عنوان بالا سے مسلسل "ہمایوں" کے پانچ نمبروں میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس میں جناب موصوف نے تقریباً تمام مذاہب عالم پر مجمل نظر ڈالی ہے۔ اس مضمون کے آخری دو نمبروں (اپریل و مئی ۱۹۲۷ء) میں "اسلام" پر بحث کی گئی ہے چنانچہ اس مضمون کی آخری قسط کے دوران میں "اہل بہاء" کے متعلق چند سطور میں جس طرح صفائی سے بعض تعلیمات بہائی کی تصریح کی گئی ہے وہاں ایک دو اصولی اشتباہات ہو گئے ہیں۔ جن کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ بالاجمال اہل بہا کا عقیدہ ذیل میں لکھ دوں

جناب میاں صاحب موصوف اپنے گرانقدر مضمون میں فرماتے ہیں کہ:۔

"بہائیت کا عقیدہ ہے کہ خدا کائنات کی روح ہے اور یہ روح وقتاً فوقتاً بعض شخصیتوں میں حلول کر کے نوع انسان کی ہدایت کے لئے دنیا میں پیغمبر اور رہبر بھیجتی رہتی ہے۔ بدھ۔ موسیٰ۔ عیسیٰ۔ محمد۔ بہاءاللہ اسی قسم کے روحانی رہنما تھے (ہمایوں مئی ۱۹۲۷ء)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اہل بہا بدھ۔ موسیٰ۔ عیسیٰ۔ زردشت۔ محمد اور بہاءاللہ کو دنیا کے اعظم ترین روحانی رہنما یقین کرتے ہیں جو ہر زمانہ اور ہر عصر میں اصلاح عالم اور خلق کی تربیت کے لئے۔ خدا کی طرف سے ظہور فرمایا کرتے ہیں۔ اور اُن کا بیان ہے کہ آج جب کہ تمام مذاہب و ادیان کے ماننے والے اپنی اپنی حقیقت کو بھول کر جو سب میں ایک ہی ہے قشور اور الفاظ پر برسر جنگ تھے۔ اہل عالم کی ہدایت و اصلاح و ترقی کے لئے مشیت ایزدی نے جو ہمیشہ سے آٹے وقتوں میں اصلاح مخلوق کے لئے ایک برگزیدہ شخص کو انتخاب کیا کرتی ہے" ایران کی سرزمین سے حضرت بہاءاللہ کو منتخب کیا اور اصلاح عالم اور اتحاد امم کا عظیم الشان کام آپ کو تفویض فرمایا

لیکن اسی کے ساتھ یہ بات قطعاً درست نہیں ہے کہ اہل بہا حلول کے قائل ہیں۔ کہ خدا یا اس کی روح اجسام انبیاء و مظاہر الٰہی میں "حلول" کر جاتی ہے حضرت بہاءاللہ کتاب مستطاب ایقان مطبوعہ مصر کے صفحہ ۸۹ پر فرماتے ہیں کہ:۔

"غیب ہویہ و ذاتِ احدیہ مقدس از بروز و ظہور و صعود و نزول و دخول و خروج بودہ و متعالیست از
وصف ہر واصفے و ادراک ہر مدرکے لم یزل در ذات خود غیب بودہ و ہست و لایزال بکینونت خود مستور
از ابصار و انظار خواہد بود۔"

اس بیان مبارک سے ظاہر و ہویدا ہے کہ اہل بہا حلول و بروز کے قائل نہیں، ہاں وہ انبیاء الٰہی اور مظاہر رحمانی کو خدا
کے دیکھنے کا آئینہ مانتے ہیں۔ جیسا کہ اسی کتاب مستطاب ایقان میں ارشاد ہے کہ

"جواہر قدس نورانی از عوالم روح روحانی بہیاکل عز انسانی در میان خلق ظاہر فرمود تا حکایت نمایند از
ذات ازلیہ و ساذج قدمیہ و این مرایای قدسیہ و مطالع ہویہ تماماً ہم از آن شمس وجود و جوہر مقصود حکایت مے
نمایند مثلاً علم ایشان از علم او و قدرت ایشان از قدرت او و سلطنت ایشان از سلطنت او و جمال ایشان از
جمال او و ظہور ایشان از ظہور او و ایشانند مخازن علوم ربانی و مواقع حکمت صمدانی و مظاہر فیض نامتناہی و
مطالع شمس لایزالی" ایقان شریف صـ

وہ شمس حقیقت جس کو خدا کہتے ہیں اپنے انبیاء اور مظاہر کے قلب میں عکس ڈالتا ہے اور اُن سے اسی کی روشنی ظاہر ہوتی
ہے۔ مگر جس طرح آئینہ میں آفتاب "حلول" نہیں کرجاتا یا اپنی بلندی سے نیچے اتر کر داخل نہیں ہوجاتا۔ بلکہ اپنی رفعتوں پر ہی قائم رہتا
ہے اسی طرح خدا اپنی تنزیہ اور تقدیس کے مقام پر اپنے کمال و جلال کے ساتھ تجلی فرما رہتا ہے۔ انبیا اور مظاہر میں حلول نہیں کرتا۔

اس مسئلہ کی مزید تصریح کے لئے حضرت عبدالبہا کا بیان ذیل بہت دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

"چناں گمان نشود کہ حقیقت الوہیت تجزی یافتہ یا آنکہ تعدد جستہ و یا آنکہ از علو تقدیس و تنزیہ تنزل نمودہ۔
حاشا ثم حاشا زیرا اگر آئینہ صاف لطیف تقابل با آفتاب نماید انوار و حرارت و صورت و مثال آفتاب در ان
چناں تجلی ظہوری نماید کہ اگر ناظرے آفتاب درخشندہ و مشہور در آئینہ صاف لطیف گوید کہ این آفتاب است
صادق است و لے آئینہ آئینہ است و آفتاب آفتاب شمس واحد ولو در مرایای متعددہ جلوہ نماید واحد است
این مقام نہ حلول است و نہ دخول و نہ امتزاج و نہ نزول زیرا دخول و حلول و نزول و خروج و امتزاج از لوازم
و خواص اجسام است نہ ارواح، تا چہ رسد بہ حقیقتِ مقدسہ منزہ حضرت الوہیت تبارک اللہ عن الکل ما
لاینبغی لتنزیہہ و تقدیسہ و تعالی علواً کبیراً شمس حقیقت چنانکہ گفتیم لم یزل بر حالت واحدہ بودہ است تغییر
تبدیل ندارد تحویل و انقلاب نجوید۔ ازلیست سرمدیست و لے حقیقت مقدسہ کلمۃ اللہ بمنزلہ آئینہ صافی و لطیف
و نورانیست حرارت و ضیا و صورت و مثال یعنی کمالات شمس حقیقت در آں جلوہ نماید"
مفاوضات حضرت عبدالبہاء ۱۴۵

ان عبارات سے اہل بہا کا عقیدہ خدا اور انبیاء کے تعلق کے بارے میں واضح اور روشن ہوگیا۔

حضرت سید علی محمد باب نے باصطلاح اہل اسلام "مہدی" یا "قائم آل محمد" ہونے کا اعلان فرمایا۔ اہل بہا آپ کو مہدی اور قائم ماننے کے ساتھ ساتھ حضرت بہاء اللہ کے ظہور کے مبشر بھی مانتے ہیں اور اُن کا اعتقاد ہے کہ جس طرح حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیلئے بطور مبشر کے تھے ویسے ہی حضرت باب حضرت بہاء اللہ کے ظہور کے لئے مبشر تھے اور آپ نے حق و صداقت اور خدا کے راستہ میں حکومت ایران کے ہاتھوں شہادت کبریٰ پائی اور قربانی اور استقامت کا وہ نمونہ پیش کیا کہ جس کو دیکھ کر مذاہب عالم کی تاریخ کا محقق حیرتوں میں ڈوب جاتا ہے۔

جس طرح حضرت محمد بن عبداللہ (علیہ السلام) نے "رسول اللہ" بن کر خدا کا پیغام قرآن مجید کی شکل میں مدون فرمایا تھا اسی طرح حضرت حسین علی نے خدا کی طرف سے بہاء اللہ بن کر کتاب الاقدس اور دیگر الواح کی شکل میں خدا کا تازہ اور جدید پیغام اہل عالم کے سامنے پیش کیا اور یہ کام ایسی حالت میں انجام دیا کہ ایران اور ترکی کی دو شخصی حکومتیں اپنے سیاسی اغراض اور علما کے بہکانے کی وجہ سے انتہائی جور و ستم سے کام لے رہی تھیں۔ اگر ایک طرف ایران میں مظلوم بہائیوں پر انواع و اقسام کے مظالم کئے جاتے تھے۔ اور ان کا خون بہانا دین و ملت کی آبیاری کے لئے لازمی خیال کیا جارہا تھا تو دوسری طرف حضرت بہاء اللہ کو حکومتیں ایران سے بغداد اور بغداد سے قسطنطنیہ اور اڈریانوپل میں جلاوطن۔ اور نظر بند اور مقید کرنے میں مصروف تھیں۔ حتیٰ کہ حکومت ترکی نے آپ کو عکہ کے قلعہ میں محبوس کردیا۔ اور خیال کیا کہ اب ہم نے اس آواز کو دبا دیا اور اس تحریک کو پامال کردیا۔ مگر ان کو معلوم نہ تھا کہ خدا کی یہ آواز دبنے والی نہ تھی اور یہ تحریک انسانی مساعی سے مٹنے والی نہ تھی چنانچہ جس قدر حکومتوں کے شدائد بڑھے اسی قدر اس تحریک نے سرعت اور قوت کے ساتھ قلوب اہل عالم پر اپنا تسلط جمانا شروع کردیا۔ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ آواز جو ایران میں بلند ہوئی تھی اور جس کو بند کرنے کے لئے ہزارہا انسان تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ تمام عالم میں گونج رہی ہے اور کوئی قوم کوئی ملت اور کوئی ملک ایسا نہیں جس میں اس صدائے حق پر لبیک کہنے والے اور اس کے شیدائی موجود نہ ہوں اور عقلاء عالم دنیا کی آئندہ بہبود انہی تعلیمات کے زیر سایہ آنے میں تسلیم کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اس مضمون کو ختم کروں ایک نہایت اہم اور دلچسپ نکتہ پر ناظرین "ہمایوں" کی توجہ منعطف کرانا ضروری خیال کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ عموماً جملہ مذاہب کے اہل قلم حضرات کی یہ حالت نظر آتی ہے کہ سب کے سب اپنے مذہب کو مکمل اور اپنی کتاب کو اکمل اور اپنی شریعت کو آخری شریعت بتاتے ہیں اور جس وقت دوسرے مذاہب پر تنقید کرتے ہیں تو دوران بحث میں تمام روایات اور خیالات اور اجتہادات اور رسوم وغیرہ کو جو کسی مذہب کے ماننے والوں میں اصل کتاب کے

علاوہ پیدا ہوگئی ہوتی ہیں معرض بحث میں لاکر اس دین کو بے حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ یا دوسرے مذاہب کو ناقص ثابت کرنے اور ان کے لئے دائرہ اتنا تنگ بناتے ہیں کہ ان کی اصل کتاب میں ہی ہر جزو و کل ڈھونڈھنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور جب اصل کتاب میں نہیں پاتے تو اس دین کی تنقیص کرتے ہیں مگر جب اپنا موقع آتا ہے تو بالکل اس کے برخلاف رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ کہیں ہر قسم کی روایات اور انفرادی اجتہادات و خیالات کی مدد سے اپنے مذہب کی برتری جتاتے ہیں۔ اور کہیں صرف اصل کتاب اور اس کی من بھاتی تفسیر ہی کو مستند قرار دے لیا کرتے ہیں۔ غرض ایک اصول نہیں جس کے مطابق وہ سب مذاہب کی تحقیقات کریں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً تمام اہل مذاہب اپنے سوا دیگر سب مذاہب و ادیان کو غلطیوں اور نقائص کا نشیمن یقین کرتے ہیں اور اپنے دین کو بے عیب سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اپنے سوا باقی مذاہب کو مردہ بتاتے ہیں اور اپنے دین و آئین کو زندہ اور ابدی ٹھہراتے ہیں۔

حالانکہ اصول یہ ہونا چاہئے کہ اگر ہم اصل کتاب آسمانی کو معیار قرار دیتے ہیں تو دوسروں کو بھی اس کا حق دینا چاہئے اور اگر اپنی روایات سے استناد کرتے ہیں تو دوسروں کی روایات کو بھی نہیں ٹھکرانا چاہئے۔ اگر اپنے علمار سلف یا خلف کو مستند مانتے ہیں تو دوسروں کو بھی اس حق سے محروم نہ کرنا چاہئے۔ یا اگر دوسروں کی روایات و رسوم کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں تو اپنی روایات و رسوم سے بھی آنکھیں نہیں موند لینا چاہئے مگر افسوس ایسا نہیں ہوتا اور ہمیشہ غلط مبحث کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے نقائص کی اصلاح نہیں ہوتی اور دوسروں کے محاسن نظر نہیں آتے۔

اہل بہا کا اعتقاد یہ ہے کہ ہر قوم ہر ملت اور ہر قانون کے لئے ایک وقت ہوتا ہے تغییر و تبدیل فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ نوع بشر ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتی اور اس کی احتیاجات بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے قوانین جو اپنے وقت میں مناسب اور حق بجانب تھے ان میں تغیر کی حتمی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اگر لفظاً اس حقیقت کا اقرار نہ کیا جائے تو لوگ نئی نئی تعبیروں کے ذریعے پرانے قوانین کو نئے ضروریات کے مطابق بنانے کی متواتر کوششوں سے قانون جدید کی ضرورت کا عملی اعلان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسی کوششیں پراگندہ ملتوں کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کی بجائے پہلے سے زیادہ اختلاف و انشقاق کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے اہل بہا اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں کہ ہمیشہ سے خدا تعالےٰ کا یہ طریق ہے کہ انقلاب زمانہ اور تغیر حالات کے بعد وہ ایک آسمانی کتاب کے بعد دوسری الٰہی کتاب نازل فرماتا ہے۔ جو آیندہ سینکڑوں سال کے لئے آنے والی نسلوں کی روحانی۔ اخلاقی۔ وجدانی اور سیاسی اور معاشرتی رہنمائی کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے مثلاً تورات شریف کے بعد انجیل جلیل اور انجیل جلیل کے بعد قرآن مجید وقس علی ہذا۔

ہر صاحب بصیرت اگر انصاف سے دیکھے گا تو اس کو نظر آئیگا کہ یہی قانون الٰہی حق ہے۔ اور قابل پذیرائی لیکن

اگر کسی ایک جگہ بیٹھ جائیں اور آگے بڑھنے سے انکار کردیں اور اپنی خرابیوں کے باوجود نئے پیام آسمانی سے استغنا ظاہر کریں تو اپنے سے پہلی ملتوں سے کس دلیل کے ساتھ اپنی ضرورت وصداقت منوا سکتے ہیں

یہ سچ ہے کہ بیک وقت کوئی قوم رفعت کی چوٹیوں سے مذلت کے غاروں میں فوراً نہیں گر جاتی بلکہ بتدریج اقوام کی حالت میں تغیر آتا ہے۔ بچہ کو دیکھ لیجئے ایک ہی دن میں رشد وبلوغ کی حد کو نہیں پہنچ جاتا نہ کوئی جوان آن کی آن میں بوڑھا ہوجاتا ہے اس تغیر حال اور انقلاب سے کوئی چیز کوئی قوم اور کوئی مذہب و دین مستثنیٰ نہیں اگر کوئی قوم انفرادی یا جماعتی یا اندرونی جزوی مصلحین کی وجہ سے اپنے آپ کو زندہ قوم اور ہمیشہ رہنے والی ملت کہنے کا حق رکھتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری اقوام کی اسی قسم کی مساعی سے آنکھ بند کرلی جائے۔ اگر ایک قوم میں اچھے مفسّر، عمدہ مصنف، اعلیٰ شاعر، ماہر سیاست دان اور قوم کے سچے بہی خواہ پیدا ہوتے ہیں یا ہو گئے ہیں تو دوسری قومیں بھی اچھے مفسروں، عمدہ مصنفوں، اعلیٰ شاعروں بلند پایہ فلسفیوں۔ بے مثال موجدوں بہترین سیاست دانوں اور قوم وملت کے مخلص بہی خواہوں سے خالی نہیں۔

معلوم ہوا کہ مذہبی زندگی روحانی بیداری، دینی حیات جو انبیا اور مظاہر الٰہی کے ذریعہ سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے اس سے اس قسم کی اصلاحی مساعی کو جو مذاہب وادیان کے اندر بلا استثنا احدے ہوتی رہتی ہیں، کوئی نسبت نہیں اگر شب یلدا کی ظلمتوں میں ٹمٹمانے والے جگنو کو مہر نیمروزا ور موت کے بے رحم چنگل میں آئے ہوئے سنبھالے لینے والے بیمار کو مردمیدان اور شہسوار کہا جاسکتا ہے تو مصلحین آسمانی کی زندگی بخش دعوتِ عام کے مقابلہ میں ایسی اصلاحات اور مساعی کو بھی جو ہرزمانہ اور ہر قوم میں ہوتی ہی رہتی ہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اہل بہا کا اعتقاد ہے کہ سینکڑوں سال مثلاً ہزار سال یا اس سے کم وبیش مدت کے بعد نوع بشر میں ایک ایسا عظیم الشان انسان پیدا ہوتا ہے۔ جو نئی کتاب، نیا پیغام، نئی زندگی دنیا کے لئے لاتا ہے اسکی صداقت کی سب سے بڑی دلیل خود اس کا وجود اور اس کا پیغام اور اس کا نفوذ ہوتا ہے۔

چنانچہ اہل بہا کہتے ہیں کہ حضرت بہا اللہ مذہبی اصطلاح کے مطابق صرف موعود اسلام ہی نہیں بلکہ موعود جمیع ادیان اور مربی عالم ہیں اور آپ کا لایا ہوا پیغام رحمانی واقعی ان تمام امراض کا علاج یقینی اپنے اندر رکھتا ہے جو نوع بشر کو ہلاکت کی طرف لئے جارہے ہیں۔ اگر دین ومذہب کی اصلاحات سے قطع نظر کرکے بھی دیکھا جائے تو آپ کی تعلیمات میں وہ ہدایات اتم واکمل واجل طور پر موجود ہیں۔ جن کے لئے تمام عالم میں تلاش وجستجو کا دانستہ یا نادانستہ جذبہ اس وقت انتہائی حد تک پہنچا ہوا ہے۔

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

سیّد الشہدا حُسین ابنِ علیؓ

اس نئی بحر میں ایک نظم "سمندر کی موج" کے عنوان سے گزشتہ مہینے کے پرچہ میں شائع ہو چکی ہے۔

کانوں میں گونجتا ہے اب تک کہا تیرا
آنکھوں کے سامنے ہے اب تک کیا تیرا

باطل کے آگے تیری گردن نہ جُھک سکی
سر ہی حق کے لئے تھا تن سے جدا تیرا

اک زندگی ذلّت تھی اور مقصد دشمن کا
اک زندگی عزت تھی اور مدعا تیرا

اک زندگی فانی تھی اور مرجع دشمن کا
اک زندگی باقی تھی اور منتہا تیرا

قاتل سفّاک تیرے محشر میں حیراں ہیں
دونوں جہاں کی دولت ہے خونبہا تیرا

دشمن کا ظلم اور دشمن دونوں فنا ہوئے
اب بھی ہے کربلا میں جھنڈا گڑا تیرا

زندہ تری عظمت ہے، زندہ تری ہمّت
زندہ تری مظلومی، زندہ خدا تیرا

حامد علی خاں

قربانی

ایثار کا ایک فقید النظیر پہلو

(۱)

گاؤں کی آخری حد پر پرانے پیپل کے سائے تلے ضعیف العمر ہیرا لال کا جھونپڑا اس کی پر آلام زندگی میں تیسری مرتبہ پھر یاس و حسرت اور غم و اندوہ کی تصویر بن رہا ہے اُسے اپنے گزشتہ دنوں میں ایک وقت بھی ایسا یاد نہیں جب کہ تنگ دستی اور بے مائگی نے اس کا ساتھ چھوڑا ہو۔

آج سے پہلے مدت ہوئی اس کے دو بیٹے یکے بعد دیگرے اُسے اور اسکی بدنصیب بیوی رادھا کو داغ جدائی دے چکے ہیں ہیرا لال کا دل فطرۃً دنیوی مصائب سے بہت زیادہ متاثر ہونے کا خوگر ہے اسی لئے اپنی زندگی کی تمام ناکامیاں ہر وقت اس کے پیش نظر رہتی ہیں۔ اُس نے بیٹوں کی موت کے بعد روتے روتے دنیا کی سب سے بڑی نعمت یعنی آنکھوں کی بینائی بھی کھو دی ہے اور اس کی وفا شعار بی بی صابر و شاکر ہونے کے باوجود اپنی عمر سے کئی سال پہلے بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکی ہے۔

آج اُن کی آخری عمر کا سہارا اُن کا اکلوتا بیٹا موہن سخت بخار کی حالت میں بستر مرگ پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ رادھا نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ اُسے پرورش کیا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں موہن نے اپنے گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان کھولی تھی اور یہ پر مسرت دن غریب والدین کے لئے ایک یادگار دن تھا۔

وہ سمجھتے تھے کہ عمر بھر کی سیاہ بختی کو ہمارے پیارے بیٹے کی خوش نصیبی ہمیشہ کے لئے مٹا دے گی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ قسمت میں ابھی کیا کیا لکھا ہے۔

رادھا کے دل میں جس قدر ارمان موہن کی شادی کا تھا اس سے بڑھ کر کوئی خواہش اُس کے دل میں نہ تھی جب وہ موہن کے ننھے ننھے بچوں کو گود میں لینے اور پیار کرنے کا تصوّر باندھتی تو مسرت کے انتہائی جوش سے اس کا ناتوان جسم کانپ اُٹھتا بیس سال کی عمر میں موہن کی شادی ہوئی۔ لیکن بیچاری بڑھیا رادھا کو بیٹے کی شادی کے دنوں میں بھی حقیقی راحت نصیب

نہ ہوسکی اُس کے غمزدہ دل کو ہر لمحہ کسی نامعلوم خطرے اور کسی نئی افتاد کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس کے پہلے دونوں بیٹے تقریباً اسی عمر میں پہنچ کر انتقال کر گئے تھے۔ اُن کی حسرتناک موت کا نقشہ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ پھر اُسے موہن کا خیال آتا اور وہ بے اختیار چیخ اُٹھتی۔

بالآخر وہی ہُوا۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی موہن بیمار ہوگیا دو ماہ اسی طرح گذر گئے اور تیسرا شروع ہُوا لیکن اس کا بخار ایک منٹ کے لئے بھی نہ اترا بد قسمت والدین کے دو بیٹے پہلے بھی اسی طرح بیمار رہ چکے تھے اور اس وقت بھی وہ یوں ہی فاقے کھینچا کرتے تھے اور شاید اُن کے رنج والم کا اندازہ ناممکن تھا لیکن اس کے باوجود اُنکے لئے دنیا میں کچھ امید باقی تھی مگر اب کچھ بھی نہ تھا۔

تمام عمر کی مسرتیں اور ارمان ملیامیٹ ہو چکے تھے۔ اور اُن کی جگہ حسرت و مایوسی نے لے لی تھی۔

(۲)

رادھا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مٹی کا کونڈا زمین پر رکھا اور آہ بھر کے بولی، بہو! وہ باقی ماندہ دوائی بھی لے آ جو آخری دن ویدجی نے دی تھی۔ پھر اُس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا "میرے بچے میرے لال تجھے شادی راس نہ آئی۔ مجھ ابھاگن کی قسمت ایسی کہاں تھی کہ تیری شادی کا دن دیکھتی۔ ضرور میں نے اتنی بڑی خوشی دیکھ کر دیوتاؤں کو ناراض کردیا۔ ہائے تیری سب بلائیں مجھ پر پڑ جائیں اور میرے بچے تو پھر پہلے کی طرح تندرست ہوکر اس اجڑے ہوئے گھر کو آباد کرے"

ایک دبلی پتلی لڑکی جس کے پر ملال چہرے سے اس کے اندرونی کرب کی تمام کیفیتیں ظاہر ہو رہی تھیں سامنے آئی اُس نے چند کھلی ہوئی پڑیاں رادھا کے ہاتھ میں رکھیں اور رکتی ہوئی آواز میں بولی "اماں اب یہ دوائیں کیا ہونگی سارے دانا اور خود ویدجی بھی جواب دے چکے"۔ . . . . اسکی آواز گلے میں پھنس گئی اور لمبی لمبی پلکیں آنسوؤں کے سیلاب میں تر ہوگئیں۔ لیکن اُس نے جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہوکر اپنے آنسو چھپا لئے۔

رادھا نے دوائی کو کونڈے میں ڈالتے ہوئے ذرا خشک لہجے میں جواب دیا "بیٹی ماں کی ممتا کس طرح اتنی جلدی آس توڑ دے"۔

بھولی بھالی دلہن نے ساس کے پژمردہ چہرے پر بے بسی کی ایک نگاہ ڈالی اور لڑکھڑاتی ہوئی اپنے بیمار شوہر کی چارپائی کے قریب پہنچی۔ شاید وہ اپنی ہی بدبختی کو اس جان فرسا سانحے کی وجہ قرار دے رہی تھی۔ رنج والم اور فاقہ کشی سے اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی اُس نے چہرے پر گھونگٹ کھینچ لیا اور پائنتی کی طرف بیٹھ کر آہستہ آہستہ مریض کے پاؤں دبانے لگی۔

سامنے بدبخت ہیرالال ہاتھ میں مالا لئے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہا تھا اور اس کی بے نور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا اور بولا "دیو کی بیٹی کیا تُو یہاں قریب ہے"! دلہن گھبرا کر چارپائی سے نیچے اتری اور قریب جا کر کہا "پتاجی میں حاضر ہُوں" ہیرالال نے بیٹھنے کو کہا۔ دیوکی نے گھونگھٹ اچھی طرح سے درست کیا اور ادب کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔

ہیرالال نے کہا بیٹی تو جانتی ہے، موہن کی زندگانی کی اب کچھ امید باقی نہیں۔ دیوکی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ ہیرالال نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ پرمیشر نہ دکھائے اگر وہ ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چل دیا تو بیٹی تو ابھی نادان ہے شاید تجھے معلوم نہیں کہ ہم پر کیسی تباہی آئے گی اور خاص کر میری بدنصیب بچی تو ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائیگی۔ تیرا دل ابھی گنگا کے پانی کی طرح پوتر ہے تو سچے دل کے ساتھ دیوتاؤں سے اس کی زندگانی کی دعا مانگ شاید وہ پرماتما سے تیری سفارش کریں۔

دیوکی نے رک کر کہا "پتاجی بھلا دعا کیوں نہ کروں گی"!

ہیرالال نے کہا ہاں بچی سچے دل سے دعا مانگ تیرا دل بے لوث ہے اور سن اگر اس نے تیرا کوئی گناہ کیا ہے تو اُسے بخش دے اور اسکی بخشش کیلئے دعائیں مانگ، پرماتما تم سے خوش ہونگے۔

دیوکی نے کانپتی ہوئی آواز سے جواب دیا۔ پتاجی آپ مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں میں تو خود ہی بہت بڑی گنہگار ہوں

ہیرالال نے کہا بیٹی شاباش میری باتوں پر دھیان رکھنا اور اب اجازت ہے جا۔ دیوکی پھر آ کر وہیں بیٹھ گئی اور پاؤں دباتے ہوئے اپنے دل سے کہنے لگی۔ پتاجی کی باتیں میرے دل کی باتوں سے کس قدر دور ہیں۔ انہیں میرے دل کا بالکل اندازہ نہیں لیکن وہ مجبور ہیں ان کے سامنے واقعی میں ایک نادان بچی ہُوں۔ لیکن آہ پرماتما کے سوائے میری حالت کوئی نہیں جان سکتا۔

دیوکی انہیں خیالات میں محو تھی کہ موہن زور سے کراہا۔ وہ بیتاب ہو گئی اور روتے ہوئے کہا تم کہاں جا رہے ہو اور مجھے کہاں چھوڑے جاتے ہو۔ اپنی بیماری مجھ بدبخت کو دے ڈالو اور اچھے ہو جاؤ۔ موہن نے اپنی کمزور انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ اس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ دیوکی نے چہرے سے گھونگٹ اٹھا کر دیکھا تو موہن کی بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ لیکن اُس نے جلد ہی پھر اپنا منہ آنچل میں چھپا لیا۔ رادھا ہاتھ میں دوا کا کٹورا لئے ہوئے آئی اور موہن سے مخاطب ہو کر بولی۔ میرے لال دوا پی لے۔

موہن نے سر کی جنبش سے انکار کیا اور اس کی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو نکل کر رادھا کے سرد ہاتھوں پر گرے۔

رادھا نے روتے ہوئے کہا۔ میرے بچے دوا پی لے تو اچھا ہو جائیگا۔ پھر دیوکی سے مخاطب ہوئی۔ "بہو تو یہاں سے اُٹھ جا تجھے دیکھ دیکھ کر اس کو تکلیف اور بھی بڑھتی ہے۔ دیوکی فرمانبرداری سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور چھپر کے نیچے پیال کے فرش پر جا کر اپنے آپ کو گرا دیا۔ موہن نے اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ بول سکا۔

ہیرالال لکڑی کے سہارے آہستہ آہستہ بیمار موہن کی چارپائی کے قریب پہنچا۔ رادھا نے ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ اس نے ذرا آواز دھیمی کر کے بیوی سے کہا۔ بہو کا جو ایک آدھ زیور تھا وہ بھی بک گیا۔ اگر کچھ پاس ہوتا تو شہر سے بڑے ڈاکٹر کو لے آتے۔ رادھا نے موہن کی جانب سے منہ پھیر کر کہا "اب بڑا ڈاکٹر آ کر کیا کرے گا۔ جو دنیا کی دوا تھی میں اپنے بیٹے کو پلا چکی۔ کئی ویدوں حکیموں نے دیکھا لیکن مرض کوئی بھی معلوم نہ کر سکا۔ کوئی مرض ہو تو پتا بھی لگے۔ اپنی شامت اعمال ہے۔ نہ جانے کون سے جنم میں کوئی گناہ ہو گیا جس سے مقدس دیوتا ناراض ہو گئے۔ پھر ذرا سوچ کر بولی ابھی کانتی کی ماں باتیں کر رہی تھی کہ یہاں سے اُتر کی جانب پہاڑی پر ایک جوگی جی کہیں سے آئے ہیں۔ جو جو مراد کوئی مانگے اُسے مل جاتی ہے اور کچھ نجوم کا علم بھی جانتے ہیں۔ اس وقت سے میرا جی تڑپ رہا ہے کہ اڑ کر وہاں پہنچوں اور جوگی جی کو ساتھ لے آؤں سنا ہے کہ وہ بیماروں کو بھی دیکھتے ہیں۔ اور خاص کر غریب لوگوں کو بہت چاہتے ہیں۔ ہیرالال نے بے صبری سے کہا تو پھر دیر کیوں کرتی ہو چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہُوں۔ بیوی نے کہا تم بہت کمزور ہو رہے ہو ایک غم ہے دوسرے فاقہ کیسے چل سکو گے۔ اس نے کہا موہن کے لئے میں چل سکتا ہُوں اگر میری ناچیز جان اس پر فدا ہو جائے اور وہ بچ جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے

رادھا نے کہا آہ اگر ایسا ہو سکتا تو اس کی تکلیفوں کے بدلے میں کبھی سے اپنی جان حاضر کر چکی ہوتی۔ پھر اس نے آواز دے کر دیوکی کو بلایا اور کہا بہو موہن کا اچھی طرح خیال رکھنا۔ اور اس سے زیادہ بات چیت نہ کرنا بڑی تکلیف میں ہے۔ ہم اس کے لئے جوگی جی کو لینے جا رہے ہیں۔ میری بہو غافل مت ہو جانا۔ دیوکی نے کہا نہیں اماں میں بڑا خیال رکھوں گی۔ دونوں میاں بیوی چل دیئے۔ دیوکی تکیہ پر بیٹھ گئی اور اپنے آنچل سے موہن کے چہرے کو ہوا دینے لگی۔

(۳)

چمپا نے شام کی سیر کو باہر جاتے ہوئے شوہر سے کہا اگر ذرا دیر ٹھہرو تو میں چندر کو بھی ساتھ لے لوں اُسے یہاں اکیلے چھوڑتے ہوئے وہم آتا ہے۔

سیتا رام نے ہنس کر جواب دیا "معلوم نہیں تمہارے دل میں کتنے وہم بھرے پڑے ہیں اور ان توہمات کی وجہ سے کبھی تمہارے دل کو چین بھی نصیب ہوا ہے یا نہیں۔ ابھی اس روز تم کہہ رہی تھیں کہ میں اب کبھی شام کو اُسے باہر نہیں جانے دونگی

ڈر جاتا ہے۔ آخر آج بھی تو ہمیں آتے آتے شام ہو جائیگی۔

چمپا۔ کیا کہوں گزشتہ رات میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا۔ اس وقت سے میرا دل بے چین ہے بار بار وہم اُٹھتا ہے کہ میں نے ایسا خواب کیوں دیکھا۔

سیتا رام: (مسکراتے ہوئے) بھلا میں بھی تو سنوں کیسا خواب ہے۔ ہر روز تم کوئی نہ کوئی خواب دیکھ لیتی ہو۔

چمپا۔ (دبی آواز میں) میں نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر سویا پڑا ہے اور میرے دیکھتے دیکھتے بالکل چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ بالکل دو ماہ کے ننھے بچے کے برابر۔

سیتا رام۔ اوہ یہ بھی کوئی بُرا خواب ہے۔ تم نے اسکے کسی ننھے بھائی کو دیکھا ہوگا۔

چمپا۔ تمہارے دل میں شاید یہ بات ہوگی۔ مجھے تو کسی بچے کا خواب و خیال بھی نہ تھا اور میں نے ایسے عجیب طریقے سے یہ خواب دیکھا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔

سیتا رام (مذاق کے لہجے میں) سب ماؤں کو اپنے بچوں سے محبت ہوا کرتی تھی لیکن ایسی انوکھی محبت کہیں نہ دیکھی تھی کہ سوتے جاگتے کبھی دل کو اطمینان ہی نصیب نہ ہو۔

چمپا۔ تم مرد ہو اس لئے تمہیں ماں کی محبت کا اندازہ نہیں لیکن یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ اُسکے سر میں درد تک بھی ہو جائے تو تم کھانا پینا سونا سب حرام کر لیتے ہو۔

سیتارام۔ واہ میں تو کسی بات پر فکر کرتا ہوں میں نے یوں پر کا کوا تو کبھی نہیں بنایا۔

چمپا۔ دراصل چندر بچہ ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اپنے تو الگ رہے بیگانے بھی اُسے بہت چاہتے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے دو برس اور دو ماہ لیکن ایسی پتے کی باتیں کرتا ہے کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں کل رات اس نے پرماتما اور دیوتاؤں کے متعلق ایسے ایسے سوال کئے کہ میری عقل دنگ رہ گئی۔

سیتارام کیوں نہ ہو بچہ کس ماں کا ہے۔ ماں بھی تو بعض وقت ایسی ہی باتیں کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔

چمپا۔ توبہ کرو۔ مجھ گنہگار کا دل ایسا پاکیزہ اور معصوم کہاں۔

اتنے میں چندر دوڑتا ہوا آیا اور سیتارام کی ٹانگوں سے آ کر لپٹ گیا۔ اس کا خوبصورت چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل رہا تھا۔

سیتارام (پیار کر کے) چندر تم بھی سیر کو چلوگے

چندر۔ نہیں میں نہ جاؤں گا۔ اماں نے مجھے بتایا تھا کہ اچھے بچے شام کو جنگل میں نہیں جاتے۔ میں کل بڑے باغ میں اتنا

کے ساتھ جاؤں گا اور جب اماں گھر آئیں گی تو مجھے رامچندر جی کی کتھا سنائیں گی۔

چمپا۔(خوش ہوکر) دیکھا میرا بچہ کیسا فرماں بردار ہے

انا نے چندر کو گود میں اٹھا لیا۔ چمپا اور سیتارام اکیلے روانہ ہوگئے۔ گھر سے باہر نکل کر چمپا نے کہا اگر میری بات مانو تو ہیرالال کے بیٹے کی خبر بھی لیتے چلو۔ غریبوں کے بڑھاپے کا یہ ایک ہی سہارا تھا وہ بھی اب اس قدر بیمار ہے کہ وید نے اس کی زندگی سے ناامیدی ظاہر کردی ہے۔

سیتارام۔(چونک کر) کیا واقعی۔

چمپا۔ اور نہیں تو کیا اتنے بڑے گاؤں کے مالک ہوکر ہمیں چاہئے کہ ہر شخص کی خبر رکھیں۔ اسی لئے میں کئی بار انا کو بھیج بھیج کر اس کی خبر منگا چکی ہوں۔ پہلے ہی میرا دل ڈر رہا ہے۔ جب سے میں نے سنا ہے کہ وہ غریب بوڑھی درگا ہمارے قریب ہی فاقوں مرگئی لیکن ہمیں خبر بھی نہ ہوئی۔ معلوم نہیں پرماتما کس قدر سزا دیں مجھے بڑا ہی رحم آتا ہے بوڑھے والدین کی کیا حالت ہوگی۔ لڑکا شادی کے چند دن بعد ہی تو بیمار پڑگیا۔ بیچاری دلہن بھی کیسی بدنصیب ہے۔ میں تو کئی بار اُن کی حالتِ زار انا کی زبانی سن کر رو چکی ہوں۔ کیسا نیک اور حیادار لڑکا تھا۔ جب میں ماں باپ کی محبت کا اندازہ لگاتی ہوں تو فوراً اپنا چندر یاد آجاتا ہے۔

سیتارام۔ اوہو پھر تو ہمیں ضرور جانا چاہئے۔ بیچارہ ہیرالال بڑا ہی بدقسمت ہے تمام عمر سے رنج و غم اُٹھا رہا ہے

چمپا۔ جتنی مدت مجھے یہاں آئے ہوئے گزری ہے اس میں ایک دن بھی میں نے اُن کی نسبت کوئی خوشی کی بات نہیں سُنی پہلے تو وہ دونو خود ہی ہر وقت کسی نہ کسی بیماری یا بلا میں مبتلا رہتے تھے۔ اب معلوم نہیں بیچاروں نے کتنے ارمان کے ساتھ بیٹے کی شادی کی تھی لیکن وہ خوشی بھی ہضم نہ ہوسکی۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہیرالال کے بوسیدہ مکان میں داخل ہوئے جب وہ صحن میں پہنچے تو اُن کے آگے آگے ہیرالال اس کی بیوی اور ایک بُوڑھا جوگی داخل ہوئے۔

رادھا اور دیوکی نے انہیں آتے ہوئے دیکھا اور چند سیکنڈ کے لئے اُن کے افسردہ چہروں پر شگفتگی پیدا ہوگئی۔ رادھا نے آہستہ سے ہیرالال کو آگاہ کیا اور وہ تینوں تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہوگئے۔ بالکل ان کی امید کے خلاف معزز رئیس اور اس کی جلیل القدر بیوی نے آکر انہیں عزت بخشی تھی وہ ایک لحظہ کے لئے اپنا تمام رنج و فکر بھول گئے

لیکن کسی فوری احساس سے بہت جلد رادھا کا چہرہ متفکر ہوگیا اُس نے بے تابانہ ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ذی مرتبہ مہمانوں کے بیٹھنے کو بھی اُس کے پاس کوئی مناسب جگہ نہ تھی۔ کچھ سوچ کر اُس نے لکڑی کے شکستہ تخت پر اپنی چادر بچھا دی۔

اور وہ بیٹھ گئے۔ رادھا نے ہاتھ باندھ کر چمپا کا شکریہ ادا کیا اور کہا بائی جی آپکی آتما ہر روز آیا کرتی ہے اور آپنے ہم غریبوں کو حد سے بڑھ کر ممنون کیا ہے۔ یہ غریب خانہ آپ کے مبارک قدموں کے قابل کہاں تھا ہم لوگ اس قدر خستہ حال ہو چکے ہیں۔ کہ جو لوگ آپکے ادنیٰ خادموں کے برابر بھی نہیں وہ بھی ہمارے گھر میں آنا تو الگ ہماری خبر تک پوچھنا بھی اپنی اہانت سمجھتے ہیں۔

چمپا نے مناسب الفاظ میں جواب دیا اور پھر موہن کی کیفیت مزاج دریافت کرنے لگی جوگی نے بیمار کو دیکھ کر سر پکڑ لیا اور کچھ سوچ کر بولا " بدنصیب ماتا اور پتا! تم سے کوئی بڑا بھاری گناہ سرزد ہو چکا ہے۔ شاید اس جنم میں یا کسی اگلے جنم میں دیوتا انسان کی سنگدلی سے سخت ناراض ہیں۔

دونوں میاں بیوی یک لخت بول اُٹھے۔ جوگی جی! کوئی تدبیر باقی ہے یا نہیں۔ جوگی نے کہا ہاں تدبیر ہے لیکن اب تمہارے بس کی نہیں۔ پھر اُس نے دھیمی آواز میں کہا " اگر دنیا میں کوئی ماں باپ اس قدر بڑا دل رکھتے ہوں کہ اپنے معصوم بچے کو جو گناہوں کی کثافت سے پاک ہو، دیوتاؤں کی نذر کر دیں یعنی سچے دل سے اقرار کریں کہ تمہارا بیٹا بچ جائے اور اس کی جگہ اُن کا معصوم بچہ لے لے۔ تو سب کام سدھ ہو سکتے ہیں ورنہ کچھ نہیں گھر والوں پر سناٹا چھا رہا تھا۔

جوگی خاموش ہو گیا اور بے اختیار چمپا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اُسے اپنا چندریا آگیا تھا اُس نے ریشمی ساڑھی کے آنچل سے اپنا منہ چھپا لیا۔

جوگی چل کھڑا ہوا اور سب کی نظر بچا کر اس کے پیچھے پیچھے حرمان نصیب دیوکی بھی چلی۔ دروازے میں پہنچ کر وہ جوگی کے قدموں میں گر گئی اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ جوگی جی کیا کوئی نوجوان لڑکی دیوتاؤں کی نذر نہیں ہو سکتی جوگی نے کہا نہیں بیٹی بہت ہی بے لوث دل والا بچہ اور تیرے شوہر سے بالکل بیگانہ چاہیئے اس کے سوائے کوئی نہیں۔

جوگی چلا گیا۔ اور شکستہ دل دیوکی آہستہ قدموں سے لوٹ آئی۔ راستے میں اُس نے چمپا اور سیتارام کو جاتے ہوئے دیکھا اور اپنی سیاہ بختی سے اُن کی خوش قسمتی کا مقابلہ کرنے لگی

اس کا خسر اور ساس رو رہے تھے۔ وہ بھی زمین پر بیٹھ کر اُن کے رونے میں شریک ہو گئی۔

(۴)

سیتارام۔ (ندی کی طرف جاتے ہوئے) چمپا تم بالکل خاموش اور افسردہ نظر آرہی ہو۔ حالانکہ ایک غریب شخص کے ساتھ ہمدردی کر کے تمہیں مسرور ہونا چاہیئے تھا۔ شاید ان سیدھے سادھے لوگوں نے پوری طرح تمہاری عزت و تکریم نہیں کی یہ تمہیں چاہیئے تھا کہ صرف مجھے بھیج دیتیں اور خود نہ جاتیں۔ میں خود بھی ایک غریب آدمی ہوں اور خصوصاً گاؤں میں رہ کر

ان باتوں کا متحمل ہو گیا ہوں لیکن تم ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو جو عزت و شہرت میں یکتائے روزگار ہے۔

چمپا۔(خشک ہنسی ہنس کر) اس وقت تمہارے جذبات میرے خیالات سے کس قدر مختلف ہیں جو کچھ میں سوچ رہی ہوں شاید تم سُن کر چونک اُٹھو۔

سیتارام (گھبرا کر) چمپا جو کچھ تمہارے دل میں ہے جلدی کہہ ڈالو۔ اور مجھے پریشان نہ کرو

سیتارام چمپا کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔

چمپا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیوں نہ میں ہی اپنے بچے کو دیوتاؤں کی نذر کر کے ان تباہ حال لوگوں کو بچا لوں۔ یہ کہتے ہُوئے اس کی چیخیں نکل گئیں۔

سیتارام۔ چمپا اس قدر ایثار کسی انسان کے دل سے ناممکن ہے۔ یہ صرف دیوتاؤں کا کام ہے۔

چمپا۔ لیکن میں تو فیصلہ کر چکی، اور اب صرف تم سے اجازت کی خواہاں ہُوں۔ کیا آج اس طبعی شرافت کشادہ دلی اور فیاضی سے تم کام نہ لوگے جس سے ہمیشہ تم میری ہر خواہش کو بجا لاتے رہے ہو

سیتارام کا سر چکرانے لگا اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ اور کہا چمپا تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہاری وہ حد سے بڑھی ہوئی محبت اور وارفتگی کہاں گئی۔ کیا تم چندر کے بغیر زندہ رہ سکو گی؟

چمپا۔ ہاں واقعی میں مر جاؤں گی، یا مرنے سے بھی بدتر ہو کر زندہ رہوں گی۔ لیکن اپنے پہلو میں ایک گوشت اور خون کا دل رکھتے ہوئے کس طرح چار انسانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے تباہ ہوتا دیکھوں۔

سیتارام (مری ہوئی آواز میں) اور بیچارے چندر کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھ سکتی ہو۔

چمپا۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تباہ تو خود میں ہو جاؤں گی۔ چندر کو ابھی اس ناپاک دنیا سے کوئی خاص دلبستگی پیدا نہیں ہوئی وہ مقدس دیوتاؤں کے پاس پہنچ کر یقیناً یہاں سے زیادہ خوش رہے گا۔ اور کیا ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام عمر ہمارے ساتھ رہے گا۔ ہرگز نہیں اگر پرماتما چاہیں تو آج اُسے اپنے پاس بلا لیں اور ہم یونہی ہاتھ ملتے رہ جائیں

سیتارام۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہ چندر کے بعد تمہاری زندگی کس قدر رنج و الم میں کٹے گی۔

چمپا۔ میں ہر طرح سوچ چکی ہُوں اب صرف تمہاری اجازت درکار ہے۔ چندر کے بعد جیسی چاہے میری زندگی بسر ہو لیکن اگر یہ غریب لڑکا مر گیا تو یاد رکھو کہ پھر بھی میرا دل ہمیشہ کے لئے گناہ کے بار تلے دب جائیگا۔ قدرت نے ہمارے ہاتھ میں ایک علاج دے رکھا ہے اگر ہم نے باوجود سب کچھ سمجھنے کے بخل سے کام لیا تو یہ صریح گناہ ہوگا کیا تمہیں ان بوڑھے اور نادار ماں باپ پر رحم نہیں آتا جن کے لئے اپنے بیٹے کی موت کے بعد عرصۂ دنیا تنگ ہو جائیگا۔ ہمارے

لئے ابھی دنیا میں بہت سی امیدیں باقی ہیں۔ لیکن وہ دونوں کس قدر سیاہ بخت ہیں جن کی تیرہ وتار زندگی کا چراغ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لئے بجھ رہا ہے اور رونے کے سوائے اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ خود موہن کو دیکھو۔ جب اپنی دلہن کا افسردہ چہرہ دیکھتا ہے اور اس کی جگرخراش آہیں اور اپنے ماں باپ کی چیخ پکار سنتا ہے تو اس بےبسی کی حالت میں دنیا سے جاتے ہوئے اس کے دل کی کیا حالت ہوگی۔

اور اس غریب دلہن کی بدنصیبی پر غور کرو جو مدت العمر کے لئے برباد ہورہی ہے۔ تمہیں شاید یاد ہوگا کہ اپنی شادی کے بعد ایک دفعہ تم بھی بیمار ہوگئے تھے۔ خدانخواستہ حالت اتنی خطرناک نہ تھی۔ لیکن میرے دل کا جو حال تھا وہ مجھی کو معلوم ہے۔ بس وہی حالت بلکہ اس سے ہزار درجہ زیادہ اس لڑکی کے زخمی دل کی ہوگی تم نے شاید نہیں دیکھا لیکن میں نے جس درد وکرب کی حالت میں اُسے جوگی جی کے پاؤں پر گرتے دیکھا ہے اُسے دیکھ کر میرے دل میں ایک دھچکا سا لگ گیا ہے۔

سیتارام (آنسو پونچھ کر) چمپا بلاشبہ تمہاری پاک ہستی ایک سراپا گناہ انسانی ہستی سے بالاتر ہے۔ شاید تم کوئی دیبی ہو جس نے انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوکر میرے سیاہ خانے کو منور کیا ہے۔

چمپا۔ یہ صرف تمہارے دردمند دل کا حسن ظن ہے ورنہ کوئی نہیں جان سکتا کہ میں ناچیز اپنے گناہوں سے کس قدر شرمسار ہوں اور میری حقیر ہستی کسی قابل نہیں۔

سیتارام۔ میں تمہیں بارہا آزما چکا ہوں اور تمہارے نیک کاموں میں رخنہ اندازی کرکے گنہگار بننا نہیں چاہتا جبکہ تم قربان کررہی ہو وہ تمہیں اپنی ذات سے اور یقیناً دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ پھر میں تمہیں کیونکر روک سکتا ہوں۔ اور اُس پر تم سے بڑھ کر میرا کیا حق ہوسکتا ہے

چمپا سیتارام کے پاؤں کے قریب گرگئی اور سسکیاں بھرتے ہوئے بولی " آہ یہی اول اور یہی آخر۔ اس وقت جی بھر کے اپنے پیارے کے لئے رولو۔ پھر جب ہم اُسے مقدس دیوتاؤں کی نذر کرچکیں گے اس وقت رونا یا واویلا کرنا پاپ ہو جائیگا۔ اپنے ہاتھوں سے کوئی چیز دے کر پھر اس کے لئے افسوس کرنا دھرم میں داخل نہیں۔" سیتارام بھی رو رہے تھے کچھ عرصہ یہی حالت رہی اس کے بعد چمپا نے آنسو پونچھ لئے اور ندی کے کنارے دوزانو ہوکر انتہائی خلوص کے ساتھ چند الفاظ آہستہ آہستہ منہ میں کہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ندی پر ایک آخری نگاہ ڈالی اُسے خیال آیا کہ شاید پھر وہ کبھی اسے نہ دیکھ سکے گی۔ ندی کا تمام پانی اُسے ایک بہتا ہوا آنسو معلوم ہوا۔ خود اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کررہی تھی جو ایک بہت بڑے

فرض سے سبکدوش ہوکرانسان پر طاری ہوجاتی ہے۔

وہ چلی گئی اور ندی کا پانی اسی اپنی پہلی سالہا سال کی پرانی روش پر بہتا چلا گیا اُسے کیا معلوم تھا کہ ایک کنول جیسے چہرے والی لڑکی اپنی زندگی کی عزیز ترین شے اس کے کنارے کھو چلی ہے

(۵)

سیتارام نے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے کہا چمپا بہتر ہے کہ ہیرالال اور اس کے گھر والوں کو بھی خبر دیتے چلیں چمپا بولی ہمیں نہیں چاہئے کہ ان غریبوں کو یہ خبر سنا کر اپنا زیادہ ممنون احسان بنائیں۔ انسان دنیا میں سب سے زیادہ شرمسار شاید اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص اس کی حقیر سی خدمت پر حد سے زیادہ ممنونیت ظاہر کرے۔ سیتارام نے کہا چمپا! لیکن یہ تو سوچو کہ اس مصیبت کے وقت شاید کوئی فرد بشر اُن مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ سچی ہمدردی سے پیش نہیں آیا۔ اور انہیں اس وقت کس قدر ہمدردی کی ضرورت ہے۔ کیا تعجب ہے، کہ جوگی کی بات صحیح نہ ہو۔ اس حالت میں ان کے دل میں یہ حسرت تو نہ رہے گی کہ ایک آخری چارۂ کار نہ ہوسکا۔ جب انہیں تمہاری یہ عظیم الشان ہمدردی معلوم ہوگی تو ان کے مایوس دل کتنے خوش ہونگے۔ کیا تم انہیں خوش ہوتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتیں؟ چمپا نے کہا اچھا جو کچھ تم چاہتے ہو کرو مجھے اس سے اتفاق ہوگا۔

افق کی دھیمی دھیمی روشنی رات کی سیاہ تاریکی میں غائب ہو رہی تھی جب وہ ہیرالال کے جھونپڑے میں داخل ہوئے موہن پر بیہوشی طاری تھی اور اس کا جسم پسینہ میں شرابور تھا۔ رادھا اپنا غمگیں چہرہ موہن کے اوپر جھکائے ہوئے آنسو بہا رہی تھی۔ اور ہیرالال ایک طرف کو بیٹھا کسی غمناک خیال میں محو تھا۔ بیچاری دیو کی چھپر کے نیچے بیٹھی مٹی کا دیا جلا رہی تھی۔ مدت کے بعد موہن کو یہ پسینہ آیا تھا اور سب اسے موت کی نشانی سمجھ رہے تھے۔

سیتارام نے مختصر طور پر انہیں سب باتوں سے آگاہ کر دیا۔ ہیرالال اور رادھا ایک ساتھ اس کے قدموں پر گر گئے اور لرزتی ہوئی آواز میں بولے ہمارے رحمدل ماتا اور پتا ہم گنہگار اتنی بڑی قربانی کے لائق نہیں دلہن نے اپنے سانولے چہرے سے سرخ گھونگھٹ اٹھا کر چمپا پر ایسی نگاہ ڈالی جو معلوم نہیں سپاس و محبت کے کس قدر عمیق اور گوناگوں جذبات سے لبریز تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان بہ نکلا اور وہ ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گئی۔ چمپا کے منہ سے جواب میں ایک لفظ بھی ادا نہ ہوسکا لیکن سیتارام نے اس کے دل کی ترجمانی کی اور کہا نہیں نہیں یہ صرف ایک انسانی فرض تھا جو ہم نے ادا کر دیا۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ پھر موہن کو دیکھ کر کہا دیکھو اسے پسینہ آرہا ہے پرماتما نے چاہا تو جلد ہی اس کا بخار اتر جائیگا۔ یہ حد درجہ کمزور ہو رہا ہے اس کی غذا کا اچھی طرح سے خیال رکھنا۔ رادھا

نے کہا۔" میرے دریادل باپ! ہم غذا کہاں سے لائیں۔ روکھا ٹکڑا بھی میسّر نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی چمپا نے اپنا سنہرا ہار گلے سے اتار کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور خود تیزی کے ساتھ دروازہ سے باہر نکل گئی۔ رادھا کے پاس شکر گزاری کے لیئے الفاظ ہی کہاں تھے۔ لیکن اس فراخ حوصلگی کو دیکھ کر بے اختیار وہ مسرت کے آنسو بہانے لگی۔

(۶)

چمپا کا دم گھٹ رہا تھا جس قدر جلد ہو سکے وہ گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ گھر میں چندر کو نہیں پائے گی۔ بار بار وہ سوچتی کہ شاید میرے جانے سے پیشتر ہی وہ دیوتاؤں کے پاس پہنچ چکا ہو اور میں اُسے آخری بار گلے لگانے سے بھی محروم رہوں۔ اُسے اپنے آپ کا بھی ہوش نہ تھا۔ اور وہ بے اختیار گھر کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ سیتا رام نے کہا چمپا ہار دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں روپیہ بھجوا دیتا۔ چمپا نے جواب دیا اس ہار کے ساتھ چندر کھیلا کرتا تھا۔ اس کے بعد یہ میرے کس کام کا ہے۔ سیتا رام کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور وہ خاموش ہو گئے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چمپا نے چندر! چندر! کہہ کر کئی مرتبہ پکارا۔ انا نے کہا میاں آنگن میں سو رہے ہیں۔ چمپا کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ دوڑتی ہوئی آنگن میں پہنچی۔ چندر! چندر میرے پیارے کیا تم سو رہے ہو یہ کہہ کر اس نے سوئے ہوئے بچے کو زور کے ساتھ اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ چندر کا پنڈا بخار میں جل رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر چمپا کی طرف دیکھا۔ اور کہا اماں اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں اور مجھے بڑی پیاس لگ رہی ہے۔ چمپا کا چہرہ سفید کاغذ سے بھی زیادہ سفید ہو گیا اور اس نے زور سے چندر کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ چندر نے پانی پی کر کہا اماں چمکیلے پروں والے بچے میرے ارد گرد پھر رہے ہیں اور مجھے بلاتے ہیں چمپا نے بیتابی کے ساتھ کہا۔ کیا تم اُن کے پاس جاؤ گے۔ چندر نے کہا۔ اماں اگر تم نے اجازت دی تو میں جاؤں گا لیکن جب تم مجھے بلاؤ گی تو میں فوراً چلا آؤں گا۔ چمپا نے آہستہ سے سیتا رام کے کان میں کہا۔ اپنے بیٹے کی آخری باتیں سُن لو۔ شاید جلد ہی یہ میٹھی آواز ہمیشہ کے لیئے خاموش ہو جائیگی۔ سیتا رام کا رنگ فق تھا اور وہ بار بار چندر کو چوم رہے تھے۔ گھر بھر میں ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ لیکن اصلی وجہ سوائے چمپا اور سیتا رام کے کوئی نہ جان سکتا تھا جس قدر چندر کا بخار تیز ہو رہا تھا اسی قدر ہیرالال کا بیٹا صحت یاب ہو رہا تھا۔ نوکروں کے ذریعہ سے کئی دفعہ چمپا اور سیتا رام اس کی خبر منگا چکے تھے۔ سب نوکر چاکر حیران تھے کہ ہمارے مالک اور مالکہ کو کیا ہو گیا۔ جس بچے کی ذرا سی تکلیف پر بیسیوں ڈاکٹر جمع ہوا کرتے تھے وہ آج بے جان سے جا رہا ہے۔ پھر بھی کوئی ڈاکٹر کا نام نہیں لیتا مگر کسی کو دم مارنے کی جرات نہ تھی کہ اصل سبب دریافت ہو سکتا۔

بعض وقت نوکر انہیں سنگدل سمجھتے۔ لیکن جب وہ اُنکے اترے ہوئے چہرے دیکھتے تو انہیں یقین نہ آتا +
چمپا کی نرگسی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ لیکن کسی کو کبھی اُن میں آنسوؤں کے ایک قطرے کی جھلک بھی نظر نہ آئی۔

چندر کو بیمار ہوئے آٹھ دن گزر گئے اور ان دنوں میں سوائے کسی اشد ضرورت کے چمپا نے اُسے گود سے نہیں اُتارا۔ وہ دن دن بھر اور تمام تمام رات اُسے گود میں لئے رہتی۔ اس کے جسم کا تمام خون خشک ہوگیا تھا اور وہ سنگ مرمر کے کسی بے حس بُت کی طرح چندر کے پلنگ پر بیٹھی نظر آتی۔ دراصل اس کی چلنے پھرنے کی قوت بھی سلب ہو چکی تھی لیکن وہ اپنا راز چھپانے کے لئے کوئی بات ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ نویں دن جب چندر پر نزع کا وقت تھا کسی نے نیچے سے آواز دی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ شاید نوکروں نے اپنے آقاؤں سے مایُوس ہوکر خود ہی ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا چندر تمام گاؤں اور تمام گھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سیتا رام نے کھڑکی سے اپنا زرد چہرہ نیچے کی طرف جھکا کر کہا۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لے جائیے اب آخری وقت ہے۔ اُن کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ لیکن چمپا کی غم میں ڈوبی ہوئی ایک نگاہ سے سنبھل گئے۔

بالآخر وہ منحوس گھڑی بھی آن پہنچی۔ چندر کی خوبصورت آنکھیں پتھرا گئیں اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اس ننھے سے تارے کی طرح جو آسمان سے ٹوٹ کر خاک میں مل جاتا ہے۔

موہن غسل صحت کر چکا تھا اور اس وقت تمام گاؤں کے لوگوں سے زیادہ چار شخص دردناک طور پر چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ یہ سب ہیرالال اور اس کے کنبے کے آدمی تھے۔ چمپا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن ان میں آنسو نہ تھے سیتا رام بے اختیار رونے لگے۔ چمپا نے کہا تم کیوں اپنا عہد بھول گئے کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے آنسوؤں کو دیکھ کر ان بیچاروں کو جو پہلے بھی رو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔ کس قدر رنج پہنچے گا اور وہ ہم سے کتنے شرمندہ ہونگے دنیا میں صرف وہی شخص بہادر ہے جو اپنے رنج و غم سے دوسرے کے دل کو پژمردہ نہ ہونے دے۔ اپنے آنسوؤں کو پونچھ ڈالو اور اس وقت جو رنج و الم تمہارے دل پر طاری ہے اسکی تاریک گہرائیوں میں اُنہیں گم کر دو۔

ہیرالال نے کہا چمپا تم جیسا پتھر کا دل کوئی کہاں سے لائے۔

چمپا مسکرا پڑی اور کہا میرا دل! میرا دل اب کہاں ہے؟ میں نہیں جانتی۔ کئی روز گزرے میں اُسے ندی کے کنارے دفن کر چکی ہُوں۔ پھر اُس نے کئی بار جھک جھک کر بچے کا منہ چوما اور بولی دیکھو میرا پیارا اس قابل نہیں کہ اسکا پھول سا جسم چتا کے خوفناک شعلوں کی تاب لا سکے۔ اور نہ گنگا میں بہا کر اُسے بے وطن کر دینا۔ بلکہ اُس کی ایک مٹی

سی قبر بناؤ اور سنگ مرمر سے اس کو اس قدر مضبوط کردو کہ ہمارے فنا ہو جانے کے بعد بھی وہ قابلِ یادگار مٹی فنا نہ ہو سکے ۔ اُس نے پھر ایک بار بچّے کو چُوما اور کہا مجھے سخت نیند آ رہی ہے ۔ میرے لئے ایک پلنگ بچھوا دو ۔ بہت مدت کے بعد سونے لگی ہوں مجھے کوئی نہ جگائے ۔ پلنگ بچھا دیا گیا اور چمپا کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئی اس کی جسمانی طاقت اسے جواب دے چکی تھی اور حقیقت میں وہ بیہوش ہو رہی تھی لیکن اس بات کو وہ لوگوں پر آشکار کرنا مناسب نہ سمجھتی تھی ۔ وہ بالکل بیہوش ہو گئی اور چندر کا تابوت نہایت تزک و احتشام کے ساتھ جنگل کی طرف روانہ ہوا ۔

(۷)

رات اور دن اسی طرح گزرتے گئے حتیٰ کہ ایک سال بھی گزر گیا ۔ اس عرصے میں چمپا موت اور زیست کے درمیان ہچکولے کھاتی رہی ۔ وہ کئی بار موت کے بھیانک غار کے منہ سے پلٹ پلٹ کر آئی ۔ لیکن اُس نے اپنے منہ سے ایک دن بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ چندر کے غم میں بیمار ہے ۔ اپنے تیمارداروں اور بیمارپرسی کرنے والوں سب کو اس نے یہ بتایا کہ میں ایک دن ندی کے پاس کسی چیز سے خوف کھا گئی تھی ۔ ہیرالال کا تمام کنبہ اس کا درم ناخریدہ غلام ہو رہا تھا اور وہ خلوص دل سے چمپا کی صحت کے طلبگار تھے ۔

موہن کی دکان پھر چل نکلی تھی وہ سب اپنے گھر میں خوش و خرم تھے اور دن رات چمپا اور سیتارام کی تعریف میں رطب اللسان ۔

ہر بات کی ضرور ایک انتہا ہوتی ہے چمپا کے دل پر اگرچہ بدستور غم کی تاریکی محیط ہے لیکن بظاہر وہ تندرست و توانا نظر آ رہی ہے ۔ اس کی گود میں ایک ننھا سا معصوم بچہ کھیل رہا ہے چمپا اور دوسرے لوگوں کو اس بات سے سخت حیرت تھی کہ اس بچے اور چندر کی صورت میں ایک بال کا بھی فرق نہیں ۔ جہاں چندر کے ماتھے پر ایک تل تھا وہیں اس بچّے کے بھی تل تھا ۔ چندر کے پاؤں کی انگلی بھی دوسری انگلی کے اوپر چڑھی ہوئی تھی ۔ بالکل اسی طرح اس بچّے کی انگلی بھی تھی ۔ آنکھیں، کان، ناک، ہونٹ بالکل وہی تھے ۔ وہی چہرہ تھا وہی مُسکراہٹ تھی اور وہ عام بچوں سے تن و توش میں بھی کسی قدر بڑا تھا ۔ اس کی ہر حرکت چندر کی حرکتوں سے مشابہ تھی ۔ اور چمپا کا دل روز بروز یہ یقین پکڑتا جا رہا تھا کہ چندر پھر اُس کے پاس پہنچ گیا ہے ۔ اور اب وہ ہر وقت ایک نئے خلجان میں مبتلا رہنے لگی ۔ آخر ایک روز اس نے بصد اصرار سیتارام سے کہا کہ جا کر چندر کی قبر کھدوا کر دیکھو وہ ضرور وہاں نہیں ہو گا ۔

سیتارام کئی دن ٹالتے رہے لیکن جب چمپا نے حد سے زیادہ مجبور کیا تو وہ تیار ہو گئے خود اُنکے دل سے بھی ایک غیر معلوم صدا اٹھ رہی تھی کہ چندر وہاں سے آ گیا ہے ۔

(۸)

سنگ مرمر قبر کے اوپر سے اُکھاڑ دیا گیا ۔ اور مزدور قبر کھودنے لگے ۔ جب تھوڑی سی اوپر کی مٹی اُٹھ چکی تو وہ ایک دوسرے

پر حیرت کی نگاہیں ڈال رہے تھے۔ جوں جوں وہ زمین کھودتے نیچے سے بالکل چٹیل میدان کی طرح سخت زمین نکل رہی تھی قبر کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

دن بھر مزدور کھودتے رہے حتیٰ کہ شام قریب ہونے لگی اور وہ قبر سے کئی حصے گہری زمین کھود چکے لیکن کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ بالکل یہی حالت تھی جیسے کوئی میدان میں گڑھا کھودنا شروع کردے۔

مزدوروں نے کہا حضور معلوم نہیں یہاں کیا اسرار پوشیدہ ہیں۔ آپ یہاں قبر بتاتے ہیں لیکن اب تو ایک کوئیں کے قریب قریب زمین کھُد چکی ہے۔ شام ہو رہی ہے اب ہمیں اجازت دیجئے۔ سیتارام نے مزدوروں کو ان کی امید سے بدرجہا زیادہ مزدوری دیکر رخصت کیا اور خود حسب معمول پیدل ہی اکیلے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ چمپا دیر سے دروازے میں کھڑی منتظر تھی تاکہ جلد اپنی تمناؤں کے کامگار یا ناکام ثابت ہونے کا فیصلہ سُن سکے۔

(۹)

آفتاب اپنے زرنگار چہرے سے ندامت کی سرخی چھپانے کے لئے شفق کا سنہرا نقاب اوڑھ رہا تھا چمپا کو وہ وقت یاد آگیا جب وہ چندر کو دیوتاؤں کی نذر کر رہی تھی بالکل وہی وقت ایک منٹ آگے اور نہ ایک منٹ پیچھے۔

چمپا پر ایک نامعلوم کیفیت طاری ہوگئی۔ دفعتہً اُس نے محسوس کیا کہ کوئی غیر انسانی ہاتھ شفقت کے ساتھ اسکے سر پر رکھ دیا گیا ہے اور کسی نے آہستہ سے اس کے ماتھے کو چُوم کہا "پیاری بچّی تیرے عظیم الشان ایثار نے دیوتاؤں کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہے تو نے اپنی عالی ظرفی کے ساتھ نوع انسان کے دامن سے سنگدلی کے دھبّے کو دھو ڈالا ہے لیکن افسوس کہ ابھی تک تیرے دل پر رنج والم کے تاریک بادل چھا رہے ہیں کیا تو نہیں جانتی کہ تیرا چندر پھر تیرے پاس پہنچ چکا ہے" بالکل اسی طرح جیسے ساون کی کالی گھٹا کھل کر برس جانے کے بعد آسمان کا نیلا رنگ نکھر آتا ہے یک لخت چمپا کے دل سے غم کا گرد وغبار ہمیشہ کے لئے نکلا اور اس کا دل کسی غیر فانی نور کے پرتو سے جگمگا اٹھا۔ آواز کے ختم ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئی تھی۔ جب اس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا تو سیتارام اسکے قریب کھڑے تھے۔ چمپا جوش مسرت سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی چندر میرے پاس پہنچ گیا ہے۔ ہاں مجھے معلوم ہوگیا چندر میرے پاس ہے پھر اس نے جلد جلد تمام واقعہ سیتارام سے کہہ دیا۔ ادھر وہ بھی قبر کا حیرت انگیز قصہ دہرا رہے تھے۔

دونوں جوش محبت سے اپنے بچے کے پلنگ کی طرف لپکے۔ چمپا نے پکار کر کہا چندر! اور دو ماہ کے معصوم بچے نے ماں باپ کو دیکھ کر منہ کھول دیا۔ ایک ساتھ وہ اس کا منہ چوم رہے تھے اور وہ مسکرا رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے چندر مسکرایا کرتا تھا۔

ز۔ ب

وہ نگاہیں مجھے دیوانہ بنا دیتی ہیں
دین و دنیا کو اک افسانہ بنا دیتی ہیں

دیکھ پروانے کے دل میں وہی رنگیں باتیں
جو ترے دل کو پری خانہ بنا دیتی ہیں

کیا یہ باتیں ہیں کہ جس دل میں سما جاتی ہیں
دو جہاں سے اُسے بیگانہ بنا دیتی ہیں

آرزوئیں جو بر آتی ہیں رُلاتی ہیں مجھے
دلِ آباد کو ویرانہ بنا دیتی ہیں

اب نہ اے دوست سُنا مُجھ کو پرانی باتیں
اب یہ باتیں مجھے دیوانہ بنا دیتی ہیں

حامد علی خاں

حجابِ حقائق

لگا کے وقت کا چشمہ نہ دیکھ ہستی کو — ہے دیکھنا تو بلندی سے دیکھ پستی کو

جسے تو چشمۂ عالم نما سمجھتا ہے — جسے تو مشعلِ ظلمت رُبا سمجھتا ہے

خیال میں جو ترے دوربینِ فطرت ہے — جو ترے زعم میں آئینۂ حقیقت ہے

جسے تو قافلہ سالارِ علم کہتا ہے — جسے تو شاخِ ثمردارِ علم کہتا ہے

یہی بلا ہے تری وسعتِ نظر کیلئے — یہی حجابِ حقیقت میں ہی بشر کیلئے

بروں ز حجرۂ فردا و دی نمی آئی
جہانِ خویش بہ تمثیل و عکس آرائی

یہ مانا وقت کا چشمہ ہے این و آں کیلئے — مگر یہ چیز نہیں گنج شائیگاں کیلئے

یہ سچ، اسی سے ہی تمثیلِ رنگ و بو پیدا — مگر محال کہ ہو پھول ہو بہو پیدا

یہ سب درست کہ خورشید کی ضیا پاشی — شعاعِ انجم و ماہِ فلک کی نقاشی

نگار خانۂ ہستی کے نقش بر دیوار — طلسمِ فطرتِ چالاک یعنی یہ سنسار

لگا کے وقت کا چشمہ ہی دیکھ سکتے ہیں — مگر حقائق اشیا بھی دیکھ سکتے ہیں؟

کسے کہ حسنِ حقیقت عزیز تر دارد
ز دیدہ چشمِ[1] فرنگیِ وقت بر دارد

ابنِ حزیں

[1] عینک

شاعر کی شکست

(رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک دلآویز افسانے کا ترجمہ)

وہ شاہزادی تھی - اس کا نام اجیتا تھا، اور راجا نرائن کے دربار کا شاعر کبھی اس سے رُوبرُو نہ ہُوا تھا۔ جس دن شاعر راجا کے سامنے کوئی نئی نظم پڑھتا، وہ اپنی آواز اتنی بلند کر لیتا کہ اس کے نغموں کی رسائی بالاخانے کی چلمنوں کے پیچھے نادیدہ سامعین کے کانوں تک ہو سکے۔ وہ اپنے نغمے کو اپنی رسائی سے دُور، بہت دُور اس تاروں بھری دنیا میں پہنچا دیتا جہاں ادراک اور نظر کی سرحد سے پرے وہ سیارہ جو اس کے مقدر کا رہنما تھا ایک ہالۂ نور میں گھرا ہُوا چمک رہا تھا۔

کبھی کبھی پردوں کے پیچھے اُسے کوئی خیالی صُورت حرکت کرتی ہوئی نظر آتی اور کبھی دور سے چھم چھم کی صدا اُسکے کانوں میں پہنچتی اور وہ ان خوبصورت ٹخنوں کے خواب دیکھنے لگتا جن کی خلخالوں کے ننھے ننھے طلائی گھنگرو ہر قدم پر راگ پیدا کرتے تھے۔ ہائے وہ سرخ و سفید نازک پاؤں جو اس خاکی زمین پر اسطرح پڑتے تھے جس طرح گناہگاروں پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ یہ پاؤں شاعر نے اپنے دل کے مندر میں بسا رکھے تھے جہاں وہ اپنے راگ کے سروں کو انکے طلائی گھنگروؤں کی صدا سے ہم آہنگ کر دیتا۔ اس کے دل میں کبھی اس بات کے متعلق ذرا سا شبہ بھی پیدا نہ ہُوا کہ اوٹ کے پیچھے کس کا پرتو نظر آتا ہے۔ اور وہ کس کے پاؤں کے گھنگرو ہیں جن کی موسیقی سے اس کے دل کے ساز کے تار نغمہ مستعار لیتے ہیں

شہزادی کی خادمہ منجاری دریا پر جاتے ہوئے ہر روز شاعر کے گھر کے پاس سے گزرتی اور اس سے ایک آدھ بات کر لینے کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ جب سڑک ویران ہو جاتی اور تاریکی زمین پر چھاؤنی چھا لیتی، وہ بلا تامل اس کے کمرہ میں داخل ہوتی اور قالین کے ایک گوشہ پر بیٹھ جاتی۔ اسکے نقاب کا رنگ اور اس کے بالوں میں گندھے ہوئے پھول دیکھ کر یوں معلوم ہوتا کہ وہ اپنی آرائش میں غیر معمولی اہتمام کرتی ہے۔

لوگ یہ دیکھکر مسکراتے اور سرگوشیاں کرتے تھے اور وہ حق بجانب تھے کیونکہ شاعر نے کبھی اس بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی کہ یہ ملاقاتیں اس کے لئے دلی مسرت کا باعث ہوتی ہیں۔

لڑکی کے نام کے معنی "شاخ گل" تھے ایک عام آدمی کے لئے یہی نام کافی دلکش ہو سکتا ہے۔ لیکن شاعر نے اپنی طرف سے اس نام میں اضافہ کیا۔ وہ اسے "شاخ گلہائے بہار" کہتا تھا۔ عام لوگ تاسف سے سر ہلاتے اور کہتے "ہائے افسوس"۔ بہار کے متعلق شاعر جو اشعار لکھتا۔ ان میں "شاخ گلہائے بہار" کی تعریف نمایاں طور پر نظر آتی۔ اس پر راجا شاعر کی

طرف آنکھوں سے اشارے کرتا اور مسکراتا اور شاعر بھی جواب میں مسکرا دیتا۔

پھر بادشاہ اس سے پوچھتا کیا شہد کی مکھی کا کام صرف یہی ہے کہ بہار کے دربار میں بھنبھناتی اور گاتی رہے ؟

شاعر جواب دیتا "نہیں بلکہ شاخ گلہائے بہار کا شہد چوسنا بھی اس کا کام ہے۔

اس پر راجا کے دربار میں سب لوگ ہنستے اور کہتے ہیں شاہزادی اجیتا بھی یہ دیکھ کر ہنسا کرتی کہ کسی خادمہ نے شاعر کا نام اپنے نام سے وابستہ ہوجانے دیا ہے۔ منجاری دل ہی دل میں خوش ہوتی۔

اسی طرح دنیا میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش ہوتی رہتی ہے اور جو کچھ خدا بناتا ہے انسان آرائش کے لئے اس میں اپنی طرف سے اضافہ کردیتا ہے۔

خالص صداقت صرف اُن نغموں میں تھی جو شاعر کی زبان پر رواں ہوتے۔ اس کے نغموں کا موضوع کیا تھا؟ وہ درد جس کا آغاز ازل سے ہوا اور وہ مسرت جو تا بہ ابد برقرار رہے گی اور کرشن محبت کا دیوتا اور رادھا اسکی محبوبہ ــــ ازلی وابدی مرد اور عورت، یہی اس کے نغموں کا موضوع تھے۔ شاہ سے لے کر گدا تک کا دل ان نغموں کی صداقت کا معترف تھا۔ شاعر کے نغمے ہر شخص کی زبان پر جاری تھے۔ باد برشگال کی ہلکی سی سنسناہٹ ــــ چاند کی کرنوں کی ذرا سی جھلک فضا کو اس کے گائے ہوئے نغموں سے معمور کردیتی اور مکانوں کی کھڑکیوں میں کھلے میدانوں میں، کشتیوں میں، عام گذرگاہوں میں، ہزاروں زبانوں پر اس کے نغمے رواں ہوجاتے۔

اسی طرح ہنسی خوشی زمانہ گزرتا رہا۔ شاعر شعر سناتا، راجا سنتا، لوگ تعریف کرتے۔ منجاری دریا کو جاتے ہوئے شاعر کے کمرے کے پاس سے گزرتی ــــ بالاخانے کی چلمنوں میں سے کسی کا سایہ متحرک نظر آتا اور دور سے ننھے ننھے طلائی گھنگرؤں کی صدا سناتی دیتی۔

انہیں دنوں جنوب کی طرف سے ایک اور شاعر اپنے کمال کے نشہ میں سرشار کوس لمن الملک بجاتا ہوا اقلیم شعر کی تسخیر کو روانہ ہوا۔ وہ امرپور کی راجدھانی میں راجا نرائن کے دربار میں بھی حاضر ہوا۔ اور تخت کے سامنے بادب استادہ ہوکر اُسنے راجا کی مدح میں ایک شعر پڑھا۔ راستہ میں وہ تمام درباروں کے شعرا کو مقابلہ کی حملا دے چکا تھا اور اس مہم میں ہر جگہ مظفر و منصور ہوتا رہا تھا۔

راجا نے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور کہا "شاعر خوش آمدید"

پنڈارک (شاعر) نے ایک پرغرور انداز میں جواب دیا "مہاراج میں مقابلہ چاہتا ہوں"

راجا کے دربار کے شاعر شیکھر کو معلوم نہ تھا کہ شعر کا مقابلہ کس طرح ہو گا۔ وہ رات بھر نہ سو سکا۔ شہرہ آفاق پنڈارک کا بھاری بھرکم ڈیل ڈول اس کی نوکیلی کٹار کی سی ناک اور اسکا تختۂ مجسم سر ۔۔۔ شانے کی طرف جھکا ہوا تمام شب اسکی آنکھوں میں پھرتا رہا۔

صبح شیکھر کانپتے ہوئے دل کے ساتھ دربار میں داخل ہوا۔ لوگ کثرت سے جمع تھے۔ شاعر نے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ اپنے حریف کا خیر مقدم کیا۔ پنڈارک نے بھی جواب میں سر کو ایک ہلکی سی جنبش دی پھر اپنے مداحوں اور حاشیہ نشینوں کے حلقہ کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی۔

شیکھر نے بالاخانے کی چلمنوں پر نظر ڈالی اور پھر سر جھکا کر دل ہی دل میں کہا "میری ملکہ اگر آج کا معرکہ میرے ہاتھ رہا تو تیرا ارجمند نام سورج کی طرح چمکے گا"

نوبت بجنے لگی اور ہجوم "مہاراج کی جے" پکارتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ راجا سفید شاہانہ لباس پہنے خراماں خراماں کمرہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک کھڑا ہوا اور اس وسیع کمرہ میں بالکل خاموشی طاری ہو گئی وہ سر کو اوپر اٹھا کر چھاتی پھیلائے اپنی گرجتی اور گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ راجا نرائن کی شان میں مدحیہ اشعار پڑھ رہا تھا۔ اس کے الفاظ سمندر کی موجوں کی طرح محل کی دیواروں کے ساتھ ٹکراتے تھے۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ سننے والوں کی پسلیوں سے متصادم ہو کر ان میں کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے ہیں۔ جس ہنرمندی کے ساتھ اُس نے نرائن کے نام کو مختلف معانی کا جامہ پہنایا۔ اور اس کے حرف حرف کو متعدد مجموعوں کے اندر اپنے شعروں کے جال میں بُنا۔ اس کو دیکھ کر سامعین مبہوت و دم بخود رہ گئے۔

پنڈارک کے بیٹھ جانے کے بعد ایک عرصہ تک اس کی آواز محل کے لاتعداد ستونوں کے درمیان لہراتی اور گونجتی رہی اور ہزاروں خاموش دلوں پر ایک خاص کیفیت طاری رہی۔ ودیاوان پنڈت جو دور دور کے دیشوں سے چل کر آئے تھے اپنے دہنے ہاتھ اٹھا کر چلائے "دھن ہو!!!"

راجا نے شیکھر کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی۔ شاعر نے جواب میں اپنی درد و کرب سے بھری ہوئی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اپنے آقا کی طرف اٹھائیں اور اس کے بعد ایک چوکڑی بھولے ہوئے ہرن کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر عورتوں کی سی شرم طاری تھی۔ اس کا نوخیز اور نازک چھریرا بدن کسی طنبور کے کھنچے ہوئے تار سے مشابہ نظر آتا تھا جو ایک خفیف سے مس پر بھی بلند آہنگ نغمے پیدا کرنے پر آمادہ ہو۔

ابتدا میں اس کی آواز دھیمی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چند پہلے الفاظ سنے بھی نہ گئے۔ اسکے بعد رفتہ رفتہ اس نے اپنا سر بلند کیا اور اسکی صاف اور شیریں آواز ایک لرزتے ہوئے شعلہ کی طرح آسمان کی طرف اُٹھنے لگی اُس نے شاہی خاندان کے شاندار کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے زمانے کی قدامت کی دھندلی فضاؤں کو چیر کر ان درخشاں روایات کا سلسلہ خاندان کے اب الآباء تک پہنچا دیا اور پھر پشت بہ پشت فقید المثال شجاعت اور عدیم النظیر سخاوت کے قصّے بیان کرکے اس نے ان کارناموں کا سلسلہ موجودہ عہد سے ملا یا۔ اُس نے راجا پر اپنی نظریں جما دیں اور شاہی خاندان کی جو محبت لوگوں کے دلوں میں پوشیدہ تھی اس کے نغموں کے جادو سے خوشبو کی طرح پھیل کر تخت کے گرد ہالہ باندھنے لگی۔ جب وہ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔ "آقا میں لفظی ہیر پھیر اور حروف کے گھوم گھماؤ میں ہار سکتا ہوں۔ لیکن تیری محبت میں شکست نہیں کھا سکتا"

سننے والوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور پتھر کی دیواریں جے جے کے نعروں سے گونج اٹھیں۔

سر کی ایک پُر شکوہ جنبش اور حقارت آمیز تبسم کے ساتھ عام جذبات کے اس جوش کی تضحیک کرتے ہوئے پنڈارک نے کھڑے ہو کر بھری مجلس کے سامنے یہ سوال پیش کیا "دنیا میں الفاظ سے برتر اور کیا چیز ہے؟" یکایک دربار پر پھر وہی خاموشی طاری ہوگئی

اسکے بعد علم و فضل کی ایک معجزانہ نمائش کے بعد اس نے ثابت کیا کہ **لفظ** ہر چیز سے مقدم ہے، **لفظ** خدا ہے اس نے مقدس کتابوں کے اقتباسات کا ایک انبار لگا دیا اور اس طرح ایک بہت بڑا خیالی مندر تعمیر کیا جس میں **لفظ** کا سنگھاسن زمین و آسمان کی ہر چیز سے بلند بنایا گیا۔ پھر اس نے اپنی گرجتی ہوئی آواز کے ساتھ وہی سوال دہرایا "دنیا میں الفاظ سے برتر اور کیا چیز ہے؟"

اس نے اپنے اردگرد ایک پُر غرور نگاہ دوڑائی۔ کسی شخص کو اس کا مدِّمقابل بننے کی ہمت نہ ہوسکی۔ آخر وہ اس شیر کی طرح جو اپنے شکار سے خوب سیر ہو کر پیٹ بھر چکا ہو آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پنڈتوں نے دھن! دھن! کی آواز بلند کی۔ راجا حیرت سے خاموش تھا اور شیکھر شاعر فضل و کمال کے اس محیّر العقول مجسمہ کے سامنے اپنے آپ کو بالکل بے حقیقت محسوس کر رہا تھا۔ آخر دربار اس دن کے لئے برخاست ہوا۔

دوسرے دن شیکھر نے اپنا ترانہ گا کر ابتدا کی اس کے نغموں میں اس دن کا بیان تھا جب پریم کی بانسری کے رسیلے سہاؤنے سر پہلے پہل بندرابن کی چپ چاپ ہواؤں میں لہرائے تھے۔ اور گوپیاں اور اہیرنیاں اچرج کر رہی تھیں

کہ یہ کون سنگنیا ہے اور یہ مدبھرے من موہنے راگ کانوں میں کہاں سے آ رہے ہیں کبھی وہ سمجھتیں کہ دکھن سے پون کی لہریں راگ کو بہائے لئے آ رہی ہیں اور کبھی سوچتیں کہ پربت کی چوٹیوں پر متوالے بادل ہی جھوم جھوم کر گا رہے ہیں پریم رس کی الوپ لہریں تھیں جو پورب میں سورج دیوتا کے ہردے سے اٹھتیں اور ملاپ کے منوہر سندیسے سناتی ہوئیں کسی برہ کے مارے کی دکھ بھری آہیں بن کر پچھم میں جا گرتیں۔ تارے یوں دکھائی دیتے جیسے اسی سارنگی کے کان ہیں جس نے نیند کے ماتوں کے سپنوں کو بھی راگ سے بھر دیا تھا۔ چاروں کھونٹ راگ ہی راگ سنائی دیتا تھا۔ کھیتوں اور پھلواڑیوں میں، اندھیری گلیوں اور اجاڑ سڑکوں میں آکاس کی پگھلتی ہوئی نیلاہٹ اور گھاس کی کانپتی ہوئی ہریالی میں راگ ہی راگ تھا۔ وہ سب اچنبھے میں تھیں کہ یہ کیا بھید ہے اس دن ان کے من میں جو چاؤ اٹھ رہے تھے اُن کا اس سنسار کی کسی بولی میں سمجھانا ان کے لئے کٹھن تھا۔ ان کے نینوں میں آنجھو بھر بھر آئے اور ان کے من جینے سے اچاٹ ہو گئے ان کو مر کر مٹ جانے کی چاہ ہو گئی کہ سو برس جینے کے بعد بھی انت مرنا ہے۔

شیکھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہا تھا۔ راجا اور اس کا دربار اور پنڈارک اور اس سے مقابلہ کچھ بھی اُسے یاد نہ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالات کے درمیان تنہا کھڑا تھا جو اُن پتوں کی طرح جنھیں بادِ بہار میں جھونکے آ رہے ہوں اس کے گرد لرزتے اور سرسراتے تھے۔ اور اس کی زبان پر **بانسری** کا راگ جاری تھا۔ اس وقت اس کے دماغ میں ایک ایسی مورت کا تصور تھا جو ایک پرتو سے صورت پذیر ہوئی تھی اور کسی خلخال کے گھنگھروؤں کی دھیمی دھیمی ٹھنٹھناہٹ کہیں دُور سے اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

آخر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت سامعین کے جسم کا رواں رواں ایک ناقابل فہم سرور کی دردانگیز کیفیت سے لرز رہا تھا۔ یہ کیفیت جتنی پراسرار تھی اتنی ہی عمیق بھی تھی۔ خود فراموشی کے عالم میں لوگ شاعر کو داد دینا بھی بھول گئے۔ جب جذبات کا یہ مدوجزر ذرا دھیما ہوا پنڈارک نے مبارز طلبی کے جوش میں کھڑے ہو کر اپنے حریف کو صلا دی کہ سامنے آ کر اس **عاشق** کی تعریف بیان کرے اور بتائے کہ اس کی محبوبہ کون تھی۔ اس نے اپنے اردگرد ایک پرغرور نگاہ ڈالی اور اپنے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر دوبارہ اس نے سوال کیا "ہاں بتاؤ کرشن عاشق اور رادھا معشوقہ کون ہیں۔ اس کے بعد خود اس نے ان لفظوں کا مادہ بتانا شروع کیا۔ اور شرح و بسط کے ساتھ اُن کے متعدد مفہوم بیان کئے۔ اس نے اپنے بوکھلائے ہوئے سامعین کے سامنے ایک ستی گم کر دینے والی ہنرمندی کے ساتھ الٰہیات کے مختلف پیچ در پیچ مسائل بیان کئے پھر وہ ان ناموں کے ایک ایک حرف کو ان کے ساتھ کے حروف سے الگ کرتا اور اپنی بے پناہ منطق کے ساتھ تجزیہ کرتے کرتے

اُن کی خاک اڑا دیتا جس سے دوبارہ وہ اس لفظ کو پیدا کرکے اُسے ایک ایسے نئے مفہوم کا جامہ پہناتا جو اس سے قبل کسی بڑے سے بڑے ماہرِ علم اللسان کے تصور میں نہ آیا تھا۔

پنڈتوں کے دلوں میں ایک ہیجان برپا تھا وہ بے اختیار تحسین و آفرین کی پُرجوش آوازیں بلند کررہے تھے اور باقی لوگ بھی اِس مغالطہ میں گرفتار ہوکر کہ آج انہوں نے اپنی آنکھوں سے علم کی حیرت انگیز قوت کے ساتھ مسلمات کی قبا کی آخری دھجیاں بکھرتی دیکھی ہیں پنڈتوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ علم کے اس عملِ فرسا مظاہرہ کو دیکھ کر وہ اتنے مسرور ہوئے کہ وہ یہ سوچنا بھی بھول گئے کہ آخر ان باتوں میں حقیقت کا کوئی شائبہ بھی ہے یا نہیں۔

راجا حیرت و استعجاب میں گم تھا فضا میں موسیقی کا گمان بھی باقی نہ رہا تھا سبزہ کے فرش کی جگہ پتھروں کی سڑک نے لے لی تھی شعریت کو حقیقت کے کھردرے پن نے کچل ڈالا تھا۔

لوگوں کو اقلیم ادب کے اس بے پرواخرام دیو کے سامنے جو ہر قدم پر مشکلات کو بے محابا روندتا چلا جاتا تھا اپنا شاعرِ کل کا بچہ معلوم ہونے لگا۔ اس وقت ان پر ظاہر ہوا کہ جو نظمیں شیکھر لکھتا ہے وہ بالکل سیدھی سادھی ہوتی ہیں۔ اور وہ اگر چاہیں تو خود بھی ویسی نظمیں لکھ سکتے ہیں۔ وہ دل میں کہتے ۔ اس کی نظمیں بالکل بیکار ہوتی ہیں۔ نہ اُن میں کوئی دِقّت ہوتی ہے، نہ جدّت اور نہ ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

راجا نے کنکھیوں سے اپنے شاعر کی طرف دیکھا اور اسے ایک آخری کوشش کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن شیکھر نے کچھ خیال نہ کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ آخر راجا ناراض ہوکر تخت سے اٹھا اور اپنے گلے سے ہیروں کا مالا اتار کر پنڈارک کو پہنا دیا۔ محل مسرت کے نعروں سے گونج اٹھا ۔ بالاخانے میں خفیف سی ہلچل پیدا ہوئی اور کپڑوں کی سرسراہٹ اور طلائی گھنگروؤں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔

چاند زوال پر تھا اور رات تاریک تھی۔ شاعر نے اپنی نظموں کے مسودے الماری سے نکالے اور زمین پر اُن کا ڈھیر لگا دیا۔ ان میں سے بعض اس کی بہت پرانی نظمیں تھیں جن کو وہ تقریباً بھول چکا تھا۔ چند اوراق کو اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا، اب اسے یہ بالکل بیکار نظر آئے ہیں ــــ محض الفاظ اور طفلانہ خیالات کے مجموعے۔

اُس نے اِن اَوراق کو پھاڑ کر پُرزے پُرزے کر دیا اور پھر یہ الفاظ کہتے ہوئے اُنہیں دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا "اے حُسن! میں اپنا سب کچھ تجھ پر قربان کرتا ہوں۔ اس حقیر اور بیکار زندگی میں تیری محبت کی آگ کئی سال تک میرے سینے میں بھڑکتی رہی ہے۔ اگر یہ زندگی سونا ہوتی تو آج میں اس آزمائش سے کُندن بن کر نکلتا۔ لیکن آہ یہ زندگی پاؤں تلے روندی ہوئی خشک گھاس سے بھی زیادہ بے حقیقت ہے اور

اب مٹھی بھر راکھ کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے گا

رات زیادہ تاریک ہوتی گئی۔ شیکھر نے اپنے مکان کی کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے اور اپنے بستر کو گل شبّو، گل داودی اور گل یاسمن سے ڈھک دیا۔ یہ اس کے چاہیتے پھول تھے۔ پھر جس قدر چراغ اس کے گھر میں موجود تھے وہ سب جمع کر کے اُس نے اپنے شبستاں میں روشن کر دیئے۔ اس کے بعد اس نے شہد میں کسی زہریلی بوٹی کا رس ملایا اور اسکو پی کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

دروازے سے باہر سڑک پر طلائی خلخالوں کے گھنگروؤں کی چھم چھم سنائی دی اور ہوا کے ساتھ کمرے میں ایک بھینی بھینی خوشبو داخل ہوئی۔

شاعر نے آنکھیں کھولے بغیر کہا "میری ملکہ آخر تمہیں اپنے غلام پر رحم آگیا اور تم اس سے ملنے کے لئے آگئیں؟"

جواب میں ایک رسیلی آواز سنائی دی "ہاں میرے شاعر میں آگئی ہوں"

شیکھر نے آنکھیں کھول دیں، اور اپنے روبرو ایک لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔

شاعر کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اُسے یوں معلوم ہوا کہ وہ مورت جو ایک پرتو سے صورت پذیر ہو کر اس سے پہلے اس کے دل کے مقدس مندر میں چھپی چھپی رہتی تھی اب اس آخری ساعت میں اسکو دیکھنے کے لئے باہر آگئی ہے۔

لڑکی نے کہا "میں شہزادی اجیتا ہوں"

شاعر انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھا۔

شہزادی نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا "مہاراج نے تم سے انصاف نہیں کیا۔ میرے شاعر مقابلہ میں کامیاب تمہیں رہے، اور میں تمہارے سر کامرانی کا سہرا باندھنے کے لئے آئی ہوں"

پھر اس نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار اتار کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ شاعر بستر پر پیچھے کو گرا اور موت نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

حامد علی خاں

سوزِ ناتمام

دِل مبتلائے حرص و ہوا بھی نہ ہو سکا　　دُنیا کی کشمکش سے رہا بھی نہ ہو سکا

یہ سوزِ ناتمام خدا جانے کیا کرے　　گزرا میں جاں سے اور فنا بھی نہ ہو سکا

وہ درد درد ہی نہیں جو جانستاں نہ ہو　　وہ درد کیا جو اپنی دوا بھی نہ ہو سکا

دونوں جہاں کا بار اُٹھا کر ملا تو کیا　　ناآشنا سا دل کہ مرا بھی نہ ہو سکا

عمرِ دو روزہ حسرت و حرماں میں کٹ گئی　　مجھ سے تری جفا کا گِلا بھی نہ ہو سکا

بیگانہ دو جہاں سے ہوا جو ترے لئے　　وہ دِل ہزار حیف ترا بھی نہ ہو سکا

جب شمع بزمِ سوز سے بیگانہ ہو گئی　　پروانہ آ کے اُس پہ فدا بھی نہ ہو سکا

گُلشن میں تیرے بعد نہ آئی کبھی بہار　　اور میں شہیدِ ذوقِ نوا بھی نہ ہو سکا

پھُولوں کو پھر چمن میں نہ آئی کبھی ہنسی
کلیوں کو انتظارِ صبا بھی نہ ہو سکا

حامد علی خاں

تجلّیات

دل مبتلائے دیر و کلیسا نہ ہو سکا — شیدا ترا کسی پہ بھی شیدا نہ ہو سکا

انکار سُن کے اور بھی بے باک ہو گیا — سرشارِ شوق پیروِ موسیٰ نہ ہو سکا

ہر چند وقفِ دید رہا ہوں تمام عمر — لیکن بقدرِ شوق تماشا نہ ہو سکا

اے وائے موجِ خوں! کہ نہ آنکھوں سے بہ سکی — اے وائے دل! کہ خونِ تمنّا نہ ہو سکا

کیا کیا تھے آرزوئے تجلّی کے اضطراب! — دیکھا تو دل حریفِ تجلّی نہ ہو سکا

رنگینیٔ نقاب کو عارض سمجھ لیا — جب بے نقاب عارضِ زیبا نہ ہو سکا

ہر ایک کو فلک سے امیدِ وفا ہی — یہ بے وفا کبھی بھی کسی کا نہ ہو سکا

ہم جان و دل کو نذرِ تغافل بھی کر چکے — وہ مسکرا کے دیکھتے، اتنا نہ ہو سکا

اک رندِ کم سواد ہے مستِ ازل نہیں — جو بے نیازِ ساغر و مینا نہ ہو سکا

وہ ذوقِ دید کیا! جو نہ سرشار کر سکے — وہ حُسن کیا! جو قُلزمِ صہبا نہ ہو سکا!

جسکی نظر میں کیف و کمِ ہست و بود ہے — کیا اس پہ میرا حال ہی افشا نہ ہو سکا!

تا زیست اے اثرؔ رہیں بے تابیاں مری

یہ قلبِ بے قرار شکیبا نہ ہو سکا

اثرؔ صہبائی

محفلِ ادب

روس ترقی کے میدان میں

بالشویکوں کی برائی ساری دنیا کرتی ہے ۔ لیکن جب سے روس پر سوویٹ کا قبضہ ہوا ہے ۔ ملک میں کایا پلٹ ہوگئی ہے ۔ یورپ میں روس سب سے زیادہ غیر مہذب سمجھا جاتا تھا ۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد وہاں ہندوستان سے بھی کم تھی ۔ لیکن سوویٹ حکومت نے اب یہ بات نہیں رہنے دی ۔ یوں دوسرے ممالک [illegible] ہیں کہیں ۔ دنیا کا کون سا الزام ہے جو اس پر نہیں لگایا جاتا ۔ لیکن اس عہدِ حکومت میں ادب نے جو ترقی کی ہے ۔ اس کی مثال صفحۂ دنیا پر نہ ملے گی ۔ صرف ماسکو میں چھ سو سے زیادہ کتب خانے ہیں ۔ جہاں سے دن رات نئی نئی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ ان میں سے بعض دار الاشاعت ایسے ہیں ۔ جو ایک ایک سال میں کئی کئی ہزار نئی کتب طبع کرتے رہتے ہیں ۔ وہاں کی سرکاری پبلشنگ کمپنی اس وقت دنیا بھر میں سب سے بڑی ہے ۔ جس کے مقابلہ کی کمپنی نہ امریکہ میں ہے ۔ نہ فرانس میں ۔ اس نے سنہ ۱۹۳۴ء میں دو کروڑ ستر لاکھ کتابیں شائع کیں ۔ بھلا کوئی ٹھکانا ہے ۔ دو کروڑ ستر لاکھ ۔ اس کمپنی کی بعض کتب اس کثرت سے فروخت ہوتی ہیں ۔ کہ سن کر حیرت ہوتی ہے ۔ گذشتہ دو سال کے قلیل زمانہ میں لینن کے مضامین کے مجموعے کے نوّے لاکھ نسخے فروخت ہوئے ۔ سٹالن کی کتابیں ایک سال میں ڈیڑھ لاکھ فروخت ہوئیں ۔ ان کے متعلق شائد یہ کہا جائے ۔ کہ یہ تو لیڈر ہیں ۔ قوم اُن پر جان دیتی ہے ان کی کتابیں نہ بکیں گی ۔ تو اور کس کی بکیں گی ۔ لیکن معمولی طور پر بھی روسیوں کا ادبی شوق بہت ترقی کر گیا ہے ۔ اس کمپنی کے رجسٹروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اوسط درجہ کے مصنفوں کی عام کتابیں اوسطاً آٹھ آٹھ ہزار کی تعداد میں فروخت ہوئیں ۔ لیکن اقتصادی اور مجلسی کتابوں کی بکری اس سے زیادہ ہوئی ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا شوق صرف ناول پڑھنے تک ہی محدود نہیں ہے ۔ وہ ٹھوس مضامین میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں ۔ اور یہ ترقی اس حالت میں ہوئی ہے جب کہ سنسر کی اجازت کے بغیر ایک لفظ بھی نہیں شائع ہو سکتا فی الحقیقت یہ حقیقی حب الوطنی اور اپنی حکومت کا معجزہ ہے ۔ کہ ہم ڈیڑھ سو سال میں بھی وہ نہ کر سکے ۔ جو روس نے صرف پانچ چھ سال میں کر دکھایا ہے ✦

(مادھری لکھنؤ (ہندی)

ایک مُصیبت زدہ کی دعا خدا کے حضور میں

اے پرماتما! تو نے اپنی کتابوں میں کئی مرتبہ کہا ہے۔ کہ میں اپنے بھگتوں کی فریاد سنتا ہوں۔ اور اُن کی تکالیف رفع کرتا ہوں +

اگر یہ سچ ہے تو میری ناؤ موت کی موجوں سے نکل کر امن اور سلامتی کے کنارے کب لگے گی۔ میری آنکھوں میں آنسو اور کلیجے میں جلن ہے اور میں سورج اور چاند اور تاروں کے روبرو تڑپتا ہوں۔ لیکن پتہ نہیں تو کیا کر رہا ہے۔ اور تیری توجہ کس طرف ہے کہ تجھے میرا دھیان نہیں آتا +

اگر تو نے اس وقت میری خبر نہ لی۔ اور میں ان مصیبتوں کو برداشت نہ کر کے مرٹ گیا۔ تو تجھے بھی پچھتانا پڑے گا۔ تو اپنا وعدہ کیوں کر پورا کرے گا۔ اور کس کے دُکھ دُور کرے گا +

کیا تجھے یہ خیال ہے۔ کہ دنیا میں کوئی شخص مجھ سے بھی زیادہ مصیبت زدہ ہے۔ اگر تیرا یہ خیال ہے۔ تو رکہ ہی دوں۔ تو یہی کہے گا کہ میں عالم مطلق ہوں۔ معمولی بات ہے) یہ بھی ٹھیک نہیں ـــــــ میں دنیا بھر میں سب سے بڑا بدنصیب ہوں +

مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میرے سر پر کوہ غم ٹوٹتا ہے۔ نہ مجھے اس بات کی فکر ہے۔ کہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں لوگ تجھے نہ کہنے لگیں۔ کہ تو اپنے وعدے پورے نہیں کرتا +

(منورما الہ آباد (ہندی)

ارا کین حکومت

رات کے پچھلے پہر بارش ہونے لگی۔ آسمان کا رنگ ایسا نکھر آیا۔ جیسا کسی نے دودھ میں دھو دیا ہو۔ جھودویپ کا نوجوان بادشاہ اس منظر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اِسی حالت میں اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میری رعایا میں جن کے پاس چھاتا نہیں ہے۔ اُنہیں بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔ بادشاہ نے اُسی وقت محافظ محل کو بلایا۔ اور حکم دیا جا کر اسی وقت وزیر اعظم کو بلا لاؤ۔ ہم جاننا چاہتے ہیں۔ کہ ہماری حکومت میں کس قدر آدمی ایسے ہیں۔ جن کے پاس بارش میں لگانے کے لئے چھاتا نہیں +

وزیراعظم کو جب یہ اطلاع موصول ہوئی۔ تو اُس نے اُسی وقت کوتوال شہر کو طلب کیا۔ اور کہا معلوم ہوتا ہے کچھ مفسد پرواز لوگوں نے بادشاہ کو بہکا دیا ہے کہ اُن کی رعایا مصیبت میں ہے۔ اب وہ جاننا چاہتے ہیں کہ شہر میں کس قدر آدمی ایسے ہیں۔ جن کے پاس چھاتا نہیں۔ میں نے تم کو کس قدر محتاط رہنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن افسوس! تم نے ذرا پروا نہ کی۔ اب بولو کیا ہوگا +

کوتوال نے زمین کی طرف دیکھتے دیکھتے جواب دیا - مہاراج میں نے تو شاہی محل کے گرد پھولوں کے اس قدر پیڑ لگا رکھے ہیں - کہ باہر کا کوئی افلاس انگیز منظر دکھائی نہ دے سکے - پر ان مہاراج کو کس نے بہکا دیا تاہم میں ابھی انتظام کرتا ہوں +

یہ کہکر کوتوال اپنے دفتر میں چلا گیا - اور جاتے ہی اپنے سپاہیوں کو بلا کر کہا - شہر کا ایک ایک مکان چھان ڈالو - اور جتنے آدمی ایسے ملیں - جن کے پاس چھاتا نہ ہو - اُن کو گرفتار کرکے حاضر کرو +

شام کے وقت کئی ہزار آدمی جن کے پاس بارش میں سر کی حفاظت کے لئے چھاتا نہ تھا - سر کے بار سے آزاد کردیئے گئے - گھر گھر ماتم ہونے لگا - شہر سے آہ و بکا کی دلدوز صدائیں اُٹھنے لگیں - لیکن ان آوازوں کو شاہی محل کے گرد کی پھلواڑی نے اپنی بو اور خوبصورتی میں اُلجھا لیا - اور رحمدل بادشاہ کے کانوں تک نہ پہنچنے دیا +

رات کو وزیر اعظم بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہؤا - اور بولا - حضور! اب آپ کی رعایا میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں جن کے پاس بارش کے لئے چھاتا نہ ہو +

بادشاہ بہت خوش ہؤا - دوسرے دن وزیر اعظم کو کئی گاؤں انعام میں مل گئے - اور کوتوال کی اور اس کے عملہ کی دربار نے تعریف کی + (ناٹک کلکتہ (بنگالی)

پلیٹ فارم کی طاقت

پلیٹ فارم میں بہت طاقت ہے - یہ سوئے ہوئے ملکوں کو بیدار کر دیتا - یہ جاہل قوموں کو ترقی اور اقبال کے رستہ پر چلا دیتا ہے - یہ روشنی ہے - یہ طاقت ہے - اور اتنا ہی نہیں - یہ زندگی ہے - یہ زندگی کا سرچشمہ ہے - جاؤ اور جاکر کسی آتش بیان لیکچرار کا لیکچر سنو - اور پھر حاضرین کی طرف دیکھو - وہ کس طرح ہونٹ کاٹتے ہیں - اُن کی آنکھوں میں غصہ کی سرخی آتی ہے - اُن کا خون کھولتا ہے - وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں - اُن میں خوف نہیں رہتا - اُن میں فکر نہیں رہتا - اُن کی یاس امیدمیں تبدیل ہو جاتی ہے - وہ اپنی زندگی کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں - یہ ایک مقرر کی شعلہ بیانیوں کی طاقت ہے - لیکن اسکے قدموں کے نیچے پڑا ہؤا - لکڑی کا بیجان چبوترہ جسے عرف عام میں پلیٹ فارم کہتے ہیں - لیکچرار سے بھی طاقتور ہے +

لیکچرار لوگوں کو جدھر چاہتا ہے چلا لیتا ہے - پلیٹ فارم لیکچرار کو اپنے پیچھے لگا لیتا ہے - اُسے بدل دیتا ہے - اس سے جو چاہتا ہے کہلوا لیتا ہے - آپ ایک ہندو کو اور ایک مسلمان کو اتحاد کے کانگریسی پلیٹ فارم پر کھڑا کردیں - دونوں اتحاد کی ور

محبت کی اور صلح و آشتی کی تقریریں کریں گے۔ معلوم ہوگا۔ یہ رواداری کے مجسمے ہیں۔ اُن کو فرقہ وارانہ روگ کی ہوا بھی نہیں لگی ہوگی دو گھنٹے بعد آپ ہندو کو شدھی اور سنگھٹن کے اور مسلمانوں کو تبلیغ و تنظیم کے پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیں۔ اب وہ محبت اور رواداری کے لیکچرار نہیں۔ جنگ اور جوش کے لیکچرار ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف اشتعال دیتے ہیں۔ اور جن زبانوں سے دو گھنٹے پیشتر امرت برستا تھا۔ اب آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ آخر یہ کیوں۔ پلیٹ فارم کی وجہ سے۔ لیکچرار وہی ہیں پلیٹ فارم بدل گئے۔ اُنہوں نے لیکچراروں سے جو چاہا کہلوا لیا +

پلیٹ فارم میں کتنی طاقت، زندوں کو بدل دینے کا کیسا جادو ہے + (مانسی کلکتہ (بنگالی)

موت کی یاد

وہ آدمی کیسا احمق، کتنا ناعاقبت اندیش ہے۔ جو موسم بہار کے رنگین ایام کو دائمی سمجھ لیتا ہے۔ اور اُسے یہ خیال تک نہیں آتا۔ کہ خزاں کے دن مع اپنی اداسی اور مایوسی کے آہستہ آہستہ میری طرف سرک رہے ہیں۔ انسان اُن کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ مگر وہ انسان کو دیکھ لیتے ہیں۔ اور اُس پر، اور اُس کے خون کے دَوران پر اور اُس کے دل و دماغ کے عیش و عشرت پر اس طرح چھا جاتے ہیں۔ جیسے بادل آسمان پر۔ مگر اس سے بیوقوف وہ آدمی ہے جو زندگی میں موت کا خیال نہیں کرتا۔ اور سمجھتا ہے موت میرے لئے نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا دل کہتا ہے موت آئے گی۔ مگر دماغ ایسی راہ عمل اختیار کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے وہ کبھی نہیں مرے گا۔ دنیا ایسے ہی گمراہوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن لوگ اپنے آپ کو عقلمند تصور کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ دوسرے بھی ایسا ہی سمجھیں۔

اے انسان آنکھیں کھول۔ اور دن کی روشنی میں رات کی تاریکی دیکھ اور اُس کے لئے تیاری کر۔ ورنہ ہو وقت تیرے پاس دن کا سامان ہوگا۔ رات کی اشیاء نہ ہوں گی۔ اور رات کے وقت میں دن کی چیزیں کسی کام نہ آئیں گی

پھول کھلنے کا اور کملانے کا۔ سردی کے آنے کا۔ اور گرمی کے جانے کا موسم مقرر ہے۔ مگر موت کا سیاہ لمحہ کوئی نہیں جانتا۔ کب آجائے۔ اِس دنیا کے پیادے اور سپاہی تیرا انتظار کر لیں گے۔ مگر اُس دنیا کے سپاہی تجھے ایک لمحہ کی اجازت بھی نہ دیں گے۔ اور تجھے ان کی ہمراہی میں جانا پڑے گا۔ اپنا کام کر۔ کما۔ کھا۔ کھلا۔ جمع کر۔ لیکن موت کے لئے ہر وقت طیار رہ۔ اُس کے لئے طیاری کرنے کا کوئی خاص موسم قدرت نے مقرر نہیں کیا ہے +

(وارتا بمبئی (گجراتی)

فہرست مضامین

جلد ١٢ | بابت ماہِ ستمبر ١٩٢٧ء | نمبر ٣

تصویر:- عروس فتح

جہاںؔ نما

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات

جنگ اور صلح کا لائحہ عمل

آج کل ہندو اور مسلمان آنکھوں پر پٹّی باندھے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں اور ملک میں ایک اودھم مچا ہوا ہے ٹکے ٹکے کے لیڈر اور دو دو کوڑی کے اخبار نویس اپنی من مانی مصلحتوں کو مدنظر رکھ کر آتش بغض و عناد کو خوب ہوا دے رہے ہیں۔ عوام جو عقل و خرد سے ہمیشہ کورے ہی رہے ہیں اور ہمیشہ کورے ہی رہیں گے ان مطلب پرست لوگوں کی انگلیوں کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم کیا رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں کہیں پیپل کی ٹہنی کٹنے پر طوفان اُٹھ رہا ہے تو کہیں مسجد کے سامنے باجا بجنے پر قیامت برپا ہے۔ مخاصمت انگیزی اور مجادلہ آرائی کے لئے یہ وجوہ جس قدر حقیر ہیں اسی قدر مضحکہ خیز بھی ہیں اور اگر لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد کو انسان اپنا مقصد حیات ہی قرار نہ دے لے تو اس قسم کی طفلانہ حماقتوں کیلئے کوئی معقول وجہ جواز پیدا نہیں ہو سکتی

یہ خود پرست لوگ جو بھس میں چنگی ڈال کر دور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں اور در پردہ اپنے ذلیل مقاصد کو پورا کرنے میں مشغول ہیں اگر ذرا ... نظر سے کام لیں تو سمجھیں کہ انکی گروہ کار فرمائیوں نے ملک اور قوم کو بہ حیثیت مجموعی اسقدر سخت نقصان پہنچایا ہے کہ برسوں تک اسکی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ کاش یہ گم کردہ راہ لیڈر قوم کی قیادت سے دستبردار ہو جائیں اور اس غریب کو اسی کے حال پر چھوڑ دیں۔

جن کو خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بے مقصد آویزش یہ بے مدعا مبارز طلبی قوم کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی فساد کے لئے چند ناقابل توجہ چند مہمل اور بے معنی چند بے سروپا اور لغو وجوہ پیش کی جاتی ہیں لیکن اتحاد، اشتراک عمل اور ایک دوسرے کی امداد کے لئے بیسیوں معقول وجوہ موجود ہیں۔ اور صلح و امن کی راہ پر چل کر ملک بحیثیتِ مجموعی بے انتہا ترقی کر سکتا ہے۔ بقول سر پی سی رائے ان تنگ نظرانہ مخاصمتوں کے مقابلہ میں اتحاد اور تعاون عمل کے لئے کس قدر وسیع میدان ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہیضہ، ملیریا، طاعون اور دوسری وبائیں ہندو اور مسلمان میں تمیز نہیں کرتیں انکی روک تھام کے لئے اتحادِ عمل کی بے انتہا ضرورت ہے۔ گاؤں قصبوں اور شہروں کی صفائی اور حفظانِ صحت کی تدابیر بھی مشترک عمل کی متقاضی ہیں ملک بھر پر افلاس کی مصیبت طاری ہے اسکا علاج بھی متحدہ کوششوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں مختلف چھوٹے چھوٹے فرقوں کی الگ الگ کوشش کسی کام نہیں آسکتی کیونکہ جب تک ملک کا ملک اقتصادی انحطاط کی گہرائیوں سے نہ ابھرے اُس میں وقت تک حسب دلخواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ جبری تعلیم، صنعت و حرفت، زراعتی تربیت مصنوعات کی خرید اور پیداوار خام کی فروخت کے لئے انجمنہائے امدادِ باہمی کا قیام ملک کی حقیقی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں صلح و آشتی، اعتماد اور اتحادِ عمل کو اپنا مسلک بنائیں۔

چینیوں کا ایک قومی ترانہ

"اے خدا! ہمیں آدمی دے"

قوموں کا انحطاط اسی وقت ہوتا ہے جب اُن میں آدمی نہیں رہتے اور قوموں کو عروج بھی اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اُن میں آدمی پیدا ہو جاتے ہیں چینیوں کی موجودہ بیداری نے انکے دلوں میں تمام ان مردہ احساسات کو زندہ کر دیا ہے جن کا وجود قومی زندگی کے لئے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔ ذیل کا ترانہ جو ایک چینی اخبار میں شائع ہوا تھا شاید ہندوستانیوں کے حسبِ حال بھی ہو اس لئے ہم اس کا ترجمہ یہاں درج کرتے ہیں

"اے خدا ہمیں آدمی دے۔ اس وقت ہمیں زبردست دماغوں، عظیم الشان دلوں، صداقت شعار روحوں اور کارکن ہاتھوں کی ضرورت ہے۔

"اے خدا ہمیں ایسے آدمی دے جو بڑے بڑے عہدوں کے لالچ کا شکار نہ ہو جائیں جنکے ضمیر کو بڑی بڑی تنخواہیں خرید نہ سکیں جنکی اپنی رائے اور اپنا عزم ہو ـــــ وہ آدمی جن کو عزتِ نفس کا احساس ہو جن کا ضمیر ہو، جو جھوٹ سے بچتے ہوں کجروی سے گریز کرتے ہوں اور مفسدوں اور فتنہ پردازوں کا بے رو و رعایت قلع و قمع کرنے پر قادر ہوں۔

اے خدا ہمیں ایسے عظیم الشان آدمی دے جنکے دل دنیا کے ادنیٰ مقاصد سے پاک ہوں جنکا ظاہر و باطن ایک ہو کیونکہ جب پست فطرت اور خود غرض لوگ جو کام کے بجائے صرف باتیں بنانا جانتے ہیں جنگ زرگری میں مصروف ہوتے ہیں تو آزادی اپنی قسمت کو روتی ہے دنیا پر غلط کاری کا غلبہ ہو جاتا ہے اور صداقت اور عدل و انصاف کو کہیں جگہ نہیں ملتی۔

یہی حالت آجکل ہندوستان کی ہے، کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیربازی تو سنتے آئے تھے لیکن یہاں "لیڈر بازی" کا بازار گرم ہے، یہ لوگ اپنی مقصد آری کیلئے باہم لڑ لڑا کر قوم کی بربادی کے درپے ہو رہے ہیں۔ اگر لیڈروں کی نحوست آج ہمارے سر سے ٹل جائے تو ملک کی حالت بہت جلد سدھر سکتی ہے

ہندوستان اور مسئلہ تعلیم

برطانی حکمت عملی

یہ امر مسلم ہے کہ مہذب ممالک میں ہندوستان تعلیم کے لحاظ سے بہت ابتر حالت میں ہے، ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹر ہیرس (ناظم تعلیمات ممالک متحدہ امریکا) نے ایک تقریر کے دوران میں بعض حقائق کا انکشاف کیا تھا جن سے اس مسئلے کے متعلق ہندوستان میں برطانیہ نے جو حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے اُس پر روشنی پڑتی ہے۔ انکی تقریر کا اقتباس درج ذیل ہے

"ہندوستان میں تعلیم کے متعلق انگلستان کی حکمت عملی تہذیب کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے میں نے اس مسئلہ کا بہت غور و فکر سے مطالعہ کیا ہے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں انگریز مصلح خلق ولبرفورس نے تجویز کی کہ ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت کے لئے مدرس بھیجے جائیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ڈائرکٹر نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ سکولوں اور کالجوں کے قیام سے ہم حال ہی میں امریکہ کو ہاتھ سے کھو چکے ہیں اب ہندوستان میں اس غلطی کو دہراتا انتہائی ناعاقبت اندیشی ہے" برطانی ہندوستان میں آزاد سکولوں کا وجود عنقا ہے۔ جبری تعلیم کا بھی یہاں کوئی نظام نہیں انگلستان کو لازم ہے کہ اس قوم کو جس کی قدیم تہذیب اور حیرت انگیز فلسفہ دنیا بھر سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے تعلیم سے محروم نہ رکھے" جس زمانے میں ڈاکٹر ہیرس نے یہ الفاظ کہے تھے اس وقت سے لیکر اب تک تعلیم کے متعلق برطانی حکمت عملی [illegible] ہندوستانی صہبائے تعلیم کے [illegible] ہیں۔ کاش برطانیہ ساقی گری کے فرض کو پہچانے۔

رُباعیّات

(۱)

یارب! مجھے غم میں صبر و ہمت دینا
وہ کیف بھی جو جوش ہو وہ طبیعت دینا
ہمراہ ہو میرے ہر قدم پہ ثابت قدمی
اے بار خدا! مجھے یہ نعمت دینا

(۲)

غم دے کے مجھے بنا لیا ہے اپنا
کم دے کے مجھے بنا لیا ہے اپنا
اللہ رے کرم افزائی الفت تیرا
دم دے کے مجھے بنا لیا ہے اپنا

(۳)

وہ چاہ وہ کھیتیاں وہ گلشن میرا
وہ میرا گھروندا اور وہ آنگن میرا
تھی نقل وہ میری اصل سے بھی بہتر
ہائے وہ زمانہ ہائے بچپن میرا

(۴)

احکام خدا پہ دل سے عامل کب تھا
کچھ علم سے اپنے مجھ کو حاصل کب تھا
شکوہ کروں کس طرح شکایت کیسی
جو کچھ نہ ملا میں اس کے قابل کب تھا

بشیر احمد

جامِ صہبائی

(۱)

تیری ہستی کا کچھ یقیں بھی نہیں

اب تک کہیں بھی نہیں

میرے آگے ہے جلوہ موجود

دیکھتا ہوں تو ہے یقیں بھی نہیں

سوچتا ہوں تو کچھ کہیں بھی نہیں

(۲)

گو سلسلۂ دیر و حرم کو چھوڑا

واعظ کو برہمن کو صنم کو چھوڑا

افکار کی قید سے نہ آزاد ہوئے

زنجیرِ خیال نے نہ ہم کو چھوڑا

(۳)

ہو جائے عیاں جو مجھ پہ ہستی میری

پھر کوئی سنے صدائے ہستی میری

معبود ہوں خود ہی میں عبادت لیکن

ہے بے خبری خدائے ہستی میری

(۴)

مجبورِ فنا نہیں حقیقت میری

کچھ مجھ سے جدا نہیں حکایت میری

رازِ عدم و وجود کیا ہے یارا!

موجِ یمِ بیکراں ہے حیرت میری

اثر صہبائی

میرے بچّے، میرے آقا

(۱)

رائے چرن جب پہلے پہل اپنے آقا کے گھر میں آیا، اسکی عمر بارہ سال کی تھی۔ دونوں کے درمیان ذات پات کا کوئی فرق حائل نہ تھا اور اُسے اپنے آقا کے شیرخوار بچّے کو بہلانے کا کام دیا گیا۔ اسی طرح کچھ عرصہ گزر گیا۔ آخر بچّہ رائے چرن کی آغوش سے نکل کر مدرسہ میں داخل ہؤا۔ مدرسہ سے کالج میں گیا اور تعلیم کی تکمیل کے بعد عدالت کے محکمہ میں ایک عہدہ پر فائز ہؤا مگر جب تک اسکی شادی نہ ہوگئی تنہا رائے چرن ہی اس کا خدمت گار رہا۔ گھر میں بی بی کے آجانے کے بعد رائے چرن کو ایک کے بجائے دو آقاؤں سے سابقہ پڑا۔ اور پہلے گھر بار میں جو اختیارات اُسے حاصل تھے وہ سب کے سب اُسکے آقا کی بی بی کی طرف منتقل ہو گئے لیکن کچھ عرصے کے بعد ایک نئی ہستی کی آمد سے اس کے اس نقصان کی تلافی ہو گئی۔ انوکل کو خدا نے بیٹا دیا اور رائے چرن نے بہت جلد اپنی ان تھک توجہ سے بچے کو اپنے ساتھ مانوس کر لیا۔ وہ اسے ہاتھوں میں اوپر اچھالتا، اس سے بچوں کی غوں غاں میں باتیں کرتا، اپنا چہرہ اُسکے چہرے سے ملاتا اور پھر مسکرا کر الگ ہو جاتا۔

آخر بچے نے گھٹنیوں چلنا سیکھا اور لڑھتا پڑھتا اندر باہر آنے جانے لگا۔ جب رائے چرن اسکو پکڑنے کیلئے اس کے پیچھے جاتا تو بچّہ شرارت سے کھلکھلا کر ہنستا اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا۔ ان موقعوں پر بچے کی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری دیکھ کر رائے چرن دنگ رہ جاتا، اور پھر اس کی اماں سے کہتا "باؤ جی پرماتما نے چاہا تو ایک دن آپ کا بیٹا جج ہوگا"۔

رفتہ رفتہ رائے چرن کے لئے ہر صبح اپنے دامن میں نئے نئے معجزات لئے ہوئے نمودار ہونے لگی جب بچّے نے چلنا سیکھا تو رائے چرن کے لئے گویا تاریخ انسانی میں ایک نہایت اہم باب کا اضافہ ہؤا۔ جب بچّے نے اپنے باپ کو با۔ با، اور اپنی ماں کو ام۔ آں اور رائے چرن کو چن۔ آں کہنا سیکھا اس وقت رائے چرن کے دل میں خوشی کا ایک اتھاہ سمندر لہریں لینے لگا وہ ایک جہان کو یہ خبر سنانے کے لئے بیقرار نظر آتا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد رائے چرن کو اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے نئے نئے موقعے دیے گئے۔ بعض اوقات وہ اپنے دانتوں میں لگام پکڑ کر گھوڑا بنتا اور اِدھر اُدھر کدکڑے مارتا پھرتا۔ کبھی کبھی اُسے اپنے ننھے رستم سے کشتی بھی لڑنی پڑتی اور اگر وہ پہلوانی کے کسی داؤں پر چڑھ کر آخر کار پچھڑ نہ جاتا تو کمسن لڑنتیا دہائی تہائی سے آسمان سر پر اٹھا لیتا۔

انہیں دنوں انوکل کا تبادلہ ایک ایسے مقام پر ہؤا جو ایک دریا کے کنارے واقع تھا، راستہ میں کلکتہ سے گزرتے ہوئے

اس نے اپنے بچّے کے لئے ایک گڈّو لنا خریدا - اس کے علاوہ زرد اطلس کا ایک کوٹ، کمخاب کی ایک زرق برق ٹوپی اور سونے کی پابلیں اور کنگن بھی بچے کے لئے خریدے - رائے چرن کا معمول تھا کہ سیر کو باہر جاتے وقت اپنے ننھے آقا کو یہ چیزیں نہایت چاؤ چوچلے کے ساتھ پہنا لیا کرتا۔

پھر برسات کا موسم آیا، اور آئے دن طوفانی بادل برسنے لگے - دریا ایک بھوکے اژدہا کی طرح مکان قصبے اور کھیتوں کے کھیت نگلنے لگا - آس پاس کی لمبی لمبی گھاس اور خود رو پھول سیلاب میں ڈوب گئے - کنارے گر گر کر ہر وقت دھما دھم دریا میں گرتا رہتا اور طوفان کا بے پناہ شور دور دور تک سنائی دیتا - کف کے تیز بہتے ہوئے گالوں کو دیکھ کر دریا کی رو کی تیزی کا اندازہ ہوتا تھا

ایک دن سہ پہر کے قریب بارش تھمی - اس وقت بادل چھایا ہوا تھا لیکن آسمان روشن تھا اور ہوا میں خنکی تھی - رائے چرن کے خود مختار ننھے راجا نے ایسے خوشگوار موسم میں گھر پر ٹھہرے رہنا مناسب نہ سمجھا - چنانچہ مہاراج اچک کر اپنے گڈّولنے میں سوار ہوگئے اور رائے چرن گھوڑا بن کر اسکو کھینچنے لگا - آخر وہ دریا کے کنارے کے قریب دھان کے کھیتوں میں جا پہنچے - کھیتوں میں کوئی شخص نہ تھا، نہ دریا ہی میں کوئی کشتی نظر آتی تھی دریا کے اُس پار مغربی افق پہ ابر کچھ کھل گیا تھا اور بادل پھٹے پھٹے نظر آتے تھے اس خاموشی میں غروبِ آفتاب کا دلکش نظارہ اپنی تمام جگمگاتی ہوئی تجلیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھا اس وقت بچے نے دفعتہً اپنے سامنے ایک طرف انگلی سے اشارہ کیا اور کہا "چن آں! پھیلے پول" قریب ہی دلدل میں کدمبے کا ایک بہت بڑا درخت پھولوں سے لدا ہوا کھڑا تھا - ننھے راجا کی حریصانہ نگاہیں اس درخت پر جمی ہوئی تھیں - رائے چرن اس کا مطلب بھانپ گیا لیکن پھول لانے کے لئے اُسے گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں گھسنا پڑتا - اس لئے اس نے بچّے کو ٹالنے کے لئے دوسری طرف اشارہ کر کے کہا - آہا! دیکھو ننھے دیکھو کیسے اچھّے پرندے ہیں - اس کے بعد اس نے بچے کی توجہ ہٹانے کے لئے عجیب و غریب آوازیں نکالیں اور گڈّولنے کو دھکیلتا ہوا پرے لے گیا۔

لیکن ایک ایسا بچہ جسے جج بننا تھا، ایسی باتوں میں کہاں آنے والا تھا - اسکے علاوہ دوسری طرف اس کی دلچسپی کی کوئی چیز نہ تھی اور پھر کسی خیالی پرندے کا بہانہ بھی دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔

ننھا آقا پھول لینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اب رائے چرن کی چترائی کام نہ آسکتی تھی - آخر اس نے کہا "اچھا ننھے میاں تم گاڑی میں خاموش بیٹھے رہو اور میں جا کر پھول لاتا ہوں، لیکن دیکھنا پانی کے نزدیک نہ جانا"

یہ کہکر اس نے گھٹنوں تک اپنا کپڑا اوپر اُٹھا لیا اور کیچڑ میں لت پت ہوتا ہوا آہستہ آہستہ درخت کی طرف جانے لگا۔

رائے چرن کے جاتے ہی ننھے میاں گڈّولنے میں سے اچک کر نکلے اور بھاگتے ہوئے ممنوع پانی کے پاس جا پہنچے - بچے نے جب دیکھا کہ دریا چھپٹتا، چھینٹیں اڑاتا اور شور مچاتا ہوا بہہ رہا ہے تو اُسے یوں معلوم ہوا گویا نٹ کھٹ موجیں دس ہزار بچوں

کے قہقہوں کے ساتھ کسی بہت بڑے رائے چرن کی نظر بچا کر بھاگا بھاگ جارہی ہیں۔ اُن کی شرارت کو دیکھ کر اس ننھے سے آدم زاد کا کا دل بھی مضطرب اور بے قرار ہوگیا۔ اور وہ گاڑی سے نکل کر چوری چوری دریا کی طرف بھاگا۔ راستہ میں اس نے کسی درخت کی ایک چھوٹی سی گری پڑی سوکھی ٹہنی بھی اٹھالی اور دریا کے کنارے پہنچ کر اس سے مچھلیاں پکڑنے لگا۔ پانی کی شریر موجیں اپنی پراسرار آوازوں سے اُسے اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے بلارہی تھیں۔

رائے چرن پھولوں سے اپنا دامن بھر کر مسکراتا ہوا واپس آرہا تھا لیکن جب وہ گڈولنے کے پاس پہنچا تو وہاں اُسے کوئی نظر نہ آیا —— اس نے چار طرف نگاہ دوڑائی لیکن اُسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے دوبارہ گڈولنے پر نظر ڈالی لیکن اُسے کوئی نظر نہ آیا۔

خوف وہراس کے اُس اولیں لمحہ میں اس کا خون اس کے بدن میں جم گیا اس کی آنکھوں کے سامنے تمام کائنات ایک گہرے غبار میں چکر کھاتی ہوئی تیر رہی تھی اس نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی گہرائیوں میں سے ایک جگر دوز آواز نکالی "میاں! میاں ننھے میاں!"

جواب میں "چن۔ آں" کی کوئی آواز سنائی نہ دی کوئی بچہ شرارت کی ہنسی نہ ہنسا کسی بچے کی خوشی کی چیخوں نے واپس آنے پر اس کا خیر مقدم نہ کیا۔ البتہ دریا اُسی طرح چھینٹیں اڑاتا اور گنگناتا ہوا بہہ رہا تھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور گویا اسے انسان کے ایک "بچے" کی موت کے سے حقیر واقعہ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں۔

شام کا دھندلکا رات کی تاریکی سے بدلنے لگا اور بچے کی ماں کی گھبراہٹ ہر گھڑی زیادہ ہونے لگی۔ اس نے تلاش کے لئے ہر طرف آدمی دوڑادیئے وہ سب ہاتھوں میں چراغ لئے ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے آخر دریا کے کنارے انہوں نے دیکھا کہ رائے چرن کھیتوں میں دیوانہ وار بھاگ رہا ہے۔ اور بچے کو چلّا چلّا کر آوازیں دے رہا ہے —— "میاں! میاں! ننھے میاں!!"

جب نوکر رائے چرن کو گھر لے گئے تو وہ اپنی بائی جی کے قدموں پر گر پڑا، نوکروں نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس سے بار بار پوچھا کہ تم نے بچے کو کہاں چھوڑا تھا۔ لیکن وہ بجز اسکے کچھ جواب نہ دے سکا کہ مجھے یاد نہیں۔

اگرچہ ہر شخص کا خیال یہی تھا کہ دریا کی موجوں نے بچے کو اپنا لقمہ بنا لیا ہے مگر ایک ذرا سے شبہ کی گنجائش باقی رہ گئی تھی کیونکہ اسی دن سہ پہر کے وقت ایک خانہ بدوش قبیلہ گاؤں کے قریب سے گزرتا ہوا دیکھا گیا تھا۔

لیکن بچے کی ماں غم سے دیوانی ہو رہی تھی۔ اس مامتا کی ماری کو خود رائے چرن پر بھی شبہ ہو رہا تھا وہ اسے حسرت آمیز التجاؤں کے ساتھ الگ لے گئی۔ اور رو رو کر اُس سے کہنے لگی "رائے چرن میں تمہیں پر ماتما کا واسطہ دیکر کہتی ہُوں میرا بچہ مجھے واپس دے دو۔ ہائے میرا ننھا تم نے کیا کیا۔ رائے چرن جتنی دولت کہو حاضر کرتی ہُوں۔ تم میرا بچہ میرا لال مجھے دے دو۔"

جواب میں رائے چرن نے صرف اپنے ماتھے پر دوہتڑ مارا اور زار زار رونے لگا۔ بائی جی نے اُسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔
انوکل نے اپنی بی بی کو سمجھایا کہ تمہارا یہ شبہ صحیح نہیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ رائے چرن اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرتا
لیکن اسکی بی بی نے جواب دیا "اجی کیا معلوم کس وقت اس موئے کھوجڑے پیٹے اس مونڈی کاٹے کی نیت بگڑ گئی ہو۔ آخر سونے کا گہنا تو تھا ہی"
انوکل خاموش ہوگیا۔ اب زیادہ بحث بیکار تھی۔

(۲)

رائے چرن اپنے گاؤں میں چلا گیا۔ اس وقت تک اس کا کوئی بچہ نہ تھا اور نہ اسے امید تھی کہ اب کوئی بچہ پیدا ہوگا لیکن سال بھر بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ اسکی بی بی کے ایک بچہ پیدا ہوا اور وہ مرگئی۔ اس نوزائیدہ بچے کو پہلی نظر دیکھتے ہی رائے چرن کا دل سخت ناخوش ہوا اُسکے دل میں یہ دردناک خیال پیدا ہوگیا تھا کہ یہ بچہ "ننھے میاں" کی جگہ غصب کرنے کے لئے آیا ہے اس کے علاوہ اُس المناک حادثہ کے بعد جو اس کے آقا کے بیٹے کے ساتھ گزر چکا تھا، اپنے بیٹے کی خوشیاں منانا اس کی نظر میں ایک مکروہ جرم تھا، اور اگر اسکی ایک بہن جو بیوہ ہو چکی تھی بچے کی نگہداشت کا فرض اپنے ذمہ نہ لے رکھتی تو بچے کی زندگی زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکتی تھی۔

لیکن رائے چرن کی طبیعت میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب پیدا ہونے لگا۔ جب اس نئے بچے نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تو یہ بھی شرارت بھری نگاہوں کے ساتھ اندر باہر پھرنے لگا۔ اگر کوئی اسے پکڑنے کو جاتا تو اس سے بچنے کے لئے یہ بھی نہایت ہوشیاری اور عقلمندی کا ثبوت دیتا۔ اُس کی آواز، اُسکے قہقہے، اس کا رونا اور اس کے اشارے سب رائے چرن کے ننھے آقا سے ملتے تھے۔ جب یہ بچہ روتا تو رائے چرن کا دل اس کے سینے میں دھڑکنے لگتا۔ اسے یوں معلوم ہوتا کہ اس کا ننھا آقا دُور، بہت دُور کسی نامعلوم سرزمین میں اپنے "چن۔ آں" کے لئے رو رہا ہے۔

نیا بچہ بہت جلد باتیں کرنا سیکھ گیا۔ اور بچوں کی تتلی تتلی زبان میں با۔ با، با۔ با، ام۔ آں، ام۔ آں کہنے لگا۔ رائے چرن نے جب یہ الفاظ سنے جن سے پہلے بھی اس کا دل مانوس تھا، تو اس پر تمام حقیقت روشن ہوگئی۔ اس نے دل میں کہا کہ میرا ننھا آقا اپنے "چن۔ آں" کی محبت کو کبھی فراموش نہ کرسکتا تھا۔ اسی لئے اس نے دوبارہ میرے گھر میں جنم لیا ہے۔ اس خیال کے حق میں رائے چرن کے پاس چند ناقابل تردید دلائل موجود تھے۔

(۱) نیا بچہ ننھے میاں کی موت کے بعد بہت جلد پیدا ہوا۔

(۲) رائے چرن کی بی بی ادھیڑ تھی اور عمر بھر کے بعد اب بچہ پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔

(۳) نیا بچہ بھی با۔ با، اور ام۔ آں کہتا تھا اور اس کی باقی تمام حرکتیں بھی ننھے میاں سے ملتی تھیں۔

اب رائے چرن کو وہ سب الزامات یاد آگئے۔ جو ننھے میاں کی اماں نے اس پر لگائے تھے۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ آہ ماں کے دل سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ وہ سچی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے اس کا بچہ چرا لیا ہے وہ یہ سوچ کر سخت پچھتایا کہ اب تک اس نے بچے سے اتنی بے اعتنائی کیوں برتی ہے۔ اور پھر دن رات ایک وفادار خادم کی طرح بچے کی خدمت کرنے لگا وہ اس کی پرورش اس طرح کرتا تھا گویا وہ کسی بہت بڑے امیر کا بیٹا ہے۔ اس نے بچے کے لئے ایک گڈولنا، کمخاب کا زرد کوٹ اور زری کی ٹوپی خریدی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی بی بی کا زیور گلا کر اس کے لئے کنگن اور پائلیں بھی بنوائیں

رائے چرن گاؤں کے دوسرے بچوں کو اس سے کھیلنے کی اجازت نہ دیتا تھا بلکہ دن رات خود اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوا تو اس کا مزاج لاڈ پیار سے بہت بگڑ گیا تھا۔ اور وہ اس قدر نفیس لباس پہنتا تھا کہ دوسرے بچے ٹھٹھے سے اسے "مہاراج ادھیراج" کہا کرتے تھے اور گاؤں کے دوسرے لوگ حیران تھے کہ رائے چرن کیوں اس بچے کے پیچھے اس قدر پگلا ہو گیا ہے۔

آخر بچہ کو مدرسہ میں داخل کرنے کا وقت آیا۔ رائے چرن نے اپنی زمین فروخت کر دی اور کلکتہ کو روانہ ہوا جہاں سخت جدوجہد کے بعد اسے ایک امیر آدمی کے ہاں ملازمت ملی۔ اس کے بعد اس نے بچہ کو مدرسہ میں داخل کر دیا۔ رائے چرن نے اُس کو اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ لباس اور اعلیٰ خوراک بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اس زمانہ میں وہ خود صرف خشکہ کے دو چار نوالے کھا کر اپنے دن کاٹتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا "آہ میرے بچے، میرے آقا! تمہیں مجھ سے کتنی محبت تھی کہ تم میرے ہی گھر میں آگئے۔ ننھے میاں خدا نہ کرے کہ تمہیں میری وجہ سے کوئی تکلیف ہو۔

اسی طرح بارہ سال گزر گئے اور لڑکے کو لکھنے پڑھنے میں شدبد ہو گئی۔ لڑکا خوش و خرم تندرست اور خوبصورت تھا، اُسے اپنے جسم کی دیکھ بھال کا بہت خیال تھا اور اکثر مانگ پٹی میں لگا رہتا تھا۔ وہ نفیس اور گراں قیمت چیزیں خریدنے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتا۔ اس کے دل میں رائے چرن کی وہ وقعت نہ تھی جو باپ کی ہونی چاہئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رائے چرن بالکل نوکروں کی طرح اس کی خدمت کرتا تھا ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ رائے چرن اس بات کو لوگوں سے چھپاتا تھا کہ وہی پھیلنا کا باپ ہے۔

مدرسہ کے جس اقامت خانے میں پھیلنا مقیم تھا وہاں کے لڑکے رائے چرن کے گنوارپن کی ہنسی اڑایا کرتے تھے اور اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خود پھیلنا بھی اپنے باپ کی پیٹھ کے پیچھے اس ہنسی ٹھٹھے میں شامل ہو جاتا تھا لیکن

دراصل اقامت خانے کے سب بچوں کو اس سیدھے سادھے نیک دل بڈھے سے انس تھا اور بھیلینا بھی اس کا بہت گرویدہ تھا لیکن اس کی محبت ویسی ہی تھی جیسی کسی وفادار نوکر سے ہوسکتی ہے۔

رفتہ رفتہ رائے چرن بڑھاپے سے کمزور ہونے لگا۔ اس کا آقا ہر وقت اسکے ادھورے کاموں میں عیب نکالتا رہتا تھا۔ رائے چرن بچے کی خاطر ایک مدت سے فاقے کاٹ رہا تھا اور اب اس میں کام کرنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔ اس کا حافظہ بہت کمزور ہوگیا ہر بات اسے بہت جلد بھول جاتی تھی۔ بلکہ کوئی بات اس کے دماغ میں سما ہی نہ سکتی تھی لیکن اس کا آقا اس سے ایک تندرست جوان ملازم کیطرح خدمت لینا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں رائے چرن کے کسی عذر کی پذیرائی نہ ہوتی تھی۔ زمین کی فروخت سے جو روپیہ اُسے ملا تھا اس میں سے ایک پائی باقی نہ رہی تھی۔ ادھر لڑکا ہر وقت اپنے کپڑے لتّے کے لئے جھڑ جھڑ کر مرا جاتا تھا وہ آئے دن روپے کے لئے جھگڑتا رہتا۔

(۳)

آخر رائے چرن نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی اور بھیلینا سے کہا کہ تم یہاں ٹھہرو میں ایک ضروری کام کے لئے گاؤں جا رہا ہوں میں بہت جلد واپس آجاؤں گا"

یہاں سے چل کر وہ سیدھا اس شہر میں پہنچا۔ جہاں انوکل مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ انوکل کی بی بی ابھی تک اپنے بچے کے سوگ سے فارغ نہ ہوئی تھی وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔ پہلے بچے کی موت کے بعد اب تک کوئی دوسرا بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔

ایک دن انوکل کئی گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد گھر میں آکر سستا رہا تھا اور اسکی بی بی ایک لمبا ٹیکے سادھو سے منہ مانگے دام دے کر کوئی بوٹی مول لے رہی تھی جس کے متعلق سادھو کا دعویٰ تھا کہ اس کے استعمال سے بے اولادوں کو اولاد کی نعمت میسر آجاتی ہے۔ اس وقت صحن میں صاحب سلامت کی صدا سنائی دی۔ انوکل نے باہر نکل کر دیکھا تو اس کی نظر رائے چرن پر پڑی۔ اپنے پرانے خدمتگار کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ بہت دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا اور دوبارہ اسے ملازمت پر بحال کرنے کے لئے بھی اس نے آمادگی ظاہر کی۔

رائے چرن کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اس نے کہا

"میں اپنی بائی جی کو ڈنڈوت کرنا چاہتا ہوں"

انوکل اُسے مکان کے اندر لے گیا۔ بائی جی رائے چرن سے انوکل کی طرح تپاک کے ساتھ نہ ملیں مگر رائے چرن نے اس بات کا خیال نہ کیا اور لپٹ دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

"بائی جی! دریا کا قصور نہ تھا، آپ کا بچّہ میں نے چرایا تھا"

انوکل چلّا کر بولا "ہائیں! ہے پرماتما! ارے کیا کہتے ہو؟ بچہ کہاں ہے؟ اُسے لاؤ"

رائے چرن نے کہا "وہ میرے پاس ہے میں اُسے اترسوں یہاں لاؤں گا"

یکشنبہ کا دن تھا، عدالت بند تھی، میاں بی بی دونوں سڑک پر نظریں جمائے بیٹھے تھے اور صبح سے رائے چرن کے لئے ہمہ تن انتظار بن رہے تھے۔ دس بجے کے قریب رائے چرن نمودار ہوا۔ وہ پھیلنا کا ہاتھ تھامے ہوئے چلا آرہا تھا۔ انوکل کی بی بی بے قرار ہوکر آگے بڑھی اور کوئی سوال کئے بغیر اس نے لڑکے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ وہ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کبھی وہ روتی، کبھی ہنستی، کبھی بچّے کا سر اور ماتھا چومتی اور بھوکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی۔ بچہ خوبصورت تھا اور اس کا لباس بھی شرفا کا سا تھا۔ انوکل کا دل بھی اس کو دیکھ کر شفقت سے بھر آیا لیکن وہ آخر مجسٹریٹ تھا اس لئے اُس نے رائے چرن سے پوچھا

"تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟"

"اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ پرماتما ہی جانتا ہے کہ میں نے آپ کا بچّہ چرایا۔ دنیا میں اور کوئی نہیں جانتا"

لیکن جب انوکل نے دیکھا کہ اس کی بی بی لڑکے سے دیوانہ وار لپٹ رہی ہے تو اس نے دل میں کہا کہ اب ثبوت مانگنا محض بے کار ہے۔ اس نے سوچا کہ آخر رائے چرن کا سا بڈھا آدمی اس قسم کا لڑکا لا ہی کہاں سے سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمیں ایسا فریب دے۔ مگر دفعتہً اُس نے درشت لہجہ میں کہا "رائے چرن اب تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

رائے چرن نے ہاتھ باندھ کر بھرّائی ہوئی آواز سے کہا "میرے سوامی! میں کہاں جاؤں۔ میں بڈھا ہوں، ایک اپاہج کو کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

انوکل کی بی بی نے کہا "اب اسے رہنے بھی دو۔ ذرا بچّے کا دل بہلا رہے گا۔ میں نے اس کا قصور معاف کیا"

انوکل آخر مجسٹریٹ تھا اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "نہیں، وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ اس کا جرم ایسا نہیں کہ معاف کیا جائے۔

رائے چرن نے اپنا سر انوکل کے قدموں پر رکھ دیا اور کہا "میرے آقا! مجھے یہاں رہنے دو۔ یہ میرا کام نہ تھا۔ یہ سب کچھ پرماتما نے کیا تھا۔

رائے چرن نے جب خدا پر الزام لگایا تو انوکل کی روح کو اور بھی تکلیف ہوئی۔ پھر اس نے کہا "مجھے اب تم پ

اعتبار نہیں رہا۔ میں اب تمہیں یہاں نہیں رکھ سکتا تم اپنی غدّاری کا ثبوت دے چکے ہو۔"

رائےچرن اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "میرے سوامی! یہ میرا کام نہ تھا۔"

"تو آخر کون مجرم ہے؟"

"وہ میرے پھوٹے ہوئے بھاگ، کرم ریکھا امٹ ہے۔"

کسی تعلیم یافتہ شخص کے سامنے اس قسم کے بہانے کارگر نہیں ہوسکتے۔ انوکل کا دل موم نہ ہوا۔

جب پھیلنا کو معلوم ہوا کہ وہ ایک متمول مجسٹریٹ کا بیٹا ہے اور رائےچرن نے اُسے فریب دے رکھا تھا، تو پہلے اسے بہت غصہ آیا، لیکن پھر رائےچرن کو بپتائیں دیکھ کر اس کا دل پسیجا اور اس نے انوکل سے کہا "پتاجی! اسکا قصور معاف کر دیجئے اور اگر آپ اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے تو پھر کم از کم اس کیلئے کچھ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیجئے۔"

یہ الفاظ سن کر رائےچرن بالکل خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنے بیٹے کے چہرے پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ پھر اپنے آقا اور اس کی بی بی کے سامنے جھک کر آداب بجالایا اور گھر سے نکل کر باہر ہجوم میں غائب ہوگیا۔ مہینے بھر کے بعد انوکل نے رائےچرن کے لئے کچھ روپیہ اس کے گاؤں میں بھیجا۔ لیکن روپیہ واپس آگیا۔ گاؤں میں اس نام کا کوئی شخص نہ تھا۔

(ٹیگور)

حامد علی خاںؔ

غزل

مجھے ہیں یاد کسی غمگسار کی باتیں ۔۔۔ مزے مزے کی وہ باتیں وہ پیار کی باتیں

بجا ہیں گر تری باتیں بجا سہی ناصح ۔۔۔ مگر نہیں یہ مرے اختیار کی باتیں

کبھی تڑپنا کبھی خون ہوکے بہ جانا ۔۔۔ یہ ہیں ہمارے دلِ بےقرار کی باتیں

رہے نہ آپ کے دل میں غبار کچھ باقی ۔۔۔ سنیں حضور جو اس خاکسار کی باتیں

فلک پہ دیکھ کے حیران ہیں فرشتے بھی
یہ فرشِ خاک پہ مشتِ غبار کی باتیں

مصطفٰی خاں بی۔اے

غزل

نشتر کہوں سناں کہوں پیکِ قضا کہوں ۔۔۔ تیری نگاہِ ناز کو اے دوست کیا کہوں
پہنچی ہے بوئے زلفِ معنبر کہاں کہاں! ۔۔۔ کس سے حدیثِ شوخیٔ دستِ صبا کہوں
زاہد کو حسن و عشق سے کد ہے ہُوا کرے ۔۔۔ اس بے شعور سے میں کہوں بھی تو کیا کہوں
اس فتنہ گاہِ ناز کا آئیں کچھ اور ہے ۔۔۔ میرا بھی خوں ہو تو اُسے خود ہی روا کہوں
چمکی ہزار بار وہ تیغ اور ہزار بار ۔۔۔ تڑپا میں خاک پر کہ اُسے مرحبا کہوں
یہ کس نے آبِ گُل ترے رُخ پر چھڑک دیا ۔۔۔ ہلکی سی اک روانیٔ موجِ حیا کہوں
وہ دن خدا کرے کہ کبھی تجھ سے رُو بہ رُو ۔۔۔ افسانۂ کرشمہ و ناز و ادا کہوں
یہ بھول کر کہ کون ہُوں کیا کہہ رہا ہُوں میں ۔۔۔ جو کچھ ہو دل میں تجھ سے کہوں برملا کہوں
تیری قسم کو، تیرے تغافل کے عذر کو ۔۔۔ میں جُھوٹ جان کر بھی زباں سے سچ کہوں
یہ سحر کیا ہے، آہ یہ کیسا فریب ہے ۔۔۔ دل مانتا نہیں کہ تجھے بے وفا کہوں

ضد کر کے پھر مُجھے درِ ذلت پہ لے گیا
اس طفلِ بے شعور کو اس دل کو کیا کہوں

"بیگانہ"

خمکدۂ حالی

مولانا حالی مرحوم نے سرسید علیہ الرحمۃ کے ایما اور اثر سے قدیم رنگ کی شاعری کو چھوڑ کر جو نیا رنگ اختیار کیا تھا، اس نے ان پر قدیم شاعری کے پرستاروں سے خشک شاعر کا آوازہ کسوایا۔ بعض لوگ تو یہاں تک بڑھے کہ انہوں نے حالی کے شاعر ہونے ہی سے انکار کر دیا۔ افسوس کہ اس خیال کے لوگوں نے حالی کے دیوان کی قدیم غزلوں کی طرف توجہ نہیں کی جنکو دیکھ کر اس قسم کے طعنوں کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اُنکی غزلوں کے بعض مداحوں کا خیال بھی یہ ہے کہ حالی ان غزلوں کے اعتبار سے کسی طرز خاص کے موجد نہیں کہلا سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے شیفتہ کی طرح غالب اور مومن کی تقلید کی لیکن حالی کا خاص سوز و گداز اور انکے شعر کی سنتی بلاشبہ اپنے رنگ میں یکتا ہے جی چاہتا ہے کہ اس صہبائے مست کے جام لنڈھاتے ہی چلے جائیں لیکن افسوس کہ اس قلیل فرصت میں زیادہ گنجائش نہیں

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

جس دل کو قیدِ ہستیٔ دنیا سے ننگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب

اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مغاں ہے اب

ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
اے جذبِ دل مدد کہ دمِ امتحاں ہے اب

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جانتا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا

رات انکو بات بات پہ سو سو دیئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

سنگِ گراں ہے راہ میں تسکینِ یار کا
اب دیکھنا ہے زورِ دلِ بےقرار کا

اک خُو سی پڑ گئی ہے تحمل کی ورنہ اب — وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

عہدِ وصال دل نے بھلایا نہیں ہنوز — عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز
آیا نہ ہوگا اس کو تغافل میں کچھ مزا — ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
سرمایۂ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل — باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں — ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا — کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کس نشہ میں ہے چُور خدا جانے اس قدر — حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
خود رفتگیٔ شب کا مزا بھولتا نہیں — آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو — کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی — دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

کل مدعی کو آپ پہ کیسا کیا گماں رہے — بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ امید — اب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی — اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے

حامد علی خاں

طامس گرے کے کلام پر ایک تنقیدی نظر

اردو داں طبقہ میں تنقید کا صحیح مذاق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ترقی یافتہ زبانوں کے نقاد اپنی زبان کے ادیبوں پر جس طرح تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اُس کے اردو زبان میں نمونے دکھائے جائیں۔ چنانچہ اسی غرض سے ہماری یہ اس قسم کی پہلی کوشش ہے جو مشہور انگریز نقاد او رشاعر میتھیو آرنلڈ کے ایک تنقیدی مضمون کا ترجمہ ہے۔

انگریزی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے آرنلڈ کے تنقیدی خیالات کی وسعت اور اس کے تنقیدی مضامین کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اگرچہ اُس نے بڑے بڑے اور متعدد ادبی دیوتاؤں پر اعلیٰ سے اعلیٰ تنقیدیں لکھی ہیں لیکن ہم نے اس کی اس تنقید کو جو اس نے طامس گرے پر کی ہے حسب ذیل وجوہ سے ترجمہ کے لئے پسند کیا ہے

۱۔ گرے سے اردو داں طبقے کے کان قطعی ناآشنا نہیں ہیں کیونکہ اس کی بعض بہترین نظموں کا ترجمہ اردو میں ہوچکا ہے۔

۲۔ اس کا کلام نہایت ہی قلیل المقدار ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو آسانی سے اس کا اردو ترجمہ کیا جاسکتا ہے

۳۔ آرنلڈ نے جس طرح سے تنقید کی ہے اس کو سمجھنے اور اس کی اصلی روح سے واقف ہونے کے لئے گرے کے کلام کے مطالعہ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے۔

۴۔ اس طریقۂ تنقید نگاری کی اردو کو فی الحال سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ اس میں جس طرز سے گرے کی زندگی اور اسکے کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ اردو میں بالکل معدوم ہے۔

اس تنقید کی جن خصوصیات کی طرف اردو کے تنقید نگاروں اور تنقیدی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو توجہ کرنی چاہئے۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں۔

نقاد نے زیر بحث شاعر کے کلام کی صرف مقدار اور نوعیت کو اپنی تنقید کا موضوع قرار دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مقدار کے لحاظ سے زیر تنقید شاعر کا کلام بہت کم ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ نوعیت کے لحاظ سے اس کا کلام کم مرتبہ نہیں۔ اس صورت میں وہ اس بات کو معادم کرتے اور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ شاعر کا کلام مقدار میں اس قدر قلیل کیوں ہے؟ اسکی توجیہ کے لئے اسکو حسب ذیل امور کا گہرا مطالعہ کرنا پڑتا ہے

۱۔ شاعر کی زندگی کی نوعیت۔

۲۔ شاعر کا ماحول اور اس کا اثر شاعر اور اس کے کلام پر۔
۳۔ شاعر کی خانگی تحریریں۔
۴۔ شاعر کے احباب کے خطوط اس کے نام۔
۵۔ شاعر کے دوستوں کے آپس کے خطوط جن میں انہوں نے شاعر کا ذکر کیا ہے۔
۶۔ شاعر کی وفات کے بعد اسکے مخالفین اور موافقین کی خانگی تحریریں۔
۷۔ شاعر کی متفرق سوانحعمریاں اور اس کے متعلق تنقیدی مضامین۔

ان تمام امور کی تحقیق و تفتیش کوئی آسان کام نہیں۔ گرے اگرچہ انگریزی زبان کا زبردست شاعر نہیں ہے لیکن انگریزی کا ایک شاعر ہونا ہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اس کے متعلق نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہوگا چنانچہ نقاد ان سب کے مطالعہ سے اپنے مطلب کی شہادتیں حاصل کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ اس اثنا میں اسکو کئی اور نخچوں یعنی شاعر کے کلام کی نوعیت اس کے متعلق اعتراضات کی تردید دوسرے شاعروں کے ساتھ اس کے مقابلہ و موازنہ میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اس ہفتخوان سے گذرنے کے بعد وہ شاعر کی حمایت کرنے میں ایک خاص رائے تک پہنچتا ہے جس کا اظہار اس کے اس تنقیدی مقالہ کا اصلی موضوع ہے۔ اگرچہ یہ کوئی زیادہ شاندار موضوع نہیں ہے، لیکن ہمارے اس ترجمہ کا مقصد بھی تو یہ معلوم کرنا نہیں ہے کہ نقاد کا موضوع کیا ہے۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ وہ کس موضوع پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے۔

کیا ہماری زبان میں اس محنت اور کاوش کے ساتھ تنقیدیں لکھی جاتی ہیں؟ اور کیا ہمارے تنقید نگار اس وقت بھی جب کہ ہمارے اکثر بڑے بڑے انشاپردازوں اور شاعروں کے خانگی خطوط، سوانحعمریاں اور دیگر متعلقات اُنکے سامنے چھپی ہوئی صورت میں نظر آرہے ہیں، یہ عذر کرنے کے مجاز ہوسکتے ہیں کہ اردو میں ابھی کافی مواد ہی موجود نہیں؟)

کیمبرج کے پمبروک ہال کا ماسٹر، گرے کا دوست اور وصی جیمس براؤن، گرے کی وفات کے دو ہفتہ بعد اسکے ایک اور دوست، اولڈ پارک ڈرہم کے ڈاکٹر وارٹن کو ایک خط میں حسب ذیل عبارت لکھتا ہے۔

"مسٹر گرے کے کمرے میں اب ہر چیز سیاہ اور غمناک نظر آتی ہے، اسکا ایک نشان بھی وہاں باقی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک عرصہ سے غیر آباد ہے۔ اور کسی مکین کا حاجتمند ہے۔ میرے دل میں اس کے اثرات پائدار ہیں اور چند سال کے اس عرصہ میں جس میں مجھے زندہ رہنے کی امید ہوسکتی ہے، میں ان سے فائدہ حاصل کرتا رہوں گا اس نے کبھی زبان نہ کھولی۔ لیکن ان چند ذرا ذرا سے اشاروں سے جو مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس سے اخذ کئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ

اُس نے اپنے تئیں ایک عرصہ قبل ہی سے بہ نسبت دوسروں کے اپنے خاتمہ سے بہت زیادہ قریب سمجھ لیا تھا"
"اس نے کبھی زبان نہ کھولی" ان چند الفاظ میں گرے کی تمام سوانحعمری خواہ وہ ایک عام انسان کی حیثیت سے ہو یا ایک شاعر کی حیثیت سے پیش ہو جاتی ہے۔ الفاظ لکھنے والے کے قلم سے بے ساختہ ٹپک پڑے ہیں۔ اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اتفاق کی بات تھی لیکن ہمیں ان پر قائم رہ کر اُن کے معنی پر غور کرنا چاہیے کیونکہ اُن کے سمجھ جانے کے بعد ہم گرے سے واقف ہو جائیں گے۔

اگرچہ وفات کے وقت اس کی عمر پچپن ۵۵ سال کی تھی، اور اگرچہ اُس نے فرصت اور آسائش کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی لیکن اسکی تمام شاعری چند ہی صفحات پر مشتمل ہے۔ شاعری میں اُس نے کبھی زبان نہیں کھولی" تاہم وہ شہرت جو چند ہی صفحات کے باعث اس نے حاصل کی ہے بہت زیادہ شاندار ہے۔ یہ سچ ہے کہ جانسن نے اس کا ذکر نہایت سرد مہری اور بے توجہی کے ساتھ کیا ہے۔ گرے کو جانسن سے نفرت تھی، چنانچہ اُس نے اُس سے ملاقات پیدا کرنے سے انکار کر دیا تھا کسی کو خیال آسکتا ہے کہ جانسن نے اسی وجہ سے جذبہ میں آکر لکھا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جانسن فطرتاً گرے اور اسکی شاعری کے ساتھ انصاف کرنے کے ناقابل تھا۔ یہ خود ایک کافی توجیہ ہے ان کمزوریوں کی جو اس نے گرے پر تنقید کرتے وقت ظاہر کیں ہم اس باب میں ایک اور توضیح پیش کرتے ہیں جو مسٹر کول کے کاغذات سے بہم پہنچتی ہے۔ کول کہتا ہے کہ "جب جانسن گرے کی سوانحعمری شائع کر رہا تھا میں نے اس کو اس کے لئے کافی مواد بہم پہنچایا لیکن وہ جلد از جلد اپنی ان محنتوں کو اختتام تک پہنچانے کا خواہشمند تھا" جانسن گرے کا جس کی وہ سوانح عمری لکھ رہا تھا طبعاً ہمدرد نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جس وقت اُس نے سوانحعمری لکھی ہے وہ عجلت میں تھا۔ اُس نے گرے کے ساتھ ناانصافی کی لیکن خود حالات جانسن کے ماہرنے اس بارے میں ناانصافی کو برقرار رکھنے میں ناکامی حاصل کی ہے۔ لارڈ مکالے "گرے کی سوانحعمری" کو جانسن کی مصنفہ سوانحعمریوں میں سب سے بدترین خیال کرتا ہے اور مکالے کے علاوہ بھی اس کو متعدد معترضوں سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ اسکے باوجود بھی گرے کی شاعرانہ شہرت بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ اس کے پہلے سوانح نگار شاعر میسن نے اس کے نوحہ میں اسکو پنڈار کا ہم پلہ قرار دیا ہے وہ کہتا ہے برطانیہ نے دیکھی ہے

...... ایک ہومر کی آگ ملٹن کے ساز میں
ایک پنڈار کا جوش گرے کے تاروں میں

پوپ کی طرز شاعری اور اسکی عام مقبولیت نے شعر و سخن کا مطالعہ کرنے والوں کو اول اول گرے کا دل کھولکر خیر مقدم کرنے سے باز رکھا۔ ایلیجی (نظم گورستان) نے خوش کیا اور سوائے خوش کرنے کے کچھ نہ کر سکی۔ لیکن گرے کی شاعری نے

بہ حیثیت مجموعی اس کے معاصرین کو بہ نسبت خوش کرنے کے زیادہ متعجب کر دیا وہ اس قدر غیر مانوس اور مروجہ شاعری سے اس قدر علیحدہ تھی! گرے کی وفات کے ساتھ اُس نے عوام اور ساتھ ہی خواص کے دل میں وہی جگہ پیدا کر لی چنانچہ گرے کا دوسرا سوانح نگار مسٹ فرڈ لکھتا ہے کہ:۔ "ان کارناموں نے جن کی طرف یا تو معاصرین نے توجہ ہی نہیں کی تھی یا جن کا مذاق اُڑایا تھا، اب گرے اور کالنز کو ہمارے بزرگ ترین نگار شعرا کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے" غرض کسی طرح کیوں نہ ہو ان کی شہرت قائم ہو چکی تھی اور اگرچہ وہ مقبولیت کے ساتھ نہیں پڑھے جاتے تھے تاہم نہایت اعلیٰ سمجھے جاتے تھے۔ جانسن کا گرے کی تحقیر کرنا "مذموم" سمجھا جاتا تھا۔ اور اس پر سختی سے الزام لگایا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام پر بی ٹی نے سر ولیم فاربس کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔ "عصر حاضر کے تمام شعرا میں مسٹر گرے کی سب سے زیادہ توقیر کی جاتی ہے۔ اور میرا یہ خیال انصاف پر مبنی ہے" کوپر لکھتا ہے "میں گرے کا کلام پڑھتا رہا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ شیکسپئر کے بعد صرف وہی ایک شاعر ایسا ہے جو عظیم الشان کہلا سکتا ہے، شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس کے متعلق کبھی ایک دوسری رائے رکھتا تھا میں متعصب تھا" آدم اسمتھ کہتا ہے "گرے میں ملٹن کی عظمت اور پوپ کی نزاکت اور روانی شامل ہے اور سوائے اس کے کہ وہ کچھ زیادہ لکھتا شاید کوئی چیز اس کو انگریزی زبان کا سب سے بڑا شاعر بنانے میں مانع نہیں ہو سکتی" اور ہم سے قریب ہی کے زمانہ میں سر جیمس میکنٹاش گرے کے متعلق اس طرح رائے ظاہر کرتا ہے کہ:۔ "اس نے اس شان و شوکت کو بلند ترین رتبہ پر پہنچا دیا جو شاعرانہ اسلوب کو حاصل ہو سکتی ہے"

ایک ایسے شاندار شاعر کے کلام کی کمی کے متعلق ہم کیا توجیہ کر سکتے ہیں؟ کیا ہم یہ کہہ کر اس کی توجیہ کر سکتے ہیں کہ گرے کو اس مرتبہ کا شاعر قرار دینا لغو ہے۔ یا یہ کہ اس میں جودت اور قوت عمل کی کمی تھی۔ اور اس لئے اس کے کلام کی مقدار بھی کم تھی اور نیز یہ کہ اس کی صرف ایک نظم ایلیجی کی مقبولیت (جو زیادہ تر موضوع کی مرہون منت ہے) کے باعث اس کو وہ تمام شہرت حاصل ہوئی جس کا وہ دراصل مستحق نہیں تھا؟ وہ خود اس مدح و ستائش کے دھوکے میں نہیں آیا تھا جو اس کی نظم ایلیجی کے متعلق ظاہر کی گئی تھی۔ ڈاکٹر گرے گری لکھتا ہے کہ:۔ "گرے نے مجھے شدت سے کہا کہ ایلیجی نے جو مقبولیت حاصل کی وہ قطعاً موضوع کے باعث ہے اور اگر وہ نثر میں لکھی جاتی تب بھی عوام اس کا اسی طرح خیر مقدم کرتے" یہ ذرا زیادتی ہے۔ ایلیجی ایک خوبصورت نظم ہے اور اس کی تعریف کرنے میں عوام نے شاعری کے حقیقی مذاق کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ایلیجی کی بہت زیادہ کامیابی اس کے موضوع کے باعث ہے نیز یہ کہ اس نے بہت زیادہ غیر محدود اور بے انتہا تعریف حاصل کی ہے۔

غرض خود گرے نے کہہ دیا تھا کہ ایلیجی شاعری میں اس کا بہترین کارنامہ نہیں، اور وہ صداقت پر تھا، باوجودیکہ

ایلیجی اعلیٰ تعریف کی مستحق ہے یہ صحیح ہے کہ گرے کے دوسرے کارناموں میں اسکی شاعرانہ قوتیں بہ نسبت اُن کے جو ایلیجی میں ظاہر ہوئی ہیں زیادہ اعلیٰ ہیں۔ لہذا ایک شاعر کی حیثیت سے وہ بہت زیادہ شہرت کا مستحق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے نقادوں اور عام لوگوں نے کامل انصاف کے ساتھ اسکی تعریف نہ کی ہو۔ پس ہم پھر اس سوال پر واپس آتے ہیں کہ:۔ ایک اصلی قابلِ لحاظ شاعر کے کارناموں کی کمی کے متعلق ہم کیا توجیہ کر سکتے ہیں؟

گرے کے کارنامے کم ضرور ہیں، اس قدر کم کہ اس بارے ہیں اس کے متعلق معلومات کے ساتھ خود شاعر کی نسبت معلومات کا اضافہ کرنا خاص طور پر دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ گرے کے خطوط، نیز اس کے متعلق اس کے احباب کی تحریروں کے باعث حسنِ اتفاق سے ہمارے لئے اسکو جاننا اور اس کی روح و قلب کی اعلیٰ صفتوں کی تحسین ممکن الحصول ہوگئی ہے ہمیں ان کا پہلے خود گرے کی شخصیت میں مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کے بعد اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسکی شاعری میں یہ صفتیں کس طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اور کیوں وہ اس میں زیادہ آزادی کے ساتھ داخل نہیں ہوتیں، زیادہ طاقت کے ساتھ روح نہیں پھونکتیں اور اس میں زیادتی نہیں کرتیں؟

ہم اس کے اقتباسات سے شروع کریں گے۔ اس کا دوست ٹیمپل لکھتا ہے: "مسٹر گرے غالباً یورپ کا سب سے زیادہ عالم آدمی تھا وہ تاریخ کی ہر شاخ سے خواہ طبعی ہو یا سیاسی واقف تھا۔ انگلستان فرانس اور اطالیہ کی تمام اصل تاریخوں کو پڑھ چکا تھا، اور ایک زبردست ماہر سلفیات تھا۔ اس کی معلومات کا بہت بڑا حصہ تنقید، مابعد الطبعیات اخلاقیات اور سیاسیات پر مشتمل تھا۔ ہر قسم کے بری اور بحری سفر اس کا دلچسپ مشغلہ تھے۔ اور نقاشی مصوری عمارات سازی اور باغبانی کا اسکو ایک نفیس ذوق تھا۔ لینیس کے اس نسخے کے اشارے جس میں اس نے ہر ورق کے درمیان ایک خالی صفحہ رکھا تھا اسکی نیچرل سائنس خصوصاً حیاتیات، حیوانیات، اور حشریات کی وسعت اور صحت ظاہر کرنے کے لئے اب بھی باقی ہیں۔ حشریات دانوں نے اس کو جانچ لیا ہے کہ انگریزی کیڑوں کے متعلق اس کے بیانات اس زمانہ کے کسی اور بیان سے زیادہ مکمل ہیں اس کی یادداشتیں اور کاغذات جن میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں اور بعض اب تک مسودہ کی حالت میں ہیں اس کی جدید اور قدیم ادبی اطلاعات کے علاوہ، جغرافیہ، فن ترسیم Topography نقاشی، فن تعمیر اور سلفیات نیز حماسیات (Heraldry) کے متعلق اس کی عجیب و غریب تحقیقات کا ثبوت دیتے ہیں، وہ ایک اعلیٰ موسیقی دان تھا اس کے علاوہ سر جیمس میکن ٹاش ہمیں یاد دلاتا ہے کہ گرے کے تمام دوسرے اکتسابات اور خوبیوں میں ہمیں یہ بھی اضافہ کرنا چاہیئے کہ وہ انگلستان میں پہلا شخص ہے جس نے نیچر کی خوبصورتیوں کو ظاہر کیا۔ اور وہاں جس قدر پر لطف رنگا رنگ سفر کئے جا سکتے ہیں اُن کے حدود مقرر کر دیئے"۔

اکتسابات کی قدروقیمت اور نوعیت کا انحصار اس انفرادیت کی قوت پر ہوتا ہے جو ان کو اپنے اندر جمع کرتی ہے
اب ہم اس امر کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ گرٹے نے جو کچھ پڑھا اس پر کس طرح نظر ڈالی تھی یہ اس کی قوت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ ذیل میں تین متفرق مصنفین پر تنقیدیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ وہ تنقیدیں ہیں جو بغیر کسی غور و ادعا کے اپنے دوستوں کے نام برجستہ خطوط میں اس نے لکھ دی تھیں اول ارسطو پر ملاحظہ ہو:-

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے جس قدر مصنفین کا مطالعہ کیا ان تمام میں وہ مشکل ترین ہے۔ اس کے بعد یہ کہ اس میں ایک ایسا خشک اختصار ہے جو پڑھنے والے کو محسوس کراتا ہے کہ میں کتاب پڑھنے کی جگہ گویا فہرست مضامین دیکھ رہا ہوں۔ وہ تمام دنیا کو ایک چبائی ہوئی گھاس یا چبائی ہوئی منطق سمجھتا ہے کیونکہ اسکو اس فن کے ساتھ (ایک طرح سے اسی کی ایجاد ہونے کے باعث) ایک خاص محبت ہے۔ پس وہ اکثر چھوٹے چھوٹے تفرقوں، ذرا ذرا سے لفظی اختلافات اور اس سے بدتر باتوں میں خود کو کھو دیتا ہے۔ اور آپ کو آپ جس طرح نکل سکیں بچکر نکلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح کثرت اختصار سے کام لینے والے تمام مصنفین کے لئے مقدر ہے۔ وہ بھی اپنے مترجمین سے بہت نقصان اُٹھا چکا ہے۔ چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ اس کے یہاں نفیس اور غیر معمولی اشیا کی کثرت ہے جو ان تکلیفوں کی تلافی کر دیتی ہیں، جو اس کا مطالعہ کرنے والوں کو اٹھانی پڑتی ہیں، آپ نے دیکھا کہ آپ کو کیا امید رکھنی چاہیئے"

ایساکریٹس کے متعلق:-

"عجیب بات ہوگی اگر میں ایساکریٹس پڑھنے کے متعلق آپ کو برسر غلط سمجھوں، میں نے خود بیس سال قبل ایسا ہی کیا، اور ایک ایسے نسخہ میں جو کم از کم ویسا ہی خراب تھا جیسا کہ آپ کا ہے پے نی جرک (Panegyric) ڈی پیس (The Depace) اریوپے گٹک (areopagatic) اور اڈوائس ٹو فلپ (advice to Phillip) وہ باقیات الصالحات ہیں جو ہمیں اس انشا پرداز سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور جو یونانی زبان کی جس قدر ادبی چیزیں موجود ہیں ان میں سے اکثر کے برابر ہیں۔ لیکن اشیا کے متعلق اس کی اصلی اور وقتی رایوں میں امتیاز کرنا آپ کی قوت تمیز پر منحصر ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ پہلے لکھ چکا ہے اس سے دوسری جگہ صاف صاف اختلاف کر جاتا ہے۔ مثلاً ایتھنس کی بحری قوت کے متعلق پناتھناٹک (Panathenaic) اور ڈی پیس (De pace) کے بیانات موخرالذکر بے شبہ اسکا ذاتی بے نقاب جذبہ ہے۔"

ایساکریٹس اور ارسطو کے متعلق گرٹے کے خیالات سننے کے بعد اب ہم فرو آرٹ کے متعلق کچھ سنیں گے۔

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے فوراً سارٹ کو سمجھ لیا۔ وہ ایک وحشی زمانہ کا ہروڈوٹس ہے اگر وہ اچھی زبان میں لکھنے کی خوش نصیبی حاصل کر لیتا تو غیر فانی ہو جاتا۔ اسکی ذاتی محنت و کاوش (کیونکہ اس وقت اکتساب علم کا کوئی دوسرا طریقہ نہ تھا) اس کا سادہ تجسس اور اس کی شدت مذہب بالکل قدیم یونانیوں کے مانند تھی۔ .... لیکن ان سب سے پہلے تمہیں ویل ہاردوئیں اور ژوانؔ ویل کو پڑھ لینا چاہیئے۔"

یہ رائیں اپنی صحت اور وضاحت کے ذریعہ سے گرے کے دماغ کی اعلیٰ صفات اور معلومات کو کام میں لانے اور ان پر حکومت کرنے کی طاقت کو ظاہر کرتی ہیں لیکن گرے ایک شاعر تھا۔ ہمیں اس کو ایک شاعر ۔۔۔ شیکسپیئر ۔۔۔ پر رائے زنی کرتے ہوئے دیکھنا چاہیئے۔ اس میں ہم اپنے تئیں اٹھارہویں صدی اور اس کے فن تنقید کے کامل وسط میں پائیں گے۔ گرے کے ایک دوست ویسٹ نے راسینؔ کی اس لئے تعریف کی تھی کہ اس نے "اپنے زمانہ کی اور خالص زبان" استعمال کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ "دوسرا میں کوئی تصفیہ نہیں کروں گا کہ ہمارے اسٹیج کے لئے کونسا اسلوب مناسب ہے۔ لیکن میں اسی طرح کا پسند کروں گا جو بہ نسبت شیکسپیئر کے کیٹو پر چھایا ہوا تھا" گرے جواب دیتا ہے۔

"اسلوب بیان کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے۔ زمانہ کی زبان ہرگز شاعری کی زبان نہیں ہوتی فرانسیسی اس سے مستثنےٰ ہے جس کی نظم جب کہ خیال اس کی مدد نہیں کرتا کسی بارے میں نثر سے مختلف نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے ہماری شاعری ایک زبان ہے۔ جو اسی کے لئے مخصوص ہے اور جس میں ہر اس شخص نے جس نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے ضرور کوئی اضافہ کیا ہے شیکسپیئر کی زبان دراصل اس کی اصولی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔ اور اس سے اس بارے میں بہ نسبت ان اعلیٰ خوبیوں کے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے آپ کے کئی اڈیسن اور کئی رو کم مرتبہ ہیں۔ اس کے یہاں ہر لفظ ایک تصور ہے۔ خدا کے لئے ذرا حسب ذیل مصرعوں کو ہمارے موجودہ ڈرامہ نگاروں میں سے کسی کی زبان میں لکھ کر مجھے دکھا تو دو۔"

"But I that am not shaped for Sportive tricks
Nor made to court an amorous looking glass"

اور اس کے بعد کہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، اور اگر یہ واقعہ ہے تو ہماری زبان نہایت ہی خراب ہو گئی ہے۔"

ایک شاعر کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ خود اپنے فن کے اصول و قواعد نہایت روشن دماغی پختگی اور تیقن کے ساتھ بیان کر دے۔ تاہم اس وقت انگلستان میں گرے کے علاوہ شاید کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو اقتباس بالا لکھنے کا اہل ہو سکتا۔ گرے کی دماغی صفات کے معائنہ کے بعد اسکی قلبی صفات بہت کم ہمارے معائنہ کی برداشت کر سکتی ہیں۔ اسکی

عزلت گزینی، اس کی نفاست اور ان اشخاص اور اشیا کے ساتھ اس کی ناپسندیدگی جو اس زمانہ کے کیمبرج —— جس کو وہ "حقیر گرد آلود مقام" کہتا تھا —— میں اس کے اطراف تھیں، ان تمام نے گرے کو ایک ایسا آدمی ظاہر کیا جو نازک مزاج سنکی، اور عورتوں جیسی طبیعت رکھنے والا ہو۔ لیکن ہم نے اس کے متعلق پمبروک ہال کے ماسٹر کی وہ ثقہ سند ابھی دیکھی ہے کہ :- "وہ میرے دل میں اس کے اثرات پائدار ہیں - اور ان چند سالوں میں جن میں زندہ رہنے کی امید ہو سکتی ہے میں ان سے فائدہ حاصل کرتا رہوں گا" ذیل میں اسی طرح کی ایک اور شہادت موجود ہے - جو ایک کم عمر آدمی اور گرے کے دوست نکلسن کی ہے -

جب وہ گرے کی وفات کی خبر سنتا ہے تو کسی دور کے مقام سے اپنی والدہ کو لکھتا ہے "آپ جانتی ہیں کہ میں گرے کو ایک دوسرا مربی سمجھتا تھا مجھے صرف اسی کا خیال تھا - اپنی تمام خوشیاں اسی پر منحصر رکھی تھیں، ہمیشہ اسی کا ذکر کرتا تھا - جب کبھی میں جدا رہتا تو اپنی ہر خوشی میں اس کی شرکت کا خواہشمند رہتا - اور جب کبھی میں کوئی تکلیف محسوس کرتا تو اس کے پاس پناہ لینے کے لئے بھاگتا - جو کچھ میں نے یہاں دیکھا ہے اس کا اب کس سے ذکر کروں اب مجھے کون پڑھنا، سوچنا اور محسوس کرنا سکھائے گا ؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا یا سوچا اس میں اس کا تعلق ضرور تھا اگر مجھ پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی تو میں اس خیال سے اپنے کو خوش کرتا کہ میرے گھر میں ایک خزانہ ہے اگر تمام دنیا مجھ سے نفرت اور میری حقارت کرتی تو میں اپنے تئیں اس کی دوستی میں کامل مطمئن اور مسرور سمجھتا - اب ایک اور نقصان ہونا باقی ہے - اگر میں آپ کو کھو دوں تو میں دنیا میں اکیلا چھوڑ دیا جاؤں گا فی الحال میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اپنا نصف کھو دیا ہے"۔

اس قسم کی شہادتیں ایک نازک مزاج اور عورتوں جیسی طبیعت رکھنے والے کمزور انسان کے متعلق نہیں حاصل ہو سکتیں - یہ نہ صرف دماغی خوبیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ قلبی کیفیات پر بھی مبنی ہیں - گرے کی قلبی خوبیوں اور اس کی اعلیٰ متانت کے متعلق ہم اس کے خطوط سے کافی مواد جمع کر سکتے ہیں - مینس کو جس کے باپ کا اسی وقت انتقال ہوا تھا وہ خط میں لکھتا ہے :-

"میں نے وہ سماں دیکھا جو تم نے بیان کیا ہے اور معلوم کیا کہ وہ کس قدر خوفناک ہے، میں نے یہ بھی معلوم کیا کہ میں ہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہوں ہم تمام سست اور بے خیال اشیا ہیں - ہم میں سمجھ نہیں ہے - اور اس قسم کے غمناک اثرات کے بغیر زندہ رہنا بیکار ہے - وہ جس قدر گہرے ثبت کئے جائیں بہتر ہے"۔

ایک ایسے ہی موقع پر ایک دوسرے دوست کو لکھتا ہے :-

وہ جو ہماری فطرت کو بہتر جانتا ہے (کیونکہ ہمیں، ہم جو کچھ بھی ہیں اُس نے بنایا ہے) ہمیں اپنے بھٹکتے ہوئے خیالات اور کاہلانہ عشرتوں سے، اور جوانی و خوشحالی کے تکبر سے۔ اس قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کرکے سنجیدہ غور و فکر کی طرف فرائض کی طرف اور خود اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان نقوش تاثر سے بہت جلد آزاد ہو رہنے کی ہمیں ضرورت نہیں زمانہ (اس طاقت کے حکم سے) تکلیفوں کا علاج کرے گا اور بعض دلوں سے غم کے تمام نشان مٹا دیگا۔ لیکن ان کو ایک زمانہ تک محفوظ رکھنا ممکن ہے کہ سزا کے ذریعے سے اصلاح کرنے والے کی مرضی کا اقتضا ہو"

اور دوبارہ ہیسن کو عین اس وقت لکھتا ہے جب کہ اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ گرے کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ آیا اس کا خط ہیسن کو بیوی کی موت سے پہلے پہنچے گا بھی یا نہیں۔

"اگر برا وقت اب تک نہیں آیا تو تم اس خط کو چھوڑ دو اور مجھے معاف کرو۔ لیکن اگر آخری جھگڑا ختم ہو چکا اگر تمہاری طویل خواہشوں کا غریب مرجع تمہاری مہربانیوں یا اپنی تکلیفوں کو محسوس کرنے کے لئے باقی نہیں رہا تو مجھے کم از کم یہ خیال (کیونکہ اگر میں موجود ہوتا تو بھی اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا؟) کرنے کی اجازت دو کہ تمہارے پہلو میں خاموش بیٹھوں اور صدق دل سے ہمدردی کروں اس سے نہیں جو اس وقت آرام میں ہے بلکہ تم سے کہ تم نے اسکو کھو دیا۔ وہ جس نے ہم کو پیدا کیا، یعنی ہماری خوشیوں اور ہماری تکلیفوں کا مالک تمہاری مدد کرے۔ خدا حافظ"

باقی

غلام محی الدین قادری زور

حامد علی خاں

کیفِ برشگال

برسات

ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہیں، گھٹائیں کالی کالی ہیں — عجب کیف آفریں ایامِ فصلِ برشگالی ہیں
ہوئی بارش تو سب نے گردنیں اپنی جھکالی ہیں — شجر ہیں یا کسی فیاض کے آگے سوالی ہیں
ہزاروں تتلیاں ہیں اور کیا کیا رنگ والی ہیں — سنہری، صندلی، اودی، کپاسی، زرد کالی ہیں
پھٹی پڑتی ہیں شاخیں بارِ فیضِ ابرِ باراں سے — یہ بوندوں کے بندھے ہیں تار یا عقدِ لآلی ہیں
گھٹائیں دیکھ کر کیوں دل ہوا جاتا ہے دیوانہ — کسی نے کھول کر زلفیں مگر شانوں پہ ڈالی ہیں
یہ بگلوں کی قطاریں اڑتی پھرتی ہیں گھٹاؤں میں — کہ مستوں نے خوشی میں پگڑیاں اپنی اچھالی ہیں
یہ بارش ہو رہی ہے یا زمیں پر مے برستی ہے — یہ بادل ہیں کہ خمہائے شرابِ پرتگالی ہیں
اڑا کر لے گئی بادِ صبا سب نشۂ صہبا — زمیں کے میکدے کیفیتوں سے آج خالی ہیں
جدھر دیکھو ادھر سبزہ ہی سبزہ لہلہاتا ہے — نگاہیں ہو گئیں شاداب جس جانب بھی ڈالی ہیں
نکل آئی ہیں سینوں سے امنگیں تتلیاں بنکر — دلوں کی آرزوئیں خوفِ ناکامی سے خالی ہیں
گلستاں پر نظر کرتے ہوئے کیا دل لرزتا ہے — کہ ہر گل کی ادائیں جانِ شیریں لینے والی ہیں
ابھی منہ بھی نہیں انکو دیا قدرت نے اے بھونرے — نہیں اچھی ابھی یہ چھیڑ کلیاں بھولی بھالی ہیں
منادی پھیر دی کوئل نے سیرِ عامِ گلشن کی — ق — دلوں کی حسرتیں ممنونِ فرمانِ بحالی ہیں
سمجھ رکھا ہے وہ بھی سیرِ گل کو گھر سے نکلیں گے — ہماری آرزوئیں ہائے کیسی بھولی بھالی ہیں
پپیہے کی فغاں درد ہے یا کوئی نشتر ہے — دلِ غمگیں کی جس نے آہ چوٹیں چھیل ڈالی ہیں

چنبیلی سروِ خوش قامت کی شاخوں سے یہ لپٹی ہے
کہ رادھا نے کنہیا کے گلے میں باہیں ڈالی ہیں

چمن کو دیکھ کر حسنِ ازل کا کھچ گیا نقشہ
دلِ گمراہ نے اپنی مرادیں آج پالی ہیں

ڈھلا سورج تو پانی پھر گیا سونے کا سبزے پر
سنہرے بیل بوٹے پر تو شانِ جلالی ہیں

شفق آلودہ ٹکڑے بادلوں کے ہیں کہ اے ساقی!
شرابِ ارغواں کی کشتیاں تو نے نکالی ہیں

یہ دو قوسِ قزح ہیں جلوہ فرما بامِ گردوں پر
فلک نے رام لچھمن کی کمانیں یا نکالی ہیں

بچھی جاتی ہے فطرت رونقِ شامِ نگاریں پر
گل و برگ و شجر وارفتۂ شانِ جمالی ہیں

بدلتی ہیں ہزاروں رنگ کس کی سحر سازی سے
یہ رنگیں بدلیاں ہیں یا تصاویرِ خیالی ہیں

کہاں کی فکرِ دنیا کس کو فرصت دشت گردی سے
دل و جان و جگر رہنِ مزاجِ لاابالی ہیں

غمِ ہستی بھلا کر مستِ بیخودی ہم کو رکھتی ہے
جگر ہم تو پرستارِ بہارِ بنگالی ہیں

دوشیزۂ رعنائی

جھوم کر چرخ پر گھٹا چھائی
زلفِ شبگوں ہوا میں لہرائی

حسنِ رنگیں کے بند ٹوٹ گئے
کس نے لی بیخودی میں انگڑائی

لد رہے ہیں درخت کلیوں سے
اللہ اللہ یہ جوشِ برنائی

دشت و گلشن بھرے ہیں پھولوں سے
کس کو منظور ہے خود آرائی

رنگِ ہر غنچہ سحرِ محبوبی
نقشِ ہر گل طلسمِ رعنائی

پتہ پتہ بہار کی تصویر
بوٹا بوٹا نہالِ زیبائی

بوندیں پانی کی ہیں یہ نرگس پر
یا کوئی محوِ نازِ رعنائی

گرمِ نظارہ دیکھ کر مجھ کو
آنکھ میں اشک شرم بھر لائی

ہو نہ جائے گناہگار نظر ایک دوشیزہ ہے یہ رعنائی

جگر بریلوی

شاعر اور ابرِ برشگال

میخانے میں آیا ہے تو مے نوشی کا لُطف اٹھا لے
پینے کے یہ دن ہیں، پی لے، پی لے پی لے پی لے پلا لے

میخواروں نے جام سنبھالے پیتے ہیں سب پینے والے
تو بیٹھا کیا سوچ رہا ہے اُٹھ اور اُٹھ کر جام اٹھا لے

اپنا شیوہ ہے مے نوشی، رندی مستی اور مدہوشی
ہم سے کیا کہتا ہے واعظ اپنی تو دستار سنبھالے

منظرِ باغ ہے کتنا دلکش مِل مِل کر آپس میں پریاں
ناز سے جھُولے جھُول رہی ہیں تو بھی مِل کر جھول جھُلا لے

کوئل کوک رہی ہے ہر سُو کوُ اُو کوُ اُو کوُ اُو کوُ اُو
آذر کیوں چُپ بیٹھا ہے تو ملکر اس سے شور مچا لے

موروں نے ہے شور مچایا، بادل آیا بادل آیا
ساقی بھر کر جام ہے لایا اُٹھ اُٹھ کر برسات منا لے

آئی گھٹا وہ کالی کالی اپنے جوبن کی متوالی
آنے والی آلی، آلی تو بھی اپنا رنگ جما لے

بجلی چمکے بادل گرجے، میخانے پر چھم چھم برسے
بہتی ہے رحمت کی گنگا اُٹھ آذر اُٹھ اس میں نہا لے

آذر جالندھری

تجربات

(۱)

میں بھی کبھی ان فریب خوردہ لوگوں میں سے تھا جو دوستوں کی کثرت پر ناز کیا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تمام ہموم وغموم جو ہماری پریشانی کا باعث ہوتے ہیں ہمارے ہی تخیل کی بے راہ روی کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے اُن کا سدباب میں نے یہی تجویز کر رکھا تھا کہ دماغ کو بیکاری سے ہمیشہ محفوظ رکھا جائے۔ میں اوقات فرصت کو بزم احباب میں بیٹھ کر قہقہوں میں صرف کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ مسرت و نشاط کا ہر موقع جس میں مجھے اکیلے شریک ہونا پڑتا مجھے مجالس عزا سے زیادہ افسردہ نظر آتا تھا۔ وہ وقت جو مجھے مجبوراً دوستوں سے علیحدہ بسر کرنا پڑتا، ہرچند کہ اس میں ہزاروں خوشیاں موجود ہوتیں میرے لئے ہر قسم کی رونق و دلآویزی سے معرا تھا۔ حتیٰ کہ کسی دعوت طعام میں بھی میں دوستوں کی شرکت کے بغیر شامل ہوجاتا تو کھانے کو شغل تفریح سمجھنے کے بجائے ایک غیر ضروری بار اور ناگوار فرض خیال کرکے وہاں سے جلد بھاگ آنے کی کوشش کرتا۔ میں خوشی کی ہر تقریب سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے اور کامل لذت اٹھانے کے لئے ہمیشہ دوستوں کی آمد کا منتظر اور اُن کی شرکت کا خواہاں ہوا کرتا تھا۔ میں اپنی انفرادیت کو مٹا کر دوستوں میں کچھ اس طرح جذب ہو چکا تھا کہ انفرادی زندگی کا میرے نزدیک کچھ مفہوم ہی نہ رہا تھا۔ گویا میری خوشی اسی میں تھی جس میں دوستوں کی خوشی ہوتی۔ اور میرا رنج وہی تھا جو "یاران طریقت" کا اجتماعی رنج ہوتا۔ آہ کس قدر ہلاکت آفریں طرز عمل تھا جو میں نے اختیار کیا۔ میں ان تمام تعلقاتِ مؤانست کو غیر فانی سمجھ کر یہ بالکل بھول چکا تھا کہ چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں حباب آب سے زیادہ ناپائدار اور آنکھ کے اشارے سے جلد فنا ہو جانے والی ہیں۔ اب جب کہ اُس خواب کی صحیح تعبیر میری آنکھوں کے سامنے ہے میں اپنے تئیں اس درخت کے مانند پاتا ہوں جو تنہا کسی وسیع ریگستان کی تند ہواؤں اور خوفناک جھکڑوں کا مقابلہ کر رہا ہو۔ لیکن اس تنہائی نے مجھے ایک کبھی نہ بھولنے والا سبق مدت العمر کے لئے ازبر کرا دیا کہ

دوستی بھی وقت گذارنے کا ایک کھیل ہے جو شخص عمداً یا سہواً اس سے آگے بڑھ کر اُسے لازمۂ حیات قرار دے لے۔ وہ حقیقتاً فریب نفس میں مبتلا ہے جس کا نتیجہ افسوس و تاسف اور شاید ہلاکت بھی ہو۔

(۲)

کسی شخص کے ساتھ دوستی پیدا کرنے سے پہلے اچھّی طرح معلوم کرلو کہ وہ والدین سے کیسا سلوک کرتا ہے والدین سے زیادہ ہمدرد اور حقیقی محسن دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا، اور جو شخص والدین کے عظیم الشان احسانات کو خاطر میں نہیں لاتا، وہ ایک دوست کا حق دوستی کب ادا کرے گا

(۳)

ہمارے آئے دن کے فسادات اور باہمی رنجشیں محض اس اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہیں کہ ہم میں نکتہ چینی و عیب جوئی کا مادہ حد سے زیادہ ترقی کر گیا ہے۔ اگر ہم میں سے ہر فرد یہ یقین کرے، تو لا نہیں فعلاً کہ وہ فرشتہ نہیں بلکہ انسان ہے اور انسان نام ہے اس ہستی کا جو لغزشوں، کمزوریوں اور خامیوں کی مرکب ہے تو آج ہی کُل مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ذرا اپنی روزمرہ زندگی کا جائزہ تو لو، دیکھو گے کہ تم بھی گنہ گار ہو، تم سے بھی خطائیں سرزد ہوتی ہیں۔ اور جب خود تمہاری یہ کیفیت ہے تو تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ خدائی فوجدار بن کر اپنے ہی ایک بھائی کی غلطیوں کو ڈنکے کی چوٹ پیٹ کر اس بچارے کی زندگی وبال بنا دو۔

عاشق بٹالوی (بی۔اے)

رُباعیات

اک رند یہ کہہ رہا تھا ہنگامِ سحر — واعظ بھی رہا ہے میکدے میں شب بھر
پھر کہنے لگا جو ہے رہِ حق کی تلاش — واعظ جو کہے وہ کر، جو کرتا ہے نہ کر

اب کون کرے گا رہنمائی میری — کچھ کام مرے سمجھ نہ آئی میری
جتنا کہ ترے قریب ہوتا ہوں میں — کھلتی ہے کچھ اور نارسائی میری

جب تک کہ نہ کوئی دیکھنے والا ہو — آئینے میں عکس کس طرح پیدا ہو
اس چیز کی کچھ نہ کچھ حقیقت ہے ضرور — عکس آئینۂ خیال میں جس کا ہو

حامد علی خاں

محبّت کا دِن

(نظم بے قافیہ)

رفعتِ گردوں سے، صبح ایک سنہری کرن
آئی لرزتی ہُوئی کانپتی ڈرتی ہوئی
اور بکھرتی ہوئی لرزشِ سیماب پر
نہر کی ہر موج کے سینۂ بےتاب پر
جیسے محبّت سے چُور ایک چھلکتی ہوئی
عشق کے جذبات سے ایک چھلکتی ہوئی
کوئی نگہ ڈال دے چہرۂ محبُوب پر

ہوتی ہے یوں ابتدا
عشقِ فسوں ساز کی
ہے یہ محبّت کی صبح

زینۂ افلاک کو کرگیا طے آفتاب
فطرتِ روشن ہُوئی اس کی جواب بےحجاب
وادی میں اک جوئے سیم کروٹیں لینے لگی

ندی کے پانی میں یا نور کا چشمہ ملا
یا کوئی کیف آفریں خواب تھا جذبات کا

پھیلتا ہے بس یونہی
نور محبّت کا بھی
عشق کے دن کا عروج!
عشق کا نصف النہار!

آہ مگر آفتاب برلبِ بام آگیا
شام کا سایہ بڑھا اور فلک کی تمام
آن وہ رخصت ہوئی شان وہ رخصت ہوئی
نُور کی وہ کیفیت محو سراسر ہُوئی
آہ! کہ جذبات کی بدلی ہوئی آنکھ سے
کھو گیا سب اعتبار مٹ گیا سب ذوق شوق

ہوتا ہے یُوں ہی زوال
عشق کی اقلیم میں
یہ ہے محبت کی شام

"ٹامس مور"
منصُور۔ از پہل گام (کشمیر)

گناہِ عظیم

(مائیکل آرلن کی مشہورِ عالم کتاب "جاذبِ نظر شخصیتیں" کے ایک افسانے کا ترجمہ منزاد)

چاندنی راتیں تھیں اور بہار کے دن۔ میں نے اور شبیر نے فیصلہ کیا کہ ایک رات راوی کے کنارے نسترن زارِ فطرت کے تماشائے جمال میں صرف کریں گے۔ ہم بارہ بجے کے قریب کھانا کھا کے شبیر کی موٹر پر گجرات سے روانہ ہُوئے۔ گجرات میں چناب کی لہریں بھی فردوس نظر تھیں لیکن اس گہوارۂ حسن۔ اس آغوش رنگ و بُو اور اس دریائے جمال کی لذت اور ہے جسے لاہور کہتے ہیں۔

شبیر کی موٹر پیلے سے رنگ کی تھی۔ ہلکا پیلا سا رنگ۔ دھوپ میں اُسے میں سبز سبز کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے کئی دفعہ دیکھ چکا تھا۔ یُوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا ماورائے خیال کی کسی مملکت حیرت ناک کی تیتریٔ ایک عجوبۂ کار نادر اور بہت بڑی تیتری اُڑتی چلی جا رہی ہے۔ ہم چار یا پانچ بجے کے قریب شاہدرے پہنچے۔

میں نے اختصار سے کہا، کچھ کھا لو۔

شبیر نے حسبِ عادت جواب دیا، "خواجِ حسین کی قسم ہرگز نہیں۔ آج سہ پہر کی چائے راوی کے کنارے ہو گی سامان تیار ہے نا؟

میں جی کہہ کر خاموش ہو گیا۔

ابھی ہمیں نکلسن روڈ سے سعادت صاحب کو ہمراہ لینا تھا۔ بدقسمتی سے سعادت صاحب موجود نہ تھے دریا کی طرف واپس جاتے وقت یُوں احساس ہوتا تھا گویا موٹر مسافت کو نگلتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ سیدھی سڑک کو چھوڑ کر ساحل دریا سے کوئی دو تین ہزار قدم ادھر ایک اور راستہ دریا کی طرف جاتا ہے۔ شبیر نے موٹر اس طرف موڑی۔

میں نے یہ کہہ کر ٹوکا، "کہ مجھے یقین تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آگے چل کر یہ پگڈنڈی ختم ہو جائیگی"

شبیر چپ رہا۔

یکایک پھٹ کی آواز آئی۔ موٹر کا ایک پہیہ پھٹ گیا تھا۔ اُسکے ساتھ ہی شبیر کے منہ سے ایک غیر مقدس اور فحش کلمہ نکلا اور پھر اُس نے خواجِ حسین کی قسم کھانی شروع کی۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ شبیر نے سہ پہر کی چائے نہ پی تھی۔ میں یہ بھی ماننے لیتا ہوں کہ وہ بھوکا تھا۔ لیکن اس سے پھر بھی

مجھے یہ شکایت ہے کہ وہ بجا اور بے جا طور پر قسمیں کھاتا ہے۔ ہر شریف آدمی قسم کھاتا ہے۔ تمدنِ جدید اس کا متقاضی ہے۔ میں خود اکثر دوسرے اشخاص کی طرح موقع بموقع ربّ جلیل اور ربّ العزت کہہ لیتا ہوں۔ لیکن وہ شے جسے غالباً پطرس منظم طریق پر قسم کھانا کہے گا یا جسے غالباً حکیم احمد شجاع بی، اے قسم خوری بطور فن لطیف کہیں مجھ سے کوسوں دور تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں اور عہدِ جہالت میں لات و عزیٰ اور خدا کی قسمیں کھاتے تھے لیکن پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ لوگ مذکورہ بالا اشیا پر اعتماد کامل رکھتے تھے۔ آج کل لوگ ہر ایک شے کی قسم کھاتے ہیں اور کسی شے پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ تمدن جدید کی ایک عادت ہے۔ یہ جلد بازی کی ایک عادت ہے لامذہبیت کی ایک عادت ہے۔ اور یہ عادت میرے عزیز دوست محمد شبیر ایم، اے۔ ایم، آر، اے، ایس، پی، ایچ، ڈی بیرسٹر ایٹ لا پر حاوی ہو چکی تھی اس بات سے قطع نظر وہ ایک شریف آدمی ہے۔

ایک نیا ٹائر لگا لینے کے بعد وہ موٹر کو چلانے ہی والا تھا کہ ایک چیخ کی آواز آئی اور وہاں کوئی بیس گز کے فاصلے پر ایک بوڑھی عورت کھڑی چیخ رہی تھی ہم دونوں اتر کر اس کے قریب گئے۔ اس کے بال سلیٹی رنگ کے دھاگے معلوم ہوتے تھے اور اس کی آنکھیں ایک شکستہ مغموم چہرے سے باہر نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"آؤ، آؤ، جلدی آؤ"

مجھے اس عورت سے ایک بوئے گندگی آتی تھی۔

اب وہ ہمارے آگے بھاگنے لگی اور ہم اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتی ہوئی خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ ہمیں ایک کچی سی پگڈنڈی پر لئے جاتی تھی۔

یکایک اُس نے چیخ ماری

"جلدی آؤ"

اور ہم جھنڈ میں سے نکل کر ایک چھوٹے سے میدان میں جا پہنچے جہاں کے درخت کاٹ ڈالے گئے تھے۔ اس میدان میں ڈوبتے ہوئے سورج کی دھوپ سنہرے فرش کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ عین اس میدان کے وسط میں ایک ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس طرف وہ عورت بھاگی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہمارے قدم خود بخود رک گئے ہماری نظر اِس منظر پر جم گئی۔ شبیر نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال لئے۔ شبیر کو عادت تھی کہ جب اُسے اپنے ہاتھوں کو برتنے کی خواہش شدت سے محسوس ہوتی تو وہ انہیں اپنی جیبوں میں ڈال لیتا۔

بات یہ تھی کہ جھونپڑی کے دروازے کے آگے ایک شخص ایک لڑکے کو مار رہا تھا میں نہیں جانتا کہ کیوں لیکن مجھے

احساس ہورہا تھا کہ جولڑکا پٹ رہا تھا وہ اس کا اپنا گوشت ہے، اپنا خون ہے - وہ ایک بلند بالا اور قوی الجثّہ اور ہیبت ناک شخص تھا اور اس کی قمیص کا رنگ خون میں سرخ تھا میں اپنی آنکھیں بند کر کے اب بھی اس ہیبتناک شخص کی گھنی ڈاڑھی اور اس کے بازو کے اُبھرے ہوئے پٹھے اور اس کی قمیص دیکھ سکتا ہوں - اور میں اس کی بیوی کو بھی دیکھ سکتا ہوں جو منتیں کررہی تھی اور رو رہی تھی - رو رہی تھی اور منتیں کررہی تھی اس طرح جس طرح ایک عمر رسیدہ پرندہ تکلیف کے احساس سے کراہتا ہے -

شبیر نے بلند آواز سے کہا -

"او! دیکھو دیکھو اب بس کرو"-

اور اس کی بلند آواز دھوپ کے پردے کو کاٹتی ہوئی جھونپڑی سے ٹکرائی - اس ہیبت ناک شخص نے اپنا ہاتھ روک لیا اور اس خاموشی میں اس بہار کی خاموشی میں بوڑھی عورت کا رونا ایک ڈراؤنا خواب تھا ہمارے اور اس ہیبت ناک شخص کے درمیان دس گز کا فاصلہ تھا لیکن وہ گز دھوپ کے تھے - اور دھوپ اس کے چہرے کی ہر ایک شکن کو روشن کررہی تھی - اُس نے ہماری طرف ایک جگردوز نگاہ ڈالی اور ہماری بلند بالا جوانیاں اس نگاہ کے نیچے مرجھا گئیں - اس نے کہا

"دوستو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو میں اپنے بیٹے میں سے یہ گناہ نکال کر چھوڑوں گا اسکی ماں ایک کمزور عورت ہے اور اس کا ہر ایک گناہ معاف کرسکتی ہے لیکن تم مرد ہو اور جانتے ہو کہ مرد ایک خاص گناہ کو کبھی معاف نہیں کرتا - جاؤ اور اپنے گھروں کی اصلاح کرو"

اور اس کی آواز اختیار کی بنیادوں پر استوار تھی -

ابھی وہ بُوڑھا مقرر ہماری طرف دیکھ رہا تھا اسکی چھڑی ہوا میں گھوم رہی تھی اسکی آواز میں اس قسم کی تلخی تھی گویا وہ سرکہ پیتا رہا ہے - اور اس کی آنکھوں میں اس قسم کا اشتعال تھا گویا اُس نے حضرت عیسٰی کو خود مصلوب ہوتے دیکھا میں نے شبیر سے کہا :

"چلو چلیں"

اور پھر وہ حادثہ رونما ہوا -

اِس اثنا میں ہم یہ نہ دیکھ سکے تھے اس کا بیٹا اس کے قدموں میں سے کھسک کر ذرا دور چلا گیا تھا ہم نے یہ دیکھا کہ اس کے بیٹے کا ہاتھ ایک پھاوڑے کو لیکر بلند ہوا اور پھر ایک چشم زدن میں ایک برق مثال تیزی کے

ساتھ اُس ہیبت ناک شخص کے سر پر آپڑا اور آناً فاناً اس کی کھوپڑی کو چیر کر گردن تک پہنچ گیا۔ وہ شخص ایک بھینسے کی طرح اڑاکر گر پڑا اور زمین اس کی خونیں رنگ کی قمیص کی طرح سرخ ہو گئی۔

شبیر بوڑھے کے قریب جھک گیا اور قمیص اٹھا کر اُس کے دل کی حرکت دیکھی۔ پھر اس نے کہا۔

"وہ مر گیا"

لڑکا زمین پر پڑا ہؤا قہقہے مار کر ہنس رہا تھا وہ پاگل ہو گیا تھا۔

شبیر نے حسب عادت ایک فحش کلمے کا استعمال کیا اور پھر کہا۔

خونِ حسین کی قسم یہ حرامزادہ ہے۔ چلو اب پولس کو خبر دیں۔

میں نے اس شخص کی آنکھوں کی طرف دیکھا ان میں تعجب تھا اور غم تھا وہ دہشت ناک شخص مجھے مدت العمر یاد رہے گا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں حیران ہوں کہ وہ کونسا گناہ تھا جو اس شخص کی نگاہ میں ناقابل معافی تھا۔

شبیر نے سرگوشی کے لہجے میں جواب دیا۔

"بھائی مجھے معلوم نہیں درحقیقت ہم ایسے مہذب ہو گئے ہیں کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ناقابل معافی گناہ کون کون سے ہیں۔

جانے سے پیشتر ہم نے اس پاگل لڑکے کو دو ریشمی رومالوں کے ذریعے سے کس دیا۔ اس کی عمر ۱۷ سال سے زیادہ نہ ہوگی اور اس کا چہرہ خوف سے مسخ ہو رہا تھا۔ اب ہم موٹر پر چڑھ کر بھاٹی دروازے کی پولیس چوکی کی طرف روانہ ہوئے۔ تھانے دار صاحب موجود نہ تھے۔ ہیڈ کانسٹبل ہمارے ساتھ ہولیا وہ ہیڈ کانسٹبل ایک بلند بالا نوجوان تھا۔ گھنی داڑھی تھی اور بالطبع خاموش معلوم ہوتا تھا لیکن وہ بار بار پوچھتا:۔

کیوں جناب آپ نے وہ مکان کہاں دیکھا ہے۔

شبیر نے کہا

"بھائی میں تمہیں کتنی دفعہ بتاؤں کہ درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹے سا مکان واقع ہے۔

لیکن وہاں پہنچ کر ہم نے کونا کونا چھان مارا اور وہ پگڈنڈی نہ ملی۔ ہم ایک گھنٹہ خراب ہوتے رہے اور پھر یکایک اس چھوٹے سے میدان میں پہنچ گئے جہاں دھوپ ایک سنہرے فرش کی طرح بچھی ہوئی تھی، اور پھر ہم نقش بدیوار

ہو کر رہ گئے۔

شبیر نے حسب عادت کہا

خون حسین کی قسم عجب......... اس کے بعد وہ ایک نہایت فحش کلمہ زبان پر لایا۔

لیکن ہیڈ کانسٹبل نے اُسے ایک عجیب لہجے سے ٹوک دیا۔ وہ کہنے لگا جناب میں آپ کی منت کرتا ہوں آپ بے سود قسمیں نہ کھائیے اور نہ فحش کلمات کا استعمال کیجئے۔

منظر واقعی حیرتناک تھا جہاں پہلے جھونپڑی دیکھ چکے تھے وہاں کچھ بھی نہیں تھا البتہ وہاں دو ریشمی رومالوں کے ٹکڑے پتھروں کے نیچے دبے ہوئے چمک رہے تھے۔

ہیڈ کانسٹبل نے کہا۔

جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہاں تو تنیس سال سے کوئی جھونپڑی نہیں بنائی گئی۔ تیس سال ہوئے یہاں ایک جھونپڑی تھی لوگوں نے اُسے جلا دیا کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک لڑکے نے اپنے باپ کو مار ڈالا تھا غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے بعض اوقات آدمی کا واہمہ عجب عجب فریب دیتا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ ہمیں سلام کر کے رخصت ہو گیا لیکن میں اس کی صورت غور سے دیکھ چکا تھا میں نے کہا شبیر دیکھا یہ ہیڈ کانسٹبل وہی لڑکا ہے جس نے اپنے باپ کو مار ڈالا تھا جسے ہم یہاں باندھ کر چھوڑ گئے تھے۔ وہم کہو جو کچھ کہو۔

شبیر نے آہستہ سے کہا:۔

اور اب میں یہ بھی سمجھ گیا ہوں کہ وہ ناقابلِ معافی گناہ کیا تھا وہ گناہ فحش گوئی اور بیہودہ طور پر قسمیں کھانا تھا۔ تم نے دیکھا اُس نے مجھے کس طرح ٹوکا تھا۔ بھائی مجھے آج سبق مل گیا۔

عابد علی

غزل

کیا کہوں ، ناکامیِ دل کا نتیجہ کیا ہوا
حوصلے بھی مٹ گئے دل بھی گیا گزرا ہوا

اس طرف میں ہوں کہ تجھ بن صبر آتا ہے نہ چین
اس طرف تو ہے کہ غافل، بیخبر، بھولا ہوا

اب تو دل کی حسرتیں ناکام رہ کر مٹ گئیں
اب تو باز آ، اب تو بس کر، اب تو دل ٹھنڈا ہوا

تو ہے اور یہ دھن کہ جب تک ہو سکے غافل رہوں
میں ہوں اور یہ غم کہ نالوں کا اثر الٹا ہوا

مجھ کو یہ کوشش کہ میرا دل ہو اور صبر و سکوں
دل کا وہ وحشت کہ میری جان کو آیا ہوا

ہم نے غم جھیلے تو کس حسرت سے کس ارمان سے
ہم نے دل پایا تو ذوقِ درد میں ڈوبا ہوا

سخت مشکل ہے کہ ضبطِ شوق ہو سکتا نہیں
سخت نادم ہوں کہ میرے ساتھ تو رسوا ہوا

یہ تو بتلا دو کہ ہم کو بھول کر کیا مل گیا
یہ تو سمجھا دو کہ غفلت کا نتیجہ کیا ہوا

وہ کسی کا بادہ نوشی پر تغافل مستزاد
وہ کسی کا ساغرِ صبر و سکوں چھلکا ہوا

آس کہتی ہے کہ "مجھ کو صبر کر میں مٹ چلی"
صبر کہتا ہے کہ "دل کو تھام میں جلتا ہوا

آہ کب تک دل کی بیتابانہ حالت دیکھئے
اور اس دل کی کہ جس کا آسرا ٹوٹا ہوا

آج ضبطِ غم کی خدمت کون سر انجام دے
میں بھی گھبرایا ہوا ہوں دل بھی گھبرایا ہوا

جتنی امیدیں تھیں بالآخر غلط ثابت ہوئیں
ہم نے کچھ سمجھا، وہ کچھ نکلے بڑا دھوکا ہوا

جس قدر مایوس ہوں، اس سے زیادہ شاد ہوں
زحمتِ امیدواری سے تو چھٹکارا ہوا

کون کہتا ہے کہ منہ مانگی مرادیں بخش دے
یہ گزارش تھی کہ اک سائل کا دل تھوڑا ہوا

وہ کسی کے دل میں اپنے خاکساروں سے غبار ق
وہ کسی پر آسمانِ رنج و غم ٹوٹا ہوا

وہ جدائی کا زمانہ، وہ کمالِ بے کسی
وہ توحش وہ ہجومِ غم وہ دل امڈا ہوا

وہ مقدّر کے گلے۔ وہ یاس وہ بے چارگی
وہ تمنّا کا جنازہ سامنے رکھا ہوا

اے زہے وہ دن کہ وصلِ دوست سے دل شاد تھا
اب جدھر دیکھو اداسی کا سماں چھایا ہوا

اب کسی دلچسپ نظارے سے دلچسپی نہیں
جسکو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں وہ تماشا کیا ہوا

بس کر اے آزاد بس تقدیر کے شکوے فضول
صبر کر۔ جو کچھ ہوا۔ بہتر ہوا۔ اچھا ہوا

حکیم آزاد انصاری

کوئٹہ

کوئٹہ برٹش بلوچستان کا ہیڈ کوارٹر ہے ۱۸۷۵ء سے پیشتر یہ ایک غیر معروف مقام تھا لیکن ۱۸۷۶ء میں جب سر رابرٹ سنڈیمن نے یہاں ریزیڈنسی بنوائی اس وقت سے یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور آجکل تو اس کا شمار ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہونے لگا ہے۔ جب سے میں کوئٹہ میں آیا ہوں میرے احباب کا اصرار تھا اور ہے کہ میں کوئٹہ کی آب و ہوا، مناظر، زراعت، باشندوں اور ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالوں کوئٹہ کا جغرافیہ اور تاریخ نامکمل ہونے کی وجہ سے مجھے یہاں کے حالات معلوم کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہوا۔ باشندے زیادہ تر غیر ملکی ہیں ان سے مجھے بہت کم مدد مل سکی۔ یہاں کے اصلی باشندوں کو اس کی تاریخ اور جغرافیہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس وقت تک ضلع کوئٹہ کا جغرافیہ شائع نہیں ہوا۔ بہرحال چھ ماہ کی متواتر کوشش اور سعی سے جو کچھ بھی یہاں کے حالات معلوم ہو سکے وہ بذریعہ معزز رسالہ "ہمایوں" اپنے احباب و علم دوست اصحاب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ زبانی روائتیں، آئین اکبری، یورپین سیاحوں کے سفرنامے۔ قدیم تصنیفات۔ تتمۃ البیان فی تاریخ الافغان۔ کوئٹہ گزیٹیر میرے معلومات کے ماخذ ہیں بہ حیثیت مجموعی یہ حالات دلچسپی سے خالی نہیں۔ اور جب تک کوئی مورخ اپنی ذاتی واقفیت اور محنت سے صحیح حالات فراہم نہ کرے اس وقت تک میرے ان چند اوراق کے معلومات غنیمت سمجھے جائیں گے۔

مسٹر سردار سنگھ نعبی دشنفقی بابو مولا بخش گجراتی۔ علی جان خاں صاحب بیروہی و ماسٹر سبحان سنگھ کا میں بہت ممنون ہوں مجھے ان تمام اصحاب سے اس مضمون کی تکمیل میں کافی مدد ملی

(اعظم کریوی سابق ایڈیٹر "اکبر")

تاریخ سنہ عیسوی سے دو صدی پہلے کوئٹہ (یہ لفظ قطع کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور پیشتر یہ مقام شالکوٹ کہلاتا تھا) یونانی سلطنت میں شامل تھا ۱۳۰۰ء سے پہلے کوئٹہ کی تاریخ و تمدن کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک زمانہ میں امیر سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی کے ماتحت رہا اس کے بعد غوری سلطنت میں شامل ہو گیا۔ ۱۴۷۰ء کے قریب سلطان حسین مرزا نے ہرات میں حکومت قائم کی اور اس نے شال (کوئٹہ) امیر شجاع الدین کو دے دیا شجاع الدین کے بعد اس کا لڑکا شجاع بیگ خاں جانشین ہوا۔ جب شاہ بابر نے کابل میں اپنی

شاہی کا اعلان کیا تو شاہ بیگ خاں ۱۵۱۱ء میں شال کی طرف بڑھا۔ شال اس وقت میر فاضل کوکلتاش اور ابو العلی ترکمان کے قبضہ میں تھا۔ شال میں آتے ہی شاہ بیگ نے قرب وجوار میں لوٹ مار شروع کی آخر کار شاہ بابر نے شاہ بیگ کو ۱۵۱۷ء میں شال سے نکال دیا اور پھر ہندوستان میں داخل ہوا اور ۱۵۲۶ء میں دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۵ء تک صوبہ قندہار شاہ ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کے قبضہ میں تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۵۴۲ء میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر مرزا کامران کی بے وفائی سے بددل ہو کر براہ کوئٹہ فارس گیا۔ ایران سے جب ہمایوں پھر ہندوستان واپس ہؤا تو قندھار دوبارہ اس کے قبضے میں آگیا اور وہ سلطنت مغلیہ میں ۱۵۵۹ء تک رہا۔ جب ہمایوں پھر تخت دہلی پر قابض ہؤا تو اس نے شال (کوئٹہ) لاونگ خاں کو دے دیا۔ تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ لاونگ خان کون تھا صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلوچی سردار تھا۔ جب وہ ۱۵۵۶ء میں راہی ملک عدم ہؤا اور اکبر نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے قندھار اور اس کے قرب وجوار کے شہر شاہ صفوی فارس کو دیدیئے اور اس طرح کوئٹہ شاہ فارس کی سلطنت میں ۱۵۹۵ء تک شامل رہا۔ اس کے بعد مغلوں نے پھر واپس لے لیا۔ آئین اکبری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شال (کوئٹہ) قندھار کی سرکار میں داخل تھا اس کے بعد یہ پھر کچھ عرصہ کیلئے شاہ عباس فرمانروائے ایران کے قبضہ میں چلا گیا۔ شہنشاہ شاہجہان نے ایک زبردست فوج دارا شکوہ کی سرکردگی میں بھیجی لیکن وہ ناکام رہا۔

۱۷۰۰ء کے اخیر میں بروہی قوم نے زور پکڑا اور کوئٹہ پر قابض ہو گئے ادھر شاہ فارس نے میرویس غلزئی سے ۱۷۰۹ء میں قندھار چھین لیا۔ میرویس کے بعد جب اس کا دوسرا لڑکا میر حسین غلزئی اپنے بھائی محمود کے بعد ۱۷۲۵ء میں قندھار کا مالک ہؤا تو اس نے ۱۷۳۳ء میں بروہی قوم کے خلاف فوج کشی کی اور کوئٹہ چھین لیا۔ اس کے بعد نادر شاہ درانی کا نام کوئٹہ کی تاریخ میں آتا ہے جس نے ۱۷۳۸ء میں بلوچستان فتح کر کے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر براہ کوئٹہ و درہ بولان حملہ کیا۔

کوئٹہ شاہ حسین غلزئی کی فتح کے بعد قندھار کی عملداری میں شامل رہا اور جب قندھار نادر شاہ کے زیر حکومت ہؤا تو کوئٹہ بھی اس کے قبضے میں آگیا۔

احمد شاہ ابدالی کے ایک نہایت معتمد علیہ سپہ سالار اور بروہی قوم کے معزز سردار ناصر خان اول نے ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ کے ساتھ محارباتِ فارس میں اکثر صعوبات اٹھائے تھے اس کے صلہ میں شاہ مذکور نے کوئٹہ ناصر خاں بروہی کو دیدیا شاید اسی وجہ سے یہ کہانی آج تک بروہی قوم سے سنی جاتی ہے کہ احمد شاہ نے جب ناصر خاں کی ماں بی بی مریم کو دسہ کا

ضلع بخشانو کہا "یہ تمہاری شال ہے" (تحفہ ہے) اسی خیال سے کوئٹہ بہت عرصہ تک شال کہلاتا رہا۔ موجودہ خانِ قلات سرؔ ناصر خاں مرحوم ہی کے خاندان سے ہیں۔ مشہور یورپین سیاح میسن ۱۸۲۸ء میں کابل سے براہ قندھار ہندوستان جاتے ہوئے کوئٹہ سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ شال (کوئٹہ) قلعہ کے پاس (موجودہ قلعہ) ایک چھوٹی سی بستی ہے جس میں کل تین سو مکانات ہیں۔ اور ایک مختصر بازار ہے[1]

انگریزوں کے قبضہ میں کوئٹہ پہلے پہل جنگ افغانستان (اول) میں آیا لیکن پھر خان قلات کے قبضہ میں چلا گیا۔ اور تاوقتیکہ کرنل سر رابرٹ سنڈیمن (جو اس وقت میجر تھے) نے ۱۸۷۶ء میں واپس نہ لیا۔ خان قلات ہی کے قبضہ میں رہا کوئٹہ واپس ملنے پر جولائی ۱۸۷۶ء میں خان قلات میر خداداد خاں نے لارڈ لٹن (وائسرائے سے بمقام جیکب آباد ملاقات کی اور اس موقعہ پر عہدنامہ ۱۸۵۴ء کی تجدید اور توسیع عمل میں آئی جس کے رو سے ایک برٹش ایجنسی کا قیام بلوچستان میں منظور کیا گیا اور کوئٹہ ہمیشہ کے لئے انگریزی فوجوں کے لئے خالی کر دیا گیا۔ سر ایچ۔ ایس۔ بارنس۔ آئی سی ایس پولیٹیکل ایجنٹ بنائے گئے۔ اس کے صلہ میں انگریزوں نے خاں قلات کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ دینا منظور کیا۔ کوئٹہ کی حالت جس وقت انگریزی فوج نے قبضہ کیا قابلِ رحم تھی۔ خان قلات کا نائب اس وقت قلعہ میں تھوڑی سی فوج کے ساتھ رہتا تھا۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے مکانات قلعہ کے آس پاس بنے ہوئے تھے اور قلعہ غیر آباد اور سنسان پڑا تھا۔ کوئٹہ میں زراعت بہت کم ہوتی تھی اور بڑی مشکل سے خان قلات کو لگان وصول ہوتا تھا بروہی قوم (جس قبیلے کے موجودہ خان قلات ہیں) ہمیشہ جھگڑے اور فساد کا بازار گرم رکھتی تھی اور حتی الامکان خان قلات کو تکلیف پہنچاتی تھی۔ انگریزوں کے قبضہ میں آتے ہی کوئٹہ کی قسمت چمک گئی۔ جو کبھی گاؤں تھا اب ایک اعلیٰ درجہ کا شہر ہو گیا جیسا کہ آگے چل کر کوئٹہ کے جغرافیہ سے معلوم ہوگا۔

جغرافیہ ۔ کوئٹہ بلوچستان ایجنسی کا دارالسلطنت اور ویسٹرن کمانڈ کا ہیڈکوارٹر ہے یہ عرض بلد ۱۳ء۳۰ درجہ شمالی اور طول بلد ۱ء۶۷ درجہ مشرقی پر واقع ہے جو چاروں طرف کوہ چلتن۔ کوہ مردار۔ کوہ تکتو۔ اور کوہ زرغون سے گھرا ہوا ہے یہ خوفناک پہاڑ خشک پڑے رہتے ہیں۔ دی ٹورسٹ انڈیا (The Tourist India) کا مصنف ان پہاڑوں کے متعلق لکھتا ہے کہ "بلوچی میں ایک کہاوت ہے کہ جب دنیا کی پیدائش ہوئی تو کچھ خراب اور فضول مادہ باقی رہ گیا تھا جس کو پروردگار نے بلوچستان میں پھینک دیا جس سے یہ خشک کالے کالے پہاڑ بنے"

۱۹۲۱ء میں مردم شماری ۴۹۰۰۰ (فوج کو ملا کر) تھی جس میں سے ۲۷۴۴۱ کوئٹہ کے باشندے تھے۔

---

[1] *Masons journeys in Afghanistan, Baluchistan and the Punjab. Pages 326 – 30.*

آب وہوا۔ کوئٹہ سطح بحر سے ۵۵۰۰ فیٹ بلند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کی آب وہوا صحت افزا ہے لیکن میرے خیال میں یوروپین اور یہاں کے اصلی باشندوں کے لئے آب وہوا موافق ہے۔ یو۔پی کے باشندوں کے لئے ناموافق ہے کوئٹہ کے گرد و نواح کا نظارہ دلکش نہیں ہے۔ چاروں طرف خشک پہاڑ نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں گرمی میں دھوپ شدت سے پڑتی ہے اور ریگستانی ہوائیں چلتی ہیں۔ موسم سرما میں انتہائی سردی ہوتی ہے۔ جنوری اور فروری میں خشک پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھک جاتی ہیں۔ اور بقول مسٹر رینالڈس مصنف "ٹورسٹ انڈیا" اس زمانہ میں کوئٹہ سائبیریا ہو جاتا ہے بارش کے بجائے اکثر برف گرتی ہے۔ اگر دنیا میں کوئی شہر جاڑے کے دنوں میں ایسا ہو سکتا ہے جہاں سرسبز درخت اور ہری گھاس تک نہ دکھائی دے تو وہ کوئٹہ ہے۔ سرد ہوا کے جھونکوں اور برفباری سے راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے بدن پر کافی گرم کپڑا نہیں ہوتا وہ اکثر راہ چلتے چلتے سردی سے اکڑ کر مر جاتے ہیں۔ جاڑے کے دنوں میں کوئٹہ سنسان اور اجاڑ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن موسم بہار میں (جو مارچ سے لیکر ستمبر تک رہتا ہے) کوئٹہ کشمیر ہو جاتا ہے۔ ایرانی گلاب اور انواع و اقسام کے پھل اور پھولوں سے کوئٹہ پر شباب آ جاتا ہے۔ اس وقت یہاں کی آب وہوا خوشگوار ہو جاتی ہے۔ سوکھے درخت دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز اور شاداب ہو جاتے ہیں۔ رنگ برنگ کے خوبصورت پھولوں اور ہر قسم کے میوہ جات سے ایک نو وارد کی نگاہوں میں کوئٹہ گلدستہ معلوم ہوتا ہے اور اس وقت یہاں کے باشندے سردی کی مصیبتوں کو بھول جاتے ہیں۔

متعدی امراض کا زور کم ہے۔ بخار، کھانسی، نمونیا، ہیضہ کا حملہ اکثر ہوتا ہے۔ ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ یہاں معمولی خراش یا زخم بھی عرصہ میں اچھا ہوتا ہے جو یہاں کی مخصوص آب وہوا کا اثر ہے۔ خاکی رنگ کا ایک عجیب الخلقت چھوٹا سا کیڑا "مانگنو" جو کھٹمل سے کچھ ملتا جلتا ہوا اور اسی قدر و قامت کا ہوتا ہے۔ کوئٹہ کے بوسیدہ اور پرانے مکانوں کی چھتوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ کوئٹہ کے غریب باشندوں کے لئے بلائے آسمانی ہے۔ یہ کمبخت بدن کے جس حصہ میں کاٹتا ہے وہاں زہریلا مواد جمع ہو جاتا ہے۔ پہلے معمولی سوجن ہوتی ہے اور خارش کے ساتھ زخم ہو جاتا ہے۔ اگر شروع ہی میں کافی علاج کیا گیا تو خیر۔ ورنہ معمولی زخم بڑھتے بڑھتے تمام بدن میں پھیل جاتا ہے اور اچھا ہونے میں مہینے لگ جاتے ہیں اور جب تک آپریشن سے زہریلا مادہ خارج نہیں کیا جاتا اس کا اثر نہیں زائل ہوتا۔ یہ "مانگنو" سے کوئٹہ میں سب پناہ مانگتے ہیں۔ اس وقت تک "مانگنو" کے زخم کا سوائے آپریشن کے کوئی اور مفید علاج نہیں دریافت ہوا۔

زراعت۔ کوئٹہ کی اراضی میں طرح طرح کے مزروعات کی قابلیت ہے۔ لیکن یہاں کے باشندے کم فائدہ اٹھاتے ہیں انگریزی حکومت نے زراعت کی طرف خاص توجہ کی ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ آیندہ کوئی زمین بے کار نہ باقی رہیگی گندم، جو، باجرہ، مٹر، تمباکو، سبز ترکاری کی زراعت ترقی پر ہے۔ یہاں کے باشندے اشجار کی غور و پرداخت خاص کر

میوہ دار درختوں کی تربیت میں کمال مہارت رکھتے ہیں انار، زردالو، توت، شفتالو، آلو بخارا، آڑو، آلوچہ، سیب۔ سردہ۔خربوزہ۔بہی۔ بادام۔انگور۔انجیر۔ناشپاتی وغیرہ بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔موسم بہار کے اخیر میں میووں کے باغات پر بہار آجاتی ہے۔اور میوے بہت سستے بکنے لگتے ہیں۔لکھنؤ کا خربوزہ اور فرخ آباد کا تربوز مشہور ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہاں کے تربوز، خربوزہ اور سردہ سے وہ زیادہ خوش ذائقہ نہیں ہوتے۔بڑی فصلیں دو ہوتی ہیں۔ (ربیع وخریف) خود رو درخت بکثرت ہیں۔

صناعت۔کوئٹہ میں صنعت بہت کم ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ اسی قدر ہے جس قدر کہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں پہنچی ہے اور اس میں کسی قسم کی جدت سے کام نہیں لیا جاتا۔پٹھان نہایت اعلیٰ درجہ کا حریر تیار کرتے ہیں اور ایک قسم کا کشمیری گرم کپڑا بناتے ہیں۔ جسے "پٹو" کہتے ہیں۔ برے کی کھال کا ایک لباس بھی بناتے ہیں جسے وہ اپنی اصطلاح میں "کرک" کہتے ہیں قبیلہ ہزارہ میں ایک قسم کی بانات بنائی جاتی ہے۔ جسے "برک" کہتے ہیں اور یہ نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ اسکو وہ "برکر" بھی کہتے ہیں۔اسکی چھوٹی آستینوں کے جبے بھی بناتے ہیں۔افغان برے کی کھال کو خوب کما کر ریشم کی طرح نرم کرتے ہیں اور زرد رنگتے ہیں اور حاشیہ پر ریشم کا کام کرتے ہیں۔پھر کوٹ بناتے ہیں جن کے دامن گھٹنوں تک اور آستینیں کہنیوں تک ہوتی ہیں اسے "پوستینچہ" کہتے ہیں۔اہل صنعت و حرفت اور اوسط درجہ کے لوگ اُسے لبادے کی طرح بناتے ہیں جس کے دامن ٹخنوں تک لمبے ہوتے ہیں۔ اور آستینیں بھی کشادہ اور لمبی ہوتی ہیں۔ اسکو پوستین کہتے ہیں کوئٹہ میں ایک زنانہ دستکاری کا سکول بھی ہے۔

تجارت۔کوئٹہ، ایران۔افغانستان اور ہندوستان کے درمیان تجارت کا اچھا مرکز ہے۔ باہر سے کپڑا۔چمڑہ۔ لوہا۔ وغیرہ آتا ہے اور یہاں سے میوہ۔کمایا ہوا چمڑہ۔گدے پوستینیں اونی چغے۔قالینیں۔مشہدی لنگیاں اور صافے باہر جاتے ہیں۔ایران اور افغانستان کی تجارت پٹھانوں کے ہاتھ میں ہے جس سے وہ خوشحال ہیں۔ہندوستانی اور انگریزی اشیا کی تجارت سے پارسی اور سندھی تجار زیادہ آسودہ حال ہیں۔بہت سے پٹھان بغرضِ تجارت موسم کے مطابق ہر سال ہندوستان چلے جاتے ہیں۔

زبان۔ ملکی زبان پشتو ہے اس کے علاوہ بروہی۔سندھی۔فارسی انگریزی۔اردو اور پنجابی بھی بولی جاتی ہے۔سردار اور بہت سے ہندو بنئے ٹوٹی پھوٹی اردو سمجھ اور بول لیتے ہیں۔دفتری زبان اردو ہے جو اب خدا کے فضل سے کافی ترقی کر رہی ہے۔اعلیٰ جماعتوں کی پسندیدہ زبان فارسی ہے اور جو شخص یہاں تعلیم یافتہ ہونے کا مدعی ہے وہ اپنی لیاقت کی دلیل میں فارسی زبان کی مہارت کو پیش کرتا ہے۔بہت کم لوگ حتیٰ کہ ملا بھی عربی زبان بہت کم سمجھتے ہیں۔ہندوستانیوں میں پنجابیوں کی تعداد

یہاں زیادہ ہے اس لحاظ سے پنجابی بھی بہت بولی جاتی ہے ۔
تعلیم و ادب ۔ یہاں بہ نسبت پیشتر کے اب بہت سے سکول ہو گئے ہیں جن میں سنڈیمن ہائی اسکول ۔ خالصہ ہائی سکول آریہ ہائی اسکول ۔ گرامر ہائی اسکول ۔ برہمو سماج اسکول ۔ پارسی اسکول ۔ لیڈی سنڈیمن گرلز اسکول ۔ زنانہ مشن اسکول ۔ سناتن دھرم کنیا پاٹ شالہ اور اسلامیہ اسکول خاص طور پر مشہور ہیں ۔ اسکولوں کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا صرف ایک اسکول ہے ۔ اور وہ بھی آٹھویں جماعت تک ہے ۔ حالانکہ دیگر قوام کے ذاتی ہائی اسکول ہیں ۔ گورنمنٹ کی بھی رپورٹ مظہر ہے کہ ملکی باشندے (پٹھان ۔ بروہی وغیرہ) تعلیم میں بہت پیچھے ہیں اور اسکولوں سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ حالانکہ سرکاری طور پر اُن کو ہر طرح کی سہولیت اور آسانی ہے ۔ زیادہ تر غیر ملکی باشندے خاص کر ہنود تعلیم یافتہ ہیں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشری حالت نہایت قابلِ اصلاح ہے ۔ شہر بھر میں ان کا کوئی باقاعدہ عربی یا فارسی کا مدرسہ نہیں ہے جس میں حدیث ، منطق ، وغیرہ کی تعلیم دی جا سکتی ہو ۔ شاید یہ اُسی بے علمی کا نتیجہ ہے کہ ان کی ادبی و معاشرتی حالت قابلِ رحم ہے ۔ مختلف قسم کے فنون ۔ فنِ تعمیر ، لٹریچر کی طرف یہاں کے مسلمان بہت کم متوجہ ہوتے ہیں ۔ حالانکہ پٹھان نہایت ذکی اور فہیم ہوتے ہیں لیکن خدا جانے کیوں اس ذہانت اور طباعی پر بھی تعلیم سے بھاگتے ہیں ۔ قریب قریب ہر قوم کی یہاں علمی یا مذہبی مجلس ہے ۔ ہندو ۔ آریہ ۔ پارسی ۔ سکھ ۔ عیسائی ۔ سندھی وغیرہ کے کتب خانے اور سبھائیں ہیں ۔ لیکن مسلمانوں کی ایک نام نہاد اسلامیہ لائبریری بھی ہے تو وہ بھی ہندوستان کے بعض ناہموار ادبی رسائل کی طرح دوسرے یا تیسرے مہینے چند دنوں کے لئے کھل جاتی ہے ۔ اور پھر کچھ دنوں کے لئے بند ہو جاتی ہے ۔ اس کی وجہ یا تو چندہ کی کمی ہے یا مسلمانوں کی علم و ادب سے بے اعتنائی ۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی علمی حالت کو سنبھالیں ورنہ انہیں اب نہیں تو آخر کبھی کفِ افسوس ملنا پڑے گا ۔ تھوڑے عرصہ سے ایک مسلم یتیم خانہ قائم ہوا ہے جس کی حالت اچھی ہے ۔ مسلمانوں میں شیعوں کی کئی مذہبی مجلسیں ہیں جن میں "ینگ مین شیعہ ایسوسی ایشن" زیادہ مشہور ہے ۔ کوئٹہ کی تاریخ میں سر رابرٹ سنڈیمن کا نام نہایت عزت اور احترام سے لیا جائے گا جن کی کوشش سے یہاں تعلیم اور ادب کا چرچا ہوا ۔ انہیں کی یادگار میں ۱۸۸۶ء میں ایک عالیشان لائبریری قائم ہوئی جو کوئٹہ ایسے شہر کے لئے مغتنمات میں سے ہے ۔ اس لائبریری میں اردو اور انگریزی کی کافی تعداد میں کتابیں ہیں لیکن قلمی کتابیں بہت کم ہیں ۔ انگریزی کے تمام مشہور رسالے اور اخبار آتے ہیں ۔ اردو کے مشہور ادبی رسالوں میں معارف ، ہمایوں ، زمانہ اور مخزن اور ہندی رسالوں میں انتری ، وربین اور سرستی آتا ہے ۔ نہایت افسوس ہے کہ اس لائبریری میں اردو کتابوں کی طرف سے بہت بے اعتنائی برتی جاتی ہے ۔ اردو کی جو کتابیں ہیں اُن میں فلسفہ تاریخ اور ادب کی بہت کم ہیں ۔ زیادہ تر بازاری ناولوں کا ذخیرہ ہے ۔ اس پر طرہ یہ کہ اُن کا سلسلہ بہت بے ترتیب ہے اور یہی

وجہ ہے کہ ایک کتاب کی تلاش کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ اگر لائبریرین کو نمبر دے کر کتاب تلاش کرائی جائے تو فضول ہے۔ کیونکہ کتابیں نمبروار نہیں رکھی ہوئی ہیں۔ تاوقتیکہ خود پڑھنے والا اپنا وقت ضائع کرکے تلاش نہ کرے اسکو اردو کتابیں آسانی سے نہیں مل سکتیں۔ ایسی مشہور لائبریری کے لئے یہ طریقہ نہایت معیوب ہے جس کی اصلاح لازم ہے۔ انگریزی کتابوں کی ترتیب قابلِ تعریف ہے۔ تعلیم نسواں میں بھی یہاں کے باشندے کوئی حصہ نہیں لیتے امسال کوئٹہ سے اردو مڈل کلاس کے امتحان میں جو پنجاب یونیورسٹی کے زیرنگرانی ہوتا ہے۔ ۸ لڑکیاں شامل ہوئیں اور کامیاب ہوگئیں۔ ان میں سب غیر ملکی تھیں۔ ۸ لڑکیوں میں سے چھ ہندو اور ۲ مسلمان تھیں۔ (موخرالذکر میرے دوست مولابخش گجراتی کی ہونہار اور قابل صاحبزادیاں ہیں) اس نتیجہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے تعلیم سے کتنی بے پروائی برتتے ہیں۔

کوئٹہ سے "کوئٹہ گزٹ" (جو انگریزی میں ہفتہ وار شائع ہوتا ہے) کے علاوہ اور کوئی مشہور اخبار شائع نہیں ہوتا۔ اسکی پالیسی سنجیدہ اور صلح کن ہے۔

مذاہب۔ اہل اسلام (زیادہ تر سنّی المذہب ہیں) ہندو (جس میں آریہ سماج بھی شامل ہے) عیسائی۔ برھمو سماج اور پارسی۔ مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل کوئٹہ کا غالب عنصر اور اس کی اکثر آبادی غیر ملکیوں کی ہے لیکن مجھ کو اس سے سروکار نہیں۔ میں تو صرف یہاں کے اصلی باشندوں کے مذاہب۔ خصائص۔ رسم و رواج اور حالات وغیرہ مفصل لکھوں گا جو میری اصل غرض ہے۔ حسب موقع غیر ملکیوں کا بھی ذکر آجائیگا۔

بروہی۔ بلوچی۔ ہزارہ اور پٹھان جو مذہب اسلام کے خوشہ چین ہیں۔ یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ ان سب اقوام کے مختصر اور دلچسپ حالات یہاں پر لکھے جاتے ہیں۔

بروہی و بلوچی یہ دونوں اقوام کوئٹہ کے قدیم اور اصلی باشندے ہیں۔ چونکہ دونوں کے حالات قریب قریب ملتے جلتے ہیں اس لئے ان کا ذکر بھی ایک جگہ کر دیا گیا ہے۔ ظاہرا فرق صرف اتنا ہے کہ بروہی کے سر کے بال چھوٹے ہوتے ہیں لیکن بلوچی کے لمبے ہوتے ہیں۔ بروہی اپنی ڈاڑھیاں چھوٹی رکھتے ہیں لیکن بلوچی دراز ریش ہوتے ہیں۔ بروہی کا لباس چھوٹا لیکن بلوچی کا لباس لمبا ہوتا ہے۔ دونوں اقوام فارسی الاصل ہیں۔ پاؤں میں "چپل" پہنتے ہیں۔ دونوں اقوام قوت جسمانی، کرم و بخشش میں مشہور ہیں لیکن اپنے مذہب سے کم واقف ـــ یہاں تک کہ بعض ایسے بھی بلوچی اور بروہی ہیں کہ اگر ان سے دریافت کیا جائے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں تو جواب دیں گے کہ "ہمارا خان پڑھ لیا کرتا ہے اسلئے ہم کو ضرورت نہیں" اگر کوئی شخص خواہ وہ اجنبی ہو ان سے ملنے جائے تو سب سے پہلے خان کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ نہایت

محبت سے سلام کرتے ہیں جس میں بہت سا وقت صرف ہوتا ہے پھر سلام کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں ،، اگر تم ہماری مقدرت کو دیکھتے ہوئے کسی چیز کا سوال کروگے تو ضرور اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے "۔

بروہی اور بلوچی قوم میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہا درجہ کے جاہل اور نہایت درجہ سخت دل ہوتے ہیں۔ دونوں اقوام میں بہت سے قبائل ہوتے ہیں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں ہے۔ان کے رسم ورواج اور عادات میں کوئی خاص بات مجھے معلوم نہ ہوسکی۔ بروہی اور بلوچی اپنی عادت سے زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔بعض بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ چرا کر گزارہ کرتے ہیں۔

پٹھان -ایرانی اس قوم کو افغان کے نام سے پکارتے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ جس وقت بخت نصر نے انہیں قید کیا تو انہوں نے آواز نالہ و بکا بلند کی جسے فارسی میں "فغان" اور "افغان" کہتے ہیں۔ اس وقت سے یہ لوگ اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ افغان نام شاؤ ولی کا ایک پوتا تھا وہ ان افغانوں کا مورث اعلیٰ تھا۔اس لئے اس کے نام پر اس قوم کا نام مشہور ہوا۔ فارس کے عوام انہیں "اوفغان" کہتے ہیں جو افغان سے ملتا جلتا ہے۔اور ہندوستانی پٹھان کہتے ہیں۔سید جمال الدین افغانی رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ افغانی ایرانی الاصل ہیں۔ان کی زبان ژند اور اوستا سے ملتی ہے جو قدیم فارسی زبان ہے۔ پچھلے زمانہ کے مورخین مثل فرنسیس لنورماں وغیرہ بھی اس رائے سے متفق ہیں۔

اس قوم میں بہت سے قبائل ہیں مثلاً غلزی۔عبدل۔ کاکر۔ یوسف زئی اور بنگش وغیرہ کے مجموعے سے مرکب ہے ان میں سے ہر ایک کے قبیلے میں مختلف خیل (چھوٹے قبیلے) ہیں۔ جیسے قبیلہ غلزی میں تھک۔ توخی۔ سلیمان خیل ،اور بابل قبیل وغیرہ شامل ہیں اسی طرح ہر خیل میں مختلف خاندان ہیں اور پھر خاندان میں مختلف گھرانے ہیں۔جن کی تفصیل اس مقام پر درج کرنا محض طوالت ہے۔

چونکہ شجاعت اور تہوّر ان کی جبلت میں ہے اور قدیم زمانہ سے جنگجوئی پیشہ رہا ہے اس لئے ان میں فوجی نظام کی بہت کچھ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ان کی طبیعت کی طرح اُن کی طرز معاشرت میں بھی درشتی اور کسی قدر وحشت پائی جاتی ہے۔ ایک ہندوستانی کی نظر میں ان کی گفتگو بدتہذیبی کا پہلو لئے ہوئے معلوم ہوگی۔لیکن سب افغان اس مزاج کے نہیں ہوتے بعض نہایت سلیم الطبع ،ملنسار اور مہذب ہوتے ہیں۔زندگی بسر کرنے کے لئے ان کو ادنیٰ چیزیں بھی کفایت کرتی ہیں۔ یہ دنبہ کو جلد سمیت کھا جاتے ہیں۔ ذبح کرنے کے بعد اس کی جلد کو جھلس دیتے ہیں پھر اُسے بھون لیتے ہیں۔ وہ چمچوں سے نہیں کھاتے اور نہ خوان پر برتن رکھتے ہیں۔ بلکہ زمین پر رکھ کر ہاتھوں سے کھا جاتے ہیں۔

اُن کا لباس بھی عجیب وغریب ماہیّت کا ہوتا ہے۔ دیہاتی لبادے کی طرح ایک لباس پہنتے ہیں جسکی آستینیں ہاتھی

کی سونڈ کی طرح لمبی ہوتی ہیں۔ اسے یہ لوگ اپنی زبان میں کوسی کہتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک دوسرا لباس ہوتا ہے جو کہ کولے تک لمبا ہوتا ہے اور آستینیں بہت چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں اسے صدری کہتے ہیں۔ امرا کشمیری شال کے جُبّے اور سمور اور سنجاب کے پوستین پہنتے ہیں۔ اکثر قبائل سر نہیں منڈاتے بلکہ لمبی لمبی زلفیں رکھتے ہیں۔

ان کی عورتیں بہت لمبے ڈھیلے کپڑے پہنتی ہیں۔ کرتے کے سامنے ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکتی ہوئی لمبی جیب ہوتی ہے۔ دیہاتی عورتیں بلا تکلف باہر گھومتی پھرتی ہیں لیکن شہر میں پردہ کا خاص لحاظ رکھتی ہیں۔ ان قبیلوں کی عورتیں جو پہاڑوں میں رہتی ہیں اکثر گھوڑے کی دُموں کے بال کاٹ کر اپنے بالوں کے ساتھ ملا کر گوندھتی ہیں۔ قبیلہ غلزی کی عورتیں اپنے پیشانی کے بالوں میں چھلے ڈال کر گھونگھروالے بناتی ہیں اور پیشانی پر جھالر کی طرح لٹکا دیتی ہیں۔ اکثر عورتیں موٹے موٹے چاندی پیتل اور سونے کے چھلے پہنتی ہیں۔

پٹھان رگو اب بہت کچھ انگریزیت آگئی ہے، کرسیوں پر بہت کم نشست رکھتے ہیں بلکہ فرش پر قالین بچھا کر بیٹھتے ہیں اور جس طرح دوسری قوموں کے امرا میں شان وشکوہ ہوتا ہے ان میں نام کو نہیں پایا جاتا یہ اپنے نوکروں اور کم حیثیت والے اعزہ کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے میں تامل نہیں کرتے۔

پٹھان بوقت فرصت یا شادی بیاہ کے موقعوں پر ایک حلقہ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور رقص کرتے ہیں اور اسکے ساتھ گاتے بھی جاتے ہیں۔ طبل بجانے والے کی طرف ہر گانے والا اپنا منہ رکھتا ہے۔ ایسا رقص میں نے اس سال عید الفطر کو دیکھا تھا۔ اس رقص میں مجھے ۸ برس کے بچے سے لیکر ۵۰ - ۶۰ برس کے بوڑھے تک دکھائی دیئے۔ سنا ہے کہ پٹھان ہاتھوں میں تلواریں لیکر بھی ایسا رقص کرتے ہیں۔ لیکن مجھے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ عورتیں بھی بعض اوقات مردوں کے ہاتھ تھام کر ناچتی ہیں۔ مرد کبھی کبھی تنہا بھی ناچتے ہیں اور اس ناچ کو اپنی زبان میں عتن کہتے ہیں۔

پٹھانوں میں شادی کا عجیب طریقہ ہے۔ شادی سے پہلے ایک عورت کو بھیج کر لڑکی دیکھ لی جاتی ہے۔ جب لڑکی پسند کر لی جاتی ہے تو لڑکا اپنے والدین اور کچھ اعزہ اور احباب کے ہمراہ لڑکی کے باپ کے پاس جاتا ہے۔ اور وہاں "ولور" (نذر) کا جو لڑکے کو دینا پڑتا ہے تذکرہ کیا جاتا ہے جو باپ اپنی لڑکی کو دیتا ہے فیصلہ کیا جاتا ہے۔ سمدھیوں کی رضامندی پر ولور کی تعداد مقرر کی جاتی ہے اور تب لڑکی کی ماں، نانی یا دادی دولہا کے باپ کو ایک سوئی جس کے سوراخ میں ایک ریشمی تاگا پڑا ہوتا ہے نذر کرتی ہے۔ اس وقت بندوقیں چھوڑائی جاتی ہیں دنبے ذبح کیئے جاتے ہیں اور دعوت ہوتی ہے یہ سگائی کا پہلا درجہ ہے۔ اور اس کو "کوکرا" کہتے ہیں۔

اچک زئی اور تارن (قبائل افغان) میں "کوکرا" کے وقت ایک "مُلّا" بھی موجود رہتا ہے اور وہ لڑکے کے باپ کی

طرف سے وکالت کرتا ہے "کوکرا" کی رسم کے بعد سگائی پکی سمجھی جاتی ہے - جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ بہت قابل لعنت و ملامت سمجھا جاتا ہے - ایک ماہ کے بعد "ولور" کی کچھ رقم ادا کر دی جاتی ہے - اور تب کچھ لوگ لڑکے کے اعزہ و احبا میں سے لڑکی کے باپ کے گھر پر جاتے ہیں، جہاں لڑکی کا باپ ان کو ایک ریشمی رومال نذر کرتا ہے جس کا رنگ عموماً سبز ہوتا ہے اور جس کے گوشوں پر کوئی ریشمی پھول یا طلائی کام ہوتا ہے - اس رسم کو "کوزدا" یا سگائی کہتے ہیں - اور اس موقع پر رقص و سرود کا جلسہ کیا جاتا ہے - کوئٹہ کے سیدوں میں دولہا کا باپ نسبت کے دن دلہن کو ایک چاندی یا سونے کی انگوٹھی نذر کرتا ہے جو انگشتِ شہادت میں پہنا دی جاتی ہے -

"کوزدا" کے بعد دولہا کو اجازت ہے کہ وہ اپنی ساس کی رضامندی سے اپنی دلہن کو مل سکتا ہے لیکن وہ ایسا علانیہ نہیں کر سکتا - اس خفیہ ملاقات کو "گلاگردنی" کہتے ہیں لیکن عام طور پر یہ رواج ہے کہ دولہا اپنے دوستوں کے ہمراہ دلہن کے گھر پر جاتا ہے - اور اپنی منگیتر کو ایک جوڑا جس میں قمیص، شلوار، جوتا وغیرہ ہوتا ہے پیش کرتا ہے - احباب تو دعوت کھا کر چلے جاتے ہیں لیکن لڑکا رہ جاتا ہے اور دو چار دن منگیتر کے گھر قیام کرتا ہے - اس کے بعد لڑکے کو بھی ایک جوڑا دیکر لڑکی والے رخصت کر دیتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی وہ جب چاہے آ سکتا ہے اور اپنی منگیتر سے مل سکتا ہے اگر لڑکی اپنے باپ کے گھر میں حاملہ ہو جاتی ہے تو شادی کی تاریخ جلد مقرر کر دی جاتی ہے اور لڑکے کو جرمانہ (جس کی تعداد پچاس سے لیکر دو سو روپے یا اس سے بھی زیادہ حسبِ حیثیت ہوتی ہے) دینا پڑتا ہے "کوئٹہ اور اس کے قرب و جوار میں سوائے کردنی سیدوں کے اور تمام پٹھان خاص خاص قبیلوں میں "گلاگردنی" کا رواج پایا جاتا ہے"

جب ولور کا سب روپیہ ادا ہو جاتا ہے تب نکاح کی تاریخ مقرر ہوتی ہے جس کی تکمیل دلہن کے گھر پر ہوتی ہے لیکن اچک زئی کے قبیلے میں اس کے برخلاف دولہا کے مکان پر نکاح ہوتا ہے - نکاح اور رخصتی کے وقت بھی بہت سی عجیب و غریب رسمیں ادا کی جاتی ہیں جن کا ذکر فضول ہے - ولور کے علاوہ دلہن کے باپ کو لڑکے کا باپ دعوت کا بھی خرچ دیتا ہے بیوہ کے ساتھ "گلاگردنی" کا رواج نہیں ہے - صرف نکاح پڑھا دیا جاتا ہے - کرانی سیدوں کے علاوہ پٹھانوں کے اکثر قبیلے "ولور" لیتے ہیں -

طلاق کا عجیب طریقہ ہے اگر مرد کو یقین ہو جاتا ہے کہ عورت بدمزاج ہے یا اس نے کوئی چوری کی ہے تو وہ تین کنکریاں یا تین مٹی کے ڈھیلے عورت کے پیچھے پھینک دیتا ہے جس سے وہ سمجھ لیتی ہے کہ اسکو طلاق دے دی گئی ہے - زانی عورتوں کو نہایت سخت سزا دیتے ہیں انگریزی عملداری سے پیشتر قتل بھی کر دیتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہوتا -

نوجوانوں کو جب کسی حسینہ سے عشق خانہ خراب ہو جاتا ہے تو وہ اسکی محبت میں ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ عشق

و محبت کے اظہار کے لیئے اپنے بزرگوں اور ناصحوں کو بھی قتل کرنے میں ذرا لحاظ نہیں کرتے۔

تمام افغانی سنی المذہب ہیں اور مرد اور عورت سب نماز اور روزہ کے پابند ہوتے ہیں لیکن قبیلہ "کاکر" کے بعض لوگ گو بظاہر مذہب اسلام پر ہیں لیکن طریقہ مزدکیہ کی پیروی کرتے ہیں۔

پٹھان گو اپنے دین مذہب اور قوم کے معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں تاہم دوسروں کی حق تلفی نہیں کرتے اور اگر کسی شیعہ یا غیر مسلم کو اپنے مذہب کے ارکان ادا کرتے دیکھتے ہیں تو بُرا نہیں مانتے

اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے پاس پناہ لیتا ہے تو جان و مال سے اُسکی حمایت کرتے ہیں

یہ لوگ غلہ کی قسم سے اکثر کنگنی، باجرہ، جوار اور گیہوں کھاتے ہیں۔ اور گوشت بکثرت استعمال کرتے ہیں اصلاح طعام کے لیئے دہی کا استعمال خاص طور سے کیا جاتا ہے۔ ایک قسم کی خمیری روٹی جسے وہ اپنی زبان میں "کاک" کہتے ہیں خُوب رغبت سے کھاتے ہیں۔

پٹھانوں کے ہاں بڑے آدمیوں کو خان، ملک یا سردار کہتے ہیں۔

ہزارہ ۔ ان کی صورتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منگولی الاصل ہونگے کیونکہ اُن کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں اور آنکھوں کے کوئے سر کی جانب پھرے ہوتے ہیں۔ ڈاڑھی بھی اُن کے بہت کم ہوتی ہے۔ صرف ٹھڈی میں دو تین بال ہوتے ہیں اور دیکھنے میں چینی یا تاتاری معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ چنگیز خاں کی فوج کے باقی ماندہ لوگوں میں سے ہیں۔ اس قبیلہ میں خشونت بہت زیادہ ہے۔ اور طبیعت بالکل جنگلی اور وحشی ہوتی ہے لیکن اب متانت بھی آتی جاتی ہے یہ لوگ سوائے قبیلہ جمشیدی کے سب ایک قسم کی کھلی ہوئی عبائیں پہنتے ہیں اور اس کے اوپر کمر میں پٹکا باندھتے ہیں۔ اگر "برک" (ایک قسم کا ریشمی کپڑا جس کو وہ خود بناتے ہیں) کی قبا ہو تو اسکی آستینیں کہنی تک رکھتے ہیں۔ چونکہ اب ان میں بھی انگریزیت آچلی ہے۔ اس لحاظ سے انگریزی پوشاک کا بھی رواج عام طور پر ہو چلا ہے ان کی عورتیں فراک سے ملتا جلتا ایک قسم کا کرتا پہنتی ہیں۔

سوائے قبیلہ "شیخ علی" اور "جمشیدی" کے تمام قبیلے ہزارہ کے شیعی المذہب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مذہب میں نہایت سخت اور راسخ العقیدہ ہوتے ہیں لیکن صوم و صلوٰۃ کی زیادہ پابندی نہیں کرتے۔ ان لوگوں میں ایک عجیب رسم یہ ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو دفن کے بعد مردے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ "جب تمہارے پاس منکر و نکیر آئیں تو خوف نہ کرنا۔ کیونکہ تمہارے آقا و مولی علی عنقریب تمہارے پاس آئیں گے اور ان کو تمہارے پاس سے بھگا دیں گے"۔ ان میں یہ بھی رسم ہے کہ تمام میت والے مُردے کے دفن کے بعد اسکی ٹوپی پھاڑ کر قبر پر رکھ کر چلے آتے ہیں۔

محرم کے عشرۂ اول میں سیدنا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماتم میں بہت کچھ اہتمام کرتے ہیں اور اپنی پشت اور سینہ کو برہنہ کر کے زنجیروں سے مارتے ہیں جس سے خون کے فوّارے جاری ہو جاتے ہیں۔

ہزارہ کے نزدیک شریف کی یہ پہچان ہے کہ وہ بہت مغرور ہو اور شان و شوکت سے رہتا ہو۔

اُن کے ہاں جب دو عورتوں میں کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو اُن میں سے ہر ایک اپنی طرف سے ایک ایک عورت کو جو طرح طرح کی گالیاں بکنے میں شہرۂ آفاق ہوتی ہے۔ نائب بنا دیتی ہے اور پھر ان نائبوں میں لڑائی شروع ہوتی ہے اور اس وقت تک یہ لڑائی جاری رہتی ہے جب تک ان میں کوئی ایسی گالی کے ساتھ حملہ نہ کرے جس کا جواب مدّمقابل سے ممکن نہ ہو۔ اس طرح سے جب ایک عاجز ہو جاتی ہے تو دوسری جیت جاتی ہے اور اس کو ہارنا پڑتا ہے جس کی نائبہ اس فحش لڑائی میں ہار جاتی ہے اگر اس لڑائی میں دن گزر جائے اور کوئی غالب نہ آئے تو کل کے وعدے پر لڑائی کو دوسرے دن کے لئے موقوف کر دیتے ہیں ان لوگوں کی کافی تعداد آج کل فوجوں میں معزز عہدوں پر ممتاز ہے۔ انکی عورتوں اور بچوں میں تعویذ بہت استعمال کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا اقوام کے علاوہ کوئٹہ میں سناتن دھرم ہندو۔ آریہ سماج (گوشت و سبزی خور) سکھ، پارسی، عیسائی کبیر پنتھی برھمو سماج۔ نیچریہ۔ جینی۔ بدھ لوگوں کی کافی تعداد ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تعداد ان سب اقوام سے زیادہ ہے

عمارتیں ۔ چونکہ کوئٹہ انگریزی طرز جدید کا بسایا ہوا شہر ہے اس وجہ سے یہاں کی تقریباً تمام عمارتیں نئی ہیں۔ کوئی تاریخی عمارت قابل ذکر نہیں ہے۔ نئی عمارتوں میں ریزیڈنسی۔ کچہری۔ ٹاؤن ہال۔ سنڈیمن ہال میکموہن پارک۔ اسٹاف کالج گوشت و سبزی کی مارکیٹ۔ میکموہن مارکیٹ۔ میکموہن عجائب گھر۔ سنڈیمن لائبریری۔ چرچ آف انگلینڈ۔ کلب گھر۔ قلعہ۔ خاص طور پر قابل دید ہیں عوام کے مکانات اکثر کچی اینٹ کے بنے ہوئے ہیں بعض مکانوں میں چھوٹا سا باغیچہ۔ کنواں یا نل بھی ہوتا ہے۔

اسپتال متعدد ہیں۔ جن میں سول اسپتال، فوجی اسپتال، مشن اسپتال، لیڈی سنڈیمن اسپتال زیادہ مشہور ہیں۔

جامع مسجد جو وسط شہر میں واقع ہے گو مختصر بنی ہوئی ہے لیکن خوبصورت ہے۔ دھرم سالے اور سرائیں بھی کافی ہیں۔ جن میں سکھوں، سناتن دھرمیوں، سندھیوں کے دھرم سالے اچھے بنے ہوئے ہیں۔ پارسیوں کا بھی ایک مختصر معبد بنا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ شہر میں ہوٹلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہوٹلوں میں خاصی رونق رہتی ہے۔ ہارمونیم اور رباب کی سُریلی صدائیں راہ چلتوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ شوقین مزاج شام کو ہوٹلوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور گپ شپ اڑاتے ہیں۔ یورپ میں جو رونق شراب خانوں کو ہے وہ یہاں کے بازاری ہوٹلوں کو ہے جس طرح وہاں غریب سے غریب مزدو

بھی تھوڑی سی شراب پینے میں فخر سمجھتا ہے۔ اسی طرح یہاں کے باشندے (پٹھان، بروہی، بلوچی، ہزارہ وغیرہ) مزدور پیشہ اور فوجی لوگ جن میں غیر ملکی بھی شامل ہوتے ہیں ہوٹلوں کی خُوب زینت بڑھاتے ہیں۔ جاڑوں میں قہوہ یا چائے کی پیالی پیتے ہیں۔ گرمیوں میں فالودہ اور شربت سے کلیجہ ٹھنڈا کرتے ہیں۔ حقّے کے کش لگاتے ہیں۔ اکثر لوگ ہاتھ میں تسبیح بھی لئے ہوئے آتے ہیں۔ کھانے پینے کے ساتھ اس کو بھی ہلاتے جاتے ہیں۔ جو دیکھنے والوں پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے یہاں پر ہر قوم ہر وضع اور ہر طبیعت کے لوگ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو چائے کا شوق نہیں ہے تو کسی اور چیز کی فرمائش کر دیجئے اور اسی گروہ کا جو یہاں جمع رہتا ہے جزو بن جائیے تو پھر گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی آپ کا جی نہیں اکتا سکتا ہندوستانی ہوٹلوں سے یہاں کے ہوٹل نفیس اور پاکیزہ ہوتے ہیں تین بڑے بازار ہیں جن میں صفائی کا انتظام عُمدہ ہے۔ اس شہر میں ایک خوبی یہ ہے کہ بڑے اور چھوٹے تمام بازار بالکل سیدھے ہیں۔ سڑکیں کشادہ اور فراخ ہیں لیکن جاڑوں میں جب بارش اور برفباری ہوتی ہے تو کیچڑ سے خراب ہو جاتی ہیں اور راستہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔

زیارت گاہیں ۔ حضرت پیر بخاری کا مزار جو کنٹونمنٹ اسپتال کے پاس ہے مرجع خلائق ہے۔ یہ بزرگ حاجب زئی سیّد تھے۔ یہاں کے باشندوں کا اعتقاد ہے کہ مزار کی خاک اندرونی امراض میں اکسیر ہے واللہ اعلم۔ مزار کے قریب ہی میر خداداد خاں مرحوم (خان قلات) کی ایک لڑکی بیراں خاتون کا مقبرہ ہے جس نے ایک خواب کی بشارت سے یہاں ہی دفن ہونے کی استدعا کی تھی۔

شال میراں (خواجہ سیّد نصیرؒ) کا مزار قلعہ کے پاس ہے لیکن زیادہ مشہور نہیں ہے۔

ہندوؤں اور سکھوں کی بھی قلعہ کے اندر ایک پرستش گاہ ہے جو پانی ناتھ کے نام سے مشہور ہے۔ پانی ناتھ کے متعلق جو ایک ہندو جوگی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گورکھ ناتھ کے چیلے تھے اور ۴۰ برس کی متواتر ریاضت اور تپسیا کے بعد اس جگہ پر جہاں آج کل ان کی سمادھی بنی ہوئی ہے زندہ دفن کر دیئے گئے تھے۔ شال کوٹ۔ سندھی اور ہندو اِن بزرگ کے متعلق عجیب و غریب روایتیں بیان کرتے ہیں۔ جن سے پانی ناتھ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ ہر دوشنبہ کو پانی ناتھ پر قلعہ کے اندر ایک مختصر سا میلہ لگتا ہے۔ جس میں تمام ہندو بغیر کسی روک ٹوک کے شامل ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں زیادہ تعداد انکی عورتوں کی ہوتی ہے معبد گاہ پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ پرشاد بانٹا جاتا ہے۔ طبلہ اور ہارمونیم کے ساتھ گانے کا جلسہ بھی ہوتا ہے جس سے بہت زیادہ رونق ہو جاتی ہے۔

سیر گاہیں ۔ وسط شہر میں ایک نہایت خوبصورت مختصر باغ (جس میں سنڈیمن ہال، عجائب گھر اور سنڈیمن لائبریری ہے) بنا ہوا ہے۔ شام کو یہاں شوقین مزاج لوگ برائے سیر و تفریح آتے ہیں۔ جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اسکے علاوہ اور بھی کئی خوبصورت میوے کے باغ ہیں۔ جو ہر لحاظ سے قابل دید ہیں۔ نرسری گارڈن اور رانی باغ بھی دیکھنے کے لائق ہیں

میلے - جم خانہ کے قریب گھوڑوں کا ہر سال ماہ ستمبر میں میلہ لگتا ہے۔ شوراتری کے دن بھی ایک مختصر میلہ لگتا ہے جم خانہ کے قریب ہی دسہرہ اور بیساکھی کے میلے لگتے ہیں۔ عیدین کے دن مسلمان نہایت تزک واحتشام سے عیدگاہ میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ اور اسی دن سبزی بازار کے پاس ایک میلہ لگتا ہے جس میں افغانی رقص بھی ہوتا ہے لیکن قابل افسوس بات جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پولیس کی ممانعت کے باوجود بھی جُوا ہوتا ہے۔ جس کا یہاں بہت رواج ہے۔ گویا جواریوں کے لئے عید کا دن دیوالی کا دن ہوتا ہے۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی لوگوں نے سنا اور دیکھا ہو گا۔ لیکن وہ "انڈے بازی" سے ناواقف ہونگے جس طرح مرغ اور بٹیر لڑائے جاتے ہیں اسی طرح کوئٹہ میں لوگ شرط لگا کر انڈے لڑاتے ہیں۔ جن لوگوں میں ایسی لغو بازیوں کا رواج ہو گا اُن کی اخلاقی، معاشرتی، اور تمدنی حالت کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پردہ - یہاں کا پردہ نہ تو ہندوستان (اس سے میری مراد یو۔ پی سے ہے۔ کیونکہ میرے پنجابی احباب مجھے ہندوستانی کے پیارے خطاب سے مخاطب کرتے ہیں) کی طرح شرع کی حد سے بڑھا ہوا ہے اور نہ یورپ کی بے پردہ قوموں کی طرح عورتوں اور مردوں کے بیباکانہ خلا ملا کی اجازت دیتا ہے۔ ماسوا بڑے بڑے ملکی سرداروں اور امیروں کی عورتوں کے عام طور پر عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ بازاروں سے بلا تکلف سودا خرید لاتی ہیں۔ پنجابی ہندو۔ سندھی، عیسائی اور پارسی عورتوں میں پردہ کا بالکل رواج نہیں ہے۔ پنجابی مسلمان عورتیں برقع کا استعمال کرتی ہیں۔ اور بلا کھٹکے سیر و تفریح کا لطف اٹھاتی ہیں۔ سودا سلف خریدتی ہیں مردوں سے بات چیت کرتی ہیں۔ اُن کے مرد ان کی عدم موجودگی میں گھر کا انتظام کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پنجابی عورتوں کی صحتِ جسمانی ہندوستانی عورتوں سے بہت اچھی ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمان عورتوں کی بھی یہاں آ کر ایک طرح سے قسمت کھل جاتی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی مسلمان پنجابی عورت سے میل جول ہو گیا یا ساتھ رہنا پڑا تو ان میں بھی آزادی کی روح آ جاتی ہے اور برقع اوڑھ کر باہر نکلنے میں انکی جھجک جاتی رہتی ہے

انتظام - مقدموں کے فیصلے پنچائت سے ہوتے ہیں لیکن کوئٹہ میں اسپیشل مجسٹریٹ فیصلہ کرتا ہے۔ عجیب بات یہاں دیکھنے میں یہ آئی کہ ہندوستان کی طرح یہاں جا بجا وکیلوں کے سائن بورڈ نظر نہیں پڑتے جس کی وجہ یہ ہے کہ بغیر خاص اجازت کے کوئی وکیل مقدمہ کی پیروی نہیں کر سکتا۔ کوئٹہ میں ایجنٹ گورنر جنرل (جن کو چیف کمشنر بھی کہتے ہیں) رہتا ہے جس کے ماتحت تمام صوبہ کا انتظام کمشنر کرتا ہے۔ اس کے نیچے ہر ضلع کے واسطے ایک ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے۔ موجودہ ایجنٹ گورنر جنرل اور چیف کمشنر آنریبل مسٹر ایف۔ ڈبلیو۔ جانسن سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ای بہت ہی قابل منتظم اور ہر دلعزیز ہیں۔ کوئٹہ کا انتظام نہایت قابل تعریف ہے۔ سول پولیس کے علاوہ خفیہ پولیس کی تعداد بہت زیادہ ہے اسٹیشن پر جب تک خفیہ پولیس نو وارد کے چال چلن کی تصدیق نہیں کر لیتی شہر میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے یہاں کے قوانین ذرا سخت ہیں جن کی وجہ سے یہاں جرائم کی کثرت نہیں۔ ہے قتل کے مقدمات بذریعہ پولیٹیکل ایجنٹ جرگہ (سرداروں

کی کونسل) میں پیش ہوتے ہیں جہاں اُن کا فیصلہ ہوتا ہے۔

فوجی حیثیت سے بھی کوئٹہ نمبر اول کا ملٹری اسٹیشن اور ویسٹرن کمانڈ (مغربی کمان) کی افواج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

زمیندار کرایہ کے طور پر اپنی پیداوار کا کچھ حصہ (شاید ⅙) سرکار برطانیہ کو دیتا ہے۔ اسکو مالیہ یا ڈھل کہتے ہیں۔

خاتمہ۔ کوئٹہ میں سب سے اچھی بات جو مجھے پسند آئی وہ یہ ہے کہ یہاں ہندو مسلمان کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے مگو مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن وہ اپنے ہندو بھائیوں سے نہایت عمدہ سلوک کرتے ہیں اور ہندو بھی مسلمانوں سے کاشی۔ پراگ اور متھرا کے ہندوؤں کے برخلاف زیادہ چھوت چھات نہیں کرتے بلکہ مل کر رہتے ہیں)۔ کاشکے ہندوستان میں بھی ایسا سلوک ہوتا۔ اگر کوئی متعصب بھی ہو تو وہ اپنے خیالات کا علانیہ اظہار نہیں کر سکتا جس کی وجہ گورنمنٹ کا حسنِ انتظام ہے۔ اگر ہمارے ہندوستانی بھی یہاں کے لوگوں کی تقلید کریں تو ہمیشہ کے لئے آئے دن کے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔ شلوار اور پگڑی کے استعمال کا یہاں بہت رواج ہے اس میں ہندو یا مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ پارسی۔ سندھی اور ہندو بنیئے اور تجار بوجہ تجارت یہاں پر زیادہ خوش حال ہیں۔ مسلمانوں میں کنجڑوں۔ قصائیوں کی حالت اچھی ہے لیکن ان میں زیادہ تر غیر ملکی ہیں۔ اصلی باشندوں میں پٹھان میوہ فروش اور سوداگر جن کی تجارت ہندوستان افغانستان اور ایران سے ہے زیادہ مالدار اور باوقار ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں کی حالت کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں ہے ان کی تعلیمی اور معاشرتی حالت قابلِ اصلاح ہے۔ وظیفہ خواروں اور خاندانی روسا کی تعداد کافی ہے۔ لیکن وہ اپنے آرام و آسائش میں مست ہیں بازاروں میں پیشہ ور پٹھان بروہی بلوچی فقیروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اُن کی حالت پر افسوس ہوتا ہے اور یہ خیال کر کے عبرت ہوتی ہے کہ انہیں کے آبا و اجداد تھے جنہوں نے عرصہ تک ہندوستان میں بادشاہت کی ہے۔ اور جن کے دربر بڑے بڑے بادشاہ راجہ اور مہاراجہ سر جھکانا اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن اب وہی لوگ جن کی رگوں میں کبھی تیمور اور نادر کا خون جوش مارتا تھا کوئٹہ کے بازاروں میں گدائی کرتے ہیں اور ان کو غیرت نہیں محسوس ہوتی۔ انہیں فقیروں میں بہت سے فقیر فخریہ اپنے کو سید کہتے ہیں لیکن بھیک مانگنے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ اللہ اللہ کیا انقلاب زمانہ ہے دنیا بھی عجیب جگہ ہے جہاں عروج و زوال کے عبرت ناک نظارے ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں۔ کوئٹہ میں عیش و عشرت کا بازار رونق پر ہے۔ تھیٹر اور سینما بکثرت ہیں۔ مزدور پیشہ اور رؤسا مزے میں ہیں لیکن متوسط حال لوگوں کی گذر اوقات کوئٹہ میں مشکل سے ہوتی ہے۔ سوائے میوہ کے تقریباً ہر چیز یہاں مہنگی بکتی ہے۔

المختصر کوئٹہ کی موجودہ حالت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پردیسی یہاں سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اصلی باشندے تنزل کی جانب مائل ہیں اور اگر انہوں نے اپنی حالت جلد نہ سنبھالی تو پھر اُن کا اللہ ہی مالک ہے۔

اعظم کریوی

رُباعی

تنویرِ وفا ہے زندگانی میری تصویرِ ضیا ہے شادمانی میری

رقصاں ہیں نگاہ میں تصاویرِ جمال فانوسِ خیال ہے جوانی میری

وجدانیات

رنگیں ہے نقشہائے محبت سے یہ فضا

دامانِ دل مرقعِ ارژنگ ہے مجھے

درکار ہیں جنونِ محبت کو وسعتیں

صحرائے خارزارِ جہاں تنگ ہے مجھے

ہر پیکرِ حیات ہے میخانۂ جمال

ذوقِ نگاہ ساغرِ صد رنگ ہی مجھے

عابد

غزل

شہیدِ خنجرِ اُلفت کو مرحبا کہئے ۔ کہ اس کے شوقِ شہادت کو مرحبا کہئے

تمام دفترِ عصیاں کی شست کردی ۔ وفورِ اشکِ ندامت کو مرحبا کہئے

صعوبتِ غمِ فرقت کو عمر بھر جھیلا ۔ وفائے اہلِ محبت کو مرحبا کہئے

وہ اور دیکھتے حالِ زبوں مرا آکر ۔ کمالِ جذبِ محبت کو مرحبا کہئے

کبھی نہ بھولے سے کی آرزو رہائی کی ۔ اسیرِ دامِ محبت کو مرحبا کہئے

نئے الم ہیں نئے غم آئے دن اٹھاتے ہیں ۔ بلاکشانِ محبت کو مرحبا کہئے

کبھی تو اپنی جفاؤں پہ ہو جئے نادم ۔ کبھی تو کشتۂ فرقت کو مرحبا کہئے

پڑے ہیں پھیر میں اسکے بڑے بڑے دانا ۔ خیالِ باطلِ راحت کو مرحبا کہئے

یہ بندشیں یہ معانی یہ ندرتِ مضموں

فروغِ طبعِ ولایت کو مرحبا کہئے

ولایت حسین خاں

نوائے راز

یہ لرزشِ رندانہ یہ لغزشِ مستانہ ۔ بدنام نہ ہو جائے ساقی ترا میخانہ

جلووں کے تبسّم سے نغموں کے ترنم سے ۔ فطرت کے تکلم سے سن لو مرا افسانہ

ذروں سے نہاں ہوتا تاروں سے چھپا ہوتا ۔ اے کاش کہ ملجاتا ایسا کوئی کاشانہ

خود کر لیے فطرت نے اندازِ جنوں پیدا ۔ کس شان سے ہوتی ہے دلداریٔ دیوانہ

اس مست خیالی سے بدنام نہ ہو جاؤں ۔ چل اور کہیں لیچل اے جذبۂ مستانہ

اے شیخ یہ سب تیری نیت کے کرشمے ہیں ۔ تو توبہ شکن ہو اور ٹوٹے مرا پیمانہ

خلوت گہِ نظارہ اغیار سے خالی ہے

بے سود یہ روپوشی اے جلوۂ جانانہ

[illegible]

موجِ مے

چشمِ مستِ مے کشاں ہے ترجمانِ موجِ مے ۔ کھل رہا ہے ساقیا رازِ نہانِ موجِ مے

برگِ گل سے لب پہ ظاہر ہے نشانِ موجِ مے ۔ موجۂ برقِ تبسم میں ہے شانِ موجِ مے

وصفِ چشمِ مستِ ساقی میں ہیں سب رطب اللساں ۔ بولتوں کے منہ لبِ ساغر زبانِ موجِ مے

گاہ خم میں گہ سبو میں شیشہ و ساغر میں گاہ ۔ منزلیں طے کر رہا ہے کاروانِ موجِ مے

لے اُڑی رندوں کو ساقی کیا ہوا برسات کی ۔ کشتیِ مے پر لگا جب بادبانِ موجِ مے

ایک کی سو سو سنائینگے جو آیا محتسب ۔ دونوں گویا ہیں لبِ ساغر زبانِ موجِ مے

کہنہ ہو کر ہوتی ہی پیرانہ سالی میں جواں ۔ کم نہیں ہوتی کبھی عمرِ روانِ موجِ مے

ساقیٔ کوثر تلک اک دن بدر پہنچائے گا یہ

راہ گم کردہ نہیں ہے کاروانِ موجِ مے

بہادر رادی

تاش کی بازی

قہوہ خانہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا جو آپس میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اور ساتھ ساتھ قہوہ بھی پیتے جاتے تھے۔ یہ عید کی شام تھی، ان میں سے ہر ایک خوش تھا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا، بعض تاش کھیل رہے تھے اور بعض تالیاں بجا بجا کر گیت گا رہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک شخص اندر داخل ہوا جس کی آمد کی کسی کو خبر نہ ہوئی، وہ ایک دبلا پتلا پست قامت شخص تھا اسکے سر پر استرخانی ٹوپی تھی، جو کسی قدر اس کے ماتھے پر سرک آئی تھی۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی یہاں تک کہ وہ مجمع کے آخری سرے پر ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ڈھاسنہ لگا کر کھڑا ہو گیا، اور ایک پرانا زنگ آلودہ پستول نکالکر اس نے کل حاضرین کو مخاطب کیا

"بھائیو! میری اس حرکت کو نازیبا خیال نہ کرنا، میں بڑی احتیاط سے اس وقت نادرخان کو اپنے پستول کی زد میں لے آیا ہوں اور اس وقت تک لئے رکھوں گا جب تک تم میں سے ایک بھائی اٹھ کر اس سے اس کا پستول نہ لے لے۔ میں صرف "

"عبا . . . ."

یہ آواز نادرخاں کے اچانک خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں سے نکلی تھی اس کا چہرہ معاً سرخ ہو گیا اور اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ لیکن وہ فوراً سنبھل گیا، اجنبی نے کہا "ہاں . . . . . عباس . . . . علی خاں"

اجنبی بہت کمزور تھا اور اس کی آواز تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی ٹوپی پیچھے سرکائی۔ اسکی چھوٹی چھوٹی خوبصورت آنکھوں میں غم صاف طور پر نمایاں تھا اُس نے پہلے نادرخاں اور پھر دوسرے آدمیوں کی طرف دیکھکر کہا، بھائیو! میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ نادرخاں سے اس کا پستول لے لو۔ میرا خیال ہے، کہ یہاں تم میں بہت سے ایسے ہونگے جو "انجمن امداد باہمی" کے ارکان ہیں، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر مصیبت زدہ انسان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر تم اس سے پستول لے لو تو میں بھی اپنا رکھ دوں گا اور بیٹھ کر اپنا واقعہ بیان کروں گا۔

اُس نے ذرا تامل کیا اور ایک ملتجی نظر سب حاضرین پر ڈالی لیکن اس عرصے میں اسکا پستول ہر طرف حرکت کرتا رہا، وہ سب کے سب معمر انسان تھے اور جسم و جان کے مضبوط تھے۔ وہ اپنے ملک کو ظلم سے پاک رکھنے میں ہمیشہ کوشاں

رہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی لہو ولعب میں مبتلا نہ تھا۔ اور لوگ انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، انہوں نے بڑی سنجیدگی سے اجنبی کی باتیں سنیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا جناب عباس علی خاں صاحب یہ کرسی لے کر بیٹھ جائیے اور اپنا قصّہ بیان کیجئے۔

یہ مرزا محمد بیگ تھا جو بولا تھا وہ اسّی سال کا بوڑھا تھا، اسکے بال برف کے مانند سفید تھے، مونچھیں بڑی بڑی اور آنکھیں بھوری تھیں۔ سارے علاقے میں اس کے الفاظ قانون مانے جاتے تھے، وہ اُن سب کا سردار تھا۔ اور ایسا انصاف کرتا تھا کہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ دیتا تھا، اس نے حکم دیا اور دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر نادر خاں سے پستول لے لیا۔ اور محمد بیگ کے حوالے کر دیا۔

عباس علی نے کہا "شکریہ"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اپنا پستول بھی اس کے حوالے کر دیا۔ پھر میز پر کہنیاں ٹیک کر اور دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ گیا، کمرے میں ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ عباس علی نے کہا "بھائیو! اس سے پہلے کہ میں اپنی داستان سناؤں، یہ ضروری ہے کہ میں اپنی شخصیّت واضح کر دوں —— اور اس کی بھی"

اُس نے اپنی جیب میں سے ایک خوبصورت تھیلی نکالی جس میں چند کاغذات تھے، اس نے ایک کاغذ نکالکر محمد بیگ کو دیا۔ اور کہا "جناب ذرا اسے پڑھئے گا!"

محمد بیگ نے کھانس کر گلا صاف کیا، پھر سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب چونکہ میرا کوئی بال بچّہ اور رشتہ دار موجود نہیں۔ اس لئے میں اقرار کرتا ہُوں۔ کہ میرے مرنے کے بعد میری کل جائداد کا واحد مالک میرا حصہ دار عباس علی خاں ہے۔ "نادر خاں"

پھر اس نے نادر خاں کو مخاطب کر کے کہا "کیا یہ دستاویز تمہیں نے لکھی تھی؟"

اِس مضبوط آواز اور کرخت لہجہ کے سامنے نوجوان آدمی نے سر ہلا کر صرف یہی کہا "ہاں"

"کیا یہ صاحب وہی عباس علی ہیں جن کا ذکر تم نے اسی دستاویز میں کیا ہے؟

"ہاں یہی ہے"

پھر اُن لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "آپ اِن باتوں کو یاد رکھیں"

عباس علی نے کہا اُس کے پاس بھی ایک نقل ہے، میرا خیال ہے، کہ آپ نے تاریخ سے معلوم کر لیا ہو گا کہ اُسے لکھے ہوئے سات سال کا عرصہ ہوا ہے۔ ہاں تقریباً سات سال ۔ ۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سات سو سال کی مدت ہے"!

اس نے ایک آہ بھری اور خاموش ہوگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور نادر خاں کو گھور رہی تھیں جو اسکے روبرو بیٹھا تھا، پھر کہنے لگا بھائیو! میرا خیال ہے کہ یہ اس دستاویز کی تحریر سے ایک سال پہلے کا ذکر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملے، میں اپنے آبائی پیشہ یعنی سوداگری پر قائم تھا۔ میرے پاس تھوڑا سا سرمایہ بھی تھا اور آہ میرا خیال ہے کہ میرے لئے ایک عرصہ تک کافی تھا۔ ہاں میں ایک حصہ دار کا ضرور حاجتمند تھا، اور نادر خاں جو نوجوان تھا اور تھوڑا بہت سرمایہ رکھتا تھا مجھے اپنے حسب منشا نظر آیا اور ہم دونوں نے مل کر معاملہ طے کرلیا، اور ہم کوہ البرز کی ان بستیوں کی طرف چل کھڑے ہوئے جن کے دیکھنے کا میں ازحد مشتاق تھا،

ہم نے آٹھ ماہ تک پہاڑوں میں قیام کیا نادر خاں نے میرے ساتھ اچھی طرح کام کیا اور چھ ہزار روپیہ کے قریب کمایا! آپ دانا ہیں اور اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت ہم نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ . . . . . خاص کر میں۔ نے کیا محسوس کیا ہوگا جس کے لئے خوش قسمتی کا پہلا موقع تھا!

بعدازیں ہمارے ذخیرہ میں کمی واقع ہوگئی، اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کسی قریبی پڑاؤ کو واپس چلنا چاہئے ۔ یہ صرف چار روز کا راستہ تھا۔ ہم نے وہاں پہنچ کر نیا سامان اور کافی خوراک ساتھ لی جو ہمارے لئے وہ ڈھائی سال تک کافی تھی۔ ہم پھر انہیں پہاڑوں میں واپس آگئے۔ میرا اعتقاد تھا کہ ان پہاڑوں میں سونا ہے لیکن اس وقت نادر خاں نے اپنا ارادہ اُس عجلت کے ساتھ بدل دیا جسے لوگ "عورت کی عجلت" کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میرے لئے کافی ذرائع ہیں اور اب میں زیادہ سفر کرنا نہیں چاہتا، اور اس نے اپنے حصے کا مطالبہ کیا، آپ ہی بتائیں کہ ایک آدمی کے لئے تین ہزار کی قلیل رقم کیا کفایت کرسکتی ہے، آہ اگر وہ چھ ہزار رہنے دیتا تو یہ ایک کھیت خریدنے اور ساری عمر خوشی سے گزارنے کے لئے کافی تھا!

"ہاں اس کے اس ارادے نے مجھے ازحد تکلیف پہنچائی، میں نادر خاں کو دل و جان سے چاہتا تھا اور اُسے ایک وفادار دوست خیال کرتا تھا، مجھے یہ یقین تھا کہ ان پہاڑوں میں سونا ہے۔ مجھے اس کا اتنا یقین تھا کہ میں اس چھ ہزار کو خوراک میں صرف کرنے کو تیار تھا جو سالہا سال تک ہمارے لئے کافی ہوتی اور ہم آرام سے سونا نکالتے لیکن وہ ہمت ہار بیٹھا تھا"

اس نے ایک لحہ تامل کیا پھر کہنے لگا۔ "بھائیو! ہم اس مسئلہ پر بڑی دیر تک بحث کرتے رہے، میری کوشش تھی کہ وہ تمام باتوں پر غور کرے اور اپنے پہلے ارادے پر قائم رہے لیکن میری یہ کوشش بے سود تھی۔ اُس نے مجھے صاف صاف کہدیا کہ آؤ روپیہ آپس میں تقسیم کرلیں اور اپنا اپنا راستہ لیں، میں نے ایک لفظ زبان سے نہ نکالا اور سیدھا صندوق کی طرف گیا جس میں تھیلیاں رکھی تھیں، نادر خاں نے پیچھے سے آواز دی اور مختصر طور پر کہا ہاں اگر تم میں طاقت ہے تو اسے تقسیم نہ کرو بلکہ اس کے بجائے ہم تاش کی ایک بازی کھیلیں۔ ہر ایک پانچ پتے کھینچے جو جیتے وہ سب کچھ لے جائے"!

اس نے نادرخاں کی طرف دیکھا وہ خاموش اور سرنگوں بیٹھا تھا۔ عباس علی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں بڑی دیر تک سوچتا رہا اور اس بات پر رضامند نہ ہوا میں کوئی قمارباز نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی کسی دوست سے وقت گزار لیا کرتا تھا۔ میں ابھی خیالات میں مستغرق کھڑا تھا کہ مجھے نادرخاں کی آواز پھر سنائی دی وہ کہہ رہا تھا دوست مجھے معلوم ہے کہ تم میں اتنا حوصلہ نہیں!"

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ میں کس طرح اس شرط پر رضامند ہوگیا میں نے اُسے ایک غافل و بے پروا لڑکے کی طرح قبول کرلیا۔ میں نے اُسے جواب دیا "نادرخاں انشاءاللہ میں جیتوں گا"

وہ ایک پرانا تاش اٹھالایا جس سے ہم بعض دفعہ وقت کاٹنے کے لئے کھیلا کرتے تھے پھر ہم سوچنے لگے کہ بازی کس طرح کھیلی جائے۔ نادرخاں نے کہا کہ یہ بہتر ہے کہ تاش پھیلا دیا جائے اور ہر آدمی پانچ پانچ پتے اٹھائے چونکہ ہمیں وہ تاش کھیلتے مدت ہوچکی تھی۔ اور ہم پتوں پر کے بعض نشانات جانتے تھے اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ ہم میں سے ایک، دوسرے کی آنکھوں پر رومال باندھے وہ پتے کھینچے اور دوسرا انہیں پکارتا جائے۔

میں رضامند ہوگیا، ہم نے قرعہ اندازی کی پہلے میری باری آئی اس نے میری آنکھیں باندھ دیں، میں نے پتے کھینچے، میں نے ایک غلام، ایک ستہ، ایک چوکا، ایک اور غلام ـــــ اور پھر تیسرا غلام کھینچا تین غلام ـــــ تین ننھے غلام!

جونہی یہ آخری الفاظ عباس علی کے منہ سے نکلے، زندہ دلی کی جھلک اس کے چہرے پر ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ علاوہ ازیں جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں تو وہ ایک لمحہ کے لئے بہت چمکدار معلوم ہوئیں اُس نے رومال سے منہ صاف کرکے پھر کہنا شروع کیا۔ میں آہستہ آہستہ ایک ہوشیار آدمی کی طرح پتہ کھینچتا تھا اور میرا خیال تھا کہ میں نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے لیکن جب میں نے نادرخاں کی آنکھیں باندھیں اور اس نے پتے کھینچنے شروع کئے۔ تو اس نے پہلے ہی پتے پر پورے پانچ منٹ لگائے ـــــ یہ منٹ مجھے گھنٹے معلوم ہوتے تھے ـــــ اس نے پہلا پتہ اٹھایا اور میں نے پکارا پان کا اِکّا!"

اب عباس علی نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک چھوٹی سی مستطیل شے نکالی جو ایک پھٹے ہوئے اخبار میں لپٹی تھی۔ اور اس پر دھاگا بندھا تھا اس نے کہا ہاں اس کا دوسرا پتہ جس کے لئے اس نے کافی دیر لگائی ـــــ اینٹ کا اِکّا تھا! بھائی یہ پہلے دو موقعوں پر ہی دو اِکّے، تیسرے پتے پر مجھے کچھ تسکین ہوئی اور جونہی میں نے پکارا نادرخاں کے منہ سے لعنت نکلی جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ یہ چڑیے کی دکّی تھی، پھر اس نے چوتھا پتا کھینچنے کی کوشش کی اور پہلے سے دوگنی دیر لگائی۔ اس نے بڑی احتیاط سے پتا کھینچا یہ حکم کا اِکّا تھا ـــــ اب اس کے پاس تین اِکّے تھے، میرے تینوں

غلاموں کے مقابل، اس سے پہلے کہ وہ پانچواں پتا اُٹھائے وہ جیت چکا تھا۔"

اب عباس علی نے اس مستطیل سی شے پر سے دھاگا کھولا، اور میز پر رکھ دی، اس نے اخبار ہٹایا، یہ ایک پوسیدہ تاش تھا، پھر اس نے آرام سے کہا۔ اس واقعہ کے بعد میں ایک گھنٹہ تک خاموش رہا پھر تاش اٹھا کر اکیلا کھیلنے لگا اور اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے لگا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایک اکّے پر نشان بنا ہے۔

بھائیو! اسی طرح باقی تین اکّوں پر بھی نشان تھے، جو پتے کی اندرونی جانب ناخن سے بنائے گئے تھے، اور اس کی پشت پر اُبھرے ہوئے تھے، یہ چھونے سے فوراً معلوم ہو جاتے تھے!"

"سانپ"

"درندہ"

"چور"

"دغاباز"

سب لوگ غصے میں بول رہے تھے، اور نادر خان کو بغور دیکھ رہے تھے، یہ وہ آدمی تھا جسے وہ چھ سال سے ایک سوداگر جانتے تھے اور جو بڑا دیانت دار مشہور تھا۔ بوڑھے محمد بیگ نے نرمی سے پوچھا "نادر خاں میں تم سے صاف صاف دریافت کرتا ہوں کہ یہ الزام ٹھیک ہے یا غلط؟"

اُس نے سخت رو بوڑھے سے آنکھیں ملانے کی کوشش کی، لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی اس کا چہرہ سفید ہو گیا، اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار ہو گئے، اور اسکی رگیں ابھر آئیں، اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر مشکل سے کہا "میں ——— یہ کامیابی کا موقع ——— میں نوجوان ——— میں ———"

محمد بیگ نے پوچھا "میں کہتا ہوں کیا انہوں نے ٹھیک کہا ہے؟"

نادر خاں نے اچھی طرح جانتے ہوئے کہ جھوٹ یا خاموشی اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اپنے سر کو بازوؤں میں چھپا لیا اور کہا "ہاں!"

سب کے منہ سے بے شمار دھمکیاں نکلیں۔ محمد بیگ نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں خاموش کر دیا۔ اُس نے کہا "بھائیو! یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں دھوکے، اور فریب سے کام لیا گیا ہے۔ ایک بدمعاش انسان نے اپنے ساتھی کو فریب دیکر لوٹا ہے۔ اس فریب کا ازالہ کرنا چاہیے میں انصاف "

"جناب ——— مرزا محمد بیگ صاحب ——— بھائیو!

یہ مداخلت عباس علی کی طرف سے تھی محمد بیگ نے اس کی طرف دیکھکر کہا۔ "ہاں آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہئے"

"شکریہ"

پھر اس نے گلا صاف کر کے کہا "آپ جلدی نہ کریں، واضح رہے کہ اس فریب سے مجھے ازحد تکلیف پہنچی، گو میرے لئے یہ کافی نقصان تھا لیکن میں ایمان سے کہتا ہوں کہ اگر یہ ایمانداری سے ہوتا تو میں بالکل پروا نہ کرتا، یہ مکاری اور فریب کاری ہے جو مجھے تکلیف دیتی ہے۔ بھاگ گیا میں بیمار ہو گیا لیکن جلد تندرست ہو گیا۔ اور نادر خاں کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔

"اپنے تمام سفر میں ایک بات پر میری امید بندھی تھی، اور اسی کے لئے میں رات دن دعائیں مانگتا تھا، میں چاہتا تھا کہ اُسی تاش سے چاروں اِکّے نکال کر نادر خاں سے پھر وہی بازی کھیلوں —— ایمانداری سے!

"میرا خیال ہے، آپ بھی اسے پسند کریں گے، چاروں اکّے نکال کر، آنکھیں باندھ کر بازی کھیلی جائے، اس فوج جیتے وہ سب ذخیرہ اور روپیہ لے جائے لیکن یہ یاد رہے کہ پتا کھینچتے وقت زیادہ دیر نہ لگے"

ہر طرف خاموشی طاری تھی اور ہر آنکھ عباس علی کے چہرے پر گڑی تھی، محمد بیگ نے پوچھا "کیا آپ ہم سے یہی انصاف چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

"تم نے سنا نادر خاں؟"

"ھ —— ھ —— ہاں!"

"تمہیں یہ شرط منظور ہے؟"

سوداگر نے اپنا پر فریب چہرہ اوپر اٹھایا، اس نے سر ہلا کر کہا "ہاں مجھے منظور ہے"

"تو پھر میں قرعہ ڈالوں"

نادر نے اپنا سر اثبات میں ہلایا اور عباس علی بولا "ہاں جناب"

قرعہ ڈالا گیا، عباس علی کا نام نکلا، نادر خاں نے خاموشی سے ہونٹوں پر زبان پھیری، اس کے ماتھے کی رگیں کانپ رہی تھیں۔ اُس نے عباس علی کی طرف دیکھا جسے اُس نے آج سے آٹھ سال پہلے دھوکا دیا تھا، محمد بیگ نے ایک سفید رومال لیا اور اٹھ کر اس سے پوچھا "عباس علی صاحب کیا آپ تیار ہیں"

"جی ہاں!"

اس نے مضبوطی سے اس کی آنکھوں پر رومال باندھ کر تاش اُٹھایا، چاروں اِکّوں کو الگ کر دیا، پھر یکے بعد دیگرے

اس نے باقی ماندہ اڑتالیس پتوں کو رکھ دیا اور کہا "پتے آٹھ آٹھ کی چھ قطاروں میں پڑے ہیں جوں جوں آپ کھینچتے جائیں گے میں پکارتا جاؤں گا"

عباس نے جواب دیا "بہت خوب!"

اور اس کے ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ آگے بڑھا۔ اس نے ایک پتا کھینچا محمد بیگ نے کہا "پان کا پنجہ!"

اُس نے پھر ایک پتا کھینچا

"پان کا ستہّ"

اب بھی مصیبت زدہ آدمی کا ہاتھ نہ رکا

"پان کا چھکاّ!"

ایک مشین کے مانند ثابت قدم انسان کے ہاتھ چوتھی مرتبہ آگے بڑھے

"اٹھاّ ــــــ پان کا"

اور اس وقت بھی اس نے کمزوری اور تردد کا کوئی نشان ظاہر نہ کیا

"سنو ــــــ پان کا دھلا جناب!"

"خدا اس پر رحم کرے"

محمد بیگ نے دونوں ہاتھوں سے اس نعرے کو بند کر دیا جو ناظرین کے منہ سے نکلا جب عباس علی نے آنکھوں سے رومال ہٹایا تو سب یہ دیکھنے کے لئے جھکے کہ اس آدمی کی کیا حالت ہے جس نے اس قدر بڑے پتے منتخب کئے ہیں، محمد بیگ نے پوچھا۔

"تیار ہو نادر خاں"؟

وہ وحشیانہ انداز سے عباس علی کو گھور رہا تھا، اس کی پیشانی کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں، اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"نہیں میں ــــــ میرا مطلب ہے اچھاّ ــــــ میرا خیال ہے شاید میں"

بوڑھے محمد بیگ نے نادر خاں کی آنکھوں پر رومال باندھا، اور غور سے دیکھا کہیں ڈھیلا تو نہیں رہا، یہ تسلی کرکے اس نے تاش کے پتوں کو ملایا اور ایک دفعہ پھر انہیں چھ قطاروں میں رکھ کر کہا "نادر خاں میں نے انہیں رکھ دیا ہے، آٹھ آٹھ کی چھ قطاروں میں"

"ہاں ۔۔۔ ہاں"

گو دوسرے کھلاڑی کا ہاتھ بھی اپنے حریف کے مانند تیزی سے آگے بڑھا، لیکن وہ کانپ رہا تھا، جب اُس نے پتا اٹھا کر میز پر رکھا تو اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔

"اینٹ کا بادشاہ ۔ نادر خاں!"

اُس نے ایک اور پتا اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

"بادشاہ ۔۔۔ چڑیا کا ۔۔۔ نادر خاں"

اب نادر خاں نے تیسری دفعہ ہاتھ بڑھایا، لیکن پھر ہٹا لیا۔ اُس نے ہونٹوں کو تر کیا، پھر ہاتھ بڑھایا لیکن رک گیا محمد بیگ نے تحکم آمیز لہجہ میں کہا "نادر خاں چلو بھی!"

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک اور پتا اٹھایا

"اینٹ کی دُکی"

اس کے منہ سے ایک آہ نکلی، لیکن فوراً اُس آواز میں غرق ہوگئی جو ناظرین کی طرف سے آئی، پھر کسی چیز نے نادر خاں کی ڈھارس بندھائی، اُس نے چوتھا پتا اٹھایا۔

"بادشاہ ۔۔۔ حکم کا ۔۔۔ نادر خاں!"

ایک آدمی نے کہا "لعنت!"

دوسرے نے کہا "مردود!"

کمرے میں اب طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں نادر خاں نے کہا "خدا ۔۔۔ خدا کا شکر ہے! ۔۔۔ خدا کا شکر ہے!"

لیکن عباس علی جو اس واقعہ سے بہت متاثر تھا، بڑے تحمل سے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ محمد بیگ نے کہا "چلو نادر خاں دیر مت کرو"

اس نے پھر کوشش کی، اس کا ہاتھ آگے بڑھتا اور گر پڑتا وہ پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا لیکن پھر پیچھے کھینچ لیتا آخر بڑی کوشش سے اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک پتا کھینچا، محمد بیگ نے حیرت سے کہا "دکی ۔۔۔ چڑیا کی! بھائیو ۔ ۔ ۔ ایک کامیاب ہاتھ!

"او ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا"

ایک چیخ کے ساتھ جس نے اُسے مصیبت سے نجات دلادی - ایک چیخ جو تقریباً دیوانگی کی چیخ تھی۔ نادرخاں میز پر جُھک گیا، سارے کمرے میں اس کی چیخ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دی، وہ آدمی جو وہاں موجود تھے عباس علی کی طرح تاسف اور ہمدردی سے لبریز آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اور چونکہ دنیا کامیاب اور ناکام دونوں کھلاڑیوں سے محبت رکھتی ہے اس لئے ہم انہیں قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

عباس علی اٹھا، اس کی آنکھوں اور چہرے سے اس غم کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے، جو یقیناً اس کے دل میں پیدا ہو رہا تھا، وہ کہنے لگا "بھائیو! اس تکلیف کے لئے تم سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جو تم نے مجھے یہ موقع دینے میں اٹھائی، میرا خیال ہے کہ قسمت ابھی تک میرے خلاف ہے، اور اگر آپ میرا پستول واپس کردیں تو میں ابھی چلا جاؤں"۔

محمد بیگ نے جو میز پر جھکا تھا اور جس کے ہاتھ نادرخاں کے کوٹ کے اندر تھے اچانک سیدھا کھڑا ہو گیا، اس نے اپنے چہرے کو متین بنانے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ ایک خاص مسرّت کو نہ چھپا سکا جو اس کی آنکھوں سے عیاں تھی، اس نے اپنا گلا صاف کرکے کہا "جناب عباس علی خاں صاحب یہ واقعہ جو اب پیش آیا ہے مجھے منصف وعادل خدا کی عنایت نظر آتا ہے۔ جس نے برسوں کے فریب کا فیصلہ کردیا، نادرخاں جیتنے کی خوشی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے مرگیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کاغذ ـــــ وہ کاغذ جو جناب نے ہمیں دکھایا ـــــ آج بھی ویسا ہی مفید ہے جیسا وہ لکھے جانے کے دن تھا، چونکہ نادرخاں ابھی تک نا کتخدا ہے، اور اس کا کوئی رشتہ دار نہیں جیسا کہ کاغذ لکھتے وقت کوئی نہ تھا، اس لئے ازروئے قانون آپ اس کی کل جائداد کے واحد مالک ہیں۔

نظامی

آہ، یہ پہلی ناکامی ہے۔ لیکن اب مجھے کامیابی کی آرزو نہیں رہی۔ کاش اب میں عمر بھر ناکامیوں کا منہ دیکھتا رہوں

جب تک کوئی اچھا موقع میسّر نہ ہو قابلیّت کسی کام نہیں آسکتی۔

قابلیت کی قدر صرف حقیقی انسان کرسکتے ہیں۔ عوام کے نزدیک دولت کے سوا عزت کا اور کوئی معیار نہیں

ہم اپنے متعلق جو رائے قائم کرتے ہیں وہ یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ ہم کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ لیکن ہمارے متعلق دوسروں کی رائے صرف اسی پر مبنی ہوتی ہے جو کچھ ہم کرچکے ہیں۔

پروانہ

اے شہیدِ ناز! اے فخرِ جہانِ عاشقی
ایک عالم میں مچی ہے دھوم تیرے عشق کی

سر ترا یکسر بنا ہے مسکن سودائے عشق
ننھا سا کلیجہ ہے کہ ہے دنیائے عشق

تو محبت کا مرقّع ۔ درد کی تصویر ہے
زندگی تیری کتابِ عشق کی تفسیر ہے

تو ازل سے لیلیٰ الفت کا دیوانہ رہا
عشق کی مے سے ترا لبریز پیمانہ رہا

اُف تری خوئے محبت، اُف ترا اندازِ عشق
اُف ترے سینہ کی وسعت، اُف تری پروازِ عشق

شورشیں پنہاں ہیں تیری ہستیٔ خاموش میں
پرورش پائی ہے تو نے عشق کی آغوش میں

مضطرب قربان ہونے کو سدا رہتا ہے تو
اور کسی سے ماجرائے دل نہیں کہتا ہے تو

عندلیبوں کو سدا گرمِ نوا ہونے کا شوق
روزِ اول سے تجھے وقفِ فنا ہونے کا شوق

ہر گھڑی برقِ تجلّی کو ہے تیری جستجو
کوئی دم کا میہماں اے سوختہ ساماں تو

نرائنداس پوری

غزل

امیدِ وصل پہ فرقت کا دو نہ داغ مجھے
دکھاؤ بہرِ خدا یوں نہ سبز باغ مجھے

شگفتگی نہ ہو کیونکر نصیبِ صورتِ گُل
کیا ہے تیری عنایت نے باغ باغ مجھے

نہیں ہے خانۂ تاریک دل کا اب کھٹکا
ملے ہیں داغِ جنوں کے نئے چراغ مجھے

حکایتِ چمنِ دہر بھی ہے پر آشوب
کہاں نصیب کہ اک دم ملے فراغ مجھے

وہ شوخ پردہ نشیں رو شناسِ خلق نہیں
کوئی بتائے کہ کیونکر ملے سراغ مجھے

صباؔ ہے رونقِ بزمِ سخن کلام مرا
مگر نہ زعم ہے اس پر نہ کچھ دماغ مجھے

محمد مظہر علی صباؔ صدیقی

موت کا راگ

فیروز ستار بجا کر گاتا، اس کی سریلی تانیں اور دلکش نغمے یاسمین پر ایک مدہوشی سی طاری کر دیتے
اس کا یہی کام تھا کہ وہ ستار بجائے اور گا کر اپنے سریلے نغموں سے لوگوں کو مسحور کرتا پھرے وہ آس پاس کے قصبوں میں نکل جاتا اور پھر دن بھر اسی طرح بادیہ گردی میں گزار دیتا جس جگہ بیٹھ کر وہ گانا شروع کر دیتا وہیں لوگ دور دور سے اپنے کام دھندے چھوڑ کر جمع ہو جاتے

اس کی موسیقی میں شاید کوئی مقناطیسی اثر تھا۔

لیکن اگر کوئی شخص خاص طور پر اُسے گانے کے لئے کچھ کہتا یا اس قسم کی کوئی اور بات کرتا تو وہ حقارت کے انداز سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا، خواہ کہنے والا کوئی بادشاہ ہو خواہ فقیر۔ اُس کی شکل و صورت اور اس کی آواز پر لوگوں کو عجیب و غریب گمان ہوتے۔ لیکن اُس کے پھٹے پرانے کپڑے بھیک منگوں اور گداگروں سے بھی بدتر ہؤا کرتے تھے۔
ناواقف لوگ اُس سے سوال کرتے "تم کون ہو" "کہاں سے آئے ہو" اور ہمیشہ وہ یہی جواب دیتا "مجھے فیروز کہتے ہیں اور میں اپنے گھر سے آرہا ہوں" لوگ اس مہمل جواب پر ہنس پڑتے اور وہ خود بھی اُن کے قہقہوں میں شریک ہو جاتا۔

گانے کے معاوضہ سے بقدرِ ضرورت یاسمین لے لیتی اور باقی سب کچھ فیروز لوگوں میں تقسیم کر دیتا بعض لوگ اس سے پوچھتے "کیا تمہاری بیوی کے لئے زیوروں کی ضرورت نہیں"، وہ جواب دیتا "یاسمین کو آرائش کی ضرورت نہیں ہؤا کرتی۔"

"کیوں"

"پھول کو دھات کے ٹکڑوں سے سجانا اسکی توہین کرنا ہے"

اکثر لوگ اس سے کہتے تمہاری بیوی نے ان پھٹے پرانے چیتھڑوں میں پرورش پا کر یہ شاہانہ حُسن کہاں سے پا لیا ہے؟
وہ جواب دیتا "اس لئے کہ وہ ایک شہزادی ہے"

"شہزادی! شہزادی نے تمہیں کیوں قبول کر لیا؟"

"اس لئے کہ وہ اسی لئے پیدا ہوئی تھی"

"اچھا پھر بتاؤ وہ کس ملک کی شہزادی ہے؟"

"اس ملک کی جو میرے پہلو میں آباد ہے"۔

لوگ ان مہمل جوابوں پر ہنس دیتے۔ وہ خود بھی ہنستا لیکن دوسروں کی بے سمجھی پر۔

یاسمین کا نام شروع سے یاسمین نہیں تھا جنگل کی راہ سے گزرتے ہوئے ایک دن فیروز کی نظر ایک خودرو پودے پر پڑی جو جنگل کی خاردار جھاڑیوں اور جڑی بوٹیوں کے درمیان اُگ رہا تھا۔ یاسمین کا پودا اپنی پوری بہار پر تھا اور پھولوں کی کثرت سے اس کی ننھی ننھی ٹہنیاں جھکی پڑتی تھیں۔ فیروز نے ستار کو زمین پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا "میری بیوی ان پھولوں سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے"۔ "یہ پھول اس سنسان جنگل میں اسی طرح خوش وخرم نظر آ رہے ہیں۔ جیسے میرے جھونپڑے میں"۔ اپنے کئی گھنٹے اس نے وہیں بیٹھ کر گانے میں گزار دیئے اور اپنے وعدے سے بہت دیر بعد گھر پہنچا۔ یاسمین انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ کیونکہ اس روز فیروز اُسے ایک بالکل نیا ترانہ سنانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس نے یاسمین کو گانا سنانے کے لئے ایک خاص وقت مقرر کر دیا تھا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر وہ کبھی اس کے سامنے نہیں گایا کرتا تھا۔ یاسمین ناراض ہونے لگی۔ لیکن فیروز نے اُسے دیکھ کر صرف اتنا کہا "اُف کس قدر مشابہت ہے"۔ اور پھر وہ اُسے یاسمین کہہ کر پکارنے لگا۔ یاسمین کو بچپن ہی سے گانے اور گانا سننے کا شوق تھا۔ دنیا کا دلچسپ ترین مشغلہ وہ صرف گانے کو سمجھتی تھی۔ لیکن جس روز اس نے پہلی مرتبہ فیروز کو گاتے ہوئے دیکھا اس روز سے لیکر آج تک وہ پھر کبھی نہ گائی۔ اس کا خیال تھا کہ فیروز کی موسیقی اور اس کی دل کو موہ لینے والی آواز سُن لینے کے بعد پھر بھی گانے کی کوشش کرنا محض ایک ہوس ہے

یاسمین کو گانا سناتے ہوئے فیروز خود بھی محسوس کرتا کہ اس سے بہتر گانا کسی اور جگہ یا کسی اور شخص کے سامنے وہ آج تک نہیں گایا۔ یاسمین فیروز کی موسیقی کے سامنے دنیا کی ہر شے کو اور خود اپنے آپ کو فراموش کر دیتی۔ بعض اوقات جب فیروز گانا ختم کر کے اُسے بلاتا تو وہ بالکل نہ بول سکتی۔ اور جب اس کے شانے زور زور سے پکڑ کر ہلاتا تو وہ یکایک چونک پڑتی۔ کیوں کیا ہے، تم گاؤ میں سُن رہی ہوں۔

"اچھا بتاؤ تم نے کیا سُنا"

"صرف ایک آواز کسی سورما کی تلوار کی دھار کی سی تیز، پگھلتی ہوئی موم سے زیادہ نرم اور شہد سے کہیں بڑھ کر شیریں اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی"۔ فیروز جی ہی جی میں خوش ہوتا اس کے واسطے دنیا میں سب سے زیادہ رنج دہ بات یہی تھی کوئی اس کی موسیقی کی داد نہ دے۔ اور سب سے زیادہ مسرت خیز بات بھی یہی تھی کہ کوئی اس کی موسیقی کی داد دے۔ لیکن زبان سے آج تک کوئی شخص اُسے داد نہیں دے سکا تھا اُس کے نغموں کی داد اکثر آنسو ہوا کرتے تھے یا لوگوں

کا کثیر التعداد جمگھٹا اگر اتفاق سے کسی دن اس کی آواز سُن کر معمول سے کم لوگ جمع ہوں تو وہ دِن اُسے نہایت ہی تکلیف دہ معلوم ہوتا۔ اور گھر پہنچ کر وہ یاسمین سے بھی کم بات کرتا۔ لیکن جتنے زیادہ آدمی جمع ہوں اتنا ہی وہ دن اُسے شادماں معلوم ہوتا۔ اگر کسی دن اُسے محسوس ہو کہ یاسمین اس کے راگ سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی تو اس کے دِل پر عجیب چوٹ سی لگتی۔ وہ باہر نکل جاتا اور کئی کئی گھنٹے خاموش بیٹھا رہتا اور پھر چند روز تک گانا سنانے کا وقت باہر ہی گزار دیتا۔

اس نے خود کبھی کوئی شعر نہیں کہا تھا لیکن یاسمین کی موجودگی نے اُسے شاعر بنا دیا مگر وہ بالکل ایک انوکھی وضع کا شاعر تھا۔ کئی درد و کرب کے مناظر دیکھ کر یا کوئی حسین سے حسین منظر دیکھ کر خواہ اس کے دل میں کتنا ہی اثر پیدا ہو وہ ایک شعر بھی نہ کہہ سکتا تھا لیکن یاسمین کو دیکھ کر اُس نے ہزاروں شعر کہے۔ اور جب وہ انہیں گاتا تو یاسمین کے رخسارے آنسوؤں سے بھیگ جاتے۔ فیروز ہنس دیتا اور کہتا "میں یاسمین کے پھولوں پر شبنم کے قطرے پسند کرتا ہوں لیکن اتنے نہیں کہ وہ اپنی بہار ہی کھو دیں"۔

یاسمین کہتی خدا جانے ان شعروں میں تم اتنا سوز و گداز کہاں سے لے آتے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ دنیا بھر سے انوکھی اور رسیلی آواز سنتے سنتے یُوں ہی مرجاؤں۔

وہ جواب دیتا یاسمین! مبالغہ کی بھی ایک حد ضرور ہے لیکن تم حد سے گزر رہی ہو پھر چپکے چپکے دل ہی دل میں اسکے فقروں کو دھراتا اور خوش ہوتا۔

فیروز نے یاسمین کو ایک عجیب پُرحسرت نغمہ سنایا، وہ کوئی نوحہ تھا یا غم کے جذبات میں ڈوبی ہوئی ایک نظم۔ جو ایک نوجوان سپاہی نے اپنی بیوی کی المناک موت کے بعد لکھی تھی۔

"میدان جنگ سے اپنے شوہر کی موت کے متعلق ایک خبر سُن کر جو محض غلط تھی ناشاد لڑکی دیوانی ہو جاتی ہے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اپنے پلنگ پر مردہ پائی جاتی ہے

ایک مدت کے بعد سپاہی گھر کی طرف پلٹتا ہے۔ ہزاروں مسرت و انبساط سے لبریز خیالات دل میں لئے ہوئے لیکن اپنے گاؤں کے قریب پہنچ کر تمام واقعہ اُسے معلوم ہو جاتا ہے۔ دفعتہً زمین و آسمان او[illegible]ات کی ہر چیز اُسے ایک مہیب تاریکی میں ملفوف نظر آتی ہے۔ وہ اپنے دل، اپنے دماغ، اپنی آنکھوں، اور اپنے جسم کے ہر رونگٹے میں ایک عمیق خلا محسوس کرتا ہے۔ "میں یہ کیا سُن رہا ہوں . . . . میں کیونکر دیکھوں گا . . . . ہمیشہ کے لئے، کیا ہمیشہ کے لئے

وہ چھپ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چلی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ مجھے تنہا چھوڑکر وہ کہاں چلی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے کیا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ موت!
اُف کتنا بھیانک نام ہے ۔اس شگفتہ نام کے ساتھ یہ کریہہ نام کیونکر وابستہ کردیا گیا"

بے اختیار وہ بڑبڑاتا ہوُا قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا اور گرتا پڑتا اپنے سیاہ خانہ میں داخل ہوتا ہے ۔

ہرطرف ویرانی اور عجیب حسرت چھارہی تھی ۔صحن میں چاروں طرف لمبی لمبی گھاس اُگ رہی تھی ۔ بیری کا درخت ٹوٹ کرگر پڑا تھا اور مکان کا تالا زنگ آلود ہوچکا تھا ۔کمرے کا دروازہ کھول کر وہ عجیب حسرتناک منظر دیکھتا ہے سب سے پہلے اس کی نظر اس پلنگ پر پڑتی ہے جس پر اس کی بیوی ایک دائمی نیند سوچکی تھی ۔ اور اب اس خالی پلنگ کے نیچے اسکی مالکہ کی چہیتی بلی جو اس کی المناک موت پر تنہا ماتم کرتے کرتے خود بھی مرگئی تھی ہڈیوں کے ایک ڈھانچ کی صورت میں پڑی تھی ۔

شمع دان میں شمع جل جل کر خود ہی بجھ گئی تھی اور اس کے گرد کئی پروانوں کے پر بکھرے پڑے تھے ۔ طاقچے میں وہ گلاس اوندھا پڑا تھا جو اس نے جنگ پر جاتے ہوئے پانی پی کر اپنے ہاتھوں سے وہاں رکھا تھا اور معلوم نہیں کتنا عرصہ وہ اس برتن کو دیکھ دیکھ کر اپنے بے قرار دل کو تسکین دیتی رہی تھی ۔ اس کی پرانی ٹوپی اسی طرح کھونٹی پر لٹکی تھی جس طرح وہ رکھ گیا تھا ۔ ایک گرد آلود کنگھی اور اس کے آس پاس کئی سنہرے بال بکھرے پڑے تھے ایک کونے میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزے گرے ہوئے تھے ۔ اور ان کے کئی حرفوں پر آنسوؤں کے مبہم سے نشان تھے وہ پھر صحن کے دروازے میں آتا ہے جہاں وہ اس سے رخصت ہوا تھا اور جہاں حقیقت میں وہ اس سے رخصت ہوئی تھی ۔۔۔۔۔ جس دروازے کی دہلیز پر اس کی آنکھوں سے کئی آنسو گرے تھے ۔ اور جہاں اس کے قدم اس وقت تک جمے رہے تھے جب تک کہ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا تھا اور جہاں شاید وہ اس کے انتظار میں کئی بے چین گھڑیاں گزار چکی تھی ۔

●

وہ بیقرار ہوکر باہر نکل جاتا ہے اور اس جگہ پہنچتا ہے جو لوگوں کے لئے محض ایک غیر دلچسپ مٹی کا ڈھیر تھی اور جسے وہ فراموش بھی کرچکے تھے لیکن وہ مٹی کا ڈھیر اس کے لئے کیا کچھ تھا آہ یہ وہ خود بھی نہ بتا سکتا تھا"

غرض کہ ساری نظم انہیں دردانگیز جذبات سے مملو تھی ۔ یاسمین سکتے میں آگئی کتنا ہی عرصہ وہ خاموش پتھر کی مورت بنی رہی ۔ اور جب [illegible] کی زبان نے اس کا ساتھ دیا تو کہنے لگی ایک ایسی ہی نظم یا ایک ایسا ہی نوحہ تم میرے لئے لکھو تاکہ اپنی زندگی ہی میں وہ چیز دیکھ لوں جو تم میرے بعد لکھو گے اور جس کو سننے سے میں ہمیشہ کے لئے محروم ہوچکی ہونگی ۔جب یہ دنیا بھر سے پیاری اور رسیلی آواز مجھ سے بہت دور رہ جائیگی ۔

فیروز نے کہا "تم کیسی ڈراؤنی باتیں کرتی ہو، یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟"

اُس نے کہا کچھ بھی ہو اب میں اپنا نوحہ سنے بغیر چین نہیں پا سکتی۔ انسان جو کچھ چاہے وہ کرسکتا ہے۔ سمجھ لو کہ میں محبت کی آزمائش کررہی ہُوں اگر تم کوئی ثبوت دے سکتے ہو تو دو۔ یکا یک فیروز کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہُوا "اچھا انسان جو چاہے وہ کرسکتا ہے تو میں تیار ہُوں میں کوئی نیک و بد شگون نہیں مانتا اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے مرنے کے بعد کئی سال تک زندہ رہوگی۔ میری محبت کی زبردست گرفت موت کے ہاتھوں کو جھٹک دے گی جب وہ مجھ سے پہلے تمہیں لینے کو آگے بڑھیں گے۔ یاسمین ہنسنے لگی۔ فیروز نے کہا اچھا رخصت میں کہیں باہر جارہا ہُوں۔ اور جب تک میرا مقصد پورا نہ ہوئے واپس نہیں آؤں گا۔ اس نے یاسمین کے بہت سے شگفتہ پھُول دامن میں بھر لئے۔ اور جنگل کی طرف کہیں نکل گیا۔ اپنے گھر سے بہت ہی دُور۔

پورے دو دن گزر گئے اُسے اس جنگل میں آئے ہوئے۔ لیکن اس کا مسرور دل ایک مصرع بھی نہ کہہ سکا وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کرتا وداع کا ایک پُرسوز گیت آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا سورج غروب ہوگیا، اور فلک پر چاند نمودار ہُوا وہ پھر بھی کوئی شعر نہ کہہ سکا۔

آدھی رات کے قریب جب چاند ڈوب رہا تھا وہ جھیل کے کنارے آیا جھیل کا پانی بےحس اور سیاہ معلوم ہوتا تھا کنول کے سفید پھولوں پر تاریکی میں ایک تنا ور درخت موت کے دیوتا کی صورت میں جھکا ہُوا تھا جھیل کے اس پار ایک سارس تنہا کھڑا ہُوا اپنی چونچ کو بار بار زمین پر پٹخ رہا تھا اور دُور بہت دُور جھاڑیوں میں سے کسی زخمی پرندے کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اپنی عمر میں کئی راتیں وہ جنگل میں بسر کرچکا تھا لیکن آج کی رات جیسی عجیب وغریب رات کبھی اس کے دیکھنے میں آئی تھی وہ اپنے دل پر کوئی غیر معمولی اثر محسوس کررہا تھا اور اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس رات میں اس کی زندگی کی تمام مسرتیں اور شادمانیاں اُس سے چھین لی جائیں گی۔ اس کی بیچارگی اور بےسامانی پر ارواح خبیثہ اُسے قہقہے لگاتی اور ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ اس کے جسم سے ایک ایک کرکے وہ تمام عنصر جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے وہ کھینچے لئے جارہی ہیں اور اپنے سیاہ اور بھیانک چہروں سے سفید دانت نکال نکال کر ہنستی ہیں معلوم نہیں کیوں اُسے محسوس ہونے لگا کہ میں اب دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہُوں۔ اور اس وقت بار بار اُسے یاسمین کا خیال آیا اور اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ فوراً اُسے دیکھے۔ لیکن وہ یہاں کہاں تھی دفعۃً اُسے وہ پھول یاد

آ گئے جو وہ گھر سے اپنے ساتھ لایا تھا، اور پتوں میں لپیٹ کر چٹان پر رکھ چکا تھا۔

وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چٹان کی طرف بڑھا اسکے قدموں سے کچھ فاصلے پر کوئی سرخ سرخ چیز بکھری پڑی تھی۔ خدا جانے کیوں اس نے خیال کیا کہ یہاں بیٹھ کر کوئی حرماں نصیب خون کے آنسو رو چکا ہے اور اپنے آنسوؤں کے سرخ نشان گھاس پر چھوڑ گیا ہے۔ حالانکہ وہ تو ننھے ننھے سرخ پھول تھے جو اندھیرے میں گھاس پر کھلے ہوئے تھے وہ پھر ٹھٹک گیا، سرد آہوں کی آواز! یہ کہاں سے سنائی دے رہی تھی؟ کوئی سانجھر سوکھے ہوئے پتوں پر سویا پڑا تھا۔ اور یہ اس کی سانس کی آواز تھی۔ لیکن وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ سارس اب بھی اپنی چونچ زمین پر پٹخ رہا تھا اور وہ زخمی پرندہ ویسے ہی چیخ رہا تھا۔

چٹان پر پہنچ کر اُس نے جلدی سے پھولوں کو اٹھا کر سونگھا لیکن وہ مرجھا چکے تھے، کبھی کے مرجھا چکے تھے مگر وہ نادان ان کے انجام کو اب تک بھولا ہوا تھا۔ اُسے اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی اور اس نے آہ بھر کر کہا میں کتنا بے خبر تھا کیا معلوم یاسمین بھی ایک دن اسی طرح . . . . . . وہ خاموش ہو گیا۔

صبح صادق کے وقت جب پرند چہچہاتے اور گاتے ہوئے اپنے آشیانوں سے نکل کر ہوا میں پرواز کر رہے تھے وہ اپنے گھر جانے کے لئے تیار تھا جس مقصد کے لئے وہ یہاں آیا تھا وہ بھی پورا ہو چکا تھا۔ کیونکہ رات کو اُن درد بھرے خیالات سے متاثر ہو کر وہ پوری نظم لکھ چکا تھا

"یاسمین! سنو، میں اپنی روح کے تمام سوز کو ان نغموں میں ختم کر چکا ہوں۔ اگر آج تم نے مجھے داد نہ دی تو بہت ہی بخل کرو گی۔"

"میں اور تمہیں داد نہ دوں یہ کیونکر ممکن ہے اس نظم کا خاکہ خود بخود ہی میرے دل میں کھنچ چکا ہے" "آج تو شاید خالقِ ارض و سما جس نے تمہیں یہ نور کا گلا اور یہ طبع نازک عطا کی ہے وہ بھی داد دئیے بغیر نہ رہے گا"

فیروز ہنسنے لگا "چہ خوش۔ اچھا یہ تو بتاؤ میری غیر موجودگی میں تمہاری طبیعت کیسی رہی"

"بہت اچھی رہی، لیکن گزشتہ رات سے معلوم نہیں کیوں ایک بھیانک شکل بار بار میرے اردگرد پھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور دل میں کچھ عجیب گھبراہٹ سی ہے لیکن یہ اس لئے ہے کہ میں کئی دن تک تمہارا گانا نہیں سن سکی تم گاؤ تو میں اچھی ہو جاؤں فیروز نے کہا اوہ کتنی عجیب بات ہے کہ میرے بے چین دل کا اثر تو اتنی دور سے بھی تم پر پڑ گیا۔ خیر یہ سنو یقیناً تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔ آؤ اس ٹاٹ پر میرے نزدیک بیٹھ جاؤ"

"نہیں میں کچھ فاصلے پر بیٹھوں گی۔ تمہاری آواز دور سے اور بھی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔"

وہ گانے لگا اور یاسمین بے حس وحرکت سنتی رہی۔

"میرے ساز کا تار ٹوٹ گیا، موسیقی کی روح آسمانوں کی طرف پرواز کر گئی اور یاسمین کا پھول آہ وہ مرجھا کر شاخ سے نیچے گر گیا۔"

فیروز نے جو خود بھی اپنی آواز کی لے میں کھو گیا تھا ایک نظر یاسمین کے چہرے پر ڈالی آنسو لگاتار اسکے رخساروں پر بہ رہے تھے وہ گاتا رہا اور گاتا چلا گیا ــــــــ "شبنم کا ایک قطرہ میری پیشانی پر گرا، خدا جانے وہ کتنے دور و دراز فاصلے طے کرکے آیا تھا چاند کی زرد چاندنی میں میری مضطرب نگاہ آسمان کے پردوں کو چیر کر اسکی نگاہوں سے مل گئی لیکن انتظار آہ میرا انتظار جس نے اس کی نگاہوں کو افسردہ بنا دیا تھا۔"

فیروز نے پھر ایک نگاہ یاسمین پر ڈالی اسکا چہرہ سرسوں کے پیلے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ اور اپنی نگاہیں فیروز کے چہرے پر گاڑے سُن رہی تھی۔ وہ گاتا چلا گیا اور اپنی آواز کو آہستہ آہستہ اور بلند کرتا گیا ــــــــ "سورج ڈوب گیا ہر چیز پر رات کی تاریکی محیط ہو گئی، لیکن کتنی ناچیز تاریکی جو روشنی کی ایک کرن کے نمودار ہونے سے غائب ہو گئی میرے ویران دل کی دائمی تاریکی! آہ اس سے اُسے کیا نسبت" اس سے اگلا شعر جسے وہ تمام نظم کی جان سمجھتا تھا۔ ابھی باقی تھا اور کتنے ہی اور شعر ابھی باقی تھے کہ اُس نے نظر بھر کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ دفعتہً وہ گر گئی۔ ادھر ستار فیروز کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا۔

"کیوں یاسمین کیسی ہو؟" لیکن ایک بیجان جسم کیا جواب دے سکتا تھا۔

"ہائے یہ کیا ہو گیا آسمان کہاں چلا گیا، اور زمین کدھر کو غائب ہو گئی۔ میں نے کیا کر دیا" اس نے ستار کے تاروں کو توڑ توڑ کر بکھیر دیا اور شعروں کا کاغذ اس نے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ایک لحظہ کے لئے وہ رُکا اور پھر ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتا ہوا باہر نکل گیا کیسی خوفناک آواز تھی جو اس کے گلے سے نکل رہی تھی "لوگو! دوڑو، بھاگو میں نے یاسمین کو قتل کر دیا اپنی بیوی کو میں نے مار ڈالا۔"

"کیوں، کیوں کیا ہو گیا؟"

"میں نے یاسمین کو مار ڈالا وہ زہر قاتل جو میں نے جھیل کے پاس چٹان پر بیٹھ کر تیار کیا تھا میں نے اُسے پلا دیا۔ میں قاتل ہوں، زہر کتنا زود اثر تھا میں اپنے ہاتھوں اُسے پلا چکا ہوں، مجھے گرفتار کر لو۔"

ہتھکڑی کی جھنکار سے آدمیوں کا انبوہ کثیر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ وہ نور کا گلا، موسیقی مجسم، سراپا نغمہ پھانسی کے خوفناک پھندے میں تڑپ رہا تھا اور ایک خزاں رسیدہ پھول مرجھا کر مٹی پر گرا ہوا تھا۔

ز، ب

حدیثِ دل

لکھوں حدیثِ دل الفِ لا قلم بنے — سات آسماں کے سات ورق چاہئیں مجھے

ہستی کے غم سے دِل مرا دریائے خوں ہُوا — ہر اشکِ تر ہُوا جو، وہاں لالہ گوں ہُوا

وہ شمعِ غم جو سینۂ خورشید میں جلی — پہلے پہل مرے دلِ نومید میں جلی

جو داغہائے درد مہِ آسماں میں ہیں — پیدا ہوئے وہ میرے ہی دل کے جہاں میں ہیں

پروانہ جب جلا تو مرا دل بھی جل گیا — شمعِ سحر بجھی تو مرا دم نکل گیا

بادِ خزاں جو باغ میں آئی تو قہر تھا — میرے لئے مسرّت و آرام زہر تھا

کملا رہی تھیں باغ میں کلیاں بھی پھول بھی — بادِ فنا سے پڑ گئی پتّوں پہ دھول بھی

ہلکی صدا شکستِ دلِ عندلیب کی — میرے لئے قیامتِ کبریٰ سے کم نہ تھی

کملا کے گل گرا تھا کہ میں ضعف سے گرا — میرا نظامِ جسم بھی برہم سا ہو گیا

جب زرد ہو کے گرنے لگیں سبز پتیاں — مجھ خستہ جاں پہ ٹوٹ پڑیں غم کی بجلیاں

بے تابیوں سے ہے مری برقِ تپاں خجل

بے چینیوں سے ہے مری سیماب مضمحل

ح - ب

محفلِ ادب

دل

کدھر جاتا ہے تو، کیا ہو ترا بھی اعتبار اے دل
دل! اے دل! اے دلِ بیہودہ گرد، اے حیلہ کار اے دل

ابد تک بندھ چکا ہے مجھ سے پیمانِ وفا تیرا
اگر صبحِ ازل مجھ سے ہوا تو ہمکنار اے دل

کہیں عشرت گہِ حسرت میں بیٹھ اپنا تماشا کر
ستم کش تو بھی ہے کیوں مثلِ چشمِ انتظار اے دل

نہ پروا کر، کہ ہوتے ہیں دو عالم سرگراں تجھ سے
یہ دیکھا کر کہ تو مجھ سے نہیں ہے شرمسار اے دل

خجل ہے عرصۂ وشتِ دو عالم تیری وسعت سے
تجھے اس خاکداں میں کس طرح آیا قرار اے دل

کہاں تک ضبطِ راز و پاسِ کم آمیزیِ لیلیٰ!
سرِ محفل تڑپ تو بھی تو ہے بے اختیار اے دل

نکل اب پہلوئے رنجِ گراں سے دیکھتا کیا ہے
نگار! اے دل، بہار! اے دل، فروغِ لالہ زار اے دل

خموشی میں جھلک ہو رنگِ تبسم ہائے پنہاں کی
شبیہِ حیرتِ خنداں ہے تصویرِ نگار اے دل

یونہی داغِ وفا سے تو بھی عالم کو فروزاں کر
ہوا خورشید دامانِ سحر سے آشکار اے دل

بڑھی ہے فوجِ غم، کر گردن اس کی خم کہ ہو برہم
قطار اندر قطار، اندر قطار، اندر قطار اے دل

تصور ہی میں ممکن ہو طوافِ منزلِ جاناں
کہاں ہے آج تو اے مونسِ شبہائے تار اے دل

بنی ہے پردۂ رازِ دروں خودداریِ حامد
جہاں میں ہے فقط تو ہی مرا اک رازدار اے دل

(حامد علی خاں) (منقول)

یہ کہانی نہیں ہے

ایک مرد ایک عورت پر عاشق تھا، اور اس کی راتوں کی تنہائی اور اُس کی تنہائی کی راتیں اُس کی یاد کے لئے وقف تھیں۔

اور وہ بھی اُسے چاہتی تھی۔

ایک دن مرد نے اس سے کہا میں تمہیں چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے میں تمہارے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ آؤ ہم تم

شادی کرلیں ۔ ہماری زندگی بہشت بن جائیگی ۔

عورت نے انکار کردیا ۔

شادی نہ ہوئی ۔ مگر دونوں کی زندگیاں بہشت بن گئیں ۔

طان (فرانسیسی)

تُو کہاں ہے؟

میری پرشوق اور آرزومند نگاہیں شب دیجور میں تجھ کو ڈھونڈتی ہیں ——— تیری تلاش میں آوارہ رہتی ہیں ۔ آخر نورانی صبح پھولوں کا مینہ برساتی مسکراتی تختِ مشرق پر جلوہ فگن ہوتی ہے ۔ آئینۂ شفق میں مجھے تیرا پر تو نظر آتا ہے جسے دیکھ کر میرے زرد، کمہلائے ہوئے چہرے پر رونق آجاتی ہے ۔ میں تیرے لئے ہمہ تن انتظار ہو جاتی ہُوں ۔

مگر آہ میری مشتاق نگاہوں کے سامنے آفتاب جلوہ ریز ہوتا ہے، مجھے تیرا کچھ پتا نہیں ملتا ۔

موسم بہار میں جب افق سے لیکر افق تک سبزہ کا سہانا فرش بچھ جاتا ہے، جب کلیاں مسکراتی ہیں، جب پرندے خوشی سے چہچہاتے ہیں ۔ اور بلبلیں گلاب کے پودوں پر ڈال ڈال پات پات رقص کرتی پھرتی ہیں ۔ میں بھی دن بھر پھولوں کی پتیوں میں تجھے ڈھونڈتی رہتی ہُوں ۔ کوئل کی درد بھری صدائیں سن کر میرا دل بیتاب ہو جاتا ہے اور بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں ۔ آخر زرد زرد آفتاب شام کے دھندلکے میں غائب ہوتا ہے ۔ پھر یکایک ایک نورانی روشنی سے عالم جگمگا اُٹھتا ہے اور میرے حرماں نصیب دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ۔ مجھے یقین ہوتا ہے کہ تو آرہا ہے اور میں ہمہ تن چشم براہ ہوتی ہُوں ۔

مگر آہ کیا دیکھتی ہُوں کہ چاند نکلا ہے اور تیرا کچھ پتا نہیں ۔

(ناکام)

نیرنگ خیال (لاہور)

تحفۂ گل

پیاری آ اس گل کو چُن شاید یہ مرجھا جائے
گلشن کے اس دل کو چُن شاید یہ کمہلا جائے

تیرے گلے کا ہار بنے اس کی کہاں اتنی قسمت
نازک نازک ہاتوں کا شاید بوسہ پا جائے

ننھے دل میں دھڑکن ہے شام کی آمد آمد سے
تیرے مندر جانے کا شاید وقت چلا جائے

رنگ ہے اس کا ہلکا سا بو بھی ہے بھینی بھینی
چُن لے اسکو رشکِ گُل شاید تجھ رحم آجائے

ورنہ اسکی قسمت میں زیست ہی کتنی رکھی ہے
شام ہوئے کملا جائے، دُھوپ لگے مرجھا جائے

حسن ازل کے پرتو سے حسن مجازی پیدا ہے
تیرے بل پر اے پیاری دل کا دھندا چلتا ہے

(ترجمہ از گیتا نجلی) تجلّی (دکن)

موجودہ ترکی شاعری کا ایک نمونہ

آتشدان کے سامنے ایک بوڑھا چپ بیٹھا تھا۔ افسردہ نگاہیں آگ پر تھیں ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"آہ! میں اس ایندھن کی طرح ہوں۔ قریب ہے کہ سب لکڑی جل جائیگی، بالکل جل جائیگی۔ اسی طرح میں بھی عنقریب جل جاؤں گا۔ سرتا سر جل جاؤں گا۔

لیکن فوراً بلبل کی آواز کان میں آئی۔ مایوس بوڑھا جھنجھلا کر بولا۔

چُپ او زبان دراز چڑیا چُپ! جوانی کے دن یاد نہ دلا! وہ دن جب جسم میں قوت اور چستی تھی۔ جب نہ آنکھیں دیکھنے سے تھکتی تھیں نہ کان سننے سے۔ خوشی کے دنوں کی یاد تازہ نہ کر۔ میں اب زندہ ہوں اور پُرامید انسان کی جگہ ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہوں۔ مجھے پچھلا زمانہ بھول جانے دے"!

بلبل نے جواب دیا۔

ماضی بعینہٖ مستقبل ہے۔ اگر مستقبل تاریک ہے تو ماضی کی یاد اُسے روشن کردے گی۔ ماضی کی روح پرور نسیم حال کی گرمی ہلکا کردے گی۔ آفتاب زندگی ہر وقت درخشاں ہے خود ہم اُسے اپنی فکروں کے بادلوں سے چھپا دیتے ہیں۔

ماضی حال مستقبل تینوں بوڑھے کے دماغ میں آگئے۔ اور دل جل گئے۔ دل میں گدگدی پیدا ہوگئی۔ آرزوں کے معطر پھول شگفتہ ہوگئے وہ پھول جو ۲۰ برس کی عمر میں پنکھڑیاں توڑ کر مسکرائے تھے!"

بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔

"بلبل نے سچ کہا۔ بے شک زندگی کا آفتاب ہر وقت روشن ہے۔ شباب اور پیری ایک ہی ہیں۔ عاقل پیری کو بھی جوانی بنا سکتا ہے بشرطیکہ جوانی کا پرجوش پانی بڑھاپے کے ساکن پانی میں ملادے۔ مسرت کے دنوں کی یاد سے بڑھ کر بھی کیا اس دنیا میں کوئی مسرت ہوسکتی ہے؟

پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور بلبل کے نغموں میں بے خبر سوگیا۔

منقول از الہلال (کلکتہ) نیرنگ (رامپور)

میں اور میرا رفیق

موسلادھار بارش ہورہی ہے۔ باہر ہوا کے تند و تیز جھونکوں، بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک نے ایک عجیب وحشتناک منظر

پیدا کر رکھا ہے۔ میں تنہا کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے قریب میرا رفیق کتا ہے۔

یہ بالکل میرے مقابل بیٹھا ہوا ٹکٹکی باندھے مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ میں خود بھی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ مجھ سے بولا ہی چاہتا ہے۔

مگر آہ وہ بے زبان ہے اظہار مطلب کے لئے اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں۔ وہ نافہم ہے مگر مجھے اس کے احساسات کا کافی اندازہ ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت میرے اور اس کے دل میں ایک ہی قسم کے خیالات موجزن ہیں کہ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک کے دل میں وہی ایک بھڑکتا ہوا شعلہ روشن ہے۔

موت اپنے وسیع بازو کی ذرا سی جنبش سے ہمارا وجود درہم برہم کر دیتی ہے۔ بس یہی ہمارا اختتام ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے بعد پھر بھلا کون تمیز کر سکتا ہے کہ ہمارے قلب کس نور سے منور تھے اور اس کے یہاں کونسا نور ضوفشاں تھا

نہیں! نہیں، ہم ایک دوسرے کو بحیثیت ایک انسان اور حیوان مطلق کے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ یہ آنکھیں دو ہم رتبہ اور مساوی ہستیوں کی آنکھیں ہیں۔ یہی وہ آنکھیں ہیں جنہوں نے ایک دوسرے کو آپس میں بالکل ملا دیا ہے۔

حیوان مطلق اور انسان دونوں کی زندگی حالت خوف میں ایک دوسرے سے بالکل مخلوط ہو جاتی ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ترجمہ از ترجنیو) الناظر (لکھنؤ)

کب تک؟

ستم شعار یہ اندازِ ساحری کب تک!	رہے گی رونق بازارِ ساحری کب تک؟
یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں تاچند	یہ اشتہارِ کرم کی فسوں گری کب تک؟
یہ بزمِ عیش و مزامیرِ خسروی تا کے	یہ تاج و تخت، یہ کلیانگِ قیصری کب تک؟
یہ فخرِ تیغ و علم کی نمائشیں تاچند	یہ شانِ طرۂ دستارِ سروری کب تک؟
یہ زور و شورِ ستمہائے رہزنی کے دن	یہ ادعائے خوش آہنگ رہبری کب تک؟
یہ طنطنے، یہ تحکم، یہ دبدبے تا کے	زبوں خصال! یہ جھوٹی سپہ گری کب تک
یہ شیطنت میں نمودِ پیمبری کیسی؟	پیمبری میں یہ اندازِ داوری کب تک
یہ چیرہ دستیٔ تثلیثِ ناروا تاچند	یہ فتنہ خیزیٔ توحیدِ آذری کب تک
یہ شغلِ ظلم، یہ آئینِ دلدہی تا کے۔	یہ مشقِ جور، یہ انداز دلبری کب تک
ٹھہر کہ چرخ نئی چال چلنے والا ہے	سنبھل سنبھل! کہ زمانہ بدلنے والا ہے

چمنستانی (حجازی)

فہرستِ مضامین

جلد ۱۲ | بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء | نمبر ۴

تصاویر:- (۱) اپالو (۲) مرحوم سعد زاغلول پاشا

جہاں نما

ترکی اور مصر کی قابلِ تقلید مثال

"اب ہر ترک سلطان ہے"

مسٹر مظہر الدین ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل کی بیگم صاحبہ نے جو حال ہی میں ترکی اور مصر کی سیاحت سے واپس آئی ہیں ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمایندے کے سامنے اپنے حسب ذیل تجربات بیان کئے:۔

"ہندوستانی بہنوں کے برعکس مسلمان مصری خواتین اپنے ملک کے تمام سیاسی معاملات میں عملی حصہ لیتی ہیں۔ اور انکو ہمسایہ یورپی اقوام کی ترقیات کا کامل طور پر علم ہوتا ہے۔ میں نے مصر کی عورتوں کو خود بازار سے سودا خریدتے اور عام کاروبار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ گھر کی چار دیواری میں بند رہنا نہیں چاہتیں۔ بلکہ ایک عورت نے مجھ سے یہاں تک کہا کہ "اب ہم پہلے کی طرح حیوانوں کی سی زندگی بسر نہ کریں گی" تمام مصر میں عورتوں کا دلی جذبہ یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی حالت کو دوسرے خود مختار یورپی ممالک کے ہم رتبہ بنانے میں مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کریں۔

"قسطنطنیہ میں نائب السلطنت نے کمال مہربانی سے ہمیں شرف ملاقات بخشا اور ہمارے لئے تمام قابل دید مقامات کے دیکھنے کا انتظام کردیا۔ ان مقامات میں سابق سلطان کے محلات بھی تھے۔ جب ہم محلات سے گزر رہے تھے تو ہم نے اس بات پر تاسف ظاہر کیا کہ اب سلطان یہاں نہیں ہے مہتمم محلات جو ایک ترک تھا ہمارے قریب آیا۔ اور مسکرا کر کہنے لگا "اگر سلطان نہیں تو کیا غم ہے اب ہر ترک سلطان ہے" یہ الفاظ ترکوں کے عمیق جذبۂ قومیت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ پھر ہم مسجد ایا صوفیہ میں گئے۔ اس جگہ جو قابل ذکر بات ہمیں نظر آئی۔ اور جو ہندوستان میں بالکل مفقود ہے۔ وہ یہ تھی کہ عورتیں اور مرد ایک ہی صف میں کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے تھے۔ بہت سی ترک عورتیں ہمیں دفتروں اور کارخانوں میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس آزادی پر جو مصطفےٰ کمال پاشا نے انہیں دی ہے بہت خوش اور نازاں ہیں۔

"مصطفےٰ کمال کے لئے ترکوں کے دلوں میں انتہائی محبت جاگزین ہے وہ اس کے تمام احکامات کو بجا لانے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ اسلام کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان تمام مہمل رسوم اور رواجات کو خیرباد کہنی چاہتے ہیں جو بعد میں اسلام کی تعلیمات میں شامل ہوئے۔ اور جنہوں نے اسلام کو موجودہ مہذب دنیا کے سامنے ذلیل کردیا۔ میں اپنی مسلمان ہندوستانی بہنوں سے استدعا کرتی ہوں کہ وہ قرآن کریم کا مطالعہ کریں اور اسلام کے اصولوں کو

سمجھیں اوران کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ اور اپنے آپ کو موجودہ ذلت سے بچاکراس عزت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں جو خدا اور اسکے رسول نے ان کو عطا کی ہے ہندوستان کے مسلمان اپنی خانگی اور ملکی زندگی میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہونگے جب تک وہ ان باتوں پر عمل کرینگے جوان کو پیغمبر اسلام نے بتائی تھیں۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں قید رہ کر قعر مذلت اور جہالت میں پڑی رہیں۔ بلکہ اُن کے پیغمبر نے بار بار انہیں تاکید کی ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں تعلیم حاصل کریں۔ اور دنیا کے ہر معاملہ میں دلچسپی لیں۔

مسولینی کی تصویر

جواس کے اپنے الفاظ میں نظر آرہی ہے

مسولینی نے جو موجودہ اٹلی کا ایک بہت بڑا رہنما ہے۔ گزشتہ چار یا پانچ سال کے عرصہ میں بہت سی پرجوش اور فصیح وبلیغ تقریریں کی ہیں۔ ان تقاریر میں سے ہم چند خاص خاص فقرات کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں۔ جو اُسے اسکے اپنے الفاظ میں ہم سے متعارف کراتے ہیں۔ مسولینی کی تقریروں کو پڑھ کر بلا شبہ انسان اسکے خلوص کا قائل ہو جاتا ہے اور یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ اُسے جمہور کے نفسیات کا کتنا گہرا علم ہے۔

"ہم قوم کو اس لئے اپنے ماتحت نہیں رکھنا چاہتے کہ ہم اُن کو اپنا غلام بنا لیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہم انکسار کے ساتھ محبت کے ساتھ اور سرگرمی کے ساتھ ان کی خدمت کر سکیں اور اس خدمت کو اپنا فرض سمجھ کر انجام دیں۔ جسے میں مذہبی فرض کہوں گا"

"تشدد ہمارے نزدیک کوئی کھیل نہیں ہے۔ نہ تشدد کبھی کھیل تھا اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے تشدد جنگ کی طرح ہے۔ جو بعض مقدر اور تاریخی ساعتوں کی ایک شدید ضرورت ہے"

"تشدد خلاف اخلاق نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف بعض اوقات وہ سراسر اخلاق ہے"

"ہمیں جمعیت اقوام میں شامل رہنا چاہئے اسلئے کہ دوسری قومیں اس میں موجود ہیں۔ وہ قومیں کہ اگر ہم الگ ہوگئے تو خوش ہونگی اور ہماری غیر موجودگی میں اپنے معاملات کو سلجھائیں گی اور اپنے مفاد کی حفاظت کریں گی۔ اور ممکن ہے کہ اس حفاظت کا بار بھی ہمیں پر پڑے"

"میری آرزو یہ ہے کہ میں اطالوی قوم کو ایک مضبوط۔ خوش حال۔ آزاد اور عظیم الشان قوم بنا دوں"

"موجودہ حکومت کی خارجی حکمت عملی میں اس انقلاب کی ضرورت نے سجھائی ہے جو ہم ترقی کی راہ میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جو یورپ بلکہ دنیا میں ہماری سیاسی حیثیت سے تعلق رکھتا ہے"

"ہر اُس قوم کی زندگی کا دارومدار شہنشاہیت پر ہے۔ جو اقتصادی اور روحانی ترقی کی خواہشمند ہے"

"خدا اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے میں میری مدد کرے"

پُراسرار ہودینی

ہودینی کے متعلق جس نے پچھلے ہی سال انتقال کیا اور جو زمانۂ حال کے شعبدہ بازوں کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا لوگوں کے دلوں میں ایک نیا خیال نشوونما پا رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہودینی کوئی معمولی شعبدہ باز نہ تھا۔ بلکہ اس کے حیرت انگیز کرتب کسی روحانی قوت کے ذریعہ سے سرانجام پاتے تھے۔

سر آرتھر کانن ڈائل نے ماہ اگست کے سٹرینڈ میگزین میں "ہودینی ایک معمّہ ہے" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جس میں انہوں نے مندرجہ بالا مسئلہ پر بحث کی ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں اس کے نہایت عجیب و غریب کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے استفسار کیا ہے کہ کیا کوئی شخص معقولی طور پر اس امر کو تسلیم کر سکتا ہے کہ اس کا کام محض ایک شعبدہ بازی تھی۔ مثلاً جب ہودینی ہالینڈ میں تھا تو اس نے شہر کے ٹوکریاں بننے والوں کو بلا کر ان سے اپنے اردگرد ایک خول بنوالیا۔ اور پھر اسکو توڑے بغیر باہر آگیا۔ پھر اس کو کاغذ کے ایک سربمہر لفافے میں بند کر دیا گیا جب وہ باہر نکلا تو کاغذ صحیح سالم تھا۔ اس کے جسم کے گرد برف کی تہ جمادی گئی۔ اور وہ اس میں سے بھی باہر نکل آیا۔

۲۶ اگست ۱۹۲۶ء کو اس کے ہاتھ پشت کی طرف کس کر باندھ دیئے گئے اور ایک من کے قریب وزن اسکے جسم سے لٹکا کر اُسے خلیج سان فرانسسکو میں پھینکدیا گیا۔ آخر اس کا جسم ایک صندوق کے ساتھ بندھا ہوا نیویارک کے قریب دریائے ایسٹ میں برآمد ہوا۔ اور وہ ابھی زندہ تھا۔

برسٹل کے صندوق سازوں نے ایک صندوق تیار کیا جس کی لوہے کی چادر ایک انچ موٹی تھی۔ کناروں پر اسکی موٹائی دگنی کر دی گئی تھی اور تین تین انچ لمبے کیل اس صندوق میں جڑے گئے تھے۔ ہودینی اس میں لیٹ گیا۔ صندوق کو بند کر کے اس کے ڈھکنے پر پھر تین تین انچ لمبے کیل لگا دیئے گئے۔ پھر صندوق کو رسیوں سے مضبوط باندھ دیا گیا۔ اور اس کو ایک خیمہ میں رکھ دیا گیا۔ پورے بچانوے سیکنڈ کے بعد ہودینی ناظرین کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کی قمیص پھٹی ہوئی تھی۔ صندوق بنانے والوں نے صندوق کا اچھی طرح معائنہ کیا لیکن وہ اسی طرح بند تھا اور رسی بھی اس پر لپٹی ہوئی تھی۔

اب میں ہودینی کی طاقت کے متعلق ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے صاف طور پر ظاہر ہو جائیگا کہ اسکے

کارناموں میں ایک غیر معمولی قوت کام کر رہی تھی۔ میرے دوست بارلٹ کا بیان ہے کہ ہودینی میرے ہاں مہمان تھا۔ دورانِ گفتگو میں میں نے اس سے پوچھا کہ "وہ تمہارا صندوق کا شعبدہ کیا ہے؟"

معاً اس کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں سے چمک رخصت ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس نے کہا "میں خود نہیں جانتا۔ بلکہ اس وقت مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو جاتا ہے کہ اگر میں ناکام رہا تو بس زندگی ختم ہے"۔

انگریز خواتین کے قد میں اضافہ

ڈاکٹر ایس جی پارسنز نے جو لندن یونیورسٹی میں اناٹومی کے پروفیسر ہیں۔ برٹش ایسوسی ایشن کے شعبۂ تشریح الابدان میں ایک نہایت دلچسپ بیان دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیس سال ہوتے ہیں میں نے خواتین کے سکول آف میڈیسن کی ایک سو پچاس طالبات کا قد ناپا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اوسط قد پانچ فٹ تین انچ ہے۔ اس کے دس سال بعد جو لڑکیاں اس مدرسے میں داخل ہوئیں ان کا اوسط قد ماقبل سے بقدر ایک انچ بڑھا ہوا تھا۔ لیکن اس سال جب سینٹ طامس ہسپتال کی ایک سو پچاس نرسوں اور طالب علم لڑکیوں کے قد کی اوسط لی گئی تو وہ پانچ فٹ پانچ انچ کے قریب تھی۔ گویا گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں انگریز خواتین کے قد میں دو انچ کی زیادتی عمل میں آئی۔

زمین کی اندرونی حالت

مسٹر جے ایل ہاگسن نے برٹش ایسوسی ایشن کے انجنیرنگ سیکشن میں تقریر کرتے ہوئے دنیا کو ایک عجیب و غریب بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ زمین کی اندرونی حرارت بھی صنعت و حرفت کے کام آسکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کرۂ ارض کے خشک رقبے میں چار چار پانچ پانچ میل کے فاصلہ پر کھود کر سوراخ کر دینے سے کھیتوں کی پیداوار بڑھانے اور صنعت کے لئے طاقت پیدا کرنے کے لئے زمین سے حرارت حاصل کرنے کا امکان معلوم ہوتا ہے اس کام میں اس وقت ہمارے سامنے سخت مشکلات نظر آتی ہیں لیکن وہ ایسی نہیں جن پر ہم غالب نہ آسکیں۔

اپالو

اپالو سورج کا دیوتا ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ کو اسی نے پیدا کیا۔ موسیقی، شاعری اور خطابت اسی کے ایجادات ہیں۔ صرف آفتاب ہی اس کے نور سے کسبِ فروغ نہیں کرتا بلکہ دنیا کی ہر حسین اور شاندار چیز اسکے جلوۂ جہاں آرا کی ایک ایک کرن مستعار لیکر پیدا ہوتی ہے اسکے حسن میں الوہیت کی ایسی ہیبت اور تمکنت ہے کہ اس کے چہرے کی طرف کوئی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ہر روز اپنی اس خوبصورت رتھ میں بیٹھ کر مشرق سے مغرب کی طرف جاتا ہے جو رنگ رنگ کے ہلکے ہلکے پھولوں سے بنی ہوتی ہے اور جس کے پہیے قوس قزح کی رنگینیوں سے مزین کیے جاتے ہیں۔ سفید اور سنہرے رنگ کے راج ہنس اسکو کھینچتے ہیں اور اپالو کی سواری کہکشاں سے گزرتی ہوئی مشرق کی طرف مڑ جاتی ہے۔ موسیقی کی پریاں حلقہ باندھے اس کے ساتھ ساتھ اڑتی ہیں۔ ان کے جسم آفتاب صبح کی سنہری کرنوں کے لباس میں سے ستاروں کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ پریاں اپالو کے نغموں کو اپنے میٹھے میٹھے سروں میں گاتی ہیں تو اپالو کے بربط کے تار ہلنے لگتے ہیں ساری فضا وجد کرنے لگتی ہے۔ دنیا مسرت سے معمور ہو جاتی ہے۔ ایک ہلکا سا سنہرا غبار اُٹھتا ہے اور پھیلتا اور بکھرتا ہوا تمام آسمان کو جگمگا دیتا ہے۔ موسیقی آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہے ہر شے میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ سکوت ٹوٹ جاتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔ پرندے چہچہاتے ہیں۔ پھر روشنی کا ایک طوفان ابل پڑتا ہے۔ اور سارا جہان بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

منصور احمد

سعد زاغلول پاشا مرحوم

زاغلول پاشا کے بے وقت اور ناگہانی انتقال سے دنیائے اسلام ایک ایسے وجود سے محروم ہوگئی جس نے موجودہ زمانے میں احساس حریت کو از سر نو زندہ کیا تھا۔ مصر کی آزادی کے لئے انہوں نے اپنی زندگی کے صرف آخری چند سال صرف کئے اور اس چند سال کے عرصہ میں انہوں نے اس بے نظیر تدبر اور فقید المثال استقلال سے کام کیا کہ تاریخ مصر اس بطل جلیل کے کارناموں کو ہمیشہ فخر سے بیان کرے گی۔

احمد سعد زاغلول سنہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے علوم عربیہ و اسلامیہ کی تعلیم آپ نے جامعہ ازہر میں پائی۔ اُنکی عمر کوئی بیس برس کی ہوگی جب اتحاد اسلامی کے مشہور علمبردار سید جمال الدین افغانی دوسری دفعہ مصر تشریف لائے۔ شیخ محمد عبدہ ان کے نہایت سرگرم شاگرد تھے سید جمال الدین کی مجالس کی شہرت جب مصر میں پھیلی تو سعد زاغلول بھی ان کے درس میں شامل ہونے لگے۔ یہیں شیخ محمد عبدہ سے بھی اُن کا رشتہ تلمذ قائم ہوگیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ ان کی طبیعت کا سکون و جمود یکسر رخصت ہوگیا۔ اور خطابت و فصاحت کی وہ غیر معمولی قابلیت بیدار ہوگئی جس کے باعث وہ ہمیشہ اپنے معاصرین میں ممتاز رہے۔

اسکے بعد انہیں نئی تعلیم کا شوق ہوا پہلے فرانسیسی زبان کی تحصیل کی اور پھر اپنے طور پر ہی قانون کا مطالعہ کیا انہوں نے مصر کی عدالت عالیہ کے پاس درخواست کی کہ مجھے مصر کی عدالتوں میں وکالت کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ان کے پاس سرکاری مدارس یا یورپی مدارس کی کوئی سند نہ تھی اسلئے سرکاری محکمہ نے اجازت دینے سے انکار کردیا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا اور کہا "اگر اس معاملہ میں دار و مدار استعداد اور اہلیت پر ہے نہ کہ سند کے ایک پرزے پر۔ تو قانون کا سخت سے سخت امتحان لے لیا جائے۔ اگر میں یورپ کے سند یافتہ بیرسٹروں سے بہتر ثابت ہوں تو میری درخواست منظور کی جائے"۔ چنانچہ اُن کی قانونی استعداد کا امتحان لیا گیا جو بلند سے بلند معیار پر بھی پوری اُتری اور انہیں وکالت کرنے کی اجازت مل گئی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ قانونی مناصب میں ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ سنہ ۱۹۰۶ء میں اپنی غیر معمولی قابلیت کے باعث وزیر تعلیم بن گئے اور مجلس تشریع کے نظام میں جب وسعت ہوئی تو مجلس نے انہیں اپنا صدر منتخب کیا۔

سنہ ۱۹۱۷ء تک ان کی تمام زندگی سرکاری مناصب میں گذری اور اسوقت تک وہ ہمیشہ آزاد قومی تحریکات کے خلاف رہے لیکن اسکے ایک ہی سال بعد سعد پاشا کی طبیعت میں ایک غیر متوقع انقلاب رونما ہوگیا یعنی انہوں نے مصر کی تحریک حریت و استقلال کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جس سے اس تحریک کو بڑی طاقت اور اہمیت حاصل ہوگئی۔ مصر کے نوجوانوں کے دلوں میں زاغلول پاشا کے لئے ایک فداکارانہ جذبہ کام کرنے لگا اور انہوں نے ان کا پیغام قریہ قریہ میں پہنچا دیا۔

سعد کا انتقال ہوگیا۔ لیکن اس کے اپنے ہی قول کے مطابق "سعد مر کر بھی زندہ رہے گا"، کیونکہ اس کی روح ہر مصری کے جسم میں سرایت کرچکی ہے۔

منصور احمد

رباعیات

(۱)

جینا ہے حقیقت میں تو ایثار کرو
سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرو
راحت سے تمہاری دوسروں کی ہو جنت
دکھی جو جہاں میں ہیں انہیں پیار کرو

(۲)

کوئل کی جو کوک اٹھی وادی میں
گھر اس کا ہے میرے دل کی آبادی میں
سب قید حسن ذات ختم ہوگی یارا
سب پھولوں پھلوں کا تیری آزادی میں

(۳)

دیکھی کوئی صورت تری گلزاروں میں
پائی کوئی عظمت تری کہساروں میں
سوتی ہو جب آرام سے ساری دنیا
ڈھونڈے کوئی راتوں کو تجھے تاروں میں

(۴)

آنکھوں میں پیا تو اے آنکھ کے تارے آجا
گھر میں مرے اے چاند ہمارے آجا
بیدل ہے مرا دل مرے اچھے دلبر
آجا کبھی اے جان سے پیارے آجا

بشیر احمد

ٹامس گرے کے کلام پر ایک تنقیدی نظر

(۲)

عمل اور متانت اس کے نزدیک تمام باتوں کا سنگ بنیاد تھا اور جہاں ان دونوں کی کمی ہوتی خواہ اُن کی تلافی کسی چیز سے بھی کیوں نہ کی جائے اس کی تشفی نہ ہو سکتی تھی والٹیر کی ادبی قوت نے اس کو خوش کیا تھا۔ لیکن والٹیر کی فطرت کی غلطیوں کو وہ اس شدت سے محسوس کرتا تھا کہ جب اُس کا نوجوان دوست نکلسن ۱۷۷۱ء میں گرے کی وفات سے کچھ ہی سال قبل باہر سفر پر جا رہا تھا تو اس نے کہا کہ :۔ "میں تم سے ایک بات کی التجا کرتا ہوں جس سے تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیئے" نکلسن نے جواب دیا۔ "آپ جانتے ہیں کہ آپ کو صرف حکم دینا چاہیئے، فرمائیے کیا بات ہے؟" گرے نے کہا۔ "والٹیر سے ملنے کے لئے نہ جانا" اور پھر کہا :۔ "کوئی اس شرارت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو انسان کر سکتا ہے" نکلسن نے تعمیلِ ارشاد کا وعدہ کیا اور دریافت کیا "اس سے میری ملاقات کیا ظاہر کرتی ہے؟" گرے نے جواب دیا :۔ "ایسے آدمی کی ہر قدر و منزلت اسکو امتیاز بخشتی ہے"۔ وہ ڈریڈن کی وقعت کرتا تھا۔ اور بہت زیادہ وقعت کرتا تھا اور شاعر کی حیثیت سے اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا، اُس نے بی ٹی سے کہا تھا کہ :۔ "خود میرے اشعار میں بھی اگر کوئی خوبی ہے تو اس کو میں نے یقیناً اسی زبردست شاعر سے سیکھا ہے"۔ اور بعد میں اُس نے بی ٹی کو خط میں ڈریڈن (جس کی نسبت اس کا خیال تھا کہ بی ٹی اس کی شاعری کی حیثیت سے کما حقہٗ قدر نہیں کرتا) کے متعلق لکھا تھا کہ :۔ "صرف ڈریڈن کو یاد رکھو اور اس کی تمام غلطیوں کی طرف سے اندھے بن جاؤ"! ہاں اس کی شاعرانہ غلطیوں کی طرف سے! لیکن ڈریڈن کی انسانی حیثیت کے متعلق بھی اس کا جملہ سخت ہے منصب ملک الشعرا (پوئیٹ لارٹ شپ) کے متعلق ذکر کرتے ہوئے وہ میسن کو لکھتا ہے :۔ "ڈریڈن اپنے کردار کے باعث اس عہدہ کے لئے اس طرح ناموزون ہے جس طرح ایک معمولی شاعر اپنے شعر کی وجہ سے"! اگرچہ زبردست برائیوں کی کمی کیوں نہ ہو لیکن کسی شخص کے کردار میں گہرائی اور وزن کا نہ ہونا گرے کی رائے میں اسکو سنجیدہ اہمیت سے باز رکھتا ہے۔ وہ ہیوم کے متعلق لکھتا ہے۔ "کیا اس کی وہ خوش مزاجی اور شگفتگی جس کی تعریف اسکے قدردان کرتے ہیں۔ اس امر پر مبنی نہیں ہے کہ وہ تمام عمر بچہ رہا جسکو جبراً لکھنا پڑھنا سکھایا گیا تھا"!

اس تمام سنجیدگی کے ساتھ اُس میں ایک ہمدردانہ جذبہ اور ایک ایسا عنصر موجود تھا جو کھیل کود اور سیر و تفریح پر مبنی تھا۔ کس وک کے مقام پر نہر کے کنارے موسم خزاں میں شام کے وقت اس نے ریوو بز یا آبرمن یا ورڈسورتھ کے

انداز میں حسب ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں۔

"شام کو غروب آفتاب کے بعد میں تنہا کروپارک کی بازو والی نہر پر چلا گیا۔ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر دھوپ کی آخری چمک کے چھپنے کا نظارہ دیکھتا رہا۔ پانی کی گہری خاموشی اور اس میں طول طویل سائے جو مقابل کے ساحل تک پہنچتے تھے، ان تمام میں روشنی کی شاندار رنگینیاں دیکھیں۔ فاصلہ پر آبشاروں کی وہ آوازسنی جو دور سے سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے چاند کی خواہش تھی لیکن وہ میرے لئے تاریک اور خاموش تھا اور اپنے خالی قمری غار میں چھپا ہوا تھا"۔

اس کی ظرافت اور کھلاڑی پن سے اس کے شگفتہ خطوط پُر ہیں۔ اس کی ظرافت اس کی شاعری میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ہورس اور والپول نے کہا تھا کہ "گرے نے کوئی چیز سوائے ظرافت آمیز مضامین کے آسانی کے ساتھ نہیں لکھی، ظرافت اس کی فطری اور ذاتی ذوق کی چیز تھی"۔

علم، غور وفکر، متانت، جذبات، ظرافت یہ تمام چیزیں گرے میں موجود تھیں۔ ایک شاعر کا منصب رکھنے والے کے لئے جو جو صفات اور التسابات ضروری ہیں وہ سب اس میں موجود تھے۔ لیکن بہت جلد اس کی طاقت زائل ہونے لگی۔ اور صحت کی خرابی کے آثار نمایاں ہونے لگے، اور یہ خرابی عمر کے سالوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی وہ ویسٹ کو ۱۷۳۷ء میں لکھتا ہے۔

"پژمردہ جذبات میرے سچے اور وفادار رفیق ہیں۔ وہ میرے ساتھ جاگ پڑتے ہیں، میرے ساتھ سوتے ہیں میری طرح سفر پر جاتے ہیں اور لوٹتے ہیں۔ صرف یہی نہیں مجھ سے ملنے آتے ہیں اور خوش مزاج بننے اور میرے ساتھ ہلکی سی ہنسی ہنسنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر ہم تنہا ایک جگہ بیٹھتے ہیں اور یہ دنیا کے سب سے زیادہ خوبصورت اور کاہل ہم نشیں معلوم ہوتے ہیں"۔

یہ مذاقیہ لہجہ ہے، گرے ابھی کیمبرس کا بھی نہ تھا وہ ویسٹ سے چار پانچ سال بعد لکھتا ہے "تجھے معلوم کرنا ضروری ہے کہ مجھے زیادہ تر ایک مالیخولیائے ابیض حاصل ہے یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ...... جو بہت ہی کم رقص کرتا ہے یا ہنستا ہے یا اس مرتبہ تک پہنچتا ہے جس کو کوئی خوشی یا مسرت کہتا ہے تاہم اس حالت میں بھی ایک آسودگی ہے"۔ لیکن وہ اس خط میں حسب ذیل جملوں کا اضافہ کرتا ہے۔

"لیکن ایک دوسری قسم ــــ یقیناً مالیخولیائے اسود بھی ہے جسکو میں نے کبھی کبھی محسوس کیا ہے اور جس میں کریڈولین کے قواعد مذہب کی طرح کوئی بات ہے ...... وہ حالت جو کہ برخلاف تمام امیدوں اور ہر اس چیز کی طرف سے جو خوش آئند ہے بالکل آنکھیں بند کر لیتی ہے اور قریب آنے نہیں دیتی۔ اس سے ہمیں اللہ تعالیٰ نجات دے کیونکہ سوائے

اس کے اور دھوپ رکھنے والے موسم کے کوئی اور یہ نہیں کر سکتا۔"

چھ یا سات سال گزر جاتے ہیں اور ہم اس کو کیمبرج سے وارٹن کو اس طرح لکھتا ہوا پاتے ہیں۔

کاہلی کی روح (یعنی اس مقام کی روح) اب مجھ پر بھی جو ایک عرصہ دراز تک اسکی مخالفت کرتا رہا ہوں چھانی شروع ہوئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زمانہ میرے خمیر کو بنائے گا۔ زمانہ میرے کمزور ساتھی کے ساتھ دوبارہ میرا ملاپ کرائے گا ہم ساتھ مل کر سگرٹ پئیں گے۔ شراب پئیں گے افیون کھائیں گے ہم دوسروں کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے مذاقوں اور بڑی بڑی کہانیوں میں محو رہیں گے۔ پورٹ سے جس کی ابتدا ہوگی اُسے برانڈی ختم کرے گی اور اس کے ایک ہفتہ بعد آپ "لنڈن ایوننگ پوسٹ" کے کسی گوشہ میں دیکھیں گے۔ کہ کل حضرت جان گرے کلیر ہال کے سینئر فیلو ایک ظریف دوست اور ان تمام کے مرجع عزت جوان کو جانتے تھے انتقال کر گئے۔"

یہ پُر مذاق اعلان اس ذاتی خط میں ایک ایسے انداز میں ختم ہوتا ہے جو مجھے یہاں نقل نہیں کرنا چاہئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور ۱۷۵۷ء میں وہ ہرڈ کو لکھتا ہے۔

"کام میں لگ جانا شادمانی ہے۔ میرے اس اصول نے (اور مجھے اس کی صداقت پر اعتماد ہے) معمول کے موافق میرے عمل پر کوئی اثر نہیں کیا۔ میں تنہا ہوں اور حد درجہ پژمردہ۔ تاہم کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے یہاں ایک عذر ہے۔ میری صحت (جس کے متعلق آپ نے اپنی نوازش سے استفسار فرمایا ہے) غیر معمولی نہیں ہے۔ کوئی بڑی بیماری نہیں لیکن کئی معمولی معمولی ہیں اور مجھے اچھا رکھتی نظر نہیں آتیں۔"

اس وقت سے وفات تک اس پر اس کی پژمردگی اور پستی (اگرچہ یہ اکثر تفریحوں اور سفروں کے باعث دور بھی ہو جاتی تھی) مہلک طریقہ سے حاوی ہوتی گئی اور آخر کار مستقل ہوگئی۔ وہ ڈاکٹر وارٹن کو لکھتا ہے کہ: "مجھے یا تو سفر کرنا چاہئے یا مرجانا چاہئے۔ اِس سال تک میں بہت کم جانتا تھا کہ مصنوعی پست خیالات کیا ہیں۔ لیکن اب میں مشرق کی ہوا چلنے پر بھی کانپنے لگتا ہوں" دو مہینے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

اس کی تمام زندگی میں یہ تکلیف دہ بادل اس پر چھائے ہوئے اور اس کو دبائے ہوئے رہے۔ اسی لئے گرے نے اگرچہ وہ نفیس طبیعت لے کر آیا تھا اور اگرچہ علم و فضل سے کافی طور پر بہرہ ور تھا تاہم اس قدر کم تخلیق کی اور اپنی قابلیت کا پورا اور کافی اظہار نہیں کیا۔ اور جس طرح پمبروک ہال کے ماسٹر نے کہا ہے: "ہرگز زبان نہیں کھولی مگر صرف وہی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس پر کیا گزرتی تھی۔

وہ بیسن کو لکھتا ہے: "آپ واقف ہیں کہ میری بہترین قوت بھی اس قدر نازک جسم والی ہے اور اس میں اسقدر

کمزور پڑھتے ہیں کہ اس کو ایک سال میں تین دن سے زیادہ نہیں جگانا چاہئیے" اور ہوریس والپول سے وہ کہتا ہے: "آپ نے اپنی عنایت سے جو فرمایا ہے کہ مجھے زیادہ لکھنا چاہئیے تھا، میں نہایت خلوص سے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اتنی بلکہ اس سے زیادہ سالوں کے بعد جب کبھی مجھ میں ظرافت پیدا ہوگی میں لکھوں گا، کیونکہ میں اس کو پسند کرتا ہوں اور جب میں ایسا کرتا ہوں تو اپنے آپ کو بہت پسند کرنے لگتا ہوں۔ اگر میں زیادہ نہیں لکھتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں لکھ نہیں سکتا" کس قدر سادگی اور کس قدر صداقت سے کہا ہے! کیا ہی اچھا ہوتا اگر گرے جیسا شخص یہ کہتا کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت زیادہ پسند کرتا ہے۔ جب کہ وہ کچھ کہتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ نہیں کہتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہیں کہہ سکتا"

بونسٹٹن وہ مضطرب مزاج سوئٹزرلینڈ کا باشندہ جس نے ۸۰ سال کی عمر میں اپنی عمر کے ساٹھ اور اسی سالوں کا درمیانی زمانہ بہ نسبت زندگی کے کسی دوسرے زمانہ کے بہت زیادہ شگفتہ اور مطمئن رہ کر گزارتے ہوئے ۱۸۳۲ء میں وفات پائی وہ اپنے ابتدائی زمانہ میں کیمبرج میں آیا تھا اور گرے کو جس کے ساتھ اُس نے وفاداری سے لگاؤ پیدا کر لیا تھا اُس نے بہت کچھ دیکھا اور گرے کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے کم عمر دوست سے خوش تھا کیونکہ وہ لکھتا ہے "میں نے ایسا لڑکا کبھی نہیں دیکھا ہماری نسل اس نمونہ پر نہیں پیدا کی گئی۔ ایک زمانہ کے بعد بونسٹٹن نے گرے کے متعلق اپنی یادداشتیں شائع کیں۔ وہ کہتا ہے: "میں گرے سے اپنے وطن اور زندگی کی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میرے لئے ایک سربمہر کتاب تھی۔ وہ ہرگز اپنے متعلق گفتگو نہیں کرتا تھا۔ اور نہ مجھے اپنی شاعری کے متعلق گفتگو کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ اگر میں اس کے اشعار اس کے سامنے پڑھتا تو وہ ایک ضدی بچے کی طرح خاموش ہو جاتا تھا۔ میں نے بعض دفعہ اس سے کہا:۔ کیا آپ مہربانی فرما کر مجھے کوئی جواب دیں گے؟ لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا" بونسٹٹن کا خیال ہے کہ گرے کی زندگی بے اطمینانی کی وجہ سے زہر آلود ہوگئی تھی اور اس کے عشق نہ کرنے کے باعث اور کیمبرج کے خاموش گوشوں میں راہبانہ طرز کے ایسے کتابی کیڑوں کی ایک جماعت کی صحبت میں رہنے کے باعث جُنکی ہستی سے کوئی حقیقی عورت خوش نہیں ہوسکتی" پژمردہ ہوگئی تھی۔ سینٹ بیو جو گرے سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس کے ساتھ دلچسپی رکھتا تھا، اس بارے میں شبہ کرتا ہے کہ آیا اس کے متعلق بونسٹٹن کا بیان قابل تسلیم ہے؟ وہ گرے کی خاموشی کا راز اس کی شاعرانہ قابلیت — کہ وہ جس قدر ممتاز اور جس قدر غیر معمولی تھی۔ اسی قدر کم خلاق بھی تھی!! — کے زیادہ تخلیق نہ کرسکنے یعنی شاعر کی اپنی طبیعت کے عقیم ہونے کی مایوسی میں مضمر سمجھتا ہے۔

لیکن گرے کو سمجھنے کے لئے اس کی طبیعت کو عقیم ہونے کا الزام دینے کی بجائے ہمیں کچھ اور کرنا چاہئیے اور اُس کی کیمبرج کی تنہائی سے گزر کر ہمیں کچھ اور دیکھنا چاہئیے۔ اس کے ناقابل تخلیق ہونے کے اسباب کیا تھے؟ کیا وہ اس کی بیماری،

اس کی موروثی نقرس تھی۔ یقیناً ہم کو نقرس کی جانکاہ تکلیف سے بےکس فانی انسان کے متاثر ہونے پر کافی توجہ کرنی چاہیے لیکن گوئٹے یہ بتانے کے بعد کہ شلر جو اس قدر پُرگو تھا، ہمیشہ بیمار رہا کرتا تھا۔ یہ صحیح ریمارک پیش کرتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں جوش جسم کے سنبھالنے میں بہت کچھ مدد کرتا ہے۔ پوپ کا اپنی اس تمام زندگی میں جس کو وہ دردناک پیرایہ میں "میری زندگی ــــ وہ طویل بیماری" کہتا ہے۔ سرگرم کار رہنا ایک زندہ نمونہ ہے جو خود گرے کے ملک اور زمانہ میں گوئٹے کی تصدیق کرنے کے لئے امتیازی حیثیت سے پیش ہوتا ہے۔ پھر وہ کیا طاقت تھی جس نے گرے کو عزلت پسند اور ناقابل تخلیق بننے پر مجبور کر دیا؟

اس کا سبب، یقینی سبب جس کو میں مانے بغیر نہیں رہ سکتا، میں کہیں بیان کر چکا ہوں۔ گرے جو ایک مادر زاد شاعر تھا، اس زمانے میں پیدا ہوا جب نثر کا دور دورہ تھا اور نثر کا کام بجائے انسان کے قلب اور روح کی گہری قوتوں کے بالعموم اس کی ذہانت اور فہم و فراست کی قوتوں کو مخاطب کرنا ہے ادبی پیداوار کے لحاظ سے انگلستان میں اٹھارہویں صدی کا کام دنیا کی شاعرانہ ترجمانی نہیں تھی۔ بلکہ ایک سادہ صاف بےتکلف اور آسان نثر کا پیدا کرنا تھا۔ شاعری کو بھی مجبوراً اسی روش پر چلنا پڑا۔ یہ زمانہ دماغی اور استدلالی تھا، نہ کہ اشیاء کو صداقت اور حسن کے نقطۂ نظر سے دکھانے والا۔ گرے ایک حقیقی شاعر کا دل و دماغ رکھنے والی صفات کے ساتھ اپنے زمانہ میں تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ بلند مرتبہ مطالعوں کے ذریعہ سے ان صفات کو برقرار اور محفوظ رکھنے کے باوجود وہ نہ اُن کو ظاہر کر سکا اور نہ اُن سے مسرت حاصل کر سکا۔ ایک شگفتہ ماحول کا عدم اور معاصرین کی غیر ہمدردانہ روش اسے مایوس کئے دیتی تھی۔ اگر گرے اسی سال پیدا ہوتا جس سال ملٹن پیدا ہوا تھا یا اس وقت پیدا ہوتا جب کہ برنس پیدا ہوا تھا تو اس کی حیثیت بالکل مختلف ہوتی۔ وہ شخص جس کی پیدائش ۱۶۰۸ء میں ہوئی ہو، عہدِ الزبتھ کے ادبی میلان کی شاعرانہ وسعتوں سے بہرہ مند ہو سکتا تھا۔ وہ شخص جس کی پیدائش ۱۷۵۹ء میں ہوئی ہو۔ یورپ کی ان انسانی ذہنیتوں کے احیا سے فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ جس کا ایک زبردست اظہار انقلاب فرانس تھا۔ گرے کا تیز اور چالاک نوجوان دوست، بونسٹٹن، گرے کی طبیعت کے ناقابل تخلیق ہونے کا سبب، اس کا عشق نہ کرنا قرار دیتا ہے۔ بونسٹٹن نے خود عشق کیا، اس کی شادی ہوئی اور بچے بھی پیدا ہوئے تاہم سینٹ بیو کہتا ہے کہ پچاس سال کی عمر میں ۱۷۸۹ء کے واقعات کے باعث وہ تیس سال کے لئے چونکا اور دوبارہ جوان ہو گیا۔ وہ خود بوڑھا ہونے کے لئے جوانی کو الوداع کہہ رہا تھا اور ہمارے جیسا غمناک اور پست ہو گیا تھا۔ جس وقت انقلاب فرانس کی ابتدا ہوئی اگر گرے برنس کی طرح ٹھیک بیس سال کا ہوتا تو غالباً کثرت کے ساتھ اشعار کہتا۔ اور شگفتگی ظاہر کر سکتا ان قابلیتوں کے باوجود جو اس کو حاصل تھیں، وہ ایک ایسا انسان تھا جو بے وقت پیدا ہوا، یا ایک ایسا انسان جس کی قوتوں کی کامل نشو نما

اس وقت ناممکن تھی۔ یہی بات اس کے زبردست معاصر ٹیلر مصنف "انالوجی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے ایک مذہبی فضا میں جو شعری فضا سے قریب تر ہوتی ہے بٹلر اپنی فطرت کے عطیہ کے باعث مذہبی اشیا کے متعلق گہرا اور حقیقی عقائد قایم کرنے کے لئے مجبور کردیا گیا تھا۔ اس چیز کی طرف اس کے معاصرین کی توجہ نہیں تھی۔ اس وجہ سے بٹلر میں گرے کی کی طرح ایک عدم اطمینان، ایک پستی "زیادہ کام اور تکان، زیادہ ناکامی اور دماغی پریشانی بھی" پیدا ہوگئی تھی۔ اس زمانہ میں شاعری کے لئے ایک قسم کی باد سموم چل رہی تھی جس میں نہ تو بٹلر شگفتہ ہو سکتا تھا اور نہ گرے۔ اس لئے انہوں نے کبھی زبان نہیں کھولی"۔

گرے کی شاعری کو اس زمانہ کے اثر سے جس میں اس نے زندگی بسر کی صرف مقدار ہی کی حیثیت سے نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ اس سے ایک حد تک اس کی نوعیت کو بھی متاثر ہونا پڑا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ گرے نے خود ڈریڈن کا کیونکر مرہون منت ہونا ظاہر کیا ہے۔ یعنی "اگر میرے اشعار میں کوئی خوبی ہے تو وہ میں نے اسی زبردست شاعر سے حاصل کی ہے"۔ یہ بالکل بیکار نہ تھا کہ وہ اس وقت پیدا ہوا جب کہ ڈریڈن نے بقول جانسن انگریزی شاعری کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ اور اینٹوں کی حالت میں پا کر سنگ مرمر کی حالت میں چھوڑا تھا"۔ یہ بالکل ہی بیکار نہ تھا کہ وہ عین اس وقت پیدا ہوا جب کہ پھر جانسن ہی کے قول کے مطابق انگریزی کان، پوپ کے اشعار کی شیرینی کے عادی ہو گئے تھے اور شاعری میں بھی بہت زیادہ وسعت ہوگئی تھی پوپ اور ڈریڈن کے لفظی انتخاب، ذہنیتوں، چالاکیوں اور تشخص میں سے گرے نے بہت کچھ حاصل کیا۔ گرے کی شاعری بہت مختصر ہے اور وہ مختصر بھی اس کے زمانہ کی غلطیوں سے آزاد نہیں۔ لہذا گرے کے دل اور دماغ کا پتہ چلانے کی خاطر اس کی زندگی اور خطوط سے مدد لینے کے لئے آگے بڑھنا جیسا کہ ہم نے کیا نہایت موزوں اور اہم تھا۔

بہرحال منصفانہ تنقید کے لئے یہ بات تشفی بخش تصفیہ کردیتی ہے۔ حقیقی شاعری اور ڈریڈن اور پوپ اور ان کے دبستان کی شاعری کا درمیانی فرق مختصراً یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے ذہنوں میں سوچی اور بنائی جاتی ہے۔ شاعری کی دونوں قسموں میں بڑا فرق ہے۔ وہ اپنے نہج زبان میں بے حد مختلف ہیں۔ جس طرح ورڈسورتھ نے ڈریڈن کے متعلق نہایت خوبی سے کہا ہے کہ ہماری اٹھارہویں صدی کی زبان شاعری ان اشخاص کی زبان ہے جو موضوع پر نظر رکھے بغیر شاعری کرتے ہیں۔ اور وہ ایک ایسی زبان ہے جو موضوع کو اسی طرح ظاہر کرتی ہے جیسا کہ نثر کی عام زبان کرتی ہے اور پھر اس کو فہم و تخیل کے لئے نہایت پھرتی اور چالاکی کے ساتھ ملبوس کرتی ہے۔ یہ عظیم الشان فن انتخاب الفاظ کہلاتا ہے۔ ہماری اٹھارہویں صدی کی شاعری کا ارتقا اسی طرح ذہنی ہے وہ ترقی فہم، اختلاف خیالات، قابلانہ رد و قدح اور مباحثات کے

ساتھ ترقی کرتا ہے۔ یہ شاعری اکثر فصاحت آمیز ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ ڈرائیڈن یا پوپ جیسے چالاک ماہرین کے قبضہ میں رہتی ہے۔ لیکن وہ ہم کو اشیا کی سطح سے نیچے تک نہیں لے جاتی اور نہ وہ ہمیں اس بات کے لئے اکساتی ہے کہ ہم اشیا کو ان کی حقیقت اور حسن کے پیرایہ میں دیکھیں۔ اس کے برخلاف حقیقی شاعری کی زبان ایک ایسے شخص کی زبان ہے جو موضوع پر نظر رکھ کر شاعری کرتا ہے اس کا ارتقا ایک ایسی چیز کا ارتقا ہے جو شاعر کے دل میں ڈالی گئی ہے اور جو فطرتاً اور ضروری طور پر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی اس قسم کا ارتقا بہ نسبت دوسرے کے زیادہ سادہ ہے اور زیادہ تشفی بخش ہے۔ یہی بات اسی طرح حقیقی زبانِ شاعری کے لئے بھی صحیح ہے۔ لیکن ان میں سے دونوں کا حاصل کرنا نہایت دقت طلب ہے۔ یہ صرف انہیں لوگوں کا کام ہے جن کی نسبت ایمرسن کہتا ہے کہ وہ ہستی کی انتہائی گہرائیوں میں زندہ رہتا ہے۔

گرے نے گولڈسمتھ کی نظم "ٹریولر" (مسافر) کی تعریف کی ہے۔ لیکن گولڈسمتھ نے اس کی تحقیر کی ہے اور نظم On the Alliance of Education and Government. میں ان الفاظ کی طرف اشارے کئے ہیں جن کو اس نے استعمال کیا تھا۔ اس کے جواب میں ہم خود گولڈسمتھ کی شاعری سے اٹھارہویں صدی کے زمانہ کی شاعری کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

"طوفان میں مسرت خیز صدائیں موجزن نہیں"

اس میں ہمارے نثر کے دور کا ٹھیک شاعرانہ انتخاب الفاظ ہے۔ بلیغ، پرتکلف اور شاعرانہ حیثیت سے قطعی باطل۔ اس کی جگہ حقیقی شاعری کا ایک مصرعہ رکھئے۔ "وحشی اور مغرور موجوں کے گہوارے میں"

یہ مصرعہ شیکسپیئر کا ہے۔ اس کے بعد اس کا سراسر باطل ہو جانا ظاہر ہو جاتا ہے۔

مسز کلگریو کی وفات پر ڈرائیڈن نے جو نظم لکھی تھی اس کے متعلق جانسن کہتا ہے کہ "بلاشبہ بہترین خطابیہ نظم ہے جس کی مثال ہماری زبان میں نہیں ملتی۔" اس پرزور پیشکش میں ڈرائیڈن جو کچھ کہنا چاہتا تھا اور جو کچھ دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ مسز کلگریو نہ صرف شاعری میں بلکہ نقاشی میں بھی بلند مرتبہ رکھتی تھی وہ اس طرح لکھتا ہے۔

"دوسری مملکت کی طرف اس نے اپنی حکومت بڑھائی
نقاشی کے لئے جو اس کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی ــــ
جو ایک وسیع صوبہ اور ایک دلکش شکار تھا۔
ایک مجلس ماتحتین مرتب کی گئی
(کیونکہ فاتحین مدافعت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے

ہرگز سطح ادعا نہیں کرتے۔"

اور شاعری کے صلہ میں اس نے تمام جاگیر کا دعویٰ کیا۔"

اس دبستان کی شاعری کے دماغی اور سطحی ارتقا کی تصویر اس سے بہتر نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس کی جگہ پنڈار کا یہ کلام رکھئے:۔

"ایک محفوظ وقت نہ توپی لیس فرزند ایکس کی قسمت میں تھا اور نہ دیوتا صورت کیا ڈمس کی قسمت میں۔ البتہ تمام فانی اشیا کے مقابلہ میں، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسرت کی انتہا حاصل کی اور سنہری ہوبافٹ الی موسیقی کی دیویوں کا گانا سنا۔ ایک نے ان کو جہاز پر سنا اور ایک نے سات دروازوں والے شہر تھیبس میں"

یہ ہے حقیقی شاعری کا ارتقاء۔

گرے کی پیداوار قلیل تھی۔ اور جیسا کہ ہم نے معلوم کیا ہے وہ قلیل ہی ہو سکتی تھی۔ جو کچھ اس نے تخلیق کی وہ انتخاب الفاظ کے لحاظ سے بھی عموماً خالص نہیں ہے اور نہ ارتقا کے لحاظ سے حقیقی ہے۔ تاہم خواہ کسی قسم کے نقائص کیوں نہ ہوں گرے یگانۂ روزگار ہے۔ یا کم از کم اپنے زمانہ میں (کیونکہ کالنس میں بھی اس قسم کی چند خوبیاں تھیں) یکتا ہے گرے نے خود کہا تھا کہ:۔ جو اسلوب میں نے اختیار کیا وہ اظہار کے لحاظ سے شدتِ اختصار تھا تاہم خالص، سہل الفہم، اور پرترنم۔ شاعری کے عہد زریں کے زبردست ماہرین کے کلام سے ہی نہیں بلکہ خود اس کے عام معاصرین کے کلام کے ساتھ مقابلہ کرنے سے ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ گرے کا کلام اسلوب کے لحاظ سے اس اعلیٰ رتبہ تک پہنچ چکا تھا جو اس کا مطمع نظر تھا۔ اس کے علاوہ اس کی نظم "ارتقائے شعریت" جیسا کارنامہ بھی کچھ کم نفیس اور اعلیٰ نہیں کہلایا جاسکتا +

سید محی الدین قادری زور

دوستی کیا ہے؟ ایک دنیائے بے پایاں! (رابرٹ برَوننگ)

ہم کہتے ہیں کہ ہم دوستوں کو انتخاب کریں گے لیکن دوست خود بخود منتخب ہو جاتے ہیں۔ (ایمرسن)

دوستی کی گفتگو ایسی ہے جیسے بلند آہنگی سے سوچا جائے (ایڈیسن)

دوستی ایک سایہ دار درخت ہے۔ (کالرج)

دوستی؟ دو قالب یک جان! (جورف دکس)

دوستی ... کی شادی ہے (والٹیر)

غزل

محبّت کارِ مردانِ خُدا معلُوم ہوتی ہے
یہ عزّت عزّتِ ہر دو سرا مَعلُوم ہوتی ہے

ابھی سے تنگ آ کر آرزو کے دمبدم شکوے
ابھی تو آرزو کی ابتدا مَعلُوم ہوتی ہے

خدا حافظ، دلِ بے صبرِ اُلفت کا خدا حافظ
تری اُلفت بہت صبر آزما مَعلُوم ہوتی ہے

نظر تو کر کہ اُسکی آن کیا عالم دکھاتی ہے
خبر تو ہو کہ اُسکی شان کیا مَعلُوم ہوتی ہے

مُرے شوقِ سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو
کسی کا جرم ہو اپنی خطا مَعلُوم ہوتی ہے

بس اب بیچارگی سے صلح کر لینی مناسب ہے
کہ اب بیچارگی اُسکی رضا مَعلُوم ہوتی ہے

مری گم گشتگی کیا دیکھتے ہو بلکہ یہ دیکھو
مری گم گشتگی کس کا پتا مَعلُوم ہوتی ہے

تمہاری بزم کو مامونِ دخلِ شرع پاتا ہُوں
تمہارے ساتھ مَینوشی روا مَعلُوم ہوتی ہے

وہ میری زیست جس سے ہر مسرّت کی توقع تھی
غمِ نا مختتم کا سلسلہ مَعلُوم ہوتی ہے

کبھی عالم کی ہستی اصل پر مبنی سمجھتا ہُوں
کبھی بالکل نمُودِ بے بِنا مَعلُوم ہوتی ہے

ضرُورت ہے کہ پھر کوئی بڑا انسان پیدا ہو
کہ پھر انسانیت بے دست و پا مَعلُوم ہوتی ہے

بس آزاد! اب وجودِ این و آں کا خاتمہ سمجھو
طبیعت دشمنِ ہر ما سوا مَعلُوم ہوتی ہے

حکیم آزاد انصاری

عشق

ہر انسان کا اولین اور اعلیٰ ترین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو چاہے وہ کچھ بھی نہ ہو یا اس سے بھی کم ہو، ایک کامل خدا رسیدہ ظاہر کرے۔ یہ جھوٹ بعض دفعہ سچ ہو جایا کرتا ہے۔ خود میرے دیکھتے دیکھتے کئی وہ جو محض زبان کے صوفی تھے آخر کار کسی حد تک نگاہ کے اور کسی بے معلوم حد تک دل کے صوفی بن گئے۔ جو لوگ عبادت کو اچھّا خیال کرتے ہیں اُن سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات محض دکھلاوے کی عبادت آخر کار حضورِ قلب والی عبادت کے درجے کو پہنچ گئی۔ علاوہ بغاوت کے زندگی کی بنیاد زیادہ تر دھوکے پر ہے اور جو شخص اپنے آپ کو نیک ہونے کا دھوکا نہیں دیتا وہ بڑے اور مہلک دھوکے میں گرفتار ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں راقم سطور بھی عرصہ سے مبتلا ہے۔ زبانی زبانی مدت ہوئی کہ اچھے اور بُرے کی سرحد سے گزر چکا بلکہ اب تو وہ بچپن کا جغرافیہ جس میں نیک و بد کے بر اعظم تھے بالکل محو ہو چکا ہے۔ وہ کاسۂ گدائی بھی جس کا نام صوفیا نے تسلیم رکھا ہے عرصہ سے ٹوٹ چکا۔ اپنے آپ کو ایک کے ساتھ ایک ہو کر اتنی دفعہ محویت کا عالم طاری دیکھا ہے کہ وہ پھٹی پرانی گدڑی جس کا نام عرفان ہے اب میرے کسی کام کی نہیں کیونکہ دنیا اور دنیا کے ساتھ عاقبت سدھار چکیں مگر

اس کے بال، اس کی آنکھیں!!

ہر انسان کا کم سے کم حق یہ ہے کہ ایک پوری مکمل کائنات ازل سے ابد تک محض اس کی مرضی کے تابع ہو۔ بدترین کفر یہ ہے کہ انسان کو انسان ہی رہنا ہے خدا نہیں بننا۔ کیونکہ اس اعتقاد میں دوئی کی جھلک ہے۔ وہ سچّا حقیقی خدا جو بشر کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کیا وہ اتنا عاجز ہے یا کمزور ہے کہ باوجود کوشش کے لگاتار کوشش کے ہم سے ملنے میں کامیاب نہیں ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ وہ ضرور ملے گا مگر ملے گا تو کس سے؟ انسان سے؟ ہرگز نہیں۔ خدا خدا سے ہی ملتا ہے۔ اور اس لئے ہر انسان کا یہ حق ضرور پورا ہوگا۔ وہ فرض، یہ حق مگر ہائے

اس کی آنکھیں اس کے بال!!

پیاری کیا تجھے یاد ہے کہ ایک شام ایک آنکھوں والی نے تیری آنکھوں کی تعریف کی تھی۔ وہ سچ جو خدا کے لئے میں ہرگز بولنے کے لئے تیار نہیں ہوں تیری آنکھوں کے تصدق ضرور میرے قلم سے نکلیگا تو نے مجھے دیکھا ہے میں نے خدا کو نہیں دیکھا۔ سچ تیرے لئے ہے جھوٹ جسقدر بول سکوں وہ خدا کیلئے ان خیالوں میں تھا کہ وہ احسان کی پری، نیند، جو مجھے بہت کم ممنون کرتی ہے آئی چھائی بیر ہو گیا خواب میں

میرا حق مجھے ملا، یعنی ازل سے ابد تک مکمل کائنات میری مرضی کے تابع ہوگئی۔ کس قدر جلدی اس کائنات کو تیرے لئے میں نے آراستہ کیا۔ سوائے تیرے ماں باپ کے اور ہر ایک چیز کو شروع سے اس طرح بدل ڈالا کہ چمن کا پتہ پتہ تیرے آنے کی خوشخبری دینے کو اپنا نصب العین سمجھے۔ ستارے تیرے لئے چمکے، بادل تیرے لئے برسے، ہوائیں تیرے لئے چلیں، وہ تمام کام جو ایک بے پروا خدا سے پورے نہ ہوتے تھے وہ ایک ایک کر کے تکمیل کو پہنچائے تاکہ دنیا تیرے لایق بنے۔ اس کائنات سے جس کا کہ میں خالق تھا مجھے سوائے ایک چیز کے اور کچھ درکار نہ تھا۔ وہ چیز کیا تھی؟ صرف یاد۔ تیری شرمگین آنکھوں کی محجوب محبوب نگاہوں کی یاد۔ اسی یاد کو میں نے کس قدر پیار سے دل میں سجایا۔ تجھے کیا ہے؟ صرف آشنا حُسن ہے او خدا ساز آنکھوں والی تیرا بھلا ہو۔ یہ یاد کی دولت اپنے لئے وقف کر کے اس کائنات کو پھر نہیں دیکھا۔ سب کچھ تیرے لائق بن چکا تھا مگر ایک نقص باقی تھا۔ وہ مَیں تھا۔ خدا ہو کر بھی ان آنکھوں کے قابل نہ بنا مگر دیکھ عشق کا کرشمہ۔ چونکہ میرے ہونے سے کائنات تیرے قابل نہ تھی آنکھ نہ کھلی اور میں مرگیا۔

"فلک پیما"

مسرور انسان

میری روح غربت کے اطمینان سے مسرور اور اپنے بوسیدہ لباس میں محفوظ ہے اعمال صالح مجھے خوش رکھتے ہیں۔ میں کبھی "قسمت" کے بیگانۂ وفا سمندر پر سفر نہیں کرتا۔ اگر طوفان آئے اور فضا تیرہ و تار ہو جائے۔ مستول ٹوٹ جائیں اور ہر طرف تباہی کے آثار نمودار ہوں، تو اس وقت حریص تاجر اپنے ناجائز منافع کی امید سے مایوس ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا سرمایہ خوفناک آندھیوں اور خشمناک لہروں کے گہوارے میں عین سمندر کی گہرائی کے اندر ہچکولے لے رہا ہوتا ہے،

"میرے لئے یہ سب کچھ ہیچ ہے"

تقدیر کے تھپیڑوں سے اور نقصان کے خوف سے مامون و مصئون، میں اپنے چھوٹے سے سفینہ میں سمندر کے شور و غوغا اور سیلاب بے پناہ کو حقیر و بے مایہ سمجھتا ہوا سفر کرتا ہوں، اور خوشگوار ہواؤں کا ہم عناں ہو کر آسمان کی بلندیوں پر نجوم سماوی کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیتا ہوں،

ڈرائیڈن (سہیل)

نفسیّات

نثارِ غمزہ و ناز و ادائے یار ہوئے
جب اہلِ دل ہیں کہیں جا کے ہم شمار ہوئے

طوافِ کعبۂ حیرت نے پیس پیس دیا
حریمِ ناز کے ہم مٹ کے راز دار ہوئے

تصوّرِ رُخِ گلگوں کا دیکھئے اعجاز
وہی جو داغ تھے سینے کے لالہ زار ہوئے

نگاہِ شوق کا پڑنا تھا حُسنِ سادہ پر
ادائیں آپ سے آپ آگئیں سنگار ہوئے

نگاہِ لُطف ہے حُسنِ غیور کی جن پر
وہ پہلے اپنی ہی نظروں میں باوقار ہوئے

کیا نہ ہمّتِ عالی نے اعترافِ شکست
ہم اپنی ہٹ سے زمانے میں کامگار ہوئے

تخیّلاتِ حزیںؔ ہیں غلافِ کعبۂ دل
تمہاری خیر نہیں گریہ داغدار ہوئے

ابنِ حزیںؔ

میکبتھ

شاہ ڈنکن والیٔ سکاٹ لینڈ کی فوج کا بہادر جرنیل میکبتھ (جو بادشاہ کا چچازاد بھائی بھی ہے) اور لیڈی میکبتھ اپنے قلعے کے ایک شاندار کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

میکبتھ نے کہا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئیے کہ اس نے ہمارے بادشاہ کو اس سخت بیماری سے نجات دی خدا اس کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر قائم رکھے، وہ کیسا مہربان اور نیک دل بادشاہ ہے۔ مجھے تو امید نہیں کہ اس کے بجائے اگر یہاں کوئی اور حکمران ہوتا تو رعایا ایسے امن اور خوش حالی سے زندگی بسر کرتی اور سلطنت کا انتظام اس خوش اسلوبی سے انجام پاتا۔"

لیڈی میکبتھ نے مسکرا کر کہا "میرے خیال میں تو آپ اس سے کہیں زیادہ حکمرانی کے لائق ہیں۔ اگر آپ بادشاہ ہوں تو اس سے بھی اچھّی طرح حکومت کریں۔ کیا آپ اس سے بڑھ کر بہادر اور جری نہیں ہیں۔ اور کیا آپ کے خوبصورت چہرے پر تاج شاہی اس سے زیادہ زیب نہیں دیتا۔ کیا صرف اس لئے کہ وہ ایک حکمران کے گھر میں پیدا ہؤا وہ بادشاہ ہے اور آپ جو درحقیقت بادشاہت کے لائق ہیں اسکے ماتحت ہیں"۔

اس کا سلسلۂ گفتگو ابھی جاری تھا کہ ایک شخص نے آ کر میکبتھ سے کہا کہ "بادشاہ سلامت نے حضور کو ایک نہایت ضروری کام کے لئے طلب فرمایا ہے جس قدر جلد ممکن ہو وہاں پہنچیئے"۔

شاہ سکاٹ لینڈ دربار میں تخت پر جلوہ افسروز تھا۔ اور تمام اعیان سلطنت اسکے گرد جمع تھے۔ میکبتھ دربار میں داخل ہؤا تو بادشاہ نے نہایت عزت سے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اور کہا کہ "تمہیں اس لئے بلایا گیا ہے کہ علاقہ کاڈر کا حاکم حکومت سے باغی ہوگیا ہے۔ اور اس نے اپنے علاقہ میں بہت شورش برپا کر رکھی ہے۔ تم آج ہی تمام فوج کو تیار ہونے کا حکم دے دو اور کل صبح تم اور بنکو (دوسرا جرنیل) اس کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو جاؤ"۔ میکبتھ اور بنکو آداب بجالا کر رخصت ہوئے۔ بادشاہ نے کہا "خدا تمہارا مددگار ہو"۔

دوسری صبح دونوں جرنیل مع فوجوں کے کاڈر کی طرف روانہ ہو گئے

لڑائی کو شروع ہوئے آج تیسرا روز ہے۔ اس وقت نہایت زور و شور سے جنگ ہو رہی ہے میکبتھ تلوار لے کر تنہا دشمن کی فوج میں گھس جاتا ہے اور اُن کی صفیں کی صفیں الٹ دیتا ہے۔ تلوار چلاتے چلاتے اس کے بازو شل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کی پیشانی پر ایک بل نہیں آتا۔ دوسری طرف بنکو بھی نہایت بہادری سے لڑ رہا ہے اپنے بہادر افسروں کی طرف دیکھ کر فوج کے حوصلے اور زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ مقابل کی فوج بھی نہایت مردانگی سے مقابلہ کر رہی ہے۔

عجیب وحشت خیز سماں ہے۔ آسمان پر تیرہ و تار بادل چھا رہے ہیں اور زمین پر ہر طرف خون ہی خون نظر آتا ہے ان نوجوانوں کے سر جنہیں ان کی ماؤں نے ہزاروں ارمانوں اور حد درجہ جانفشانیوں سے پرورش کیا ہوگا آن کی آن میں تن سے جدا ہو کر گرتے اور پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ ہزاروں خونچکاں تلواریں ایک ہی دفعہ بلند ہو ہو کر عجیب خوفناک منظر پیش کر رہی ہیں۔ مقتولوں کے گھوڑے لاشوں کو روندتے، اور نہایت کریہہ آواز سے ہنہناتے ہوئے جنگل کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔

دس بجے کے قریب کاڈر کا حاکم گرفتار کر لیا گیا۔ اپنے سردار کو دشمن کی قید میں دیکھ کر فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور تمام فوج میدان جنگ سے بھاگ نکلی۔ اسی وقت ایک افسر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا گیا تاکہ جلد اسے یہ خوشخبری سنائے

لڑائی کے خاتمہ پر میدان جنگ سے کچھ فاصلے پر تین کریہہ المنظر چڑیلیں نمودار ہوئیں جو اپنے چہروں پر سیاہی اور تیل کا لیپ کئے ہوئے تھیں۔ اور ان کے موٹے ہونٹ کانوں کے قریب پہنچ کر ختم ہوتے تھے۔ ان کی گول گول آنکھوں کی پتلیاں خون کے مانند سرخ تھیں۔ اور سر کی جلد کی رنگت گہری گلابی تھی۔ دونوں کانوں کی لووں کے نیچے ایک ایک لمبی لٹ لٹک رہی تھی۔

پہلی چڑیل ۔کیوں ری خون کی لال لکیر تلے تو کیا کر رہی تھی۔

دوسری ۔چوہے کی منگنی، مینڈک کی تھوک پوچھنے والی کا منہ اور بھی کالا۔ ملاح کی بیوی کی جھولی میں اخروٹ تھے میں نے کہا مجھے دے دے، وہ کہنے لگی چل بڑھیا یہاں سے دفع ہو۔ اب میں اسے جھڑکنے کا مزہ چکھاؤں گی اس کا شوہر جہاز پر سوار ہو کر سمندر پار گیا ہے۔ میں چھلنی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے جاؤں گی اور پھر میں کروں گی، میں کروں گی میں کروں گی۔

پہلی ۔ خون کا قطرہ، غلاظت کی دھار مینڈک کی ہڈی سمندر پار،

دوسری - میں گدھے کی مونچھ کو سنوار سنوار کر اُسکے شوہر کو گھاس کے تنکے کی طرح سکھا دوں گی۔

تیسری - چپ وہ دیکھو سامنے سے میکبتھ آرہا ہے۔

میکبتھ اور بنکو باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے جہاں وہ کھڑی تھیں - ایک لحظہ کے لئے وہ ان کی بھیانک شکلیں دیکھ کر ڈر گئے - میکبتھ نے اُن سے کہا تم کون ہو، بتاؤ تم کون ہو - اور ہماری طرف دیدے پھاڑے کیوں گھور رہی ہو" اُن میں سے ایک بولی "مرحبا اے کاڈر کے حاکم" دوسری نے کہا "مرحبا اے ہمارے آیندہ بادشاہ" میکبتھ یہ سُن کر حیرت سے بنکو کا منہ دیکھنے اور مری ہوئی آواز میں بولا - بنکو سنتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہیں - بھلا میں کاڈر کا حاکم کیسے ہو سکتا ہُوں - کاڈر کا حاکم تو زندہ سلامت موجود ہے - اور دوسری بات تو (آہ بھر کے) بالکل ہی ناممکن ہے" بنکو نے کہا "مہمل بکواس کر رہی ہیں اور کیا کہتی ہیں - ٹھہرو میں ان سے بات کرتا ہُوں" یہ کہہ کر وہ ان سے مخاطب ہوا اور بولا "اُے خبیث ہستیو! اگر واقعی تم کچھ جانتی ہو تو مجھے میرے مستقبل کی نسبت کچھ بتاؤ" وہ بولیں "تم میکبتھ سے کم، مگر اس سے زیادہ خوش، اور اس سے کم مگر زیادہ با اقتدار ہو گے" بنکو نے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا" وہ بولیں "تمہاری اولاد بادشاہ ہو گی"

اس کے بعد زمین سے ایک غبار سا اٹھا اور وہ غائب ہو گئیں - میکبتھ نے کہا "افسوس وہ چلی گئیں - کاش کہ تھوڑی دیر اور ٹھہرتیں اور میں اُن سے کچھ اور پوچھ لیتا" پھر اُسے اپنی بیوی کی باتیں یاد آگئیں اور وہ سوچنے لگا کہ کیا تعجب ہے کہ میں واقعی بادشاہ ہو جاؤں۔

بنکو نے چڑیلوں کی باتوں کو دل میں زیادہ اہمیت نہ دی - وہ وہیں کھڑے تھے کہ وہ آدمی جو بادشاہ کے پاس خوشخبری لے کر گیا تھا واپس آگیا اور کہنے لگا بادشاہ سلامت آپ کی کامیابی کی خبر سنکر بے حد خوش ہوئے ہیں (میکبتھ سے مخاطب ہو کر) جب انہوں نے سنا کہ آپ نے کس طرح شجاعانہ مقابلہ کیا تو وہ آپ پر بہت ہی خوش ہوئے - وہ آپ دونوں کا نہایت بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں - اور انہوں نے آپ کو یہ پیغام دیا ہے کہ آج سے آپ کاڈر کے حاکم مقرر ہوئے ہیں۔

میکبتھ اور بنکو یہ سن کر نہایت حیران ہوئے کہ کس طرح چڑیلوں کی ایک بات بالکل ٹھیک نکلی - میکبتھ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا - پھر یکایک کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب بادشاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میکبتھ اور بنکو جب بادشاہ کے حضور میں پہنچے تو بادشاہ نے انہیں گلے لگا لیا۔ اور تمام دربار کے سامنے ان کی نسبت تحسین آمیز کلمات کہے۔ "میکبتھ سے کہا" کہ میں تمہارے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کاش وہ اتنا ہوتا کہ میں تمہیں اس کا اجر دے سکتا۔

میکبتھ بولا "یہ حضور کی عنایت ہے ورنہ میں نے تو کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا۔ صرف اپنا فرض ادا کیا ہے"! اسکے بعد ایک شخص نے آکر بتایا کہ کاڈر کے حاکم کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ اس نے نہایت بہادری سے جان دی۔ مرتے دم تک اسکے لبوں پر تبسم تھا

بادشاہ نے کہا "آہ مجھے اس پر کس قدر اعتماد تھا۔ میں یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ ایسا غدار ثابت ہوگا۔ کاش دنیا میں کوئی ایسا فن بھی ہوتا جس سے انسان اندرونی جذبات کو چہرے پر سے پڑھ سکتا۔

میکبتھ نے بادشاہ کو دعوت دی کہ وہ آج رات اس کے ہاں کھانا کھائے۔ بادشاہ نے نہایت خوشی سے اسکی دعوت قبول کی۔ میکبتھ اپنے قلعے کی طرف روانہ ہوا کہ اپنی بیوی کو بادشاہ کے آنے کی اطلاع دے۔

اس نے وہاں پہنچ کر اپنی بیوی کو تمام واقعات کہہ سنائے اور بتایا کہ آج رات بادشاہ ہمارے گھر آرہا ہے۔

لیڈی میکبتھ ۔ جس طرح چڑیلوں کی پہلی بات سچ ہوئی، دوسری بھی اسی طرح ہو کر رہے گی۔

میکبتھ ۔ وہ کیونکر سچ ہو سکتی ہے

لیڈی میکبتھ ۔ میں سچ کر کے دکھاؤں گی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ بادشاہ یہاں سے جائے گا کب"؟

میکبتھ ۔ "کل صبح"

لیڈی میکبتھ ۔ وہ اب یہاں سے کبھی نہیں جائے گا۔

میکبتھ (کانپ کر) تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟

لیڈی میکبتھ ۔ "یہی کہ چند دنوں تک میکبتھ کے سر پر تاج شاہی رکھا ہو۔ تم سکاٹ لینڈ کے بادشاہ کہلاؤ اور مجھے اس ملک کی ملکہ کا لقب ملے"

میکبتھ ۔ "اس نے مجھ پر بے انتہا احسان کئے ہیں"

لیڈی میکبتھ ۔ اس کا فرض تھا آپ نے بھی تو نہایت وفاداری سے اس کی خدمت کی۔ بس اب آپ کو میری بات ماننی ہوگی۔ آج رات اس کا کام تمام کر دیجئے"

قلعے کی دوسری طرف کچھ شور سا ہوا۔ میکبتھ نے کہا بادشاہ آرہا ہے۔ آؤ اس کے استقبال کو چلیں"

میریا بولی "آپ جائیے، میں بھی آتی ہُوں"۔

بادشاہ اپنے دونوں بیٹوں، اور بہت سے امیروں، میکڈف۔ بنکو۔ راس اور لن آکس وغیرہ کے ہمراہ قلعے میں داخل ہُوا۔ ایک شاندار کمرے میں میکبتھ نے سب کو بٹھایا۔

جب لیڈی میکبتھ کمرے میں داخل ہوئی تو بادشاہ نے اپنے ہمراہیوں سے کہا "دیکھو ہماری قابل احترام میزبان آ رہی ہیں ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوجاؤ۔ سب نے تعمیل کی۔ لیڈی جھک کر کورنش بجالائی اور یہ کہہ کر "خدا حضور کی عمر دراز کرے" ایک طرف کو منہ پھیر کر مسکرا دی۔ بادشاہ نے کہا اس قلعے کی فضا نہایت خوشگوار ہے۔ میرا دل یہاں آکر بہت ہی خوش ہُوا۔

رات کو جب بادشاہ سونے کے کمرے میں چلا گیا تو میکبتھ اور اس کی بیوی ایک دفعہ پھر تنہائی میں ملے۔ میکبتھ نے کہا شاید تم بادشاہ سے ملنے کے بعد اپنا ارادہ بدل چکی ہوگی۔ دیکھو وہ ہمارے ساتھ کس قدر مہربانی کے ساتھ پیش آتا ہے وہ آج یہاں آکر حد درجہ مسرور ہوا ہے۔ میں جب اس کے سامنے جاتا ہُوں تو میرے سارے ارادے خاک میں مل جاتے ہیں۔ کس کا جی چاہتا ہے کہ موسم بہار کے شگفتہ پھول کو شاخ سے توڑ کر پاؤں میں مسل کر خاک میں ملا دے۔ کوئی شخص جس کے پہلو میں دل کی بجائے پتھر کا ٹکڑا ہو وہی ایسا کر سکتا ہے"۔

لیڈی میکبتھ۔ میرے ارادے کو دنیا کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی نہیں بدل سکتی۔ اور میں اپنی زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کو اخلاقیات پر قربان کر دینا حد درجہ کی بزدلی سمجھتی ہُوں۔ میں سنگدل ہی سہی میں ایسی سنگدلی کو مبارک خیال کرتی ہُوں جس کے بعد مجھے عمر بھر کی حکومت اور عزت نصیب ہوجائے۔ آپ کیوں بار بار اپنا ارادہ بدل دیتے ہیں۔ ہمت کیجیے صرف تھوڑی سی ہمت کرنے سے آپ کو دائمی راحت اور شادمانی حاصل ہو جائیگی"۔

میکبتھ۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہُوں لیکن مجھے اسے قتل کرنے کی جرأت نہیں پڑتی"۔

میکبتھ کے دل میں اس وقت نیکی اور بدی کی زبردست کشمکش ہو رہی تھی۔ نیکی کا زبردست ہاتھ اُسے روکتا تھا اور بدی کی مقناطیسی کشش اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

وہ بڑی دیر تک سرنگوں ہو کر کچھ سوچتا رہا۔ آخر اُس نے سر اٹھا کر کہا "تم جو کچھ کہو گی میں اس پر عمل کروں گا۔ خدا مجھے اس کی توفیق دے"۔

لیڈی میکبتھ کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے کہا "اچھا اب باہر جاکر آپ دیکھ آئیے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ میرے خیال میں تو اب آدھی رات گزر چکی ہوگی۔ آپکے آنے تک میں سب کچھ تیار کر رکھوں گی۔ پھر آپ آکر کام کر لیجئے"

میکبتھ اپنے کمرے سے نکل کر ان تمام کمروں کے گرد پھرا جن میں لوگ سو رہے تھے۔ ہر طرف ایک بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں دور سے اُلو کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اُسے سامنے سے بنکو آتا ہوا دکھائی دیا۔ جب وہ قریب آیا تو میکبتھ نے کہا "بنکو تم اس وقت تک جاگ رہے ہو"

بنکو۔ ہاں جناب! معلوم نہیں آج مجھے کیوں نیند نہیں آتی بار بار وحشت انگیز خیالات میرے دل میں آتے ہیں۔ آج کی رات نہایت خوفناک ہے"

میکبتھ۔" رات کتنی گزر چکی ہوگی"

بنکو۔" چاند غروب ہو رہا ہے آدھی رات ہو چکی ہے۔ آپ اب کہاں جارہے ہیں"

میکبتھ۔"میں سونے کے لئے اپنے بستر پر جارہا ہوں" یہ کہہ کر وہ آگے چلدیا اور جلد جلد میری کے کمرے میں پہنچا۔

لیڈی میکبتھ"کیوں کیا حال ہے"

میکبتھ" سب سوئے پڑے ہیں"

لیڈی میکبتھ" آج سب نے خوب شراب پی ہے"

میکبتھ۔" کیا تم اپنا کام کر چکی ہو"

لیڈی میکبتھ۔ ہاں میں ان دونوں محافظوں کی تلواریں جو بادشاہ کے کمرے میں سوئے پڑے ہیں اُنکے سرہانوں سے اٹھاکر بادشاہ کے پلنگ کے پاس رکھ آئی ہوں۔ اگر سوتے میں اس کی شکل میرے باپ سے نہ ملتی ہوتی تو میں نے خود ہی اسکا کام تمام کر دیا ہوتا۔ اب آپ جلد جائیے اور کام کر چکنے کے بعد دونوں محافظوں کے ہاتھ اور چہرے خون سے رنگ آئیے"

میکبتھ۔ بہت اچھا۔ لیکن پیاس کے مارے میرا گلا خشک ہو رہا ہے، مجھے پانی پلادو"

پانی پی کر میکبتھ بادشاہ کے کمرے کی طرف چلا، اس کا چہرہ زعفران کی طرح زرد ہوگیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں اپنی بیوی کی آنکھوں سے ملیں۔ وہ پھر سنبھل گیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بادشاہ کے کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ اُلو کے بولنے کی آواز بدستور آرہی تھی اور ہوا اس طرح چیخ رہی تھی جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔

میکبتھ کا دل اور زیادہ زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ دروازے پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹکا لیکن اُسے ایسا معلوم ہوا

کہ اسکی بیوی کی نظریں تاریکی کے پردوں کو چیر کر اُسے دیکھ رہی ہیں۔ وہ یہ خیال کرکے کہ میریا اُسے بزدل سمجھے گی فوراً کمرے میں داخل ہوگیا اسکے دل کی دھڑکن اور زیادہ تیز ہوگئی اور اُسے خوف ہونے لگا کہ کہیں بادشاہ اس آواز سے بیدار نہ ہوجائے ایک ہاتھ سے اُس نے اپنے دل کو سنبھالا اور ایک ہاتھ میں تلوار پکڑ کر بادشاہ کے سرہانے جا کھڑا ہوا۔ اسکا تمام جسم کانپ رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ گر جائے۔ دفعتہً اس کے کانوں میں میریا کے یہ الفاظ گونجے "تھوڑی سی ہمت کیجئے۔ بس تھوڑی سی ہمت کرنے سے آپ کو دائمی راحت اور شادمانی حاصل ہوجائیگی"۔ اس نے ایک زور کا ہاتھ مارا بادشاہ کا سر تن سے جدا ہوگیا۔ کمرے کی شمع یکایک زور سے بھڑک اٹھی اور بجھ گئی۔

میکبتھ تلوار ہاتھ میں لئے باہر نکل آیا اور گرتا پڑتا میریا کے کمرے میں پہنچا اور بولا آہ میں نے کیا کردیا۔ چاروں طرف سے عجیب آوازیں آ آکر مجھے ملامت کررہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں "میکبتھ نے نیند کو قتل کردیا آہ اس میٹھی نیند کو جو دن بھر کی کلفتوں اور غم کو بھلا دیتی ہے۔ اب میکبتھ تمام عمر نہیں سوئے گا"

لیڈی میکبتھ۔ (گھبرا کر) لے ہے۔ آپ یہ تلوار کیوں ہاتھ میں لے آئے۔ جائیے اسے وہیں رکھ آئیے۔ اور کیا محافظوں کے چہرے خون سے رنگ دیئے آپنے؟

میکبتھ۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ آہ میں وہ مہیب منظر پھر کیونکر دیکھوں گا"

لیڈی میکبتھ نے کہا آپ خود نہ جائیے میں خود ہی سب کچھ کرلوں گی۔ میکبتھ بولا شمع بجھ گئی ہے اور کمرے میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ لیڈی میکبتھ نے ایک مشعل ہاتھ میں لی اور تلوار لے کر کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ واپس آگئی اور بولی میں نے اُن کے چہرے اور ہاتھ خون سے رنگ دیئے ہیں۔ وہ شراب کے نشہ میں مدہوش پڑے ہیں۔ انہیں کیا خبر ہے کہ صبح ہماری موت آنے والی ہے آئیے اب ہم سونے کے کمرے میں چلیں وہاں چلکر ہاتھوں پر سے خون دھولیں گے۔ صبح ہورہی ہے اگر کوئی جاگ اٹھا تو راز فاش ہوجائے گا۔ وہ دونوں سونے کے کمرے میں چلے گئے۔

~~~

صبح جب بادشاہ مردہ پایا گیا تو تمام قلعے میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ ایک ایک آدمی اپنے سردلعزیز بادشاہ کی موت پر کفِ افسوس مل رہا تھا میکبتھ اور لیڈی میکبتھ بھی ان سب کے غم میں شریک تھے۔ لیڈی میکبتھ کو تین مرتبہ غش آچکا تھا۔ جب اُسے ہوش آتا تو کہتی۔ ہائے ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ بادشاہ ہمارے ہی گھر میں مرتا"۔ میکبتھ نے جب دیکھا کہ محافظوں کے ہاتھ خون سے رنگے ہوتے ہیں تو اس سے نہ رہا گیا۔ فوراً اپنے عزیز بادشاہ کے قاتلوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔
~~~

بادشاہ کے بیٹوں نے جب اپنے باپ کو مرے ہوئے دیکھا تو دنیا اُن کی آنکھوں میں تاریک ہوگئی بڑے بھائی مسلکم نے چھوٹے بھائی سے کہا "ہم خوب جانتے ہیں کہ بادشاہ کس لئے قتل کیا گیا ہے۔ اب ہمیں فوراً یہاں سے چلے جانا چاہئے ورنہ ہماری بھی یہی گت بنے گی لیکن ہمیں الگ الگ ملکوں میں جانا چاہئے۔ اکٹھے رہنے میں ہم دونوں کی جان خطرے میں رہے گی۔ آؤ ہم ابھی یہاں سے چلدیں۔"

وہ دونوں اسی وقت قلعے سے باہر نکل گئے۔

ان کے فرار ہونے سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ انہوں نے خود ہی اپنے باپ کو قتل کرایا ہے۔

میکبتھ سکاٹ لینڈ کا بادشاہ ہوگیا تمام ملک میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ ڈنکن کے بیٹے اُسے قتل کرا کر بھاگ گئے۔

میکبتھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنکو اس کے راز سے آگاہ ہے۔ چنانچہ اسے یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح بنکو کو مروا ڈالے اور ساتھ ہی اس کے بیٹے کو بھی۔ تاکہ چڑیلوں کی تیسری بات سچ نہ ہونے پائے۔ ایک دن اُس نے اپنے تمام امرا کی دعوت کی اور بنکو سے کہا کہ ہماری دعوت میں ضرور شریک ہونا۔ بنکو بولا "حضور میں ضرور آؤں گا۔" جب بنکو رخصت ہوا تو ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا "کیا وہ آگئے؟" وہ بولا "ہاں حضور آگئے ہیں۔" بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس بھیجدو۔" وہ آدمی باہر چلا گیا تین قاتل اندر داخل ہوئے اور آداب بجا لا کر ایک طرف کو کھڑے ہوگئے۔

بادشاہ نے آہستہ آہستہ اُن سے کچھ باتیں کیں اور وہ یہ کہہ کر "ہم حضور کے حکم کی تعمیل کریں گے" باہر نکل گئے۔

شام کے وقت بنکو اور اس کا بیٹا بادشاہ کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ بنکو نے کہا "آج کی رات نہایت تاریک ہوگی ہمیں گھوڑوں کو تیز چلانا چاہئے تاکہ جلد ہی وہاں پہنچ جائیں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا گھوڑا اور زیادہ تیز کردیا۔ اس کے بیٹے نے بھی اسکی تقلید کی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ سڑک کے ایک ایسے حصے میں پہنچے جس کے دونوں طرف گھنے درخت ہونے کی وجہ سے تاریکی اور بھی خوفناک ہوگئی تھی وہ اس میں داخل ہوئے ہی تھے کہ دفعتہً ایک درخت کے نیچے سے تین سائے نمودار ہوئے اور بنکو پر حملہ کر دیا۔ بنکو نے کہا "دغا۔ دغا۔ آہ مجھے مار ڈالا گیا۔ بیٹا بھاگ جاؤ شاید تم کبھی میرا بدلہ لے سکو۔" اس نے یہ کہہ کر جان دے دی اور اس کا بیٹا بھاگ گیا قاتلوں نے اُس کا تعاقب کیا لیکن وہ بہت جلد دور نکل چکا تھا آخر وہ مایوس ہوکر واپس آگئے۔

شاہی محل کے ایک کمرے میں سب مہمان جمع تھے وہ کھانا کھانے کے بعد شراب پی رہے تھے تینوں قاتل کمرے میں داخل ہوئے۔اور بادشاہ کو آہستہ سے سب کچھ بتا کر نکل گئے وہ چلے گئے تو بادشاہ نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر کہا "مجھے اس بات کا بہت ہی افسوس ہے کہ ہمارا عزیز دوست بنکو آج یہاں موجود نہیں۔لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہوگا۔ضرور اُسے کوئی مشکل پیش آگئی ہے۔جس کی وجہ سے وہ نہیں آسکا۔ یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی پر بیٹھنے کو تھا کہ اس نے دیکھا کہ بنکو کی روح کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اور اسکے سر سے خون کی دھاریں نکل کر اُسکے چہرے پر بہ رہی ہیں یہ دیکھ کر بادشاہ کا رنگ زرد ہوگیا۔ اور اس پر خوف و ہراس طاری ہوگیا۔اس نے بنکو کی روح کو مخاطب کرکے کہا۔ "کیا تو اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا؟ ارے مردود یہاں سے دفع ہوجا۔ تو یہاں کیونکر آگیا" مہمان حیرت سے بادشاہ کا منہ دیکھنے لگے۔ملکہ نے انہیں کہا صاحبو! تم اس کا ذرا بھی فکر نہ کرو بادشاہ کو یہ ایک بیماری ہے جس کا دورہ انہیں کبھی کبھی ہوجایا کرتا ہے۔

بادشاہ نے مہمانوں کو مخاطب کرکے کہا "کیا تمہیں یہ خوفناک نظارہ دکھائی نہیں دیتا۔ کیا تم اسے کرسی پر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ رہے ہو"

ملکہ گھبرا کر بولی "اب آپ لوگ تشریف لے جائیے اس وقت انہیں اکیلے چھوڑ دینا چاہئے۔سب مہمان بادشاہ کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے گھروں کو رخصت ہوئے۔تھوڑی دیر بعد بادشاہ پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

دوسرے روز بنکو کے دوستوں نے اس کی تلاش کی تو انہیں اس کی خون آلود لاش ملی۔کئی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اُسے بادشاہ ہی نے قتل کرایا ہے لیکن ڈر کے مارے کوئی یہ بات زبان پر نہیں لاسکتا تھا۔

مقتول بادشاہ ڈنکن کے دربار کا ایک امیر میکڈف میکبتھ کی تاجپوشی کے جشن میں شریک نہیں ہوا تھا اس لئے بادشاہ اس سے ناراض ہوگیا۔میکڈف کو پہلے بادشاہ سے دلی محبت تھی۔اس کا خیال تھا کہ میکبتھ ہی نے اس کو قتل کیا تھا۔اور میکبتھ چونکہ رعایا پر ظلم کررہا تھا۔اس لئے بھی وہ اس کے خلاف تھا۔

اچانک ایک دن میکبتھ کو اطلاع ملی کہ میکڈف انگلستان بھاگ گیا ہے۔بادشاہ جو پہلے ہی سے کسی موقعہ کی تلاش میں تھا یہ خبر سنکر غصہ سے لال پیلا ہوگیا۔اور حکم دیا کہ فوراً اس غدار کے بیوی بچوں کو تہ تیغ کردیا جائے۔اور اس کی تمام جاگیر پر حکومت کا قبضہ ہوجائے۔

لیڈی میکڈف اپنے قلعے کے ایک کمرہ میں بیٹھی تھی۔ اس کے پاس اُس کا ایک بیٹا جسکی عمر تقریباً چھ سال تھی، اور ایک اور امیر راس بیٹھے ہوئے تھے۔ لیڈی بے حد غمگین تھی اور میکڈف کی نسبت کہہ رہی تھی "ہائے وہ کتنا بے وفا نکلا مجھے اس سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ کہ وہ مجھے اس طرح چھوڑ کر چلا جائیگا۔ اُس نے ان ننھے ننھے بچوں کا خیال بھی نہ کیا۔ وہ کس قدر بے انصاف ہے جو مجھے بچوں کے جنجال میں پھنسا کر بھاگ گیا۔

راس نے کہا خاتون صاحبہ! آپ اسے اس قدر قصوروار نہ ٹھیرائیے۔ وہ ایک نہایت شریف آدمی ہے ضرور کسی مجبوری کی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے۔ اور مجھ سے زیادہ تو آپ خود ہی اُسے جانتی ہیں۔ یونہی اس وقت غصہ میں آکر ایسی باتیں کہہ رہی ہیں۔ میکڈف ہرگز ایسا آدمی نہیں کہ خواہ مخواہ کسی کو تکلیف پہنچائے۔ تھوڑی دیر کے بعد راس اٹھ کر اپنے گھر چلا آیا۔ لیڈی نے بچّے سے مخاطب ہوکر کہا "کیوں بیٹا اب تم باپ کے بغیر کیونکر رہ سکو گے۔

بیٹا :- "اماں جس طرح تم شوہر کے بغیر رہ سکو گی۔"

لیڈی :- "تمہارا باپ بڑا سنگدل آدمی ہے"

بیٹا :- ہرگز نہیں۔ سنگدل تو اماں تم ہو۔ جو میرے بے وطن باپ کی نسبت ایسی باتیں کہہ رہی ہو میں تو بہت خوش ہوں کیونکہ تھوڑی مدت کے بعد ضرور آبا ہمیں بھی انگلستان بلالیں گے۔ ہم نئی نئی چیزیں دیکھیں گے اور بازاروں کی سیر کریں گے۔

دفعتہً ایک آدمی گھبرایا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور کہنے لگا "لیڈی صاحبہ آپ سب کو بادشاہ کے آدمی قتل کرنے کے لئے آرہے ہیں اگر آپ بھاگ سکتی ہیں تو فوراً اپنے بچوں سمیت یہاں سے نکل جائیے لیکن اب وقت بالکل کم رہ گیا ہے" یہ کہہ کر وہ شخص تیزی سے باہر نکل گیا۔ لیڈی کی رنگت بالکل پیلی پڑگئی۔ بچّے نے اس کا بازو تھام کر کہا "اماں گھبراؤ نہیں میں تمہارے ساتھ ہُوں۔ دشمن کیا کرسکتے . . . . . اتنے میں دروازہ کھلا پانچ چھ آدمی اندر آگھسے اور لیڈی سے تحکم آمیز لہجے میں پوچھنے لگے "تمہارا شوہر کہاں ہے" اس نے کہا وہ ایسی جگہ ہے جہاں تم جیسوں کے ناپاک قدم نہیں پہنچ سکتے۔ ایک نے گرج کر کہا وہ غدار ہے۔ میکڈف کے بیٹے نے کہا، ارے ملعون میرے ابا کی شان میں کیا بکتا ہے۔ یہ سُن کر اس آدمی نے لڑکے کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ لڑکے نے دم توڑتے ہوئے کہا ہائے اماں ظالم نے مجھے مار ڈالا آپ یہاں سے جلد بھاگ جائیے ورنہ وہ آپکو بھی مار ڈالیں گے۔

لیڈی چیختی ہوئی اپنے دوسرے بچوں کی طرف بھاگی جو مکان کے دوسرے حصّہ میں کھیل رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کے تینوں بچوں کی لاشیں خاک اور خون میں لتھڑی ہُوئی پڑی ہیں۔ وہ دیکھتے ہی زور سے زمین پر گری اور ایک آدمی نے

اس کا بھی کام تمام کر دیا۔

ایک دن میکبتھ نے سوچا کہ اب پھر مجھے چڑیلوں کے پاس جا کر اپنی نسبت کچھ پوچھنا چاہئے چنانچہ اسی وقت وہ جنگل کی طرف چلدیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہی تینوں چڑیلیں بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک کے درمیان ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ناچ رہی ہیں۔ اور عجیب خوفناک گیت گا رہی ہیں۔ وہ ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ "تم کس لئے آئے ہو" میکبتھ نے کہا "میں اپنے مستقبل کی نسبت کچھ دریافت کرنے آیا ہوں"۔ وہ بولیں ٹھہرو ہم اپنے شوہروں کو بلاتی ہیں وہی تم کو بتائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئیں، زمین سے ایک غبار سا اُٹھا اور ایک بھتنا ایک سپاہی کی شکل میں نمودار ہوا۔ میکبتھ کچھ کہنے کو تھا کہ اس بھتنے نے کہا "تم خاموش رہو جو کچھ تم پوچھنا چاہتے ہو ہم جانتے ہیں۔ اچھا سنو میکڈف سے بچتے رہنا وہ تمہارا جانی دشمن ہے"۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہو گیا اور ایک اور بھتنا ایک خون آلود بچے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور بولا جرات کرو، تلوار ہاتھ میں لو اور خون آشام بنو کیونکہ کوئی عورت کا جنا ہوا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا اور جب تک برنم کا جنگل چل کر تمہارے قلعے تک نہ آجائے تم پر کوئی فتح نہیں پا سکتا"۔ وہ بھتنا بھی غائب ہو گیا۔ اب میکبتھ نے بنکو کی اولاد کی نسبت پوچھنا چاہا۔ ایک اور بھتنا نمودار ہوا جو سر پر تاج پہنے ہوئے تخت پر بیٹھا تھا۔ اُس نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا اودھر دیکھو! میکبتھ نے دیکھا کہ ایک بادشاہ جس کی شکل بنکو سے ملتی جلتی تھی اس کے سامنے سے گزر گیا۔ اس کے بعد ایک اور بادشاہ گزرا جس کے بال بنکو کے بالوں کی شکل کے تھے۔ اسی طرح کئی بادشاہ اس کے سامنے سے گزرے جن کی کوئی نہ کوئی بات بنکو کی شکل سے مشابہت رکھتی تھی۔

میکبتھ نے کہا اُف میں یہ نظارہ نہیں دیکھ سکتا! اسے میرے سامنے سے ہٹا لو چنانچہ سب بھتنے وہاں سے غائب ہو گئے اور وہ اپنے محل میں واپس چلا آیا۔

مقتول بادشاہ کا بڑا بیٹا میلکم سکاٹ لینڈ سے نکل کر انگلستان چلا گیا۔ انگلستان کا بادشاہ اس کا رشتہ دار تھا جب اس نے میلکم کی مصیبت کی داستان سنی تو اس سے بہت ہمدردی کی اور میلکم کو دربار میں کوئی عہدہ دے دیا۔

میکڈف بھی سکاٹ لینڈ سے نکل کر سیدھا انگلستان پہنچا اور میلکم سے مل کر اُسنے کہا کہ اگر آپ سکاٹ لینڈ چلیں تو تمام رعایا آپ کے قدموں میں آنکھیں بچھانے کو تیار ہے۔ میکبتھ رعایا پر طرح طرح کے ظلم توڑ رہا ہے۔ دوسرے آپ ہی سلطنت کے حقدار ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوتا ہے کہ ہمارے عزیز بادشاہ کا قاتل ہم پر حکومت کرے۔

میلکم نے کہا "میں کس طرح یقین کرسکتا ہوں کہ تم حقیقت میں میرے خیر خواہ ہو۔ کیا تعجب ہے کہ تم وہاں جا کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مجھے اس کے حوالے کردو" میکڈف کو یہ سن کر سخت رنج ہوا اور اس نے کہا "جناب میں ایسا نہیں ہوں جیسا کہ آپ مجھے سمجھے ہوئے ہیں" میلکم بولا "نہیں میکڈف میں یہ نہیں کہتا کہ تم واقعی ایسے ہو گے میں صرف شک دور کرنا چاہتا ہوں"۔ میکڈف بولا "آہ ہمارا غریب وطن روز بروز مصیبتوں کا شکار ہو رہا ہے" میلکم اپنے وطن کی حالت پر رحم کرنے میلکم کہنے لگا "میکڈف ان مصیبتوں کے خاتمہ کا کیا فائدہ جو از سر نو پہلے سے بھی زیادہ ہو کر شروع ہو جانے والی ہوں"

میکڈف ۔میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

میلکم ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ یہ کیونکر جان سکتے ہو کہ میکبتھ کو تخت سے اتار کر تم چین اور آرام کی زندگی بسر کرسکو گے میں اپنی کمزوریوں کو تم سے زیادہ جانتا ہوں کیا تم ایک ایسے آدمی کو حکمرانی کے قابل سمجھ سکتے ہو جو ایسا ہوس پرست ہو کہ تمام ملک کا مال بھی اپنے خزانوں میں بھر کر اس کی خواہشات کم نہ ہوں اور جو اپنی ذرا ذرا سی خواہشات پوری کرنے کیلئے کئی انسانوں کا خون بہائے ۔ جو عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی عیش وعشرت میں ایسا ڈوب جائے کہ مہینوں تک سلطنت کی خبر نہ لے ۔میکڈف میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر حکومت مجھے مل جائے تو میں ایسا ہی کروں۔ کیونکہ میری فطرت ہی ایسی ہے"

میکڈف ۔نہیں نہیں ۔ایسا آدمی ہرگز حکمرانی کے قابل نہیں ۔بلکہ وہ تو اس قابل ہے کہ دنیا جلد اس کے ناپاک وجود سے پاک ہو جائے لیکن آہ میلکم تمہارا باپ تو نہایت ہی پاک طینت انسان تھا ۔افسوس میں اپنے دل میں کیا کیا امیدیں لئے ہوئے یہاں پہنچا تھا ۔میری تمام آرزوں کا خون ہو گیا ۔ آہ اے بدنصیب وطن تجھے بچانے والا کوئی نہیں رہا ۔تو ایک عمر تک یونہی خون میں نہائے جا مصیبتوں کی تیرہ و تار گھٹائیں ہمیشہ کے لئے تجھ پر چھا گئی ہیں"۔ میکڈف کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا ۔ دفعتہً میلکم نے اٹھ کر میکڈف کو گلے لگا لیا اور بولا "پیارے میکڈف! میں نے آج تک تم جیسا نیکدل انسان کہیں نہ دیکھا تھا ۔ اب تم خوش ہو جاؤ کہ میں یہ سب باتیں تمہیں آزمانے کے لئے کہہ رہا تھا ۔ مجھے شک تھا کہ کہیں تم میکبتھ کے بھیجے ہوئے نہ ہو" میکڈف کی آنکھوں میں اسوقت خوشی کے آنسو تھے اور میلکم کی آنکھوں میں خلوص اور محبت کے ۔

آخر میلکم نے اُسے بتایا کہ شاہ انگلستان نے مجھے دس ہزار فوج دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ وہ اسی کے متعلق تجویزیں کر رہے تھے کہ راس اندر داخل ہوا ۔ دونوں اسکے یوں غیر متوقع طور پر آجانے سے بہت حیران ہوئے میکڈف نے کہا ۔ "راس تم یہاں کیونکر آگئے"

راس ۔ آپ ہی کے پاس آیا ہوں ۔

میکڈف ۔" کہو ہمارے وطن کا کیا حال ہے ؟"

راس ۔ "وطن کی خبریں ایسی ہیں کہ زبان اُن کو بیان کرنے سے لرزتی ہے"۔

میکڈف ۔"تازہ ترین واقعہ کیا ہے؟"

راس ۔ ایک واقعہ ہو تو کہوں وہاں تو ہر روز نہایت ہی دردانگیز حادثات رونما ہو رہے ہیں۔

میکڈف "میرے گھر والوں کا کیا حال ہے"

راس ۔ آہ میں تمہیں ان کا کیا حال بتاؤں ۔ بدنصیب میکڈف! ان سب کو ظالم میکبتھ نے قتل کرا دیا ہے" میکڈف یہ سنکر بیہوش ہو کر گر پڑا میلکم اور راس جلد جلد اُسے ہوش میں لائے ۔ اس کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی مہینوں کا بیمار ہو۔ میلکم نے کہا "میکڈف مرد بنو"۔ میکڈف نے راس کو مخاطب کر کے کہا" کیا کہا تھا تم نے ؟ وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے ۔ اُن میں سے ایک بھی نہیں بچا۔

راس ۔ ہاں ! سب کے سب ۔

میکڈف ۔ کیا میرے حسین بچے مارے گئے اور اُن کی ماں بھی ؟

راس ۔ ہاں میکڈف تمہارے سب بچے" اور بیوی بھی قتل کر دی گئی"

میکڈف ۔" آہ اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟"

میلکم ۔ میکڈف! تمہیں یُوں ہمت نہ ہارنی چاہیئے تم مرد ہو تمہیں میکبتھ سے بدلہ لینے کے لئے زندہ رہنا چاہیئے" میکڈف نے کہا " جناب میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپنے مجھے اپنا بھولا ہوا فرض یاد دلا دیا۔ میں زندہ رہوں گا میکبتھ سے بدلہ لینے کیلئے اور اپنے وطن کو ایک بار پھر خوشحال دیکھنے کیلئے ۔

اچانک میکبتھ کو یہ اطلاع دی گئی کہ میلکم کثیر التعداد فوج لیکر اسکے مقابلہ کو آ رہا ہے میکبتھ نے ملکہ کو یہ بات بتائی اور کہنے لگا۔ وہ آکر کیا کرے گا چڑیلوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ جب تک برنم کا جنگل چل کر یہاں نہ آجائے کوئی مجھ پر فتح نہیں پا سکتا۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ برنم کا جنگل قیامت تک نہیں چل سکتا۔ میلکم کو قضا خود ہی یہاں لے آئی ہے انگلستان میں تو وہ ہمیشہ میرے مقرر کردہ آدمیوں سے بچ جاتا رہا۔ لیکن اب خود ہی موت کے منہ میں آ رہا ہے۔

میکبتھ کو چڑیلوں کی اس بات پر کہ "کوئی عورت کا جنا ہوا تمہیں ہلاک نہیں کر سکتا" پورا یقین تھا۔ اسی لئے وہ میلکم کے چڑھائی کرنے سے ذرا بھی نہ گھبرایا اور نہایت اطمینان سے قلعے میں بیٹھا رہا۔

میلکم کی فوج جب برنم کے جنگل میں پہنچی تو اس نے انہیں ہدایت کی کہ فوج کی اگلی قطار کے سپاہی درختوں کے بڑے بڑے ٹہنے کاٹ کر ہاتھوں میں لیکر چلیں تاکہ دشمن ان کو دیکھ کر فوج کی تعداد کا اندازہ نہ کرسکے۔

جب وہ میکبتھ کے قلعے کے نزدیک پہنچے تو ایک سپاہی میکبتھ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور بولا حضور! غضب ہوگیا برنم کا جنگل چل کر ہمارے قلعے کی طرف آرہا ہے۔ بادشاہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ کہنے لگا "کیا واقعی تم سچ کہہ رہے ہو۔ اگر تمہاری بات جھوٹ نکلی تو میں تمہارا سر اڑا دوں گا" وہ بولا "حضور خود جاکر دیکھ لیجئے۔ بادشاہ نے قلعے کی فصیل پر سے دیکھا تو سپاہی کی بات کو سچ پایا اُس نے دل میں کہا اُف غضب ہوگیا۔ اب میلکم شاید مجھ پر فتح پالیگا لیکن مجھے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے میں اُن کا خوب مقابلہ کروں گا"

میلکم کی فوج نے قلعے کے قریب پہنچ کر درختوں کے ٹہنے ہاتھوں سے پھینک دیئے میکبتھ ان کو دیکھ کر جوش میں نعرے مارتا ہوا قلعے سے باہر نکل آیا اور فوج کو مقابلہ کے لئے تیار کرنے لگا۔

اسی اثنا میں ملکہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوگئی تھی میکبتھ کے میدان جنگ میں جانے کے بعد مرض اور بھی شدید ہوگیا۔ ملکہ کے معالج نے ایک رات اسکی ایک پیشدست خاتون سے اس کا حال دریافت کیا۔ خاتون نے کہا گذشتہ شب وہ رات بھر آنکھیں بند کئے اِدھر اُدھر پھرتی رہی اور عجیب وغریب باتیں کرتی رہی"

ڈاکٹر۔ وہ کیا باتیں کرتی رہی۔

خاتون "جو باتیں اُس نے کیں وہ میں زبان پر نہیں لاسکتی"

اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ملکہ ہاتھ میں مشعل لئے کمرے سے باہر نکلی اسکی آنکھیں بند تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا یہ مشعل اُس نے کہاں سے لی" خاتون بولی "وہ کبھی اندھیرے میں نہیں سوئی اس نے حکم دے رکھا ہے کہ اس کے کمرے میں رات بھر شمع جلتی رہا کرے"

ملکہ اُن کے قریب پہنچ گئی وہ کہہ رہی تھی "میں نے ان کے ہاتھ اور چہرے خون سے رنگ دیئے ہیں۔ میکبتھ آؤ اب ہم سونے کے کمرے میں چلیں اور وہاں چل کر ہاتھوں پر سے خون دھولیں۔ صبح ہورہی ہے۔ اگر کوئی آگیا تو راز افشا ہو جائیگا" ڈاکٹر کا دل سینے میں پھڑ پھڑایا وہ اور زیادہ توجہ سے اس کی باتیں سننے لگا۔ وہ پھر بولی "اُف مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بوڑھے جسم میں اس قدر خون ہوگا" ڈاکٹر نے کہا "خوب" وہ اپنے ہاتھوں کو مل رہی تھی) اور کہہ رہی تھی۔ آہ میں جس قدر ان دھبوں کو دھوتی ہوں وہ اور زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں"

پھر کہنے لگی "آپ کیوں فکر کرتے ہیں کہ راز افشا ہو جائیگا۔ بنکو کو تو آپ مروا ہی چکے ہیں۔ پھر ڈر کس کا ہے"

ڈاکٹر سب کچھ سمجھ گیا۔

میکبتھ کی فوج میں جس قدر بہادر افسر تھے سب اپنے اپنے دستوں کو لے کر میلکم سے جا ملے صرف تھوڑی سی فوج اس کے پاس رہ گئی۔ اس نے کہا مجھے کچھ پروا نہیں بے شک باقی فوج بھی میلکم سے جا ملے۔ میں اکیلے ہی سب کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے باقی ماندہ فوج کو اکٹھا کر کے حملہ کر دیا۔

چونکہ میکبتھ کی فوج بہت کم تھی اس لئے جلد ہی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ آخری روز صرف چند آدمی اس کے پاس رہ گئے تھے لیکن وہ نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا۔ میکڈف اس کے سامنے آیا اور بولا "شکر ہے کہ ابھی تک تم زندہ ہو کیونکہ میں اپنے ہاتھ سے تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں تمہارے خون سے اپنی پیاس بجھاؤں گا۔"

میکبتھ نے جواب دیا "تم کبھی مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی عورت کا جنا ہوا مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

میکڈف کہنے لگا "اچھا تو میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں کیونکہ مجھے میری ماں نے نہیں جنا تھا۔ مجھے اس کا پیٹ چاک کر کے نکالا گیا تھا۔" میکبتھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بولا "اُف مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ شیاطین ایسی باتیں بھی کرتے ہیں جنکے دو معنی نکلتے ہوں۔" ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک آدمی قلعے کی طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا "حضور ملکہ مر گئیں۔" یہ سن کر میکبتھ کو سخت رنج پہنچا۔ میکڈف بولا اس کا غم کیوں کرتے ہو۔ جب کہ تم خود بھی ابھی اس کے پاس جہنم میں پہنچ جاؤ گے۔ یہ سن کر میکبتھ نے تلوار لیکر اس پر حملہ کر دیا۔ دونوں میں خوب مقابلہ ہوا۔ آخر میکڈف نے میکبتھ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اور اُسے نیزے پر اُٹھا کر میلکم کے پاس لے گیا۔

اسکے بعد میلکم قلعے میں داخل ہو گیا اور تمام قلعہ "بادشاہ زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔

ع۔ ب

نوائے راز

حریفِ شیوۂ ابنائے روزگار نہیں
وہ بادہ نوش جو سرگشتۂ خمار نہیں

بلا سے بزمِ جہاں میں جو کامگار نہیں
میں کامیاب ہوں پھر بھی کہ خامکار نہیں

عجب جگہ ہے خراباتِ عالمِ امکاں
جو ہوشیار یہاں ہے وہ ہوشیار نہیں

مثالِ نکہتِ گل خانماں خراب ہوں میں
کہ اس چمن کی ہوا مجھکو سازگار نہیں

خزاں کی گود میں پائی ہے پرورش میں نے
رہینِ لذتِ کیفیتِ بہار نہیں

تو آج تک تو مرے دل کے داغ دھو نہ سکی
اب اعتبار ترا چشمِ اشکبار نہیں

گناہ کرتا ہوں بیشک مدام کرتا ہوں
یہ واقعہ ہے مگر میں گناہگار نہیں

مشرقِ انوار میرا سینہ ہے
مہرِ عالمتاب کا آئینہ ہے

خود پرستی کی ہے آخر کوئی حد
تو ہے اور پیشِ نظر آئینہ ہے

بے خبر ہوں حال و مستقبل سے میں
کیا خمارِ بادۂ دوشینہ ہے

عجز کی پستی سے آزردہ نہ ہو
بامِ رفعت کا یہی اک زینہ ہے

مدعی ہے طالبِ دیدار آج
اور یہ میری حسرتِ دیرینہ ہے

رنجِ ماضی فکرِ مستقبل فضول
حال تیرے حال کا آئینہ ہے

حسن کے جلووں سے ہے معمور دل
اب یہ آئینہ مرا آئینہ ہے

دل ہے میرا دل کہ راز دلفگار
عشق کے اسرار کا گنجینہ ہے

(ابوالفاضل) راز چاندپوری

رُوح

مئی کا مہینہ نصف النہار کا وقت تھا۔ آفتاب اپنے آتشیں طشت سے موجودات عالم پر آگ برسا رہا تھا اور دیو قامت درخت سبزی و شگفتگی سے محروم تھے۔ زرد پتے جو کسی کسی شاخ میں باقی تھے۔ آہنی تار میں لٹکے ہوئے مصنوعی پتوں کی طرح بے حرکت و بے جان نظر آتے تھے۔ دریائے گنگ کا پانی پگھلے ہوئے سیسے کی طرح رواں مگر تموج سے قاصر تھا ہر طرف اداسی اور حد بصر تک موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مگر اسی حابس و جان سوز و ناسد وقت میں دو نوجوان کیننگ کالج کے وسیع احاطہ کے اندر ایک پیپل کے درخت کے نیچے جو سایہ سے محروم تھا کھڑے بحث کر رہے تھے۔

دونوں میں سے ایک نوجوان نے کسی قدر جوش سے کہا کہ حضرت یہ تو سچ ہے کہ اگر ہم معلوم نہ کرتے تو آج کچھ بھی معلوم نہ ہوتا۔ مگر اب تک کیا معلوم کیا انصاف کرو تو امر واقعہ یہ ہے کہ ہم کسی چیز کی حقیقت بھی نہیں جانتے۔ ایک امرود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس کی حقیقت ہم جانتے ہیں۔ امرود ایک خاص وزن و مقدار رکھتا ہے۔ امرود میں خوشبو، رنگ، ذائقہ ہے۔ مگر یہ سب اوصاف یا عرض ہیں یا جوہر، قایم بالذات ان میں سے کوئی شے بھی نہیں۔ حالانکہ امرود قائم بالذات شے ہے۔ اور اس لئے ہم امرود کی اصلی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر شے کی بلندی سے نیچے گرنے کی علت کشش اجسام ہے لیکن جسموں میں کشش کی خاصیت کیوں ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ پس مرئیات و محسوسات کے ادراک میں تو ہم قدم بہ قدم ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ لیکن ہماری تعلی و بلند پروازی یا خود نمائی و سادہ لوحی کی یہ حالت ہے کہ غیر مرئی و غیر محسوس دنیا میں داخل ہو کر کائنات کے حقائق اصلی و اسرار آلٰہی کے حجب و نتق لوٹ دینے کا ادعا کرتے ہیں۔ مثلاً روح انسانی کے متعلق ایک مدعی کا دعویٰ ہے کہ اس بے حقیقت خود زائیدہ شے کو ہمارے عظمائے نوع نے چند ہی کا سانپ بنا کر تخیل و استہزا کے بلند ترین مستول پر چڑھا دیا۔ اور ایک سیدھی سادھی ترکیب جسمانی کو جو نباتات و حشرات الارض اور تمام ذی حیات اجسام میں بلا تفاوت یکساں پائی جاتی ہے۔ خواہ مخواہ بھان متی کا پٹارہ اور عمر عیار کی زنبیل قرار دے دیا۔ حالانکہ روح کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ چند اجزائے معدنی کے اختلاط سے جس طرح بجلی پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک یہ اختلاط اجزائی قائم رہتا ہے اس کی رو قوت احتراق رکھتی ضیا پیدا کرتی، اور دوسرے بے جان اجسام کو حرکت میں لاتی ہے۔ لیکن جونہی اجزائے مختلطہ میں افتراق و شقاق پیدا ہوا۔ وہ رو معدوم ہو جاتی ہے۔ یہی حالت روح حیوانی کی ہے۔ جو اختلاط عناصر و امتزاج ترکیبی سے

ہر حیوانی جسم میں پیدا ہوجاتی اور تمام قوائے جسمانی کو متاثر و متحرک رکھتی ہے اور جب تک اس اختلاط و امتزاج میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ یہ قوت قائم رہتی ہے۔ لیکن جیسے ہی عناصر ترکیبی کے اعتدال میں فرق آیا وہ رو غائب و معدوم ہوجاتی ہے۔ اور اس رو کے معدوم ہوتے ہی تمام قویٰ اپنی اپنی حرکات سے معطل ہوجاتے ہیں۔ اور اسی کا نام موت ہے۔

یہی روح ایک ننھی سی خودرو بوٹی۔ جنگلی رو کہڑی۔ ہوا میں اڑنے والے مچھر اور بھنگے کے اندر ہے اور اسی نوعیت کی روح حکیم سقراط و افلاطوں کے محترم جسموں میں تھی۔ نہ باعتبار تعقل وادراک و مقدار قدرت و شعور کسی قسم کی فضیلت و علویت جالینوس اور ابن سینا کی ارواح کو مچھر اور بھنگے کی روحوں پر حاصل تھی۔ نرگسی اور پیر، فقیر، سنت، مہنت کی ارواح کو میسر ہے۔ بلکہ جیسی حشرات الارض اور رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کی روح تعقل و ادراک سے خالی اور فنا ہونے والی ہے اسی طرح اپیکورس وسینکا کی روحیں بھی تعقل و شعور سے عاری اور فانی تھیں مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ اجسام انسانی وحیوانی جو کسی حال میں بھی فنا ہونے والے نہیں۔ اور جو صرف صورتیں بدلتے رہتے ہیں ان کو فانی کہا جاتا ہے اور روح کو جو انہیں اجسام کی زائیدہ شعاع ہے اُسے غیر فانی وابدی بتایا جاتا ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

بات یہ ہے کہ انسانی ردو قبول ہی سخت حیرت ناک ہے اس مغالطہ میں نہ صرف ابتدائی قرون کی نسلیں غرق ہوئیں۔ بلکہ آج بھی کروڑوں تعلیم یافتہ، مہذب، مسائل حکمیہ سے واقف انسان اسی تخیلہ و متوہمہ ورطہ میں غوطے کھا رہے ہیں۔

زمانۂ تاریک کے متقشف و متعبد طبقہ نے خالی الذہن اور سادہ دل انسانوں کے واہمہ پر روح کی جو تصویر کھینچ دی تھی قرن در قرن انساب و اصلاب میں اسی شبیہہ کا عکس اترتا رہا اور مذاہب عالم کی عظیم الشان عمارتیں اسی شبیہ کے انعکاس میں تیار ہوتی رہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ روحانی تخیل ہی ان سب مستعمرات کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دیتا رہا۔

دیکھو آیونک فلاسفی کا وہ پہلا مسخرہ طالیس* ملطی توہمات کے کیسے کیسے جال پھیلا گیا۔ اور ارسطو سے ماقبل تک جس قدر فلسفی ہوئے توہمات و جہالت کی زنجیروں میں کڑیوں کا اضافہ ہی کرتے چلے گئے۔

اشراقیین نے روح انسانی کو جوہر مجردہ تسلیم کرتے ہوئے مدرک و معقول عالم الغیب فاعل و مختار مان لیا اُنکی روحیں ایک لحظہ میں سمٰوات طے کر لیتی ہیں۔ کوہ ہمالیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ سکتی ہیں۔ دریائے آمیزن و نیل کو ایک لحہ میں خشک اور رود گنگ و سندھ کو ریگ زار عرب میں بہا سکتی ہیں۔ ان کی روح کو یہ قدرت بھی حاصل تھی کہ ہزاروں کوس کے فاصلہ پر برائے

---

* طالیس ملطی یونان کا پہلا فلسفی ہے جس کا فلسفہ جاہلانہ توہمات و روحانی کرشموں سے پُر ہے۔

بڑے معمور و آباد شہروں کو غارت و ویران اور لاتعداد فوجوں اور مہیب لشکروں کو پامال و تباہ کر دے۔

مشائی طبقہ کے معلمین میں سے بعض نے اگرچہ سرے سے نفس ناطقہ او عقل فعلی و فعالی کا انکار کر دیا اور اس عقیدہ کا وہ استہزا کرتے تھے۔ کہ انسان کے اندر کسی ایسی روح کا وجود بھی ہے جو غیر محدود غیر منجزی ناقابل فنا ہو۔ وہ انسانی روح کو جسمانی ہی سے ملتزم جانتے اور فقدان عناصر ترکیبی کے ساتھ روح کے فنا ہو جانے کا عقیدہ رکھتے تھے لیکن باوجود اس کے پھر بھی اس گروہ عالیہ کے اکثر فلاسفہ نے معلم اول کے نفس ناطقہ فعلی و انفعالی کی تفریق یعنی نفس فعلی کی قدامت و نفس انفعالی کے حدوث و فنا پذیری کے معمّہ سے دھوکا کھا کر عقول ہیولانی ۔ مستفاد ۔ مدرک ۔ انفعالی ۔ فعلی کا گورکھ دھندا تیار کیا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہر انسان عقل ہیولانی کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ اس حالت میں محض ادراک کی استعداد و قابلیت ہوتی ہے۔ اضافہ عمر کے ساتھ ساتھ یہ قوت فعلیت کا درجہ حاصل کرتے کرتے آخر کار عقل مستفاد کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اور اس وقت اسفلیت و رذالت کے جذبات انسان سے معدوم ہو کر شرف و علویت کے تمام اعلیٰ اوصاف روح سمیٹ لیتی ہے۔ اور گویا اس جگہ ما و شما کی غیریت دور ہو کر روح مجسم ہمہ اوست بن جاتی اور عقل کل (خدا) میں جذب ہو جاتی ہے جو انسان کی اصلی سعادت کا سرچشمہ ہے۔

اس نظریہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مشائی نظریہ کا یہ حصہ اشراقیین کے عقاید کا عکس ہے۔ اور بالآخر یہ سب مل جل کر وہی نتیجہ پیدا کرتے ہیں جس نے لاکھوں انسانوں کو ان کے قوائے فطری کی سادگی کے بدولت دیوجانس[۵۱] و جے روم[۵۲] کارڈن کے نفوس میں نمودار کیا۔ اور ہزاروں انسانوں کو ان کے قوائے فطرت کے مشعبدو متفنن تخمیر کے طفیل۔ مانی[۵۳] و ابن مقنع و حسن بن صباح کی صورتوں میں نمایاں کیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز یہ مسئلہ ہے کہ عہد موجودہ کے حیرت انگیز انکشافات اور سائنس کی تعجب خیز اختراعات نے جن پر زمانہ حال کو بجا طور پر فخر و ناز کا حق ہے یکسر کائنات کا پاسہ الٹ دیا ہے۔ مگر روح کے متعلق مبادی قرون میں جو واہمے و افسانے وضع ہوئے وہ آج تک بھی اپنی اصلی صورت میں نظر آتے ہیں۔ گویا قبر نما تاریکی کا زمانہ اور بیسویں صدی کا برقی دور ان معتقدات خاص میں متحد و متفق اللسان ہے۔ چنانچہ یورپ جیسی سرزمین سے بھی اس وقت یہ واہمے دور نہیں ہوئے۔ بڑے

---

۵۱ دیوجانس شہر کارنتھہ کا رہنے والا اور سکندر اعظم کا ہمعصر تھا۔ مشہور ہے کہ جب سکندر اسے دیکھنے گیا تو دیوجانس نے سکندر سے اس قدر سخت گفتگو کی کہ وہ غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ غرضکہ دیوجانس سخت خود بین اور بداخلاق تھا۔ برہنہ پا گلی کوچوں میں ایک لکڑی کا پیپہ سر پر اٹھائے پھرتا تھا اور روحانیت کا وہم رکھتا تھا۔ ۵۲ جے روم اٹلی کا طبیب اور شدید واہمہ پرست تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ایک روح جسے میں پہچانتا ہوں میرے سامنے حاضر رہتی اور میرے احکام کی تعمیل کرتی ہے ۵۳ مانی ایران میں مدعی نبوت گزرا ہے نبوت کے استدلال میں طرح طرح کے شعبدات پیش کرتا تھا۔

بڑے مخزن علم وحکمت شہروں میں مسمریزم کی تجربہ گاہیں کھلی ہوئی ہیں اور متعدد شعبدہ باز سلیم الطبع لوگوں کو روحوں کی زیارت کراتے رہتے ہیں حالانکہ ان مزخرفات کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ مشق وتمرین سے صحیح الدماغ ذی حیات انسان کے حواس باطنی اس درجہ قوی الحس ومنجلی ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ تاریکی میں آنکھ بند کر کے روشنی کا تصور کرے گا تو فوراً اپنے آپ کو وہ روشنی میں پائے گا۔ اگر وہ فرداً فرداً یا اجتماعاً زید وبکر وخالد کا تصور کرے گا تو وہ تینوں اپنی اپنی اشکال میں اس کے سامنے متشکل ہونگے۔ یا اگر وہ کسی باغ، دریا، عمارت بازار پر قوتِ خیال وارد کرے گا تو ہر ہر شے اپنی ہیئت کمل کے ساتھ اسکی نظر کے سامنے آجائیگی۔

یہ ہے قوتِ استدراک انسانی کا انتہائی نتیجہ اور یہی وہ روح ہے جس سے جے روم کارڈن جب چاہتا ملتا بات چیت کرتا اور وہ روح اس کے سامنے حاضر رہتی تھی۔ مگر واضح رہے کہ اس استدراک میں بھی روح کو کسی قسم کا تصرف نہیں ہے۔ بلکہ یہ تصرف انہیں قوائے مختلفہ وواہمہ وحسِ مشترک کا نتیجہ ہے جو انسانی دماغ کے تجادیف میں ودیعت ہیں۔ کیونکہ روح تو جسمانی اجزہ کی حرارت ہے جو جسم کے تنور کو گرم رکھتی ہے۔

کیا طرح طرح کے مدور ومربع مثلث ومخروطی۔ خوشبو۔ خوش رنگ۔ خوش مزہ کیک اور مٹھائیاں تنور کی بھاپ کی استعداد وقابلیت کا نتیجہ ہیں یا اس کے بواعث سانچہ۔ خمیر۔ شکر ومسکہ ہیں۔ پس جس طرح تنور کی بھاپ و حرارت اور بجلی کی رَو باوصف قوتِ احتراق وضیا وحرکت تعقل وادراک۔ سیر وطیر سے محروم ہے اسی طرح ہر ذی حیات جسم کی حرارت اور رَو قوائے شعوریہ وادراک سیر وطیر سے عاری ہے روح کا فائدہ محض قیام حیات ہے جو قوائے شعوریہ اجسام انسان وحیوان کو منور ومتحرک رکھتی ہے۔ مثلاً اجسام انسانی میں حواس خمسہ ظاہریہ وحسِ مشترکہ ومتخیلہ۔ متوہمہ۔ حافظہ۔ متصرفہ قوائے باطنیہ کے علاوہ وہ تمام قوتیں بھی موجود ہیں جو دیگر حیوانات ونباتات میں پائی جاتی ہیں۔ حیوانات میں انسانی حواس باطنیہ کے مقابلہ میں بہت کم قوتیں ہیں اور نباتات کے اندر ظاہری حواس بھی اکثر مفقود ہیں۔ مگر روح ان سب کی ایک ہی قسم اور ایک ہی ترکیب کی ہے جو قوا جس جسم کے اندر ہیں اُن کو حیات کا نفع پہنچاتی ہے۔ جو روح دیمقراطیس واپی کیورس کے تجادیف دماغی کو فائدہ حیات پہنچاتی تھی وہی روح عرب کے خچر اور ہندوستان کی گائے کے خزینہ وہم کو متحرک رکھتی ہے جس کے طفیل میں سینکڑوں ہم شکل گایوں کے اندر گائے کا بچھڑا اپنی ماں کے تھنوں کو پہچانتا ہے۔ حقیر طائر بئے کے جثہ کو دیکھئے کہ اس کے اندر کیسی استعماری قابلیت مستور ہے جس کے بدولت وہ بہترین صنعت پر اپنا گھونسلہ تیار کرتا ہے۔ مگر ہاتھی گھوڑوں کے کوہ نما جسم کے اندر یہ شعور مفقود ہے۔ غرضکہ محل ادراک وعقول اور مخزنِ جذبات وشعور ہر جسم میں تجادیف دماغی ہیں جو روح کے پرتو حرارت سے متحرک رہتے اور صانع بے چون وچند کی مشیت کے تابع اپنے اپنے دائرہ قسمت کے اندر فرائض ادا کرتے ہیں۔

فرق جو کچھ ہے وہ جسم کی ترکیب اور تجاویف دماغی کے تنوع کا ہے اپیکورس کے تجاویف دماغی کی ترکیب اور ہے جالینوس کے دماغ کی ترکیب اور ہے۔ بندر کے تجاویف دماغی کی ترکیب دوسری ہے اور بہ گوسفند کے تجاویف کی ساخت اور قسم کی ہے۔ اگر اپیکورس کی روح کسی بندر کے جسم میں منتقل ہو جاسکتی تو اس بندر کو اپیکورس کے تعقل و دانائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس اپیکورسی بندر سے اُسی قسم کی شعور یہ قوتوں کا صدور ہوتا جو دماغِ میمونی کا خاصہ ہیں۔ اس لئے کہ بنفسہٖ روح میں شعور و تعقل کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اگر روح میں شعور و ادراک ہوتا اور اجسام استعداد و قابلیت تعقل و شعور سے عاری ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سنین عمر کی ترقی کے ساتھ ادراک و شعور کو بھی ترقی ہوتی یا زوال عمر کے ساتھ تعقل و شعور کو بھی نقصان پہنچا جاتا۔ جب کہ مدرک روح ہر شیخ و شاب و صبی میں موجود ہوتی ہے *

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ارواح میں تعقل و شعور ہوتا اور اجسام اس استعداد و قابلیت سے محروم ہوتے تو جنون کی حالت میں فتور دماغ سے اور سرسام کی صورت میں ورم اغشیہ سے شعور و تعقل کو نقصان نہ پہنچتا نہ عوارض کی نسبت اجسام سے کی جاتی کہ فلاں شخص کا دماغ مختل ہو گیا۔ اور فلاں کے دماغ یا حجاب میں ورم آگیا۔

روح کا فائدہ دونوں حالتوں میں انسان کو یکساں پہنچتا ہے وہ دورِ جنون و سرسام میں بھی شمع حیات انسانی کو روشن رکھتی ہے اور مجنون و سرسامی کے دورِ صحت میں بھی یہی نفع پہنچاتی ہے۔

دوسرا نوجوان اب تک اس تقریر کو حیرت اور نفرت سے خاموشی کے ساتھ سنتا رہا مگر یکا یک اس کا پیمانہ ضبط و تحمل لبریز ہو گیا۔ اور انتہائی جوش و غصہ سے سخت و تلخ لہجہ میں اس نے جھلّا کر کہا "حضرت توبہ کیجئے۔ آپ کی تقریر سراپا کفر سے بھری ہوئی اور ملحدانہ ہے۔ نعوذ باللہ آپ روحانیت کے منکر معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ مذہب اسلام کی بنیاد روحانیت پر ہے۔ خدائے حکیم نے اپنے کلام مجید میں روح کو "امر رب" فرمایا ہے۔ اور اجسام طاہرۂ آدم و مسیح میں خدا نے اپنی روح داخل کی ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قول کے مطابق مع جسد سمٰوٰت کو طے کیا ہے۔ اور دوسری روایت کے مطابق آپ کی روح مطہرہ آسمان پر لے جائی گئی ہے۔ شہدا کی روحیں عرش کے سایہ میں طیور کے اجسام میں رہتی اور جنت میں اڑتی چگتی پھرتی ہیں۔ ہماری آپ کی روحیں بہ حالت خواب کیسے کیسے عجیب مشاہدات دیکھتی اور لمحوں میں کہاں سے کہاں پہنچتی ہیں۔ اولیائے کرام و صوفیانِ عالی مقام کی روحیں جو شب و روز تزکیہ و تصفیہ نفس و باطن سے مدارج علیا طے کرتی ہیں اگر اُن سے حیرت انگیز خوارق ظاہر ہوں تو تعجب ہی کیا ہے۔

نبیوں کے معجزات۔ ولیوں کی کرامات محض روحانی قوت کا نتیجہ ہیں۔ اگر روح آپ کے قول کے مطابق عناصر ترکیبی کی بھاپ یا حرارت ہے۔ اور موت کے ساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ تو پھر باقی ہی کیا رہتا ہے حشر و نشر کس چیز کا ہوگا

اور سزا و جزا کس پر جاری ہوگی۔ آپ کے عقیدہ کے موافق تو نظام روحانیت ہی باطل و بے مآل ٹھہرتا ہے۔ اور کائنات کا وجود ہی سرتاپا ایک ڈھکوسلہ قرار پاتا ہے۔

اول الذکر نوجوان نے اپنے رفیق کا یہ جواب سنکر تبسّم آمیز لہجہ میں کہا۔ ادا شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست۔ خطا معاف ہو۔ میری تقریر کا آپ مطلب ہی نہیں سمجھے۔ مجھے اس سے کب انکار ہے کہ روح "امرِ رب" نہیں ہے بلکہ میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ حیوانات و نباتات کی روح بھی امر رب ہے۔ میں اسے بھی تسلیم کرتا ہوں کہ آدم و عیسٰی بلکہ ساری مخلوقات کے اجساد میں جو روحیں تھیں اور ہیں وہ سب امر ربانی ہے۔ مگر امر ربانی ہونا اور بات ہے اور روح کا مدرک و باشعور طیار و سیر ہونا دوسری بات ہے۔ میں اسے بھی تسلیم کرتا ہوں کہ خداوند عالم اگر چاہے تو انسان کیا معنی ہاتھیوں اور اونٹوں کو فضائے آسمانی پر اُڑا سکتا ہے۔ دیکھئے آخر ٹنوں وزنی جرمنی جہاز اُڑتے ہی ہیں۔ اس بات سے بھی مجھے انکار نہیں کہ شہدا کی روحیں عرش عظیم کے نیچے رہتی ہیں۔ ساری کائنات ہی خدائے عظیم کے عرش کے تحت میں ہے اور خدا سے مافوق کوئی مخلوقات نہیں ہے۔ بہ حالت خواب روحوں کا مشاہدہ یا چلنا پھرنا یہ آپ کی سمجھ کا قصور ہے۔ میرے نزدیک روح نہ دیکھنی سنتی ہے نہ چلتی پھرتی نہ پرواز کرتی ہے۔ حالت خواب میں جو مشاہدات انسان کو ہوتے ہیں۔ وہ حواس باطنی کے تصرفات ہیں۔ جن کا مرکز تجاویف دماغی ہیں۔ ان قویٰ میں بھی نہ اپنے مستقر سے باہر جانے کی قدرت ہے نہ سیر و پرواز کی لیکن اپنے ہی گھر بیٹھے بیٹھے کائنات کا عکس لے لینے کی ان میں طاقت ہے۔ اولیائے کبار و صوفیہ صافیہ انھی باطنی حواسوں کا تصفیہ و تزکیہ کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کے حواس ہم آپ سے بہت زیادہ صاف و منجلی ہوتے ہیں۔

رہا آپ کا یہ خیال کہ موت کے ساتھ انسان کی روح بھی فنا ہو جاتی ہے تو پھر باقی کیا رہے گا۔ حشر و نشر کس کا ہوگا اور سزا و جزا کس پر جاری ہوگی عجیب خیال و سوال ہے۔ لاکھوں جسد راکھ ہو کر ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ لاکھوں کھاد ہو کر کھیت کی مٹی بن گئے۔ لاکھوں اجساد کی مٹی خمیر ہو کر چاک پر چڑھی اور صراحی و کوزے قدحے بن کر ٹوٹ پھوٹ گئے اور بارہا پسکر قلعی میں مل کر دیواروں، چھتوں کے پلاسٹر ہو گئے۔ ہزاروں نعشیں تیزاب* فاروق میں محلول ہو گئیں۔ آخر یہ سب اجساد حشر کے دن آپ کے اعتقاد کے مطابق ہوا کے غبار، تیزاب کے محلول، کھیتوں کی مٹی، پختہ اینٹ اور چاک پر چڑھے ہوئے گلی ظروف سے نکلیں گے تو فنا شدہ روحوں کا دوبارہ پیدا ہونا اور اجسام میں داخل کرکے ان پر سزا و

---

* حسن بن صباح نے قلعہ الموت میں تیزاب فاروق کا ایک حوض تیار کر رکھا تھا جس میں اپنے مریدوں کے مردہ جسموں کو ڈلوا دیتا تھا۔ اور اپنے پیروؤں کو یقین دلا دیتا تھا کہ وہ مرتے ہی مجسم جنت میں چلے جاتے ہیں۔

جزا کا جاری ہونا کونسا مشکل کام ہے۔ کیا وہ خدا جس نے بے نمونہ عظیم الشان کائنات پیدا کی وہ دوبارہ روحوں کو پیدا نہیں کر سکتا؟ معاف فرمایئے میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ وہ لاکھوں مرتبہ تمام کائنات اور ارواح کو معدوم و فنا اور پھر پیدا کر سکتا ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ ایسی باتوں کو کفر و الحاد سے کیا واسطہ۔ آپ جو باتیں روح سے منسوب فرماتے ہیں میں انہیں حواس انسانی سے متعلق سمجھتا ہوں۔ آپ روح کو غیر فانی و ابدی اور جسم کو فانی سمجھتے ہیں۔ میں روح کو فانی و نابود ہو جانے والی اور جسم کو باقی و ابدی خیال کرتا ہوں۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ روح کسی غیر معلوم قسم کی غیر مرئی باشعور و مدرک چلنے پھرنے اُڑنے والی کوئی شے ہے۔ مجھے یہ یقین ہے کہ روح اختلاط عناصر و ترکیب جسمانی کے بھاپ کی ایک حرارت ہے۔ جو شعور و ادراک ارادہ و اختیار سب سے عاری ہے۔ اور یہ استعدادیں حکیم مطلق نے جسم میں پیدا کی ہیں ادراک و شعور و ارادہ دماغ کے جوفوں میں اور حرکت اور دوسری قوتیں جوارح و اعضا کے اندر ہیں۔ جو سب بہ تابع مشیت الٰہی اپنا اپنا فعل ادا کرتی ہیں۔

اول الذکر نوجوان کی گفتگو اسی جگہ تک پہنچی تھی کہ قریب کے درختوں کے جھنڈ سے ایک تیسرا شخص مقدس صورت سن رسیدہ نمودار ہوا اور حقارت آمیز لہجہ میں بولا کہ میرے نادان دوستو اگر روح باشعور و مدرک صاحب قدرت و اختیار ہے تو کیا اور بے شعور و غیر مدرک و بے حس ہے تو کیا تم دونوں اس بحث سے کونسا اخلاقی نتیجہ حاصل کر سکتے ہو جو ابن آدم کو نفع پہنچائے۔

ایک نادان انسان جب مختلف مظاہر قدرت پر نظر ڈالتا ہے تو اسے ساری کائنات ہی روحوں کا کرشمہ محسوس ہوتی ہے۔ چاند، سورج میں بھی اُسے دیوتاؤں کی روحیں جلوہ گر معلوم ہوتی ہیں اور رات کو تاروں بھری فضا بھی روحوں سے معمور نظر آتی ہے وہ خیال کرتا ہے کہ زمین ایک گائے کے سینگ پر یا مچھلی کی پیٹھ پر رکھی ہوئی ہے۔

سمجھ دار انسان جب انہیں مظاہر قدرت پر نظر کرتا ہے تو وہ ان سب مظاہر کو ایک قاعدۂ قدرت کے ماتحت پاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ یہ سب قانون جذب و کشش کا کرشمہ ہے۔

پہلی قسم کے انسانوں کا خیال ہے کہ کائنات کی کسی شے میں کوئی لزوم نہیں ہے عالم اور ما فی العالم صرف اشارۂ خالق عالم پر قائم ہے۔ وہ جو چاہے تغیر کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ قوانین فطرت محض فریب و دھوکا ہیں۔ کائنات کسی لزوم کی پابند نہیں ہے۔ رشیوں، نبیوں کی روحوں کو کائنات میں بڑے بڑے تصرف حاصل تھے۔ اور ہیں۔ نبی رشی خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ خدا سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ انکو یہ قدرت حاصل ہے کہ سخت چٹان پر ٹھوکر ماردیں تو پتھروں سے پانی کے چشمے ابلنے لگیں۔ سنگ ریزوں سے وہ خطاب کریں تو سنگریزے آدمیوں کی طرح بولنے چالنے چلنے پھرنے لگیں لاٹھی

کا سانپ بنا دیں۔ آدمی کو گدھا بنا دیں۔ گدھے کو جونپور کا قاضی کر دیں۔

دوسری قسم کے شخصوں کی رائے ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں ایک لزومی علاقہ سے مربوط ہیں یہ ناممکن ہے کہ علت بغیر معلول اور معلول بغیر علت پائی جائے کائنات کے تمام کام اسی علاقہ علیت کے تابع سرانجام پاتے ہیں۔ اسی لئے دوسری قسم کے لوگ خوارق عادات و معجزات کا انکار کرتے ہیں لیکن ان مسائل کے انکار یا اقرار سے کونسی قانون شکنی ہوتی ہے۔ اور کس فریق کو مضرت پہنچتی ہے۔ کیا علاقہ علیت کے لزوم و وجوب کے اقرار سے خالق عالم کی خالقیت و حکمت کو بٹہ لگتا ہے۔ یا اس کے انکار سے خدا کی عظمت و تقدیس میں اضافہ ہوتا ہے۔

کیا بغیر خوارق عادات و معجزات تسلیم کئے ہوئے کوئی انسان نیک نہیں ہوسکتا۔ اور کیا بجائے خود کسی انسان کی نیکی و سعادت اس قابل نہیں ہے کہ اس کی تعظیم و تکریم کی جائے۔ ہاں یہ بات ہی دوسری ہے کہ انسان کے نیک چال چلن کی اس وقت تک عزت نہ کی جائے جب تک کہ وہ شعبدہ و متنفی نہ ہو اور انسان کے خیالات اور باتوں کی تو یہ حالت ہے کہ جتنی منہ میں زبانیں اتنی ہی باتیں جتنے دماغ اتنے ہی خیالات ہیں۔ ایک صوفی صاحب فرمایا کرتے ہیں کہ شبلی نعمانی سخت کافر و ملحد تھا اس لئے کہ اس کا عقیدہ تھا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا بھی مثل عام مخلوق کے سایہ تھا۔ ایک اور درویش پاکیزہ کیش فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اس بات کا انکار کرے کہ رسول مقبول کے جسم پر مکھی بیٹھتی تھی وہ کافر ہے۔ اس لئے اے میرے نادان دوستو ایسی باتوں پر ایک کا دوسرے کو ملحد و کافر کہنا سخت بدتہذیبی و نادانی ہے۔ بلکہ ان مسائل پر گفتگو کرنا ہی کج بحثی و بیہودگی ہے یہ کہہ کر بوڑھے شخص نے ایک قہقہ لگایا اور اسی جگہ نظروں سے غائب ہوگیا۔

حکیم محمد ابراہیم

روح غیر فانی ہے اپنے خالق کی طرح (منٹگمری)

سکوت اور تنہائی روح کے بہترین دوست ہیں (لانگ فیلو)

جسم کی طرح روح کو بھی غذا کی ضرورت ہے (جے جی ہالینڈ)

آدمی کی شباہت روح کی تصویر ہے اور آنکھیں روح کے ارادے کو ظاہر کرنیوالی ہیں (سیسرو)

جسم۔۔۔۔ وہ خاک ہے۔ روح۔۔۔۔ باغ ابد کی ایک کلی ہے (کلورویل)

دل ٹوٹ سکتا ہے لیکن روح کو کوئی بلا بھی نہیں سکتا۔ (بولین)

برسات

آئی برسات پھر جگر آئی   دیدہ و دل نے تازگی پائی
تیرہ و تار ابر چھایا ہے   کیا دھواں دھار ابر چھایا ہے
نیلگوں آسمان پر بادل   ایسے پھیلے ہیں جس طرح کاجل
جھومتے فیل مست آتے ہیں   جوشِ مستی سے لڑکھڑاتے ہیں
لغزشیں چال میں ہیں مستانہ   کئے دیتی ہیں دل کو دیوانہ
ابر ہے یا کسی کے گیسو ہیں   خم بہ خم مشک بیز و دلجو ہیں
کبھی کھا کھا کے بل الجھتے ہیں   آپ ہی آپ پھر سلجھتے ہیں
پیچ در پیچ اُڑتے پھرتے ہیں   تہ بہ تہ آسماں پہ گھرتے ہیں
مست و مخمور ہو رہی ہے نظر   نشہ میں چور ہو رہی ہے نظر
ولولے بھر گئے رگ و پے میں   یہ کہاں بات نشۂ مے میں
برق ہیں بیقراریاں دل کی   اُف رے الفت شعاریاں دل کی
مدعائے نظر کہاں پائیں   دل کو ہم لے کے اب کدھر جائیں
ابر کہتا ہے ساتھ چل میرے   آسماں کے لگاؤں گا پھیرے
میں کہ مجبور ہوں کہاں جاؤں   کیوں نہ غم ہی سے دل کو بہلاؤں
جسکو سمجھے ہوئے ہوں میں تقدیر   پاؤں کے واسطے ہے اک زنجیر

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں   جھولا اشجار کو جھلاتی ہیں
جسم سے لگ کے رنگ لاتی ہیں   سر میں بن کر جنوں سماتی ہیں
جوشِ وحشت کا وہ پڑا دورا   ہو گیا دل محیطِ ارض و سما
ہے کہاں فصلِ گل کہاں دل ہے   جوش پر ایک جوش مائل ہے

ڈار بگلوں کی اڑتی پھرتی ہے   جھیل پر گاہ جا کے گرتی ہے
ہے گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ کبھی   جیسے گیسو میں موتیوں کی لڑی
ہیں پھواریں کہیں کہیں جھالے   ندیاں ہیں کہیں کہیں نالے
کہیں بارش کی لگ رہی ہے جھڑی   کہیں کالی گھٹائیں سر پہ کھڑی
کہیں رم جھم کی لے سہانی ہے   کچھ عجب لوچ ہے روانی ہے
ہلکی ہلکی پھوار گرتی ہے   یا مئے خوشگوار گرتی ہے
بڑھ رہا ہے سرور آنکھوں میں   شوق کا ہے ظہور آنکھوں میں
اُف مرے اضطراب کا عالم   دل ہے یا ایک لرزشِ پیہم

موسلا دھار ہے کہیں پانی   جس سے برپا ہے ایک طغیانی
آ کے اس پر ہوا نے زور کیا   رعد نے اور گرج کے شور کیا
کیسا ہیجان ہو گیا برپا   ایک طوفان ہو گیا برپا
یک بیک آسماں پہ توپ چلی   خیر یارب کہیں گری بجلی

لئے پھرتی ہے بادلوں کو ہوا   جیسے انساں کو خواہشِ دنیا
کبھی اُتر سے اڑ کے آتے ہیں   کبھی دکھن میں جا کے چھاتے ہیں
کبھی پورب میں شکل دکھلائی   کبھی پچھم میں چھاونی چھائی
ایک دم ایک جا قرار نہیں   ابر تیرا کچھ اعتبار نہیں

آسماں کا عجیب نقشا ہے   رنگ ہر دم نیا بدلتا ہے
ہے ابھی نو کدورتوں سے صاف   ایک دریائے نیلگوں شفاف

وہ گھٹا آئی ہوگیا اودا　　وہ ہوا آئی سرمہ پھیل گیا

صبح کو اور شام کو کچھ اور　　کچھ عجب رنگ کے ہیں چرخ کے طور

شام کو چھائی جب شفق کی بہار　　ہوگیا سارا آسماں گلنار

کیسا رنگیں فلک کا دامن ہے　　آئینہ دارِ صحنِ گلشن ہے

بدلیاں ہیں کہ یہ حسینیں ہیں　　باغِ جنت کی نازنینیں ہیں

آسماں کی ہوائیں کھاتی ہیں　　کیا ہی رنگینیاں دکھاتی ہیں

ہے تماشائیوں کی موت جگر　　بس ہٹا لو فلک سے اپنی نظر

پھٹ پڑا حسن کوہ و صحرا میں　　جھیل تالاب اور دریا میں

تر و تازہ ہرا بھرا سبزہ　　لہلہاتا ہے جا بجا سبزہ

کس قدر دلربا ہے ہریالی　　ہے دلہن یا درخت کی ڈالی

کشش حسن سبز کا یہ اثر　　جم گئی ہے نگاہ سبزے پر

بیل بوٹے نکھر گئے سارے　　پھول ہیں یاسمیں کے یا تارے

پھول شاخوں میں زرد رنگ کے ہیں　　یا پیالے مئے فرنگ کے ہیں

حسنِ رنگیں غضب ہے گلشن کا　　لوٹ ہے روئے گل پہ نظارا

تتلیاں اڑ رہی ہیں گلشن میں　　رنگ کیا کیا بھرے ہیں دامن میں

زرد ہے کوئی کوئی عنابی　　ہے سنہری کوئی کوئی آبی

سینکڑوں رنگ کے کسی کے پر　　جن پہ بکھرا ہوا ہے سودۂ زر

نرم و خوش رنگ تتلیاں ہیں یہ　　یا گلِ تر کی پتیاں ہیں یہ

یا ادائیں ہیں مہ جبینوں کی　　یا تمنائیں نازنینوں کی

ناچتی پھر رہی فضا میں ہیں　　نہیں معلوم کس ہوا میں ہیں

ہر طرف ہیں سرور کے ساماں　　شاد ہیں وحش و طیر و انس و جاں

کیسی کیفیتوں کا عالم ہے　　حاصلِ زندگی ہے جو دم ہے

جنگلوں میں جھنگارتے ہیں مور　　آہ کس کو پکارتے ہیں مور

دیکھ کر آسمان پر بادل　　ہوتے ہیں فرطِ شوق سے بیکل

عاشقی کی ہوا میں بھرتے ہیں　　مست ہو ہو کے رقص کرتے ہیں

نہیں آزاد ہوتے غیرت سے　　ناچتے ہیں، مگر متانت سے

کس غضب کی تڑپ صدا میں ہے　　درد سا بھر گیا فضا میں ہے

کتنی میٹھی ہے کوک کوئل کی　　قند ہے یا نبات کی ہے ڈلی

ڈالی ڈالی پہ شور کرتی ہے　　کیا حلاوت فضا میں بھرتی ہے

اُف پپیہے نے پی کہاں کہکر　　رگِ جاں پر چلا دیا نشتر

جسمِ دل بن کے ایک زخم بنا　　ٹیس رگ رگ میں ہوگئی پیدا

جو نشاطیں تھیں آفتیں ہیں اب　　رنجِ حرماں کی کثرتیں ہیں اب

میں ہوں یا ایک سوزِ غم کا ساز　　ہر رگ و پے سے آئی ہے آواز

مایۂ زندگی کہاں ہے تو　　میں بھی پہنچوں کہیں جہاں ہے تو

تجھ میں دل اور دل میں تو ہے بھی　　میری آنکھوں سے کیوں نہاں ہے تو

دُور ہے جا ہٹا کے اپنی بہار　　فصلِ گل اک وبالِ جاں ہے تو

ہے کسی مہ لقا کا پردۂ در　　آسماں آسماں کہاں ہے تو

پھر بھی آتا نہیں قرار مجھے　　دل میں ہر چند اک جہاں ہے تو

مرتے مرتے جلا دیا تو نے　　کچھ عجب چیز پی کہاں ہے تو

ضبط کر ضبط کیوں بہکتا ہے
ہوش میں آ جگر کہاں ہے تو

جگر بریلوی

ساحرہ کی بیٹی

وادیٔ نیل پر چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ کبھی کبھی ابر کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑہ چاند کے چہرہ پر ایک ہلکی سی نقاب ڈال دیتا تھا لیکن اس کے ہٹتے ہی ریت کے اس سمندر میں سے کروڑوں ذرات قدرت کے اس دلفریب نظارہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے نظر آتے تھے دریائے نیل اپنے شفاف پانی کو دونوں طرف سے سمیٹتے ہوئے نہایت خاموشی سے بہائے لئے جاتا تھا۔ اور اگر کوئی شوخ موج سر اٹھا کر اس نظارہ کا لطف اٹھانے کے لئے پانی کی روانی میں حارج ہوتی تھی تو وہ اُسے سختی سے کنارہ پر دے پٹکتا تھا

ساحرہ نے جو اپنی خوبصورت بیٹی کے ساتھ ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھی اپنی کشتی کا انتظار کر رہی تھی چیتے کی طرح ایک جست بھری اور کھڑی ہو کر بولی۔

"بیٹی آج تو میری باتوں کو اس دلچسپی اور توجہ سے نہیں سن رہی۔ جیسے پہلے سنا کرتی تھی۔ یاد رکھ انسان کو انسان پر فوقیت بخشنے والا اور کمزور کو طاقتور پر غالب کرنے والا یہی ایک علم ہے جسے آج میں تجھے ودیعت کرنا چاہتی ہوں۔ تیری نظر زمین کو چیرتی ہوئی ان خزائن تک پہنچ جائیگی جن کے مقابلہ میں فراعنہ کے خزانے ہیچ ہونگے تیرا ارادہ ہر اُس آدم کے بچہ کو تابع فرمان کرے گا۔ جسے اس کی ماں نے جنا ہے۔ اور زمین پر ہی کیا موقوف ہے۔ طاغوتِ اعظم کا لاتعداد ہوائی لشکر تیرے احکام بجا لائے گا۔ جسے حوادثِ قدرت میں دخل انداز ہونے کی قدرت حاصل ہے۔ لے، وہ کشتی آن پہنچی۔ آ، میں تجھے انسان کی طاقت سے بالاتر طاقت کا ایک کرشمہ دکھاؤں"۔

کشتی خود بخود کنارے پر آلگی۔ دونوں ماں بیٹیاں اس میں سوار ہوگئیں اور کشتی تیزی کے ساتھ پانی کی مخالف سمت چل پڑی۔

ساحرہ کی بیٹی نرم مخملیں گدیلوں پر لیٹ گئی اُسے معلوم تھا کہ اس کی ماں آج پھر کوئی فوق العادت کرشمہ دکھائیگی جس میں نیل کے کنارہ پر بھوت ناچتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یا مردوں کے لمبے لمبے ڈراؤنے ڈھانچ تلواروں سے لڑتے نظر آئیں گے۔ یا کوئی دیو پانی سے اپنا ہیبت ناک سر نکال کر ساحرہ کو سلام کرے گا۔

ساحرہ نے اپنے بازو مشرق کی طرف پھیلا دیئے۔ اور بلند آواز سے ایک افسون پڑھنا شروع کیا۔ لڑکی نے دیکھا کہ افق پر ایک سیاہ خط کھنچ گیا۔ جو لمحہ بہ لمحہ ان کی طرف بڑھتا چلا آتا تھا۔ یکایک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ اور

بادلوں نے تمام آسمان کو گھیر لیا۔ ہوا زور زور سے چلنے لگی۔ کشتی کے بعض حصوں سے جب یہ ہوا گزرتی تھی تو اس میں سے خوفناک چیخوں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ پانی کی کوہ پیکر موجوں کے تھپیڑے اٹھ اٹھ کر بار بار کشتی کو الٹ دینے کی کوشش کرتے تھے۔ بارش اب موسلا دھار شروع ہوگئی اور بجلی کی پیہم کڑک سے تمام وادی گونج اٹھی۔

لڑکی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "اماں! اب بس کرو ورنہ یہ طوفان ہمیں غرق کر دیگا۔

ساحرہ نے افسون پڑھنا بند کر دیا۔ اور مسکرا کر بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ اس راز کا ایک ادنی کرشمہ ہے جو میرے سینہ میں پوشیدہ ہے"۔

طوفان رفتہ رفتہ ٹھہر گیا۔ بادل چھٹ گئے۔ چاندنی نکل آئی اور وادی نیل پر پہلا سا سکون طاری ہوگیا۔ اب کشتی واپس جا رہی تھی۔

دفعتہً ایک خوشگوار ساز کی سریلی آواز سے وادی نیل گونج اٹھی۔ ریت کا ذرہ ذرہ، دریا کا قطرہ قطرہ، اور افق کی طرف ڈوبتے ہوئے چاند کی ایک ایک کرن اسکی لہروں کے ساتھ وجد کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔

ساحرہ کی بیٹی چونک اٹھی اور دور اس جگہ نظریں گاڑ دیں جہاں ایک چھوٹی سی کشتی میں ایک نوجوان بیٹھا اپنا ساز بجا رہا تھا۔ اُسے یاد تھا کہ پچھلی مرتبہ جب کہ اسی چودھویں رات کو وہ اپنی ماں کے ساتھ دریا کی سیر کو آئی تھی۔ تو عین اسی جگہ یہ نوجوان چیتے کی کھال پہنے اپنے ساز کو بجا رہا تھا۔ کشتی اسی طرح دریا کے بہاؤ کے ساتھ آہستہ آہستہ بہتی چلی جاتی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ اس نے نوجوان کی خوبصورتی اور اس کے کمال فن کی تعریف اپنی ماں سے کی تھی تو اس نے اس صنف کے متعلق جسے مرد کہتے ہیں کس قدر سخت اور درشت الفاظ استعمال کئے تھے اور اسے اپنے خاوند کا قصہ سنایا تھا جس کے ساتھ شادی کرنے کی پاداش میں اس کی تمام ساحرانہ قوتیں یک بیک زائل ہوگئی تھیں۔ اس نے ان عذابوں کی دل ہلا دینے والی داستان کہی تھی جن سے اس نے اپنے خاوند کی جان لی تھی۔ اور آخر اُن ریاضتوں کی تفصیل بیان کی تھی جن کے عمل سے اُس نے اپنی کھوئی ہوئی قوتیں دوبارہ حاصل کی تھیں۔

یکا یک نوجوان کے ساز سے ایک مغموم نغمہ بلند ہؤا۔ فضا مغموم ہوگئی، دریا پر اضطراب سا چھا گیا۔ اور ہوا میں پریشانی سی پیدا ہوگئی۔ ساحرہ کی بیٹی کی آنکھیں نوجوان پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک تار بندھ رہا تھا۔ اب دونوں کشتیاں ایک دوسری کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ ساحرہ کی کشتی کی رفتار سست ہوگئی اُس نے ایک قہر آلود نگاہ نوجوان پر ڈالی ...... ساز کے تار بگڑتے اور نغمہ اکھڑتا معلوم ہؤا۔ ساحرہ کی بیٹی ایک شیرنی کی طرح جھپٹی اور ماں کا منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔ اس کا نغمہ میری رگ رگ میں گونج رہا ہے۔ اس نے کائنات کو

مدہوش کر دیا ہے۔ آماں! وہ تجھ سے زیادہ طاقتور ساحر ہے۔

"اے ساحر اپنے مسحور کو سنبھال" ساحرہ کی بیٹی یہ کہتی ہوئی دریا میں کود پڑی۔ نوجوان مغنی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی کشتی میں کھینچ لیا۔

ساحرہ نے چاہا کہ اپنے افسون کی مدد سے دونوں کو جلا کر خاک کر دے لیکن اس نے دیکھا کہ ملک الاعلیٰ کا ایک ماتحت فرشتہ ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ جب ملک الاعلیٰ سحر کو باطل کرتا ہے تو وہ ساحر کی موت کا پیغام ہوتا ہے۔

نوجوان مغنی نے اپنے ساز کو چھیڑا۔ کائنات ایک مسرور نغمہ سے معمور ہو گئی۔ ساحرہ کی بیٹی کو وادیٔ نیل کا ذرہ ذرہ رقص کرتا ہوا معلوم ہوا۔

مظفر احمد

موسیقی

موسیقی فرشتوں کی زبان ہے (لانگ فیلو)

موسیقی ٹوٹے ہوئے دل کی دوا ہے (سرایے ہنٹ)

کوئی دل ایسا ہے جو موسیقی کو سن کر بہ نہ نکلے؟ (زبی ٹی)

آسمان کی وہ چیز جو زمین پر ہے۔ (رائڈلیسن)

موسیقی ہوا کی شاعری ہے۔ (رچر)

موسیقی کو سن کر میں کبھی خوش نہیں ہوا۔ (شکسپیئر)

اگر انسان کے کان ہوں تو ہر چیز میں موسیقی موجود ہے (بائرن)

مجھے مرتے وقت موسیقی سنا دو۔ اس سے زیادہ مسرت کی مجھے تلاش نہیں (کیٹس)

شاعر کے اس مصرعہ کو میں کلمہ ایمان سمجھتا ہوں کہ "وہ جن کو خدا سے محبت نہیں ہوتی ان کو موسیقی سے محبت نہیں ہوتی" (ڈی ماسے)

ہماری فطرت کی سب سے بڑی چار مادی ضروریات میں سے چوتھی ضرورت موسیقی ہے پہلے غذا پھر لباس پھر جا سے امن پھر موسیقی۔ (بودی)

مغنی مر گیا! . . . . . وہ تمام موسیقی کے مالک کے کچھ قریب پہنچ گیا (لانگ فیلو)

جذبات

ہوتا سب کو دیکھ کے دھوکا بہار کا
اللہ یہ رنگ میرے دلِ داغدار کا

احساس ہی رہا نہ دلِ بےقرار کا
احسان یہ بھی کم نہیں کچھ یادِ یار کا

دیکھا ہے جب سے تیرے رُخِ بے نقاب کو
عالم مری نظر میں ہے فصلِ بہار کا

تیری نگاہِ ناز مسیحا سہی مگر
اب تک وہی ہے رنگ دلِ بیقرار کا

جا اے نسیمِ صبح! مجھے اس سے کیا غرض
اہلِ قفس سے چھیڑ نہ قصّہ بہار کا

دامن ہے داغِ اشک سے سارا بھرا ہوا
مجھ پر ہے یہ کرم ستمِ انتظار کا

صُبحِ فراق! دیکھ ابھی رونما نہ ہو
دِل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا

گلشن میں رنگ و بُو کی مجھے کچھ خبر نہیں
دامن کفن کا ہو گیا دامن بہار کا

پھر سامنا اُسی نگہِ فتنہ گر کا ہے
پھر حال ہے وہی دِلِ حسرت شعار کا

ہے برق پاش خندۂ گُل ہجرِ یار میں
دوزخ سے کم نہیں مجھے جھونکا بہار کا

دل بیقرار، در سے لگی ہے نگاہِ شوق
کیا حشر ہو گا دیکھئے اس انتظار کا؟

صادق شبِ فراق میں اک درد کے سوا
کوئی نہیں شریک دلِ بیقرار کا

صادق - ایوبی

لالۂ صحرا

ڈوبتے ہوئے دن کے پراسرار دھندلکے میں ایک سبک رفتار اونٹنی پر سوار ہوکر اور اپنی لمبی بندوق کو سر سے ذرا بلند رکھ کر میں تیزی کے ساتھ فریب آفریں ریت کے عظیم الشان خاموش بیابان میں سے گزر رہا تھا۔ ایک دفعہ میں نے نکیل کو ذرا کھینچا۔ اور اپنی بائیں طرف مڑ کر ایک نظر کی جہاں ناتا گاما پہاڑ کی چوٹیاں آری کے دندانوں کی طرح اپنے سر اٹھائے کھڑی تھیں لیکن جب میں نے دیکھا کہ صحرا کی ہیبت فزا خاموشی کو توڑنے والی یہاں کوئی چیز موجود نہیں تو میں پھر روانہ ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے نخلستان کے پاس پہنچ کر میں نے اونٹنی کو بٹھا دیا اور خود نیچے اتر آیا۔

میں آہستہ آہستہ سیدی اکبر کے سنسان مقبرے کی جانب چلنے لگا۔ یہ ایک چھوٹی سی گنبددار عمارت ہے جس کی دیواریں کچی ہیں اور جس کی چھت کے نیچے ہمارے ایک نہایت معزز بزرگ محوِ آرام ہیں۔ چادر جو میں نے اوڑھ رکھی تھی میلی شکستہ اور سفر کی وجہ سے داغدار ہوچکی تھی۔ نقاب جو ہمارے گروہ کا ہر آدمی پہنتا ہے پھٹا ہوا اور گرد آلود تھا اور میرے پاؤں میں ایک سخت اور بوجھل جوتا تھا۔ جوتا میں نے مقبرے کے قریب پہنچ کر اتار دیا۔ اور پھر آفتاب زدہ دیوار کے قریب جھک کر میں نے ریت کی ایک چٹکی اٹھائی اور تبرکاً اپنے اوپر ڈال لی۔ مقبرے کی پاک زمین کو چوما۔ اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگا۔ نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ میں بار بار جھک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میری آواز بلند ہونی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ مقبرے کی پُر سکون فضا میں اس کا ایک ایک لفظ صاف صاف سنائی دینے لگا۔

"اے رحیم، اے رحمٰن۔ اے التجاؤں کو قبول کرنے والے۔ اے یوم الدین کے مالک! کل کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے ہم کو اس راستے کی طرف ہدایت کر جو سیدھا ہو۔ جو ہمارے دشمنوں کے شہر ابیا کی طرف جاتا ہو۔ ہمارے بازوؤں میں قوت دے رات کی تاریکیوں میں اور دن کی روشنی میں ہماری رہنمائی کر۔ ہمارے دشمنوں کو تباہ کر۔ اور ان کو الہاویہ سے ہمکنار کر۔ وہی ہاویہ جسے تو نے کافروں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ جہاں اُن کا کھانا زہریلے سانپ ہونگے۔ اور جہاں اُن کی پیاس کھولتی ہوئی رال سے بجھائی جائیگی۔"

یکایک مجھے ایک آہٹ۔ نے چونکا دیا۔ میں نے سانس روک کر کان اس طرف لگا دیئے۔ مجھے خیال پیدا ہوگیا کہ مرد میرے الفاظ کو کسی جاسوس نے سن لیا ہے۔ بے اختیار میرا ہاتھ "تنبیہ" پر جا پڑا جسے میں نے اپنے پہلو میں پیٹی کے اندر لٹکا رکھا تھا۔ وہی لمبا تیز خنجر ہے جسے میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر سکوت ٹوٹا اور ایسا معلوم ہوا جس طرح کوئی گہری

لمبی آہ کھینچتا ہے۔ میں اٹھا اور دوڑتا ہوا عمارت کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہوا میں لہراتی ہوئی سفید قبا کی ایک آخری جھلک عمارت کی تاریکی میں غائب ہو رہی ہے۔ میں بجلی کی طرح اس کے پیچھے جھپٹا اور کوئی بیس قدم کے فاصلے پر پہنچ کر میں نے اپنے دشمن کو پکڑ لیا جو یکایک ہلکی سی چیخ مار کر میرے بوجھل ہاتھ کے نیچے زمین پر گر پڑا۔

میں نے درشتی کے ساتھ گھسیٹ کر اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا اور کہا "اُٹھ لے ابلیس کے بچے! اُٹھ۔"

دوسرے ہی لمحے میں مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا قیدی ایک عورت ہے۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا وہ ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس نے وہ پھولا ہوا سفید پاجامہ پہن رکھا تھا۔ جو عرب کی عورتوں کو جب وہ یہ لباس پہن کر باہر نکلتی ہیں نہایت کریہہ منظر بنا دیتا ہے۔

میں نے اپنا خنجر کھینچ کر کہا "تو نے میری دعا سن لی ہے۔ بول! . . . . . بول! ورنہ سچ کہتا ہوں کہ ابھی خنجر تیرے سینے سے پار کر دوں گا"

لیکن پراسرار عورت نے کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا۔ اور میں نے دیوانوں کی طرح اس کے چہرے کا نقاب پھاڑ ڈالا۔

میں حیران و ششدر کھڑا رہ گیا خنجر میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ نقاب میں سے جو شکل ظاہر ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر خوبصورت تھی۔ اس کے فتنہ خیز حسن کو دیکھ کر میں ایک لمحہ میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ گویائی کی قوت مجھ سے سلب ہو گئی اور پشیمانی مجھ پر چھا گئی۔

اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے اعضا متناسب تھے اور اس کا رنگ سفید تھا۔ اسکی دونوں چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ اور اسکی کشادہ پیشانی کا نصف حصہ سونے کی اشرفیوں کے دھاگوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور جب کبھی وہ اپنے سر کو ذرا سی جنبش بھی دیتی تھی تو ان میں سے موسیقی کی ایک لہر پیدا ہو جاتی تھی اس کے سر پر ایک بھڑکیلی سرخ ٹوپی رکھی تھی جس کے کنارے بے شمار چھوٹے چھوٹے موتیوں کے بوجھ سے جھکے پڑتے تھے۔ اسکی لمبی گردن کو نیم تراشیدہ یاقوت اور فیروزہ کے ہار زینت دے رہے تھے۔ اور اس کی ریشمیں چادر کے شکنوں میں مرمر کی لطیف خوشبو بسی ہوئی تھی۔

آہستہ سے اس نے اپنی غمگین آنکھیں اوپر اٹھائیں جن میں آنسو ابھی تک بہہ رہے تھے۔ میرے غصہ کے خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔ اور اس کا جلد جلد ابھرتا اور گرتا ہوا سینہ لہروں کے مد و جزر سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔

آخر میں نے اپنے درشت اور سخت ہاتھ سے اسکی سفید نازک کلائی کو پکڑا اور کہا کہ اپنی زبان کو ذرا ڈھیلا کر اور مجھے بتا

کہ تو مدینۃ الشمار آفو سے آئی ہے؟ اور تجھے ہمارے حملے کے متعلق بھی علم ہو گیا ہے؟"

اس نے لرزتی ہوئی زبان سے کہا "اے اجنبی تو درست کہہ رہا ہے۔"

میں نے استعجاب آمیز نظروں سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "لیکن تو اپنے گھر سے جو سامنے پہاڑ کی چوٹی پر نظر آرہا ہے تن تنہا اتنی دور کیسے آگئی؟"

اس نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور نہایت متانت سے جواب دیا "میں بھی یہاں اسی مقصد سے آئی ہوں جس مقصد سے تو یہاں آیا ہے۔ میں بھی خدا کی نصرت کو ڈھونڈ رہی ہوں۔"

میں نے کہا "وہ کیا تم کوئی ناقابل تسلیم غم کی سہنے والی ہے کہ تو نے اپنی جان کی پروا نہ کر کے اکیلے یہاں تک آنے کی جرات کی ہے"

وہ ہچکچائی۔ اور پھر گھبراہٹ میں عطر کی اس شیشی کو جو اس کے سینے پر لٹک رہی تھی اور جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے ادھر ادھر ہلا کر اس نے جواب دیا "میں ——— میری منگنی ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جس سے مجھ کو نفرت ہے اور اب صرف اسی رحیم و کریم خدا کا فضل و کرم ہے۔ جو مجھے اس مصیبت سے نجات دے سکتا ہے۔ جسے میں موت سے بدتر سمجھتی ہوں۔"

میں نے کہا "وہ کون ہے۔ جو تجھے اس نارضامندی کے عقد پر مجبور کرتا ہے۔ کیا وہ تیرا باپ ہے؟"

اس نے کہا "ہاں وہ میرا باپ ہی ہے۔ اور اس کا نام عبدالجلیل بن سیف النصر سلطان ابیا ہے"

میں حیرت زدہ لہجے میں بولا "تم سلطان! اور تم خیرا ہو!" کیونکہ سلطان ابیا کی اکلوتی بیٹی خیرا کا غیر معمولی حسن تمام صحرائے اعظم میں ضرب المثل ہو چکا تھا۔

اس نے کہا "ہاں اور تمہاری باتوں سے اور تمہارے لباس سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم قبیلہ ازجر سے ہو جو ہمارے جانی دشمن ہیں!"

میں نے کہا "سچ ہے کل میرے قبیلے کے دس ہزار آدمی جو ہوتنٹ فورو کی وادی میں چھپے بیٹھے ہیں تمہارے مستحکم اور ناممکن التسخیر شہر پر اجتماع کریں گے۔ اور ———"

اس کا رنگ زرد ہو گیا اور فوراً اضطراب میں وہ بول اٹھی "دس ہزار! اور تم میرے باپ کو قتل کر دو گے؟ اور ہماری رعایا کو غلام بنا لو گے؟ آہ نہیں! اے اجنبی! ہمیں بچائے۔ ہماری فوجیں پچھلے چاند پر جنوبی علاقوں سے لگان وصول کرنے گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں ہوئیں۔ اس لئے اس وقت ہم بالکل بے کس و بے بس ہیں۔ آہ میں کیا کروں۔ میں اپنے باپ کو کیسے بچاؤں؟"

میں نے کہا "کیا اگر وہ تمہیں اس ناخوشگوار شادی پر مجبور کرے تب بھی تم اسے بچاؤ گی۔
اس نے کہا "یقیناً۔ میں ۔ ۔ ۔ میں مدینۃ السمار کو اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر بھی بچاؤں گی"
میں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور پوچھا تمہارے باپ نے تمہیں کس شخص سے منسوب کر رکھا ہے"
اس نے کہا "آغا حسن راوی سے جو ناناگا ما پہاڑیوں کے پار ضغرا میں رہتا ہے اسکی عمر ستر سال کے قریب ہے اور سنا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں سے نہایت بے رحمانہ سلوک روا رکھتا ہے۔ خود اس کی ایک لونڈی نے بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی"

میں خاموش ہوگیا۔ طرح طرح کے خیالات نے مجھ پر غلبہ پالیا گو میں ایک ایسے قبیلے کا فرد تھا جس کی گزران صرف کاروانوں اور آس پاس کے شہروں کی لوٹ مار پر ہوتی تھی۔ پھر بھی سلطان کی بیٹی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میرے دل میں اُسے قتل کرکے اپنا راز چھپانے کا خیال تک نہ رہا۔ اور میں نے اپنے آپ کو اسکی محبت میں سرشار پایا۔
میں نے کہا "اے آفتاب کی بیٹی آج رات ہم دوستوں کی طرح ملتے ہیں۔ کل ہم ایک دوسرے کے دشمن ہونگے۔ ہمارے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ تمہارا شہر اس وقت مقابلہ کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور آہ! ہمارے آدمی تمہاری قوم کے خون کے پیاسے ہیں۔ اور تمہاری قوم ہماری جانوں کی دشمن ہے۔ اس لئے جب ازجر کی فوجیں تلوار اور آگ لیکر تمہارے شہر میں داخل ہونگی تو ان کی بے پناہ تباہ کاری سے بہت ہی تھوڑے لوگ بچیں گے کیا تم ہمارے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ رہ کر اس بربادی سے بچنا چاہتی ہو"
اس نے پر غرور انداز سے کہا "نہیں میں آفو کی رہنے والی ہوں اور اپنے لوگوں میں ہی واپس جاؤنگی۔ خواہ تمہاری بے رحم تلواریں کل کا آفتاب غروب ہونے سے پہلے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں"
جب وہ یہ باتیں کہہ رہی تھی اس وقت اس کا ایک ہاتھ اس کی نازک کمر پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس بلند سایہ دار چوٹی کی طرف اشارہ کر رہی تھی جس پر وہ عظیم الشان سفید قلعہ واقع تھا جسے مدینۃ السمار کہتے ہیں۔
میں نے اپنی چادر کو اپنے کندھوں پر لپیٹتے ہوئے کہا "اگر تم جو ستاروں میں چاند کی طرح ہو ہمارے ارادوں سے واقف ہوچکی ہو اور یہ میرا فرض ہے کہ میں تم کو قتل کر دوں"
اس نے کہا "میں تمہارے ہاتھوں میں ہوں اگر تم ان کو میرے خون سے آلودہ کرو گے تو تمہارے ضمیر کی لوح پر ہمیشہ کیلئے اس امر کی یاد باقی رہے گی کہ تم نے ایک ایسی عورت کی جان لی تھی جو کسی سازش یا کسی فریب کی آلودگی سے قطعاً پاک تھی اور اگر تم مجھ کو آزاد کردو گے تو مجھے اپنے لوگوں کے درمیان آرام اور آسودگی کی کم از کم ایک آدھ مختصر ساعت اور مل جائیگی۔

اور اس کے بعد معلوم نہیں کہ ...."

اور اس نے جملہ پورا کئے بغیر ایک آہ کھینچی۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مگر تمہارے لئے جو سرچشمہ حیات کا ایک شگفتہ پھول ہو دو انجام انتظار کر رہے ہیں۔ کل کی شکست اور نئے چاند کے طلوع پر شادی کی تقریب۔ اپنے دل کو تکلیف نہ دو۔ کیونکہ میں تمہیں الزام دینے کے لئے ہرگز اپنی زبان نہیں کھولوں گا۔ قبیلۂ ازجر کے احمد کو تم آیندہ اپنا بہترین دوست پاؤگی۔ جو شاید کسی ایسے طریقہ سے تمہاری مدد کرے جس کا تمہیں خواب و خیال بھی نہیں۔ اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور جتنی جلدی تم آنو پہنچ سکتی ہو پہنچ جاؤ۔ نہیں نہیں۔ لیکن اس سے پہلے نہ جاؤ کہ تم مجھے اس عجیب و غریب ملاقات کی کوئی نشانی نہ دے لو۔"

اس نے کہا "تم نے شفقت اور مروت کے زلال سے میری پیاس کو بجھا دیا ہے۔ مجھے تمہاری طرف دیکھتے ہی خیال پیدا ہوا تھا کہ تم میرے دوست ہو۔"

"دوست؟ — نہیں۔ تم سے محبت کرنے والا۔" یہ الفاظ میرے منہ سے مشتاقانہ انداز سے نکلے اور میں نے اسکا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کر اسکی حنا آلود انگلیوں پر بوسہ دیا۔ حیا کی سرخی اس کے رخساروں پر دوڑ گئی۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ رکھا۔ آخر اس نے اپنی کلائی سے سونے کی ایک چوڑی اتار کر مجھے پہنا دی

پھر اس نے ہنس کر کہا اور اسکی ہنسی میں موج چشمۂ آب حیات کی جنبش تھی۔ "لو اب تم میرے حلقہ بگوش ہو گئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں خوش ہوں کہ میں دنیا کی سب سے زیادہ حسین خاتون کا غلام ہوں" پھر میں نے اسکو سمجھا دیا کہ وہ سلطان کو ازجر کے ارادوں سے متنبہ کردے اور پھر آخری مرتبہ اپنے ہونٹوں کو اسکے ہونٹوں سے ملا دیا اس کے بعد میں نے اسکو سہارا دے کر اسکے آراستہ و پیراستہ گھوڑے پر سوار کرایا۔ اس نے اپنے چہرے سے پھٹا ہوا نقاب ہٹا کر مجھ پر سلام بھیجا۔ اور اس خبر کو لیکر جو کوہستان کے استحکام میں بھی زلزلہ ڈال دے ایک سبک پرواز تیر کی طرح رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔

جب اس کے گھوڑے کے سموں کی ٹاپ ختم ہو گئی تو میں نے کہا آہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے مگر میں اُسے کیسے بچا سکتا ہوں۔ کل جب ہم آنو میں داخل ہونگے اور محلات کو لوٹیں گے تو اُسے غلام بنا لیا جائے گا۔ نہیں! انکے وحشی ہاتھ اسے کبھی نہ چھوئیں گے — کبھی نہیں جب تک میرے دم میں دم ہے۔"

اسی وقت کسی کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھنا شروع کیا۔ جہاں کچھ

جھاڑیوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد میں نے اپنے قبیلے کے چھ آدمیوں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔
کسی نے چلا کر کہا "مخبر کتے تو نے ہمیں دھوکا دیا" میں نے فوراً اس آواز کو پہچان لیا۔ یہ میرا دشمن اور رقیب محمد اسفکی تھا۔

اس کے بعد سب نے بیک آواز کہا "ہاں ہم نے اس حرام کے بچے کو اس عورت سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور ہم نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُن لیا ہے کہ سلطان کو جا کے ارادوں سے مطلع کر دے!"

اسفکی نے چلا کر کہا "جاؤ ہوا کے پروں پر سوار ہو کر جاؤ اور اس کو مار ڈالو کیونکہ صرف موت ہی اس فاحشہ کے منہ پر سکوت کی مہر لگا سکتی ہے"

دو سیہ نقاب پوشوں نے رکاب میں پاؤں رکھا اور اڑتے ہوئے اس طرف روانہ ہو گئے جس طرف خیرا گئی تھی۔
اسفکی جس نے اپنے دوسرے ہمراہیوں سمیت اب مجھے گھیر لیا تھا کڑک کر بولا "بتا کیا تو جانتا ہے کہ غداری کی کیا سزا ہے"؟

میں نے بھاری آواز سے کہا "ہاں"
اس نے کہا "یہ کون عورت تھی جس کے مکر و فریب نے تجھے مسحور کر لیا تھا"
اتنے میں دور سے تین دفعہ بندوق چلنے کی آواز آئی۔ ظاہر تھا کہ ہمارے آدمیوں نے سلطان کی بیٹی کو جا لیا ہے اور اسے مار ڈالا ہے۔

میں نے اپنا سانس روک لیا۔
میں نے فیصلہ کن طریقہ سے کہا "میں اس بات کا جواب دینے سے انکار کرتا ہوں"
اس نے کہا "خدا کی قسم تو ہمارے سردار اور ہمارے قبیلہ کا غدار ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تو خود بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے اس لئے تیری سزا موت ہے"

پھر دوسروں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا "چلو ہمارے پاس شیطان کے اس ملعون بیٹے کے ساتھ بحث کرنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ اسے سامنے درخت کے ساتھ باندھ دو تاکہ گدھ اس کے مردار گوشت کو مزے لے لے کر کھائیں"
سب کے سب مجھ پر لعنتیں ڈالتے ہوئے پل پڑے۔ انہوں نے میرا نقاب پھاڑ ڈالا۔ میرا چغہ اتار لیا اور ایک کھجور کے درخت سے مجھے اس طرح مضبوط باندھ دیا کہ میری نظروں کے سامنے سوائے صحرا کی ویرانی اور وسعت کے اور کچھ نہ تھا۔ پھر ظلم و جور کے اس مظاہرہ کے لئے جو بادیہ گرد از جبر کی جدت طراز طبیعت کا مایۂ امتیاز ہے انہوں نے

میرے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر کھجور کا رس مل دیا۔ تا کہ کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں مجھے کاٹ کاٹ کر کھا جائیں پھر مجھے ابدی تباہی اور دائمی تعذیب میں گرفتار کر کے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ہنستے ہوئے مجھے اپنے انجام کا انتظار کرنے کیلئے چھوڑ گئے۔

خاموش اور طویل رات کی بھیانک تاریکی میں بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ میں سلطان کی خوبصورت بیٹی کے خوفناک انجام کو سوچتا رہا جس نے میری دعا کے الفاظ سُن لئے تھے۔ میرے قبیلے کے دو آدمی جو اس کے پیچھے گئے تھے ابھی تک واپس نہ ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اعلیٰ درجہ کے سوار ہیں۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد اسے جا لیا ہوگا۔ اپنے متعلق میں بالکل ناامید ہو چکا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بہت جلد صحرا کی آگ برسانے والی دھوپ میرے جسم کو جلا ڈالے گی اور کیڑے مکوڑے میرے جسم کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔ لیکن میں ہر آواز سننے کے لئے چوکنا ہو رہا تھا دور مشرق میں ریگستان کے کنارے پر ایک زعفرانی شعاع طلوع آفتاب کا اعلان کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ میں دیکھتا رہا کہ وہ رفتہ رفتہ تمام آسمان پر محیط ہو گئی۔ یہ میں جانتا تھا کہ ہر وہ لمحہ جو گزر رہا ہے مجھے میرے المناک انجام کے قریب تر لیجا رہا ہے میں نے اپنی آواز کو خدا کی استعانت کے لئے بلند کر دیا اور اس مہم کیلئے جس پر میرے قبیلے کے لوگ آج جانیوالے تھے ہزاروں لعنتیں بھیجنے لگا۔ خیرا کا زرد حسین چہرہ ایک پل کیلئے بھی میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ وہ اسی طرح میرے سامنے تھی جیسے کوئی دھندلا سا خواب ہو۔ اس کا حسن مجھے مسحور کئے دیتا تھا اور اس سحر کے اثر سے میں صبح کی ان خوفناک گھڑیوں کی ہیبت کو بھول رہا تھا جو میرے لئے موت کا پیغام لا رہی تھیں۔

ابھی تمام صحرا زعفران زار بنا ہوا تھا۔ ابھی وہاں گلاب کھلنے لگا اور پھر گلاب کی جگہ زر سرخ نے لے لی یہاں تک کہ آفتاب اپنی پوری تابانی سے بے جادہ صحرا پر چمکنے لگا۔ مکھیاں جو اب ہشیار ہو چکی تھیں آ آ کر مجھے دق کرنے لگیں۔ اور میں نے جان لیا کہ سورج کی بے رحم شعاعیں اپنی گرمی سے میرے دماغ کو مختل اور مجھے مجنوں بنا دینگی جوں جوں دوپہر قریب آتی گئی دھوپ کا آتشدان تیز ہوتا گیا۔ روشنی کی شدت نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا۔ اس لئے مجبوراً میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

یکایک میرے کانوں میں شور کی سی آواز آئی پہلے تو ایسا معلوم ہوا جیسے دور سے کوئی ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دے لیکن میرے عادی کانوں نے جلد ہی سمجھ لیا کہ یہ بندوقوں کے سر ہونے کی آواز ہے۔

مدینۃ السما پر حملہ ہو رہا تھا۔ ازجر نے اسی وقت حملہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن جس بات سے مجھے حیرت ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ بار بار توپوں کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ آنے والے مدافعت

لیکن جس مقام پر میں بندھا ہوا تھا۔ وہاں سے مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی آٹھ میل کا رستہ تھی اور شہر تک جو اس چوٹی کے اوپر آباد تھا۔ دوسری طرف سے ایک دشوار گزار راستہ جاتا تھا۔ تاہم ساعت بہ ساعت توپوں اور بندوقوں کے شدید حملوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نہایت زبردست جنگ جاری ہے۔ اور اس بات نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ کیونکہ خیرا نے کہا تھا کہ شہر قطعاً مدافعت کے قابل نہیں۔ بہرحال جنگ کے ہنگامے نے مجھے بالکل بےحواس ہوجانے سے بچا لیا۔ اور جب تک آفتاب نے خونِ شفق میں ایک ڈبکی نہ لگالی توپیں اور بندوقیں آگ برساتی رہیں اس کے بعد پھر ایک عالمگیر خاموشی چھا گئی۔ صحرا کی جھلس دینے والی سموم سے کھجور کے درختوں کی ٹہنیاں ماتمی طروں کی طرح لہرانے لگیں۔ اور رات کا سایہ بڑھنے لگا۔ چیونٹیوں کے عذاب، دماغ پر دھوپ کی گرمی کے اثر۔ بھوک، پیاس اور اعصاب پر مسلسل بوجھ پڑنے سے میں بہت مغلوب ہوگیا اور جب مجھے نیند آئی تو مجھے متوحش خواب نظر آنے لگے اور اپنے ناگزیر انجام کی ہیبت نے مجھے ذرا دم نہ لینے دیا۔ وہی ہیبت جو دوسرے الفاظ میں موت کا پیغام تھی۔

دوسری رات اسی حال سے گزری یہاں تک کہ پھر آفتاب طلوع ہوا لیکن میری آنکھیں اب تک نہ کھلیں جلتی ہوئی دوپہر کی گرمی سے مجھے کیا کام تھا اور ان گدھوں سے بھی مجھے کیا کام تھا جو میرے سر پر منڈلا رہے تھے یکایک مجھے کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز آئی اور میں نے اس وقت نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔

ایک آواز جو دوسری تمام آوازوں سے بلند تھی خدا کا شکر بجا لا رہی تھی میں اسکو سنتا رہا۔ پھر میں نے اپنی تمام اس طاقت کے ساتھ جو مجھ میں باقی تھی اس ایک رحیم و کریم خدا کے نام پر ان کو مدد کے لئے بلایا۔

مجھے ان لوگوں کے تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد حیرت و استعجاب کی آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ آس پاس کی تمام چیزوں کی ہیئت مجھے تبدیل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ تمام صحرا مجھے گھومتا ہوا معلوم ہوا اور پھر مجھے کسی بات کی خبر نہ رہی۔

جب میں نے دوسری مرتبہ اپنی تھکی ہوئی بخار آلود آنکھیں کھولیں تو میں نے اپنے آپ کو ایک عالیشان کمرے میں ایک نرم ریشمین بستر پر دیکھا۔ میرے آس پاس کتنے ہی خدام کھڑے تھے جو میری ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار تھے۔ میں نے ایک بلورین گلاس میں سرد پانی کے دو گھونٹ ان سے لیکر پیئے اور پھر اٹھ کر ان سے پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔ خدام نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ جھک کر مجھے سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ چند منٹ کے

بعد ریشم کے "فرو فرو" نے مجھے چونکا کر دیا۔ اور ایک دوسرے لمحے میں میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ انتہائے مسرت میں میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور میں نے دوڑ کر خیرا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

حرم کے زرق برق لباس میں جو گلابی ریشم سے بنا ہوا تھا۔ وہ نہایت دلفریب معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی اس کی آنکھوں کے گرد گزشتہ چند روز کی کوفت کے باعث سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک بلند بالا قامت کا شخص جس کی وضع وقطع نہایت شاندار تھی کمرے میں داخل ہوا اس نے اعلیٰ درجہ کی ریشمیں قبا پہن رکھی تھی اور اس کی دستار میں ایک بہت بڑا ہیرا چمک رہا تھا۔ خیرا اسے دیکھتے ہی میری آغوش سے الگ ہو گئی اور اپنے باپ سلطان ابیا سے میرا تعارف کرایا۔

سلطان نے پرجوش مصافحہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "میری زندگی اور میری سلطنت تمہارے ہی احسان کی بدولت ہے۔ خیرا نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کے ساتھ کیسا رحیمانہ سلوک کیا۔ اور یہ تمہاری ہی تنبیہ کا نتیجہ ہے کہ ہم ازجر کو شکست دے کر اپنے ملک سے نکالنے کے قابل ہو گئے"۔

میں نے خیرا سے مخاطب ہو کر کہا "اے دریائے لطافت کی موج! کیا تو ان سے بچ کر نکل گئی تھی؟"

خیرا نے کہا "ہاں مجھے تمہارے دو سواروں نے آہی لیا تھا، مگر میں نے خفیہ راستہ اختیار کر لیا۔ اور وہ بھٹک کر دوسری طرف نکل گئے"۔

سلطان نے کہا "تقدیر کے مالک خدا نے ہمارے سپاہیوں کے دلوں کو ہماری نازک حالت سے آگاہ کر دیا اور وہ اسی رات واپس آگئے۔ خدا کی نصرت کی ہوا چلی۔ اس کی مہربانیوں کا آفتاب چمکا۔ جو خبر خیرا لے کر آئی تھی اس پر فوراً عمل درآمد کیا گیا۔ اور شہر کی مدافعانہ تدابیر اس قدر مستحکم ہو گئیں کہ دوپہر کے وقت جب حملہ ہوا۔ تو ہماری توپوں نے تمہارے قبیلے کے آدمیوں کو اس طرح اڑا دیا۔ جس طرح باد تند و تیز ریت کے ذروں کو اڑا لے جاتی ہے پورے چھ گھنٹے تک وہ لڑتے رہے۔ لیکن شہر کے دروازوں کو توڑنے کے متعلق ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں بیشمار قتل ہوئے۔ مٹھی بھر آدمی جو بچ رہے تھے مقابلہ ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ پانچ سو کے قریب قیدی ہمارے ہاتھ آئے جن میں تمہارا شیخ بھی تھا۔

میں نے مختصر طور پر اپنی سرگزشت انہیں سنائی کہ کس طرح میری اور خیرا کی گفتگو سن لی گئی تھی۔ اور پھر پوچھا کہ اس قید جانکاہ سے آخر میری خلاصی کیونکر ہوئی۔

خیرا نے کہا لڑائی کے دوسرے دن ہم سب سیدی اکبر کے مقبرے پر خدا کا شکر ادا کرنے گئے تھے اور وہاں ہم نے

تمہیں تپش اور پیاس کی شدت سے دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ تم نے ہمارے بادشاہ اور شہر کو بچانے کے لئے قربانی کی تھی۔ اس لئے ہم تمہیں یہاں لے آئے"۔

سلطان نے میرے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور کہا "دنیر ے قبضے میں زندگی کے سبزہ زاروں کی شادابی ہے۔ خدا تجھے مصیبت سے بچائے۔ اور تجھے کامل آرام و آسائش کے ساتھ سالہا سال تک زندہ رکھے اور تجھے مسرت و شادمانی کے ہمیشہ رہنے والے باغات مرحمت فرمائے۔ درد و کلفت کا زنگ اپنے دل کے آئینہ سے صاف کر دے۔ اور میرے ساتھ آ کہ اس فتح کی خوشی میں ایک دعوت تیار ہے"۔

اور ہم محلات کی عظیم الشان بارہ دریوں میں سے گزرتے ہوئے جو سنگ مرمر اور سونے سے تیار کی گئی تھیں ایک رفیع و عظیم دیوان میں پہنچ گئے۔ جہاں شاہی شامیانے کے نیچے کھڑے ہو کر جو زرد رنگ کے زربفت سے بنا ہوا تھا۔ سلطان ایبا نے مجھے اپنی عنایات سے سرفراز کیا۔ اور میرے نام کا اعلان یوں کیا:۔ احمدو۔ قوم ازجر کا ایک فرد۔ اور مدینۃ السما کا نجات دہندہ۔

آخر میں کئی ماہ تک مقیم رہنے کے بعد میں نے اپنی قوم کے لوگوں سے صلح کر لی۔ اور ان کے پاس واپس چلا گیا۔ کیونکہ ریت کے ناپیدا کنار سمندر کی آزاد زندگی مجھے محلات کے آرام و آسائش اور شاہوں کے لطف و عنایات سے زیادہ بھاتی تھی۔

منصور احمد

(ولیم لی کوئیکس)

محبّت

محبت موت کی مانند زبردست ہے۔ اسکی لویں آگ کی لوہیں ہیں۔ پانیوں سے وہ بجھ نہیں سکتی اور طوفانوں میں وہ ڈوب نہیں سکتی۔ (سلیمان کی غزل الغزلات)

محبت مر نہیں سکتی اور نہ ہی بدل سکتی ہے۔ خواہ سارا جہان بدل جائے۔ (ایچ کالرج)

کسی کی محبت کی حقارت نہ کرو خواہ وہ کیسا ہی حقیر کیوں نہ ہو محبت ایک گنج شایگاں ہے۔ (جارج ہربرٹ)

محبت کی تکلیفوں میں دوسری تمام آسائشوں سے زیادہ حلاوت ہے۔ (جان ڈرائیڈن)

محبّت

محبّت خوابِ حسنِ لم یزل ہے — محبت دورِ صہبائے ازل ہے
محبت ساحلِ بحرِ فنا ہے — محبّت جوہرِ آبِ بقا ہے
محبّت جلوۂ دار الحرم ہے — محبت نغمۂ بیت الصنم ہے
محبّت شمعِ نورِ مشتعل ہے — محبّت گوہرِ دریائے دل ہے
محبّت دامِ عنقائے نظر ہے — محبّت مایۂ اہلِ بصر ہے
محبّت مکتبِ علمِ نہاں ہے — محبت نقشِ مہرِ کن فکاں ہے
محبت منزلِ ایثارِ حق ہے — محبت جذبۂ اظہارِ حق ہے
محبت حاصلِ کارِ جنوں ہے — محبّت شرحِ اسرارِ جنوں ہے
محبت جامِ وحدت کی جھلک ہے — محبّت باغِ عرفاں کی مہک ہے
محبت نام ہے صدق و صفا کا — محبّت کام ہے اہلِ وفا کا

محبت سے ہوئی ہے استواری
وگرنہ روح کو تھی بے قراری

خوشا اے فیضِ دردِ عشقِ کامل — نشاطِ جاوداں ہے تجھ سے حاصل
مٹائی جب سے تو نے خود پرستی — رہا باقی نہ فکرِ اوج و پستی
اطاعت نفس کی تھی اپنا پیشہ — عدو کو دوست رکھتا تھا ہمیشہ
برنگِ شعلہ تھا سرگرمِ رحلت — بساطِ عنبر تھی میری حقیقت
بہت تھی عشرتِ فانی پہ نازش — نہ سمجھا تھا کہ ہستی کو ہے لغزش
حباب آسا ہے اپنی زندگانی — فشارِ غم سے دل ہے پانی پانی
عناصر ہیں بہم دست و گریباں — نہیں ممکن ثباتِ بزمِ امکاں
زمانہ اپنے مرکز سے جدا ہے — خبر جس کی نہیں وہ مبتلا ہے
ولیکن عشق سے ہیں جو کہ سرشار — نظر آتا ہے اُن کو جلوۂ یار

اٹھا کر آنکھ دیکھو تو خدارا
درخشاں ہے محبت کا ستارہ

سیّد امیر احمد شاب

اماں! تو ڈر جاتی ہے جب میں خواب کی حالت میں مسکرا اُٹھتا ہوں، تو نہیں جانتی کہ میں کیوں مسکراتا ہوں تو مجھے مسکراہٹ سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن تجھ کو کیا معلوم کہ میں اس وقت کس کو دیکھ کر مسکراتا ہوں؟

اماں! تو مجھے کھلی فضا میں لٹا دیتی ہے اور میں چندا ماموں کو دیکھ کر کھکھلا پڑتا ہوں اور اس کو اپنی مٹھیوں میں لے لینا چاہتا ہوں تو تو ہنستی ہے اور میری اس حرکت کو بچپن پر محمول کرتی ہے۔ لیکن آہ تجھ کو کیا خبر کہ میں اس سے کیا سرگوشی کرنا چاہتا ہوں؟

اماں! جب تو مجھے گلاب کا پھول پکڑا دیتی ہے اور میں اس کی پنکھڑی پنکھڑی جدا کر دیتا ہوں تو تو خفا ہو جاتی ہے اور مجھے نفرت زا نظروں سے دیکھنے لگتی ہے لیکن تجھے کیا معلوم کہ میں اس کی پنکھڑیوں کو جُدا کر کے کونسا راز سربستہ معلوم کرنا چاہتا ہوں؟

اماں! جب بجلی چمکتی ہے یا بادل گرجتا ہے اور میں اچھل پڑتا ہوں تو تُو مجھے سینہ سے لگا لیتی ہے تو سمجھتی ہے میں ڈر گیا۔ لیکن تجھے کیا معلوم کہ میں کس عجیب خیال سے تھرا اُٹھتا ہوں؟

اماں! جب میں مسکراتا ہوں تو تُو خوش ہو جاتی ہے۔ اور میرا منہ چُوم لیتی ہے۔ تو سمجھتی ہے کہ تیرا بچہ تجھ کو دیکھ کر مسکرا دیا ہے۔ لیکن تو کیا جانتی ہے کہ مسکراہٹ کے جذبہ سے میں کس لئے ہم کنار ہوتا ہوں؟

اماں! جب میں نئی چیز دیکھ کر ہنستے ہوئے ہمک کر آگے بڑھتا ہوں اور اُسے جلد سے جلد چھو لینا چاہتا ہوں تو تو میری اس کوشش کو میری شوخی سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن تجھے کیا معلوم کہ میرا دل اس وقت کس چیز کے لئے بیقرار ہوتا ہے؟

امّاں ! جب میں تیرے بال پا جاتا ہُوں اور انہیں دونوں ہاتھوں سے نوچتا ہُوں تو تو مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتی ہے اور انہیں چھڑانا چاہتی ہے۔ لیکن آہ تجھ کو نہیں معلوم کہ میں اُن کو پکڑ کر اُن پر کیوں غور کرنا چاہتا ہُوں۔

امّاں ! جب میں کسی کوشش ناکام سے تھک جاتا ہُوں اور رو دیتا ہُوں تو تو مجھے طرح طرح سے بہلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور میرے رونے کو میرے رنج کا اثر خیال کرتی ہے۔ لیکن آہ تو نہیں جانتی، کہ میں اپنے اندر کیا طاقت پیدا کرنا چاہتا ہُوں ؟

امّاں ! جب میں بگڑ جاتا ہوں اور رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لیتا ہُوں تو تو گھبرا اُٹھتی ہے۔ اور میرے رونے کا سبب میری ضد خیال کرتی ہے۔ لیکن تجھ کو کیا معلوم کہ میں تیری محبت کا امتحان لینا چاہتا ہُوں ؟

امّاں ! جب میں ننھی عمر میں تجھ سے دور اور ہمیشہ کے لئے دور چلا جاتا ہُوں تو تو اسے قہرِ خداوندی خیال کرتی ہے۔ اور مجھ کو مظلوم سمجھتی ہے لیکن تجھ کو کیا معلوم کہ خود تجھ کو صبر کی تلقین دینے کیلئے میں ایسا کرنا پسند کرتا ہُوں ؟

امّاں تو مجھے بے حقیقت خیال کرتی ہے لیکن تجھ کو معلوم نہیں کہ میرے دل میں بھی احساسات ہیں۔ میرا ننھا سا دماغ بھی فطرت کی گلکاریوں سے مستفید ہوتا ہے۔ میں بھی کائنات کے متعلق غور کرتا ہُوں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تو بول سکتی ہے اظہار خیال کر سکتی ہے اور میں یہ نہیں کر سکتا۔

"اخلاق فاطمہ"

محفلِ ادب

سعد زاغلول کے اقوال

مصر کامل آزادی کا مطالبہ کرتا ہے ۔ کیونکہ آزادی قوموں کا پیدائشی حق ہے ۔

اس وقت ہماری حالت کیسی ہی ابتر ہو ۔ مگر ہماری قوم جیسی کوئی بڑی قوم ۔ کبھی اپنی قسمت کی طرف سے ناامید نہیں ہوسکتی ۔

اپنے آزاد وطن میں ایک حقیر فرد رعایا بن کر رہنا مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ اجنبی حکومت کے ماتحت بڑے سے بڑے عہدے پر مقرر ہوں ۔

آزادی کے طلبگار انتہا پسند نہیں ہوتے کیونکہ یہ تو ایک ابتدائی چیز ہے ۔ غلامی پسند کرنے والے البتہ انتہا پسند ہوتے ہیں ۔ کیونکہ غلامی ذلتِ نفس کی انتہا ہے ۔

قوم کی روح نہ جنگی توانین سے مغلوب ہوسکتی ہے ۔ نہ ظلم سے نہ دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت سے ۔

ابنائے وطن تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ میری نگرانی کرے ۔ صرف سعد ذمہ دار نہیں ہے ۔ وطن کا ہر فرد ذمہ دار ہے

یہ دیکھ کر میری مسرت بے حساب ہوجاتی ہے کہ مصر میں صرف ایک ہی فرقہ موجود ہے ۔ اور وہ مصری قوم ہے ۔

سعد مر کر بھی ہمیشہ زندہ رہے گا ۔ کیونکہ ہر مصری سعد ہے ۔ بلکہ سعد سے بھی زیادہ ۔

میرے دل میں نہ حسد ہے ۔ نہ کینہ ہے ۔ میرے دل میں قومی امانت نے کسی چیز کے لئے بھی جگہ نہیں چھوڑی ۔

جو قوم اپنے فرزندوں کا خون اس لئے بہتے دیکھتی ہے کہ وہ آزادی چاہتے ہیں اور پھر خاموش رہتی ہے ۔ وہ یقیناً آزادی کا استحقاق نہیں رکھتی ۔

شریر قوت نے جو کچھ جمع کیا ہے بکھر جائیگا ۔ طمع نے جو کچھ جوڑا ہے سب ٹوٹ جائیگا ۔ جس کی بنیاد جھوٹ پر ہے وہ یقیناً گر پڑے گا ۔

کسی زمانہ میں بھی ضرورت قانون نہ تھی ۔ کسی وقت بھی قوت حق کا معیار نہ تھی ۔

ہر ظلم اپنے دامن میں مظلوم کے لئے خوشخبری اور ظالم کے لئے سزا چھپائے ہوتا ہے ۔

"الہلال" ۔ کلکتہ

جوگی کی صدا

یہ ستھری ستھری آنکھیں   یہ لمبی لمبی پلکیں
یہ تیکھی تیکھی چتون   یہ سندر سندر درشن

مایا ہے سب مایا ہے

یہ گورے گورے گال   یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن   یہ ابھرا ابھرا جوبن

مایا ہے سب مایا ہے

کل جھوٹا ہے سنسار   اک سچا سرجن ہار

بچے اور بڑے

(۱)

دیکھا گیا ہے   گودی میں سوتے
سپنے میں بچے   ہیں سارے ہنستے
دیکھا گیا ہے   گودی میں سوتے
اُٹھنے پہ بچے
ہیں سارے روتے

(۲)

دنیا کے نقشے   ہیں خواب سارے
دھوکے میں جن کے   ہیں سارے ہنستے
لیکن جب اُٹھتے   خواب گراں سے
بچے ہوں جیسے
ہیں سارے روتے

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)   "اردو" اورنگ آباد دکن

ساون کے گیت

مرد کہتے ہیں عورتیں شعر و شاعری نہیں سمجھتیں نہ اُن کے پاس تخیل کی باریکیاں دیکھنے والی آنکھ ہے لیکن اُن کے گیتوں میں شاعری کی روح موجود ہے۔ انہیں سن کر کسی صاحب دل پر جذبے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ہم ساون کے دو گیت درج کرتے ہیں جو پورب کی دیہاتی ہندو عورتیں گاتی ہیں۔

(۱)

دھیرے بہو ندیا تیں دھیرے بہو   میرا پیا اتار دے پار۔ تیں دھیرے بہو

کاہن کو نوری نیارے ۔ کا ہے کو کرو وار کہاں تو رانیا کھویا کی وھن اترے پار

دھیرے بھو ندیا تیں دھیرے بھو

دھرمیں کے موری نیارے ست کو لگی کروا سیّاں مورا نیا کھویا ۔ ہم دھن اُترب پار

دھیرے بھو ندیا تیں دھیرے بھو

ترجمہ ۔ اے ندی کے پانی آہستہ آہستہ بہ ۔ میرا شوہر پار اتر رہا ہے ۔

تیری ناؤ کس چیز کی ہے ؟ اس کا پتوار کاہے کا ہے ۔ تیری ناؤ کا ملاح کون ہے ؟ اور اُسے پار لگانے والی عورت کون ہے ؛

میری ناؤ دھرم کی ہے ۔ اس کا پتوار پاکیزگی اور عصمت کا ہے ۔ میرا شوہر میرا ملاح ہے اور میں اُسے پار لگانے والی عورت ہوں ۔

اے ندی کے پانی آہستہ آہستہ بہ ۔ میرا شوہر پار اُتر رہا ہے ۔

(۲)

ٹٹھی مڑیا بنیاں ٹپکئی رے کے سدھ لیو ہمارا

جیٹھا چھوا وہیں آپن بنگلا

دیورا چھوا وہیں چاؤ پار

ہمرا مندروا کے نہ چھوائی ہیں جیکر پیئوا بدیس

ٹٹھی مڑیا بنیاں ٹپکئی رے

ترجمہ ۔ ایک عورت جس کا خاوند پردیس میں ہے ۔ حیران ہو کر سوچ رہی ہے ۔ کون ہماری سُدھ لیگا ؟ جھونپڑا اٹوٹ گیا ہے ۔ چھت ٹپک رہی ہے پانی کی بوندیں رات کو بھی سونے نہیں دیتیں ۔ ہماری سدھ کون لے گا ؟

جیٹھ اپنے بنگلے کی مرمت کر رہا ہے ۔ دیور کو چوپال کی فکر ہے ۔ میرے جھونپڑے پر نئی چھت کون ڈالے گا ۔ جس کا شوہر پردیس میں ہے ۔

ان گیتوں میں کتنی محبت ہے ، کتنا درد ۔ الفاظ سادہ ہیں لیکن ان کے معانی نہایت گہرے ہیں ۔ ان میں عورت کا دل ہے ۔ عورت کا درد ہے ، ان میں عورت کا جذبہ ہے عورت کا پیار ہے ۔ ذرا اس منظر کا خیال کرو ۔ جب معصوم عورتیں اپنی شیریں اور دلکش آوازمیں جذبات کے یہ ہوش ربا گیت گاتی ہونگی تو کیا ہوتا ہوگا ؟

ھ سرسوتی ۔ الہ آباد (ہندی)

بارش

بارش ہو رہی ہے آسمان سے پانی برس رہا ہے۔ لوگ اوپر کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر اپنے اپنے دنیوی کام میں محو ہو جاتے ہیں۔ مگر میرے سینہ میں قدرت کے اس تماشے سے ہلچل مچ جاتی ہے۔

یہ بارش نہیں ہے کسی دکھیا کا سینہ پھٹ گیا ہے اور سینہ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لوگ اسے بادل کی کڑک سمجھتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ یہ اُن کی غلطی ہے۔

یہ بجلی نہیں ہے کوئی عاشق جانباز اپنے معشوقِ دلنواز کے ہجر میں تڑپ رہا ہے اور اس کی پریم کٹاریوں سے گھائل ہو چکا ہے۔

یہ پانی کے قطرے نہیں ہیں کسی بدنصیب کے آنسو ہیں۔ انہیں معمولی بوندیں نہ سمجھو یہ خون جگر ہے جو سفید ہو کر بہ نکلا ہے۔ یہ بوندیں ٹھنڈی نہیں ہیں۔ ان میں قیامت کی حرارت ہے۔ انہیں حقیر قطرے نہ سمجھو ان میں غضب کی طاقت پنہاں ہے۔

ذرا آسمان کی طرف تو نگاہ اٹھاؤ یہ کہر نہیں ہے کسی ناکام آرزو کے دل کی گرم آہیں ہیں جو آسمان پر چھا گئی ہیں اور ان میں حسرتوں کے خون کی لالی ہے جو چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔

یہ بادل نہیں دوڑ رہے۔ جنت کے لافانی فرشتے ہیں۔ جو زمین کے کسی نامراد بیٹے کی بدنصیبی دیکھ کر اُسے تسلیاں دینے آتے ہیں۔

یہ ہوا نہیں ہے اس کے دل کے ارمان ہیں جو پامال ہو کر آسمان پر جا پہنچے ہیں۔ اور اس سے پرے بھاگے جاتے ہیں۔ مگر کیا ان کو پناہ کی جگہ ملے گی؟

بارش ہو رہی ہے۔ دنیا کے سمجھدار آدمی اوپر کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر اپنے دنیوی کام میں محو ہو جاتے ہیں مگر قدرت کا یہ دلدوز منظر میرے سینہ میں جذبات کا تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔

ثناءؔ احمد آباد (گوجرانی)

وَقت

تین حرفوں کا چھوٹا سا لفظ! لیکن کتنا عظیم، کتنا بیش قیمت اور کتنا وسیع۔ یہ دنیا کا ہمزاد ہے۔ دنیا کا کونسا خوشگوار اور کونسا دلدوز منظر ہے جو اس نے نہیں دیکھا اور دنیا کا کونسا لطف ہے جو اس کے پہلو میں نہیں ہے۔ ذرا اپنے سامنے

دیکھو گھڑی کی ٹک ٹک ایک چیز کو لاتیں مار کر پیچھے پھینک رہی ہے۔ اور آپ آگے قدم بڑھائے چلی جاتی ہے۔ یہی وقت ہے۔ چارپائی پر اونگھ کر، لایعنی اور بے معنی گپیں ہانک کر، سڑکوں پر بغیر مقصد و مطلب کے گھوم کر ہم لوگ جس شے کا گلا گھونٹتے رہتے ہیں یہ وہی وقت ہے ہر دم گزرتا رہتا ہے۔ دن کو بھی رات کو بھی۔ کبھی نہیں رکتا۔ کبھی نہیں ٹھہرتا۔ ان تھک مسافر کی طرح ہمیشہ ایک ہی رفتار سے چلتا رہتا ہے گویا اس کی کوئی قیمت ہی نہیں لیکن تاہم یہ ایک ناقابل تردید صداقت ہے کہ قدرت کے خزانہ میں اور جنت کی نعمتوں میں اس سے اچھی چیز اور کوئی نہیں ہے۔ اس وقت کی قیمت کسی سے اس وقت پوچھو جب اس وقت کا وقت گزر چکا ہو۔ "کاش میں دو منٹ پہلے پہنچ جاتا۔" اس سے زیادہ جگرخراش فقرہ دنیا میں نہیں۔

یہ چیونٹی کی چال چلنے والا۔ آہستہ آہستہ رینگنے والا وقت بہت بڑا، بہت قدیم ہے یہ اس وقت بھی موجود تھا جب ہماری دنیا پر زندگی نے پہلی دفعہ آنکھ کھولی۔ یہ اس وقت بھی موجود تھا جب انسان معصوم تھا اور خدا اس سے زمین پر آ کر ہم کلام ہوا کرتا تھا۔ یہ اس وقت بھی موجود تھا جب دنیا میں حضرت موسیٰ، حضرت مسیح اور مہاتما بدھ قدرت کی لافانی صداقتوں کا بیان، جھوٹی دنیا کے جھوٹے آدمیوں کے سامنے کرتے تھے اور بے پروا دنیا کے بے پروا بیٹے اُن کا مذاق اڑاتے تھے اور یہ آج بھی موجود ہے۔ جب کہ اُنہی آدمیوں کی اولاد کہتی ہے۔ کاش ہم اس وقت ہوتے تو ان سے یہ سلوک نہ کرتے۔ وقت نے وہ منظر بھی دیکھا ہے۔ یہ آواز بھی سنی ہے۔ لیکن وہ بہت بڑا، بہت حوصلہ مند ہے۔ وہ اس وقت بھی چپ تھا وہ آج بھی خاموش ہے اور آئندہ کے لئے بھی ——— اسی طرح، چپ کی نگاہوں سے سب کچھ دیکھتا ہوا چلتا رہے گا۔ چلتا رہے گا۔ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اور کبھی نہ بولے گا۔

"مانسی" کلکتہ (بنگالی)

انسان کیا کرے؟

انسان اس دنیا میں اپنی مرضی کے بغیر آتا ہے۔ اور اپنی خواہش کے خلاف یہاں سے چلا جاتا ہے اس عرصہ میں اُسے نہ کوئی سمجھتا ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بچپن میں فرشتہ جوانی میں شیطان اور بڑی عمر میں احمق سمجھا جاتا ہے۔ اگر شادی کرے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کی زندگی جانوروں کی سی ہے۔ اگر کنوارا رہے تو کہتے ہیں کہ اس کا چال چلن اچھا نہیں۔ اگر وہ کھانے پینے والا آدمی ہے تو لوگ اُسے خطرناک ہستی سمجھتے ہیں۔ اگر اس کے برعکس ہے تو کہتے ہیں کمبخت بخیل ہے۔ اگر غریب ہے تو فضول ہے۔ اگر امیر ہے تو مغرور ہے۔ اگر خیرات کرتا ہے تو کہتے ہیں،

شہرت کا بھوکا ہے۔ اگر نہیں کرتا تو کہتے ہیں انسان کاہے کو ہے حیوان ہے۔ اگر مذہب میں دلچسپی لیتا ہے تو مکار ہے اگر مذہب سے پرے رہتا ہے تو بندۂ گناہ ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے ہر شخص اُسے چوسنا چاہتا ہے۔ جانے سے پہلے ہر ایک آدمی اُسے ٹھوکریں مارنے کو تیار ہوتا ہے۔ اگر جوانی میں مرجائے تو دنیا کہتی ہے ہونہار تھا۔ اگر زندہ رہے تو اس کے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک ہوتا ہے گویا دنیا میں اس سے بُرا کوئی دوسرا نہ ہوگا۔

"ایفی شینسی" انگریزی (لندن)

سرزمینِ عشق

آ اس ملک کو چھوڑ دیں کیونکہ یہاں انسانیت کا قحط ہماری روحوں کو مضمحل کر رہا ہے!

اس دنیا میں ہم کبھی بھی روحانی آسائش کا لطف نہ اٹھا سکیں گے۔ اس سرزمین سے کبھی بھی خوش نصیبی کا پھول نہیں کھلے گا۔

آ! چلیں، ایک آزاد دنیا کی جستجو کریں! چھوڑ دے اس دنیا کو کہ اس میں ہمارے دل قفس کے اسیر پرندوں کی پھڑک رہے ہیں! بھلا دیں اسکو ہمیشہ کے لئے بھلا دیں!

آ! اس دنیا سے باہر چلیں! کیونکہ ہماری روحوں کے نغمے یہاں کسی کو بھی اپنا ہمصفیر نہیں پاتے! چل ایک ایسی دنیا کی طرف کوچ کر جائیں جہاں روح اور دل دونوں کو اطمینان نصیب ہو!

اس کوچ کے دوران میں ہم مجبور ہونگے کہ بیسیوں ٹیلوں دروں اور خوفناک جنگلوں کو عبور کریں مگر تیرے دل کی پاکیزگی اور میرے روح کی قوت مل جل کر فطرت کی ان سختیوں کے مقابلہ میں ہماری حفاظت کریں گی!

اس کوچ کے دوران میں سینکڑوں خوفناک راستے، ہیبتناک گھاٹیاں اور بے خواب راتیں سامنے آئیں گی مگر تیرے دل کی صفائی اور میرے روح کا صبر و تحمل دونوں ہمیں اس سے نکال بھی لیں گے!

اس سفر میں ہمیں ہزاروں تکلیفیں اور مصیبتیں اپنے تند حملوں کا ہدف بنائیں گی۔ مگر تیرے دل کی مسرت اور میری روح کی متانت دونوں ان کو مغلوب کر لیں گی۔

آ! اس دنیا سے کوچ کر جائیں اور اُس دنیا میں ایک نئی خوش نصیب زندگی کی بنیاد ڈالیں! آ! دل مضبوط رکھ! اور چل اس نئی سرزمین میں! .... سرزمینِ عشق میں!

(ترجمہ از ہرمن) "بہارستان" لاہور

تبصرہ

رسالے

"مخزن" دورِ جدید کا مخزن اپنی قدیم روایات کو تازہ کرنے کے لیے پھر عرصۂ ادب میں آیا ہے اور سچ یہ ہے کہ پہلے سے زیادہ شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے پنجاب کے مشہور شاعر اور ادیب حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری اسکے ایڈیٹر ہیں مخزن کے مضامین نہایت عمدہ متین اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور موجودہ ادبی رسالوں میں یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے حضرت حفیظ مبتذل اور مخرب اخلاق تصاویر شائع کرنے کے سخت مخالف ہیں اس لئے جو تصاویر "مخزن" میں نکلتی ہیں وہ بھی بہت مقبول اور اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے حجم $\frac{20 \times 30}{8}$ سائز کے ۷۲ صفحات قیمت سالانہ للعہ معہ محصول۔ دفتر "مخزن" بھاٹی گیٹ لاہور سے طلب فرمائیں۔

"نورجہاں" ہر ماہ امرت سر سے خواتین کے لئے علم و عمل کا پیغام لے کر شائع ہوتا ہے اس رسالہ کو جاری ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس قلیل مدت میں رسالہ کے حجم اور ظاہری و باطنی خوبیوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ تاریخی، اخلاقی ادبی۔ طبی اور صنعتی ہر قسم کے مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں۔ نورجہاں کے دفتر کا تمام انتظام و انصرام عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور اب کوشش کی جا رہی ہے کہ ادارت کے لئے بھی کوئی لائق اور قابل خاتون مل جائیں تاکہ یہ پرچہ صحیح معنوں میں ایک زنانہ پرچہ بن سکے ہم امید کرتے ہیں کہ یہ پرچہ خواتین کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ حجم ۸۸ صفحات اور سالانہ چندہ پانچ روپے ہے۔ پتہ منیجر نورجہاں امرت سر

"نظام المشائخ" اس رسالہ کا رسول نمبر ہمارے سامنے ہے جو ایک سو سے زائد صفحات پر شائع ہوا ہے رسول کریم صلعم کی مقدس زندگی کے حالات اور عادات و اخلاق پر اسمیں نہایت اچھے مضامین درج ہیں۔ نظام المشائخ اٹھارہ انیس سال سے نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اور اس میں مذہب اخلاق اور تصوف کے مضامین کا نہایت عمدہ انتخاب ہوتا ہے۔ اخیر میں ضمیمہ کے طور پر عام فہم تفسیر القرآن کا کچھ حصہ بھی شامل کیا جاتا ہے سالانہ چندہ تین روپے آٹھ آنے مقرر ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر نظام المشائخ پوسٹ بکس نمبر ۱۵۔ دہلی۔

"عصمت" یہ رسالہ بھی فرقۂ نسواں میں ادب اردو کی خدمت کر رہا ہے مولانا راشد الخیری اس کے سرپرست ہیں اسلئے عصمت کے علمی و ادبی مضامین کا معیار نسبتاً بلند ہوتا ہے۔ رسالہ کے کارپردازوں نے انعامات کا سلسلہ ابھی جاری کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس سال سترہ خواتین کو انعامات دیئے گئے ہیں اچھے مضامین حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ بہت عمدہ ہے۔

کہ مضمون نویسوں کی حوصلہ افزائی کی جائے سالانہ چندہ ۱۲؎ دفتر رسالہ عصمت دہلی سے طلب فرمائیے۔

"نظام کالج اردو میگزین"۔ یہ رسالہ نظام کالج حیدر آباد دکن کی طرف سے سہ ماہی کو شائع ہوتا ہے۔ دکن کے مشہور و ممتاز اہل قلم کے مضامین اس میں چھپتے ہیں۔ کتابت، طباعت اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔ سالانہ قیمت معہ محصول ۱۲؎ ہے۔ مینجر نظام کالج اردو میگزین اسد باغ نظام کالج حیدر آباد دکن سے منگائیے۔

"تبلیغ" جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی طرف سے سید غلام بھیک صاحب نیرنگ کی زیرنگرانی شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مذہبی، اخلاقی اور تبلیغی مضامین کا اچھا ذخیرہ ہے۔ جمعیتہ مذکور تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں نہایت قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ پرچہ بھی تبلیغی مقاصد کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس کام میں سید صاحب کی مدد کریں۔ "تبلیغ" مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوا کرے گا کتابت اور طباعت اچھی نہیں ہے قیمت تین روپے سالانہ ہے مینجر "تبلیغ" انبالہ سے منگائیے۔

"زمیندارہ گزٹ"۔ زمینداروں کی ضروریات کو پورا کرنے اور انہیں نئے نئے معلومات بہم پہنچانے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ایسے رسالوں کی اشد ضرورت ہے، جو اس سادہ لوح طبقہ کو مآل اندیشی کا سبق سکھائے چندہ سالانہ تین روپے رکھا گیا ہے مینجر زمیندارہ گزٹ لائل پور سے مل سکتا ہے

"جنت"۔ اس نام سے ایک نیا رسالہ شہر سیالکوٹ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ مضامین زیادہ تر ادبی ہیں۔ پنڈت کشن چند صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔ مضامین میں ہندوانہ رنگ غالب ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے مقرر ہے ملنے کا پتہ:۔ رسالہ "جنت" سیالکوٹ

کتب

قرآن مجید کا پہلا پارہ۔ سید دلاور علی شاہ اینڈ سنز محلہ پیر گیلانیاں لاہور نے قرآن کریم ہفت رنگ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ پہلا پارہ نہایت آب و تاب سے چھپ کر ہمارے سامنے آچکا ہے ہر صفحہ منقش ہے جلی قلم سے لکھا گیا ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ اور شاہ عبدالقادر صاحب کا موضح القرآن بھی درج کیا گیا ہے۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ کے لحاظ سے یہ پارہ نہایت عمدہ شائع ہوا ہے قیمت دو روپے رکھی گئی ہے۔ مندرجہ بالا پتہ سے مل سکتا ہے۔

بیداری ہند (یعنی کارنامۂ مہاتما گاندھی) اس چار سو صفحات کی مفصل و مبسوط کتاب میں مہاتما گاندھی کے ان تمام [illegible] مضامین کو اردو ترجمہ کرکے یکجا جمع کر دیا ہے جو وقتاً فوقتاً ان کے اخبار ینگ انڈیا میں شائع ہوتے رہے۔ ترجمہ سادہ اور [illegible] ہے۔ کتاب نہایت عمدہ طبع ہوئی ہے۔ امید ہے کہ ہمارے ناظرین جناب مولف لالہ منصدی لال

صاحب ہندی کی محنت کی داد دیں گے۔ قیمت دو روپے کتاب مولف موصوف سے میرٹھ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

غبار افق۔ تحریک ارتداد کی مجمل سی تاریخ ہے اور شدھی اور سنگٹھن کے اغراض و غایات کو اس میں واضح کیا گیا ہے۔ سید غلام بھیک صاحب نیرنگ اس کے مرتب ہیں۔ جمعیتہ مرکزیہ تبلیغ الاسلام انبالہ سے ملتی ہے۔

بنات حرم۔ مرتبہ مولوی محمد دین صاحب فوق۔ اس میں ان مشہور ہندو رانیوں کے مستند تاریخی حالات درج ہیں جو مسلمان بادشاہوں کے محلوں کی زینت بنیں اور بیگمات کہلائیں۔ حجم ۴۰ صفحات قیمت ۸ر

لاہور عہد مغلیہ میں۔ مرتبہ مولوی محمد دین صاحب فوق۔ اس کتاب میں مغل بادشاہوں کے عہد میں لاہور کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ اور عہد مغلیہ کی بعض عمارات اور باغات کے حالات بھی دیئے ہیں۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ر

دونوں کتابیں ظفر برادرس تاجران کتب ظفر منزل لاہور سے دستیاب ہوتی ہیں۔

احمد خال و عزیزہ۔ مصنفہ آقا محمد کرمانی بی، اے مدرس فارسی مدرسہ عالیہ متعلق بہ نظام کالج حیدر آباد دکن جدید فارسی زبان کی ایک نہایت دلکش اور سبق آموز داستان ہے اور جدید اصول افسانہ نگاری کے مطابق لکھی گئی ہے پلاٹ نہایت عمدہ ہے۔ زبان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مصنف ایرانی ہیں۔ اور ادب و انشا کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ملک کو اس کتاب کی قدردانی کرنی چاہئے۔ اور اسے نصاب میں شامل کرنا چاہئے۔ اعلیٰ چکنے کاغذ پر بہت اچھی چھپی ہے۔ قیمت ۱۲؎ ہے۔ مصنف موصوف سے منگائیے۔

شعر و شاعری عرفی۔ مصنفہ آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج حیدر آباد دکن چالیس صفحات میں ہندوستان کے عظیم الشان فارسی شاعر عرفی کی مختصر سوانح عمری اور اس کے کلام پر تبصرہ لکھا ہے کتاب فارسی زبان میں ہے اور طرز تحریر بہت عمدہ ہے۔ مصنف موصوف سے ملے گی۔

درِ ثمین۔ مرتبہ مولوی تصدق حسین صاحب ۴۸ صفحات کی مجلد کتاب ہے۔ اس میں بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی چیدہ چیدہ مقبول انگریزی نظمیں اور متعدد شعرا کے قلم سے ان کے منظوم تراجم درج کئے گئے ہیں۔ مسز نائیڈو کی تصویر بھی کتاب کی زینت ہے قیمت ایک روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ احمد حسین جعفر علی، تاجر کتب چار مینار حیدر آباد دکن۔

ترکان احرار مولفہ محمد عبد المجید صاحب عتیقی قیمت مجلد ۱۲؎ بے جلد ۱۰؎ اس کتاب میں مصطفےٰ کمال پاشا۔ انور پاشا۔ خالدہ خانم، رؤف پاشا، طلعت پاشا کے علاوہ بیس کے قریب دوسرے احرار ترکوں کے حالات نہایت دلچسپ اور سلیس پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ ہے حجم دو سو صفحات سے زائد ہے۔ کامل بک ڈپو رنگ محل لاہور سے طلب فرمائیے۔

جلد ۱۲

فہرست مضامین

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۷ء ۶

تصویر: شاہ جہان کا دربار

جہاںؔ نما

امریکہ اور انگلستان

لندن کے اخبار مارننگ پوسٹ میں صدر جمہوریہ امریکہ ولسن کے ایک مکالمہ کا اقتباس طبع ہؤا ہے جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہؤا۔ ہم اس میں سے مندرجہ ذیل فقرات نقل کرتے ہیں۔ جن میں برطانیہ عظمےٰ اور ریاستہائے متحدہ کے باہمی تعلقات کا تذکرہ ہے۔

"تم ہمارا ذکر چچا کے بیٹے کہہ کر نہ کیا کرو۔ کیونکہ اُن کا درجہ بھی بھائیوں سے کم ہوتا ہے۔ ہم دونوں میں سے کچھ بھی نہیں بننا چاہتے۔ نہ تم ہمیں سیکسن انگریز خیال کیا کرو۔ کیونکہ یہ الفاظ اب ریاستہائے متحدہ کے لوگوں پر اپنے صحیح مفہوم میں عاید نہیں ہوسکتے۔ اور نہ اس سلسلے میں اس بات کو تم کچھ زیادہ اہمیت دیا کرو کہ انگریزی ہماری مشترکہ زبان ہے۔

"انگریزی کو ہم اپنے لئے غیر مفید سمجھتے ہیں مگر وہ ہمارے لئے مفید بھی ہے۔ کیونکہ ہمیں تمہاری کتابوں، تمہارے رسالوں میں سے ان باتوں کا علم ہوتا رہتا ہے۔ جو تم ہماری نسبت کہتے ہو، مثلاً ہماری نسبت یہ کبھی نہیں کہا جانا چاہئے کہ ہم تمہارے خلاف جہاز کے مقابلہ پر جہاز بناتے ہیں۔ فرانسیسیوں اور جرمنوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ کیونکہ جو کچھ فرانسیسی اور جرمن شائع کرتے ہیں اس میں سے اکثر حصّہ لوگوں تک نہیں پہنچتا۔ اور اس لئے کم نقصان پہنچتا ہے۔

"ہاں! صرف دو باتیں ہیں۔ جو تمہارے ملک اور میرے ملک کے درمیان قریبی تعلقات قائم کرسکتی ہیں اور وہ مطمح نظر اور مفاد کی یکسانیت ہے۔

"اگر میں کسی قوم کے متعلق کچھ جانتا ہُوں۔ تو وہ ریاستہائے متحدہ کے لوگ ہیں۔ انہیں ہرگز برطانیہ کا دشمن نہیں کہا جا سکتا لیکن یقیناً وہ برطانیہ کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ اگر ان کو کسی کے حق میں کہا جاسکتا ہے۔ تو وہ فرانس ہے۔

"میں یہ نہیں کہوں گا کہ آیندہ جنگ کا احتمال نہیں۔ مگر جو کچھ میں نے کہا ہے یہ ہے کہ اگر اس جنگ سے ایک ہفتہ پہلے بھی عوام کی موجودگی میں صورتِ حالات پر آزادانہ طور سے بحث کرلی جاتی۔ تو یہ جنگ کبھی نہ چھڑتی۔

"میں وعدہ کرچکا ہُوں کہ موتمر صلح کی تمام کارروائی کو عام کردوں گا۔ اگر میں نے دیکھا کہ کوئی کارروائی پوشیدہ طور پر عمل میں لائی جارہی ہے۔ تو میں اس کی اشاعت کرنے میں نہ رکوں گا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ عوام ایک ایسے معاملہ کے تصفیہ کرنے

ہیں حصّہ لے رہے ہیں اور ان کی حوصلہ فرسائی نہ کی جائے گی۔

"جو تھوڑی بہت خدمت بھی مجھ سے ہو سکے گی اس کے انجام دینے کے لئے میں یورپ آیا ہوں۔ خدائے بزرگ و برتر کی مدد کے بغیر کوئی شخص کوئی باقی رہنے والا کام کوئی عظیم الشان کام انجام نہیں دے سکتا۔ اور کوئی دانشمند انسان خدا کی ہستی کا انکار نہیں کر سکتا۔"

چینی خواتین

چین کی تحریک خواتین کے متعلق عموماً اور ہنکاؤ کے سیاسی مدرسہ خواتین کی نسبت خصوصاً مسز سن یٹ سین نے جو خود اس مدرسہ کی بانی مبانی ہیں۔ ایک ملاقات کے دوران میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ہماری مائیں امریکہ کی عورتوں سے پانچ سو برس پیچھے تھیں لیکن ہماری بیٹیاں اُن سے پچاس برس آگے ہونگی۔ تحریک خواتین کی ان رہنماؤں کا مطمح نظر جو اس وقت ہمارے زیر تربیت ہیں۔ ایک آزاد چینی نسوانیت ہے جس کا آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصّہ ہوگا۔ ڈاکٹر سن یٹ سین کے مدنظر بھی یہی بات تھی کہ ہماری قوم کے نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی آزاد ہونی چاہئیں۔ وہ صرف سیاسی انقلاب پیدا نہ کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ معاشرت کو بھی بدلنا چاہتے تھے۔ خصوصاً جہاں تک اس معاشرت کا تعلق عورتوں سے ہے۔ جہاں جہاں وہ گئے اور انہوں نے کام کیا۔ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کے حقوق کے لئے لڑے۔ اور مشورہ کی مجلسوں میں جہاں سن یٹ سین اور دوسرے کارکن بیٹھے وہیں عورتوں کو بھی جگہ ملی اور آج بھی عورتوں کو مجلس شوریٰ میں وہی نشستیں حاصل ہیں۔ جہاں چین کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔"

آسمان کا نقشہ

چالیس سال سے دنیا کے ہیئت دان اس کوشش میں مصروف ہیں کہ آسمان کی عکسی تصویر لی جائے لیکن اب تک یہ کام درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچا۔

اس عظیم الشان کام کی غرض وغایت یہ ہے کہ ایک ایسا کامل و مکمل نقشہ تیار کیا جائے جس سے آسمان کے روشن ستاروں کے صحیح صحیح مقامات ظاہر کئے جاسکیں بلکہ ان میں وہ ستارے بھی شامل ہوں جو تین انچ کی دوربین سے بخوبی نظر آسکتے ہیں اس وقت ایسی انیس رصدگاہیں ہیں جو دنیا کے مختلف حصّوں میں اس نجومی نقشہ کے بنانے میں مصروف ہیں سب سے پہلے گرین وچ کی شاہی رصدگاہ نے اپنے حصہ کا کام ختم کیا تھا جس کو آج تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت

سے اب تک آکسفورڈ۔ پرتھ (آسٹریلیا) اور کیپ ٹون کی رصدگاہیں اپنا اپنا حصہ ادا کر چکی ہیں)۔

تمام آسمان کا نقشہ تیار کرنے کے لئے بیس ہزار سے کچھ زیادہ تصویریں تیار کرنی پڑیں گی۔ ہر تصویر کے تین تین عکس لئے جاتے ہیں۔ تاکہ شیشے کے اندر کوئی داغ ہو تو اس پر ستارے کا دھوکا نہ ہو جائے۔

اس کام کا دوسرا حصہ ناپنا اور اندازہ لگانا یا روشنی اور مقام دریافت کرنا ہے۔ اس شعبہ میں قریباً نوے لاکھ ستاروں کے متعلق حساب لگانا پڑے گا۔ ہر اندازہ دو دفعہ لگایا جاتا ہے۔ تاکہ غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔

موٹر کی تباہ کاریاں

ریاستہائے متحدہ میں گزشتہ آٹھ سال کے اندر اتنے مرد عورتیں اور بچے موٹر کے حادثات سے ہلاک ہوئے کہ ان سے نیش ول جیسا ایک پر رونق شہر آباد ہو سکتا تھا۔ یا جیسا کہ نیشنل آٹو موبائیل چیمبر آف کامرس کا بیان ہے کہ اموات کی تعداد جنگ عظیم میں امریکن افواج کے نقصانات سے بھی بڑھ گئی ہے۔" گویا جنوری ۱۹۱۹ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک اس ملک میں ۱۳۷۰۱۷ جانیں ضائع ہوئیں۔ اور جنگ عظیم میں ۱۲۰۰۵۰ افراد ہلاک ہوئے۔ ان آٹھ برس میں تقریباً ۳۵۰۰۰۰۰ اشخاص موٹر کے حادثات سے زخمی ہوئے۔ مرنے والوں اور زخمیوں میں چھبیس فیصدی ۱۵ سال سے کم عمر کے بچے تھے۔ پچھلے سال کا اندازہ ہے کہ ۲۳۰۰۰ جانیں ضائع ہوئیں۔ گویا سال گزشتہ کی بنسبت ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔ پٹس برگ کا اخبار "پوسٹ" لکھتا ہے کہ جنگ میں ہماری شمولیت اور ہمارے نقصانات کی خبر سن کر ایک دنیا چونک اٹھی تھی۔ مگر ان ایک لاکھ اور سینتیس ہزار کی کسی نے پروا تک نہیں کی جو ان آٹھ سالوں میں موٹر کے حادثات کی نذر ہوئے۔ یہ ہماری تہذیب کے ماتھے پر ایک کلنک کا ٹیکا ہے۔"

آرام کی گرانی

چرچ آف انگلینڈ کی مجلس قومی کی معاشی اور صنعتی جماعت نے انگلستان میں قمار بازی کی کثرت کے متعلق ایک اعلان شائع کیا ہے جس میں اس کے وجوہ بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اعلان میں اس استفسار کے جوابات ہیں جو انگلستان اور ویلز کے ایک سو منتخب ارکان حکومت کے نام بھیجا گیا تھا۔ جوابات کی اکثریت ظاہر کرتی ہے کہ شرط بازی اور قمار بازی کی کثرت جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی۔ اور اسی زمانے سے عورتوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ وہ اس کی وجہ آرام و آسائش کی زیادتی بتاتے ہیں۔ جس سے اکتا کر یہ لوگ جوش و ہیجان کی طرف اس طریقہ سے مائل ہوتے ہیں۔ "

جوابات ایسے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ سب سے زیادہ قماربازی گھوڑدوڑ میں ہوتی ہے - اس کے بعد فٹ بال میں - اور پھر اس کے بعد معمولی شکلوں میں - یعنی تاش - پاسہ پھینکنا - کتوں کی دوڑ - کبوتر اڑانا اور کشتی چلانا وغیرہ -

ریاضی کا ایک عجیب معمّہ

کیا کوئی اس اصول کی تشریح کر سکتا ہے - جو ریاضی کے مندرجہ ذیل حیران کن معمہ میں پوشیدہ ہے ؟ کوئی سی رقم لے لیجئے جو ۱۱ پونڈ ۱۹ شلنگ ۱۱ پنس سے زیادہ نہ ہو - لیکن شرط یہ ہے کہ پنس کی تعداد پونڈوں کی تعداد سے بڑھنے نہ پائے - اسی رقم کو الٹا لکھ کر مفروضہ رقم میں سے تفریق کیجئے - پھر اس میں حاصل تفریق کے اعداد کو الٹا لکھ کر جمع کر دیجئے - اس طرح جو جواب آئے گا وہ ہمیشہ ایک ہی ہوگا - یعنی ۱۲ پونڈ ۱۸ شلنگ ۱۱ پنس - مثلاً

پونڈ	شلنگ	پنس
۱۱	۱۹	۱۰
۱۰	۱۹	۱۱
۰	۱۹	۱۱
۱۱	۱۹	۰
۱۲	۱۸	۱۱

پونڈ	شلنگ	پنس
۱۰	۱۰	۸
۸	۱۰	۱۰
۱	۱۹	۱۰
۱۰	۱۹	۱
۱۲	۱۸	۱۱

پونڈ	شلنگ	پنس
۶	۶	۵
۵	۶	۶
۰	۱۹	۱۱
۱۱	۱۹	۰
۱۲	۱۸	۱۱

نئی روشنی

دانایانِ فرنگ اب ایک ایسی روشنی ایجاد کرنے والے ہیں جس کے سامنے بجلی کی موجودہ روشنی کی وہی حیثیت رہ جائے گی جو آج کل مٹی کے تیل کی روشنی کو حاصل ہے - اس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کی تپش بالکل مفقود ہوگی - اس ایجاد کا خیال انہیں ان جگنوؤں کی طرف دیکھ کر آیا ہے جو رات کو ہزاروں کی تعداد میں چمکتے نظر آتے ہیں - اور ان لاکھوں مچھلیوں کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے جو سمندر کی تاریک گہرائیوں میں آگ سی لگائے رکھتی ہیں -

شاہجہان کا دربار

دربارِ شاہجہان کی یہ تصویر تاریخی حیثیت سے بڑی قدر وقیمت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں جتنے امرا و ارکان سلطنت شامل ہیں سب کے نام درج کر دیے گئے ہیں۔ اور ان کی یہ تصاویر جو شاہجہان ہی کے عہد کے ایک مصوّر کی بنائی ہوئی ہیں اور اسی لئے معتبر بھی ہیں۔ ہمیں ان تصاویر کے نام مشخص کرنے میں بہت مدد دے سکتی ہیں جو آج کل عجائب خانوں یا لوگوں کے ذاتی مجموعوں میں ملتی ہیں۔

اس تصویر میں بادشاہ کی دائیں جانب آصف خاں کھڑا ہے۔ اور اس کے ساتھ خواجہ ابوالحسن ہے جس کا انتقال ۱۶۳۲ء میں ہوا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ عہد شاہجہان کے کسی ابتدائی دربار کی تصویر ہے جو غالباً فروری ۱۶۲۸ء میں منعقد ہوا جب آصف خاں، داراشکوہ، شجاع اور اورنگ زیب کو لاہور سے آگرہ لایا تھا۔ اور اُسے یمین الدولہ کا خطاب اور ہشت ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ تھا۔

درباریوں کی فہرست حسب ذیل ہے

۱۔ قلیچ خاں تورانی۔ ۲۔ شیخ نذیر۔ ۳۔ راؤ امر سنگھ راجہ گج سنگھ کا بڑا بیٹا۔ ۴۔ گج سنگھ راجہ جودھپور۔ ۵۔ مرزا ابو طالب جو بعد میں شائستہ خاں کے نام سے مشہور ہوا۔ ۶۔ رکن السلطنت خواجہ ابوالحسن تربتی۔ ۷۔ مرزا آصف خاں جسے بعد میں اعتماد خاں، آصف خاں، یمین الدولہ اور خانِ خاناں کے خطابات ملے۔ ۸۔ دولت خاں جسے خواص خاں بھی کہتے تھے۔ ۹۔ شہزادہ داراشکوہ۔ ۱۰۔ شہزادہ شجاع۔ ۱۱۔ شہزادہ اورنگ زیب۔ ۱۲۔ زماں بیگ، مہابت خاں خانِ خاناں۔ ۱۳۔ مرزا رستم قندہار کا ایک شہزادہ جس نے ازبک سے ڈر کر شاہ جہان کے دربار میں پناہ لی۔ ۱۴۔ خان عالم مرزا برخوردار۔ ۱۵۔ مہابت خاں کا بیٹا امان اللہ خاں زماں بہادر مرزا۔ ۱۶۔ قاسم خاں جسے معتمد خاں کا خطاب ملا۔ ۱۷۔ وزیر خاں۔ ۱۸۔ راجہ بٹھل داس۔ ۱۹۔ جلال بخاری صدر الصدور۔ ۲۰۔ مراد بخش شاہ جہان کا سب سے چھوٹا بیٹا۔ ۲۱۔ میرن ۲۲۔ صادق خاں، میر بخشی۔ ۲۳۔ مرزا سلطان ایرانی صفویوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ۲۴۔ مظفر حسین اعظم خاں کو کا جو عام طور پر فدائی خاں کے نام سے مشہور تھا۔ ۲۵۔ موسوی خاں صدر۔ ۲۶۔ مرزا رستم کا بیٹا مرزا بدیع الزمان جسے شاہ جہاں سے شاہ نواز خاں کا خطاب ملا۔ ۲۷۔ ملا شکر اللہ شیرازی مخاطب بہ افضل خاں۔ ۲۸۔ سید ابوالمظفر خاں جو میراں شاہ خانِ جہاں کے نام سے مشہور تھا۔ ۲۹۔ راؤ کرن بھرتیہ بیکانیری۔ ۳۰۔ راجہ انوپ سنگھ باج گزار۔ ۳۱۔ خاں ساماں میر جملہ، خطاب میر محمد سعدی، ایک ایرانی تاجر۔ ۳۲۔ ابوالبقا امیر خاں۔ ۳۳۔ رضا بہادر منعم رسوم۔ ۳۴۔ سیف خاں مرزا صفی جو بعد میں بہار کا حاکم بنا۔ ۳۵۔ اللہ وردی خاں۔ ۳۶۔ مکرمت خاں۔ ۳۷۔ معتقد خاں یا معتمد خاں۔ ۳۸۔ مخلص خاں یا اللہ بردی خاں کا بھائی۔

منصور احمد

نواہائے راز

چندانکہ درِ دوست کشائم نگرم من — از دوست جُدا ہستم و بیگانہ ترم مَن

ہر آئنہ اقرارِ دوئی ہرزۂ فہم است — من نیستم او ہست نہ او ہست اگرم مَن

تمثالِ خدا در دلِ ہر ذرہ بجویم — دیوانۂ خود ہستم و ہر سو نگرم مَن

در ذرّہ من افسردہ و در مہر فروزاں — آفاق ہمہ پُر ز من و سر بہ سرم مَن

تازاں سوئے گردوں خبر از دوست بیابم — اے دل ہمہ شب با مہ و پروین بپرم مَن

منت کشِ عیسےٰ نہ شدم مُردم ازیں شرم — روحش چو صبا ہست چراغِ سحرم مَن

رسوائے جہاں کرد ترا سینہ فگارے

اے دوست بیاد آر ہماں پردہ درم مَن

حامد علی خاں

سر اسحٰق نیوٹن

مغرب کا مشہور عالم حکمیات

پیدائش اور بچپن ۔ ۱۶۴۲ء میں سر اسحٰق نیوٹن عالم وجود میں آیا پیدائش کے وقت وہ اس قدر چھوٹا اور کمزور تھا کہ اس کی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں صرف چند لمحوں کی زندگی لے کر آیا ہے ۔ اسکی ظاہری حالت اس قدر خراب تھی کہ ان دو عورتوں کو جو پڑوس میں دوا لینے کی غرض سے بھیجی گئی تھیں یہ امید نہ تھی کہ واپسی پر اس کو زندہ پائیں گی ۔ اس کا باپ ۲۶ سال کی عمر میں شادی کے چند ہی ماہ بعد انتقال کر چکا تھا ۔ ماں نے اس کا نام والد مرحوم کے نام پر اسحٰق رکھا ۔

لنکن شائر میں ایک مکان اس کے خاندان کے قبضہ میں ایک صدی سے چلا آتا تھا اور اس سے صرف ۳۰ پونڈ سالانہ کی قلیل آمدنی ہوتی تھی اسحٰق ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کی والدہ نے ایک پادری سے نکاح کر لیا ۔ اور اسحٰق اپنی دادی کی نگرانی میں آ گیا جس نے اس امر پر پوری نگاہ رکھی کہ بہترین تعلیم جو قرب وجوار میں میسّر آ سکتی تھی، اسحٰق کو دی جائے ۔ ۱۲ برس کی عمر میں اس کو قصبہ گرنتھم میں جو ۶ میل کے فاصلہ پر واقع تھا تعلیم کی غرض سے بھیجا گیا ۔ اس فاصلہ کے سبب سے یہ ضروری ہوا کہ وہ قصبہ ہی میں رہے ۔ چنانچہ وہ ایک دوا فروش مسٹر کلارک کے ساتھ رہنے لگا ۔

نیوٹن نے مدرسہ میں کوئی خاص شہرت حاصل نہ کی ۔ وہ جماعت میں سب سے کم نمبر حاصل کرتا تھا جس کا سبب یقیناً یہ تھا کہ وہ اپنے سبقوں میں دلچسپی نہ لیتا تھا ۔ لیکن ایک روز ایک ساتھی طالب علم نے اس کے شکم میں زور سے پاؤں مارا جس پر نیوٹن نے اس کو لڑنے کی دعوت دی ۔ گرجا کے میدان میں جنگ ہوئی اور نیوٹن نے فتح حاصل کی ۔ مگر اس جسمانی فتح پر قناعت نہ کرتے ہوئے اس نے اس لڑکے کو جماعت میں بھی نیچا دکھانے کا مصمم ارادہ کر لیا اور آخر کار اپنے دماغ کو کام میں لا کر وہ نہ صرف اپنے مقابل کو شکست دے سکا بلکہ سارے مدرسے میں اول رہا ۔

وہ اپنے ساتھیوں کی کھیلوں میں بالکل شریک نہ ہوتا تھا اور مختلف مشینوں اور ایجادوں کے نمونے بنانے پر کافی وقت صرف کرتا تھا ۔ اس نے "پھرکی" کا نہایت عمدہ نمونہ تیار کیا جس کو پڑوس میں نصب کر دیا گیا ۔ ایک "پانی کی گھڑی" بھی اس نے منجملہ دیگر اشیاء کے تیار کی جو اگرچہ بہت پرانا خیال تھا مگر اس گھڑی سے وقت معلوم کرنے کے لئے اس کے

پڑوسی اکثر اس کے کمرے میں جھانکا کرتے تھے

وہ ہر کام میں جو وہ کرتا تھا بہت تیز تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ بہت "خاموش سنجیدہ اور غور کرنے والا" لڑکا تھا مگر اس سنجیدگی کے ساتھ شوخی اور شرارت بھی ملی ہوئی تھی۔ اس نے یہ معلوم کر کے کہ دیہاتی شہاب ثاقب سے بہت ڈرتے ہیں اور شیطان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک پتنگ کے ساتھ ایک کاغذی لالٹین کو باندھ دیا اور رات کو اُسے اڑا کر غریب دیہاتیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہوا۔

جب نیوٹن ۱۴ برس کا تھا تو اس کے سوتیلے باپ کا انتقال ہوگیا اور اس کی ماں اپنے قدیم مکان میں واپس آگئی۔ اس وقت اس کی ماں کی آمدنی مکان کی آمدنی کے علاوہ ایک اور زمین سے ۸۰ پونڈ سالانہ تھی۔ مگر اس زمانہ کے اخراجات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ رقم کچھ زیادہ نہ تھی اس لئے یہ ضروری تھا کہ نیوٹن کو جو آیندہ گھر کا مالک ہونے والا تھا کاشتکاری سکھائی جائے چنانچہ اُسے مدرسہ سے واپس طلب کر لیا گیا۔

اس کام کو سیکھنے کے لئے نیوٹن کو ایک بڈھے خادم کی نگرانی میں قصبہ گرنتھم بھیجا جاتا تھا تاکہ وہ بازار کی حالت دیکھے۔ مگر نیوٹن اس کام کے لئے بہت ہی نکما ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ وہاں جا کر ایک دوافروش کی دکان پر بیٹھا رہتا تھا۔ اور اس وقت تک کتابیں پڑھتا رہتا تھا جب تک اس کا خادم واپسی کے وقت اس کو بلانے کے لئے دوبارہ آتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ خادم کا ساتھ چھوڑ کر راستہ ہی میں پھر کتاب کے مطالعہ میں غرق ہو جاتا تھا۔

آخر خادم نے مجبوراً اس کی ماں سے سارا قصّہ بیان کر کے کہہ دیا۔ کہ وہ کبھی کاشتکار نہیں بن سکتا۔ بلکہ خود اسکی ماں نے اس کا اندازہ اچھی طرح لگا لیا۔ کیونکہ جب کبھی اُسے کھیت کی نگہداشت کے لئے بھیجا جاتا تھا تو وہ اپنی ذمہ داری کو قطعاً فراموش کر کے نمونوں کے بنانے میں محو ہو جاتا تھا۔ اور مویشی کھیت کا صفایا کر دیتے تھے۔ بہت سے کوتہ اندیش والدین یہ ترکیب اختیار کرتے ہیں کہ کتابوں کو لڑکے کے پاس نہیں پہنچنے دیتے۔ مگر نیوٹن کی ماں نے اس معاملہ میں اس امر کو ملحوظ رکھکر کہ وہ صرف وقت گذاری کی خاطر نہیں، بلکہ علم کی تشنگی کو سیراب کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے اپنے بھائی سے جو کسی گرجا کا پادری تھا، مشورہ کر کے عقلمندی سے کام لیا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ نیوٹن کو پھر مدرسہ میں بھیجنا چاہئے

نیوٹن نے اس کے بعد بھی اپنے دماغ کو بے کار نہ رکھا بلکہ اس نے سورج کا عکس مشاہدہ کر کے ایک دُھوپ گھڑی بنائی۔ جو آج بھی موجود ہے اس نے عجیب ذہانت کو کام میں لا کر بہت سی عجیب چیزیں بنائیں جن سے ہمیں فی الحال کوئی تعلق نہیں +

کالج کی زندگی ۔ ۱۸ برس کی عمر میں نیوٹن کو ٹرنیٹی کالج کیمبرج میں بھیجا گیا۔ جہاں پہلے اس کا ماموں طالبعلم

رہ چکا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس وقت اس عظیم الشان درس گاہ میں علم ہندسہ پر کافی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اور صرف سترھویں صدی کی ابتدا سے اس کے ارکان نے اس اہم مضمون پر توجہ دینی شروع کی۔

نیوٹن نے کالج میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا۔ اور جس طرح اسکول میں سب سے پیچھے رہتا تھا۔ اسی طرح کالج میں بھی اُس نے یہ خصوصیت برقرار رکھی۔ مگر جس وقت اس نے گرنتھم چھوڑنا چاہا تو اُس کے استاد نے اُسے اسکول میں سب سے اونچے مقام پر نشست دی اور آنکھوں میں آنسو بھر لا کر اس کو رخصت کیا اور دیگر طلبہ کو اس کی تقلید کرنے کی تاکید کی۔

ہم کو نیوٹن کے کیمبرج جانے کے بعد چند سالوں تک کے حالات کا بالکل علم نہیں مگر حسب ذیل تین واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے مضامین میں ماہر بن گیا تھا۔ اس کے پادری ماموں نے اس کو "منطق" پر ایک کتاب دی اور نیوٹن نے اس پر اس طرح عبور حاصل کر لیا۔ کہ کالج میں خود استاد اس کو اس مضمون میں اپنے آپ سے زیادہ ماہر پاکر متعجب ہو گیا۔ اس استاد نے نیوٹن کو کپلر کی ایک کتاب پڑھنے کو کہا تاکہ وہ اس کی تقریروں کو زیادہ بہتر طریق پر سمجھ سکے اور وہ اس کتاب کے مضامین پر بھی اس قدر حاوی ہو گیا۔ کہ استاد نے اپنی تقریر سے پہلے ہی اس کو ان تمام باتوں پر مکالمہ کے لئے مستعد پایا جو وہ اپنی تقریر میں کہنے والا تھا۔

کیمبرج میں پہنچنے کے تین سال بعد اس نے ایک میلہ میں جا کر "فلکیات" پر ایک کتاب خریدی جس میں وہ ایک اقلیدسی شکل کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ اس نے اقلیدس پر ایک کتاب خریدی اور جب ایک نظر ڈالنے پر اس شکل کو حل کر لیا تو اس نے کتاب کو یہ کہہ کر الگ رکھ دیا کہ بھلا ایسی ظاہر باتوں کے لئے کون سے ثبوت کی ضرورت ہے؟ مگر جلد ہی نیوٹن کو معلوم ہو گیا کہ اس کی یہ رائے غلط تھی۔ اور وہ بعد میں کہا کرتا تھا کہ "مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اقلیدس کو اس توجہ سے پڑھے بغیر جو اس کا حق تھا۔ ڈسکارٹس اور دیگر جبر و مقابلہ کے مصنفین کی تصنیفات کا مطالعہ شروع کر دیا" اور اس لئے وظیفہ کے ایک امتحان کے وقت ہندسہ کے ایک پروفیسر نے اس کے علم اقلیدس کی بابت کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی

نظریہ کشش ثقل نیوٹن نے ۲۲ سال کی عمر میں بی۔ اے کی ڈگری بغیر کسی امتیاز کے لی۔ اسی سال کالج اس خوفناک پلیگ کے سبب سے جس نے اکیلے لندن ہی میں ۶۰ ہزار جانوں کا خاتمہ کر دیا بند ہو گیا۔ اور اسی زمانہ میں نیوٹن نے مشہور تاریخی سیب کو گرتے ہوئے دیکھا۔ کشش ثقل کا مسئلہ بہت پہلے سے معلوم تھا مگر یہ نیوٹن ہی تھا جس نے اس قانون کو تمام نظام عالم تک وسعت دی اور ثابت کیا کہ یہی وہ قوت ہے کہ جس کے سبب سے چاند زمین کے ساتھ اور زمین اور دیگر سیارے آفتاب کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں۔

سیب کا واقعہ۔ سیب کے گرنے کے واقعہ کو تسلیم کرنے سے بہت سے مورخین نے انکار کیا ہے کیونکہ نیوٹن نے اُن عالمانِ حکمیات سے جن کے سامنے اس نے نظریہ کشش ثقل پیش کیا۔ اس واقعہ کا بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن یہ کوئی قوی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ اس نے اس حقیر سے واقعے کو اہمیت کے قابل خیال نہ کیا ہو۔ لیکن اس واقعے کو نیوٹن کی بھانجی نے جس نے اس کی زندگی کے آخری بیس سال اس کے ساتھ بسر کئے تھے - تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے صرف اس واقعہ کی تحقیق باقی رہ جاتی ہے کہ آیا اس کی بھانجی نے اس قصہ کو ماموں سے سنا تھا یا اس نے بھی اس کو عام زبانوں پر رائج دیکھ کر تسلیم کرلیا۔ سر داؤد نے اس درخت کو ۱۸۱۴ء میں دیکھا اور وہ اپنے ساتھ اس کی جڑ کے کچھ حصے لے گیا۔ لیکن ۱۸۲۰ء میں یہ اس قدر خشک ہوگیا کہ اسکو کاٹ دیا گیا۔ اور اس کی لکڑی بڑی حفاظت کے ساتھ محفوظ رکھی گئی۔

اصلیت یوں ہے کہ نیوٹن ۲۳ سال کی عمر میں سیب کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا فطرت کی عظیم الشان قوتوں پر غور کررہا تھا۔ اس کو ڈسکارٹز کے اس نظریہ کے متعلق پوری واقفیت تھی کہ تمام سیارے ایک دائرہ میں گھومتے ہیں اور ہر سیارے کے ساتھ ایک ایسی قوت ہے جو اس کو اپنے مقام پر رہنے پر مجبور کرتی ہے لیکن یہ نظریہ نیوٹن کے نزدیک بہت زیادہ حد تک خیالی تھا۔ کیونکہ اس نے کیپلر کے قوانین کی رو سے یہ اندازہ لگایا تھا۔ کہ کوئی مرکزی قوت آفتاب کے پاس ایسی ہے جو ان سیاروں کی حرکت کا باعث ہے۔ سیب کے گرنے سے اُسے یہ خیال ہوا ہوگا کہ کشش کی قوت کا اقتدار اس زمین سے آگے بھی ہوگا۔ اور اس لئے اس نے ان قوانین کو نظام عالم سے تطبیق دی۔ مگر جب اس نے حساب لگایا کہ کشش ثقل چاند کے فاصلہ پر کیا ہوگی تو اس کے جوابات چاند کی رفتار کے لحاظ سے درست نہ آئے۔ اس پر اس بڑے فلسفی نے اس جھگڑے کو علیحدہ رکھ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس نظریہ کی غلطی کا پورا الیقین ہوگیا کیونکہ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے اس مسئلہ پر پھر کبھی غور نہ کیا۔ اور نہ ہی اس نے اس خیال کو کسی سے بیان کیا۔ آخر کار چند سال بعد جب زمین کے وزن وغیرہ کی بابت نئے اعداد و شمار شائع ہوئے۔ اس وقت نیوٹن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ اُس نے اپنے حسابات کو بالکل صحیح پایا۔

نیوٹن اپنے گاؤں والے مکان میں دو سال تک رہا تب جاکر کہیں طاعون رفع ہوا اور وہ کیمبرج واپس جاسکا۔ جب تک اس نے ایم۔اے پاس نہ کرلیا اس وقت تک اس کو ذاتی تحقیق و تدقیق کا بہت کم موقع ملا۔ اس امتحان کے نتیجہ کی فہرست میں اس کا نام تیسواں تھا۔ یہ خیال کرکے کہ نیوٹن جیسے دماغ کا شخص نہایت آسانی سے اول کیوں نہیں آجاتا تھا۔ یقیناً ہر شخص یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ بڑا فلسفی اپنا سارا وقت امتحان کے مضامین پر صرف نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ ان مضامین کے

مطالعہ کرتا رہتا تھا جو ذاتی طور پر اس کے لئے مفید ہوں - نہ ان مضامین کا جو عارضی طور پر اس کو امتحان میں کامیاب بنائیں -

پروفیسر نیوٹن - ڈاکٹر بیرو جو ہندسہ کا پروفیسر تھا، نیوٹن کی ہندسی قوتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے نیوٹن کو اپنی جگہ پروفیسری دلانے کی کوشش کی، کیونکہ وہ خود دینیات کے مطالعہ کے لئے علیحدہ ہو رہا تھا - اس طرح نیوٹن ۲۶ سال کی عمر میں پروفیسر ہو گیا -

نیوٹن اور نوریات - نیوٹن کا نام نوریات (Optics) کے سلسلے میں بھی بہت ممتاز ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ اس نے پروفیسر ہونے سے بہت پہلے اس مضمون پر کافی قدرت حاصل کر لی تھی - کیونکہ جس وقت ڈاکٹر بیرو پروفیسر تھا، تو اس نے "نوریات" پر ایک کتاب لکھی تھی - اور نیوٹن سے اس پر نظر ثانی کرنے کی خواہش کی تھی - نوجوان نیوٹن نے چند اہم تجاویز پیش کیں گو کتاب کے بہت سے مضامین بالکل ابتدائی تھے -

ہندسہ کے پروفیسر کا یہ فرض تھا کہ وہ ہفتہ میں ایک بار فلکیات، جغرافیہ یا نوریات میں سے کسی ایک مضمون پر لکچر دے - نیوٹن نے اپنے ابتدائی لیکچروں کے لئے نوریات کا انتخاب کیا - ان لیکچروں میں ذاتی تحقیق و تدقیق کا زیادہ حصہ ہوتا تھا لیکن اس نے ان کو شاہی انجمن کا رکن انتخاب ہونے تک، جو چند سال بعد ہوا، شائع نہ کیا -

نیوٹن کا کیرکٹر اور ذاتی حالات - ایک دلچسپ خط جو نیوٹن کے کیرکٹر پر کچھ روشنی ڈالتا ہے محفوظ رکھا گیا ہے کسی نوجوان شخص نے جو دنیا کی سیر کرنے جا رہا تھا - نیوٹن سے مشورہ طلب کیا - نیوٹن نے جو قوانین بتائے ان میں دو حسب ذیل ہیں :-

"مسافروں کا مقصد پڑھنا ہے نہ کہ پڑھانا . . . ."

"اگر تمہاری کسی غیر ملک میں توہین کی جائے تو اس کو خاموشی سے گزار دینا اور مذاق میں اڑا دینا بہتر ہے - ایسے عذر کہ اس نے مجھے اس قدر اشتعال دلایا کہ میں برداشت نہ کر سکا، دوستوں پر کچھ اثر ڈال سکتے ہیں مگر اجنبیوں میں بالکل بیکار ہیں - اور مسافر کی کمزوری کا اظہار کرتے ہیں"

مذکورہ بالا خط میں اکثر مخاطب کو "نوجوان دوست" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے - اس سے بہت سے لوگ نیوٹن کو بڑی عمر کا آدمی خیال کریں گے - مگر درحقیقت وہ اس شخص سے خود ایک برس چھوٹا تھا - اور خط لکھنے کے وقت اس کی عمر کل ۲۶ برس کی تھی -

ہمیں نیوٹن کی کالج کی زندگی کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں - ان کو جان وکنس کے فرزند نے جس کا باپ نیوٹن کے ساتھ اس کے کمرے میں رہتا تھا - اپنے ایک خط میں لکھا ہے -

"میرے والد اور نیوٹن کی دوستی محض اتفاقیہ طور پر ہوئی۔ میرے والد کا ساتھی ان کے مزاج کے موافق نہ تھا وہ ایک دن رنجیدہ ہو کر سیر کے لئے گئے تو راستے میں نیوٹن افسردہ خاطر سیر کرتے ہوئے ملا ۔ بات کرنے سے معلوم ہوا کہ دونوں کی آزردہ خاطری کا سبب ایک ہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان لوگوں سے علیحدہ ہو کر ایک جگہ رہنے کا فیصلہ کر لیا اور جلد ہی اس پر عمل پیرا ہو گئے اور جس وقت تک کالج میں رہے ایک ساتھ ہی رہتے رہے۔

"میں نے اپنے والد کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ نیوٹن کی غذا فراموشی کے متعلق جو قصے مشہور ہیں، اس کا انہوں نے اکثر مشاہدہ کیا ہے اور اکثر اس کو شب کی نیند برباد کر کے کسی سوال کے حل کرنے کی خوشی میں کرسی سے اُٹھتے ہوئے دیکھا ہے۔

"ہم نے اکثر اس کو انجیل تقسیم کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اور میرے پاس بھی انجیل کے کئی ایسے نسخے موجود ہیں جو اُس نے اسی مقصد سے میرے پاس بھیجے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہب کی کس قدر عزت کرتا تھا"

ہمارے پاس چند دلچسپ یادداشتیں بھی ہیں جو نیوٹن کے انتقال کے وقت ڈاکٹر ہمفری نیوٹن نے لکھی تھیں۔ یہ شخص اس وقت سر اسحٰق نیوٹن کے ساتھ مددگار کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ جب اس نے ۴۵ برس کی عمر میں مشہور عالم کتاب "پرنسپیا" (ابتدائی اصول) لکھی تھی اس کے خط کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

وہ بہت حلیم، شریف اور منکسر المزاج تھا۔ اس کا چہرہ خاموش، خوبصورت اور شاندار تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کو ایک دفعہ سے زیادہ ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔" میں نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیوٹن نے اپنے ایک دوست سے جس کو اس نے اقلیدس دی تھی یہ پوچھا کہ اس نے وہ کتاب کہاں تک پڑھ لی ہے۔ اور اس کی رائے کتاب کے بارے میں کیا ہے۔ دوست نے جواب میں پوچھا کہ مجھے اقلیدس پڑھنے سے زندگی میں کیا فائدہ ہوگا اس پر نیوٹن کو ہنسی آگئی۔"

ڈاکٹر موصوف آگے چل کر لکھتا ہے کہ "نیوٹن اپنے مطالعہ میں ہر وقت غرق رہتا تھا اور وہ بالکل ورزش نہ کرتا تھا۔ مطالعہ کے علاوہ تمام اوقات کو ضائع تصور کرتا تھا۔ بہت کم لوگ اس کی ملاقات کو آتے تھے۔ مگر جو آتے تھے اُن سے شام کے وقت باتیں کر کے وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ اپنے مطالعہ پر اس قدر توجہ دیتا تھا کہ اکثر کھانا بھی بھول جاتا تھا اور میں اس کو یاد دلاتا تو وہ "کیا واقعی" ؟ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور میز کے پاس جا کر کھڑے کھڑے ایک دو لقمے کھا کر واپس چلا آتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کبھی میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا ہے"

"جب وہ ہال میں جا کر کھانا کھانے کا ارادہ کرتا تو کمرہ سے بائیں طرف پھر جاتا اور سیدھا سڑک پر پہنچ جاتا۔ اور

اگر معلوم ہوتا کہ کہیں غلطی ہوگئی ہے تو وہ کبھی کبھی واپسی پر پھر ہال میں جانے کے بجائے کمرے میں واپس آجاتا وہ کمرے میں اِدھر اُدھر پھرنے کا بہت زیادہ عادی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس تھوڑے سے وقت کے ضائع ہونے کی بھی شکایت کرتا تھا۔ جو کھانے اور سونے میں صرف ہوتا ہے وہ بہت مخیر تھا اور بہت کم حاجتمند اس کے پاس سے خالی ہاتھ جاتے تھے۔

نیوٹن کے ایک دوست کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس کو موسیقی سے بالکل دلچسپی نہ تھی ایک دفعہ وہ موسیقی کا ڈراما دیکھنے گیا۔ پہلا ایکٹ اس نے دلچسپی کے ساتھ سنا، دوسرا ایکٹ اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا۔ اور تیسرے ایکٹ پر وہ بھاگ آیا۔ اور اس کے بعد پھر کبھی تھیٹر میں نہیں گیا۔

پھر اس کا دوست اس کی حاضر دماغی کی چند مثالیں پیش کرتا ہے کہ اگر وہ شراب کی بوتل لانے جاتا تھا تو اندیشہ رہتا تھا کہ وہاں جاکر تجربات میں نہ مشغول ہو جائے اور اپنے منتظر دوستوں کو بالکل فراموش کردے۔

نیوٹن اپنے لباس اور بناؤ سنگار کے معاملہ میں بالکل بے پروا تھا۔ مگر یہ اس کی فطرت تھی۔ کیونکہ جس شخص کو تھوڑا سا وقت کھانے اور سونے میں صرف کرنے پر بھی اعتراض ہو اُسے بال سنوارنے کے لئے کیسے موقع مل سکتا ہے۔ اور وہ اپنے لباس کی دیکھ بھال کیسے کرسکتا ہے؟ اس کا دوست بھی اس امر کی تائید کرتا ہے کہ وہ باہر ملا لباس پہنے ہوئے چلا جاتا تھا۔ اور جب سڑک پر پہنچ کر اُسے معلوم ہوتا تھا تو وہ شرمندہ ہوکر جلدی سے کپڑے پہلنے واپس آجاتا تھا۔

ایک پُرلطف مذاق ۔ ایک موقع پر یہ دوست نیوٹن سے ملنے گیا۔ اور حسب معمول اس کو مستغرق پایا۔ وہ یہ خیال کرکے انتظار کرتا رہا کہ نیوٹن عنقریب اُٹھے گا کیونکہ کھانا میز پر رکھا ہوا تھا۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد عالم دوست بیتاب ہوکر میز پر بیٹھ گیا۔ اور جو جوزہ نیوٹن کے لئے پکایا گیا تھا وہ خود کھا گیا۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد آخرکار نیوٹن اُٹھا اور اپنے دوست کو سلام کرکے کھانے کی میز پر گیا۔ وہاں جب اُسے سوائے ہڈیوں کے کچھ نہ ملا تو اس نے صرف یہ کہا کہ "مجھے بالکل یاد نہ تھا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں" اس دوست کو اپنے مکرم دوست کے ساتھ یہ مذاق کرتے ہوئے شرم تو آئی۔ لیکن اس نے ضمیر کو یہ کہہ کر خاموش کردیا کہ آخر وہ بھی تو اپنا کھانا فراموش کردینے کا مجرم ہے۔

رکنیت دارالعوام ۔ نیوٹن ایک سال تک دارالعوام کا رکن رہا۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کا نمایندہ تھا۔ اور اس نے اس عظیم الشان درسگاہ کے حقوق کی خوب نگہداشت کی اس وقت وہ ۴۰ برس کا تھا"

علالت اور جنون کا فرضی قصہ ۔ دو برس بعد وہ سخت بیمار ہوا جو اس کی شدید دماغی محنت کا لحاظ کرتے ہوئے کچھ تعجب خیز نہیں۔ اس کی سخت محنت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص بھول جاتا ہے کہ وہ بچپن میں کس قدر نازک اور کمزور تھا۔ عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد نیوٹن کے خیالات منتشر ہوگئے جس کا سبب، یہ بتایا جاتا ہے کہ اسکا

دماغ اس قدر بار کا متحمل نہ ہو سکا۔

کہتے ہیں کہ اس بیماری کا سبب چند قیمتی قلمی نسخوں کا جل جانا تھا جو اس کے معمل میں واقع ہوا۔ وہ مشہور قصہ یوں ہے کہ نیوٹن کے پاس ایک کتا ڈائمنڈ تھا۔ ایک روز جاڑے کے دنوں میں صبح کے وقت وہ کتے کو چھوڑ کر گرجا گیا۔ واپس آنے پر اُسے معلوم ہوا کہ کتے نے ایک شمع گرا کر چند نہایت قیمتی کاغذات جن پر اس نے اپنے مدت العمر کے تجربات درج کئے تھے جلا دیئے ہیں کہا جاتا ہے کہ اس نے اس وقت کتے سے صرف یہ کہا "ڈائمنڈ! ڈائمنڈ! تجھے نہیں معلوم کہ تو نے کتنی بڑی شرارت کی ہے" مگر اس واقعہ نے اس کی صحت کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ وہ چند دنوں کے لئے پاگل سا ہو گیا"

نیوٹن کے مددگار نے ایک خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک بلا واسطہ ثبوت ہے۔ کوئی سنی سنائی بات نہیں "وہ اپنے کمرے میں نہ کتا رکھتا تھا نہ بلی۔ جس کا نتیجہ بڈھی خادمہ کے حق میں بہت اچھا ہوتا تھا جو صبح کے وقت دن اور رات دونوں وقت کا کھانا بے چکھے ہوئے پاتی تھی اور خوب مزے سے کھاتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیان اس سے پہلے کے بیانات کی ساری قدر و قیمت ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ گو وہ قصہ کتے کا نام اور نیوٹن کے الفاظ بھی بیان کرتا ہے۔ مگر اس بیان کے مقابلہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر ہم اس ظاہراً صحیح قصہ کو غلط تسلیم کر سکتے ہیں تو پھر ہم اس جنون کے قصہ کو کیوں نہ غلط کہیں؟ نیوٹن کے چند خطوط بھی ہیں جن کو اسکے دماغ پر برا اثر ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ میں نے ان خطوط کا بغور مطالعہ کیا ہے اور میں قائل ہو گیا ہوں کہ بعض لوگوں نے بعض مخصوص حالات سے متاثر ہو کر اس سے بھی زیادہ تعجب آمیز خطوط لکھے ہیں۔ نیوٹن خود اپنے ایک خط میں لکھتا ہے "میں سخت تکلیف میں ہوں .... میں نے ان بارہ ماہ میں نہ اچھی طرح کھایا ہے نہ سویا ہوں" اس میں کاغذات جل جانے پر رنج و غم کا بالکل اظہار نہیں۔

آج بھی کیمبرج کے طلبہ کو نیوٹن کے کمرہ کے دروازہ میں دو سوراخ دکھائے جاتے ہیں۔ ایک سوراخ جو بڑا ہے بلی کے استعمال کے لئے بنایا جاتا ہے اور دوسرا اس کے بچے کے لئے۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ اس دلچسپ قصہ کو بھی بلا واسطہ شہادت کے مقابلہ میں غلط تسلیم کرنا ہو گا۔ کیونکہ یہ خیال کرنا بھی مشکل ہے کہ نیوٹن جس کو خود اپنا خیال بھی نہ تھا کتوں اور بلیوں کا خیال رکھتا ہو گا جس چیز کی اس کو ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ کوئی دوسرا شخص اس کی خبر لے۔

شادی۔ ہمارے پاس یہ یقین کر لینے کے لئے کافی ثبوت موجود ہے کہ نیوٹن کے شادی نہ کرنے کا ایک سبب مالی مشکلات بھی تھیں۔ گرنتھم میں دوا فروش کی دکان میں بہت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ جن کے لئے نیوٹن کھیلنے کی چیزیں تیار کر دیا کرتا تھا ان میں ایک زندگی بھر نیوٹن کی دوست رہی۔ ۸۰ برس کی عمر میں اس نے نیوٹن کے ایک دوست کے سامنے اقبال کیا کہ مالی

دقتیں نہ ہوتیں تو نیوٹن ضرور اس سے شادی کرلیتا۔ اس عورت کا نام اسٹوری تھا جو دو دفعہ بیاہی گئی مگر نیوٹن عمر بھر کنوارا رہا۔

وفات۔ نیوٹن اپنے انتقال کے وقت جو ۲۰ مارچ ۱۷۲۷ء کو واقع ہوا پچاسی برس کا تھا۔ ۲۔ مارچ کو اس نے شاہی انجمن کے ایک جلسہ کی کرسی صدارت کو رونق بخشی۔ لیکن دوسرے ہی روز بیمار ہوگیا۔ اس طرح اس کا مرض تین ہفتے سے کچھ کم مدت تک رہا۔ اس نے سخت تکلیف اٹھائی جس کو اس نے بغیر کسی شکایت کے برداشت کیا۔ وہ ویسٹ منسٹر ایبی میں مشاہیر انگلستان کے درمیان دفن کیا گیا، جہاں اب ہر شخص اس کے مقبرے کے کتبے کو دیکھ سکتا ہے۔ مرض الموت میں اسکے چند احباب اسکی بڑائی بیان کر رہے تھے جس کے جواب میں اُس نے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ دنیا کیا خیال کرتی ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بچوں کی طرح ساحل پر سیپیاں اور گھونگھے جمع کر رہا ہوں۔ صداقت کا بحر بے پایاں ہمارے سامنے پڑا ہوا ہے اور ہمیں اس کی حقیقت معلوم نہیں"۔

مشہور شاعر پوپ نے جو نیوٹن کے انتقال کے وقت ۴۰ سال کا تھا، حسب ذیل کتبہ لکھا جو اس کی پیدائش کی جگہ دیوار پر نصب کر دیا گیا۔ "فطرت اور فطرت کے قوانین تاریکی میں پڑے تھے۔ کہ خدا نے کہا نیوٹن پیدا ہو۔ اور پھر ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی"۔

خاتمہ۔ نیوٹن کی زندگی اس قدر دلچسپ رہی ہے کہ میں نے تاحال یہ نہیں بیان کیا کہ وہ ۵۵ برس کی عمر میں سکہ سازی کے کارخانہ کا مہتمم ہوگیا۔ یہ انتخاب اس کی مشہور بیماری کے بعد ہوا۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ لوگوں میں اس کے جنون کا جو خیال پھیل چکا ہے اس کے برخلاف وہ اخیر وقت تک صحیح الدماغ رہا۔ ۷۵ برس کی عمر میں جب وہ سکہ سازی کے کارخانہ سے واپس آ رہا تھا اُسے ایک مشکل سوال دیا گیا جو ایک جرمنی مہندس نے انگریزوں کے دماغ کو آزمانے کی غرض سے بھیجا تھا۔ اور گو نیوٹن دن بھر کا تھکا ماندہ تھا پھر بھی اس نے اسی وقت سوال کو حل کر دیا۔

آخر میں یہ تحریر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس نے چھ بادشاہتوں کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔ وہ چارلی اول کے قتل سے چند سال قبل پیدا ہوا اور جارج ثانی ابھی اپنے عہد حکومت کے پہلے ہی سال میں تھا کہ اس کا انتقال ہوا۔

جارج ثانی کی بیوی ملکہ کیرولین جس وقت شہزادی ویلز تھی، تو مشکل سے مشکل سوالات نیوٹن کے سامنے پیش کرتی تھی جس کا جواب اس کو مطمئن کر دینے کے لائق درحقیقت سوائے نیوٹن کے اور کوئی دے بھی نہ سکتا تھا اور اس امر کا اس نے بار بار اعلان کیا کہ وہ اس عظیم الشان آدمی کے پاس رہنے اور اس کے ساتھ بات کرنے میں مسرت محسوس کرتی ہے۔

ظفر الاحسن

ایک شاعر کی موت پر

مجھے زمانے کی کشمکش سے ترقیوں کا گلہ نہیں ہے
مجھے تمدن کی کاوشوں سے سکون کی التجا نہیں ہے

فروغِ نسرین و نسترن کی دعائیں کیوں اور کس سے مانگوں
میں جانتا ہوں کہ اب چمن کو دماغِ نشو و نما نہیں ہے

جنہیں ضرورت قیام کی ہو قضا انہیں کھینچتی ہے پہلے
یہ شعبدہ زارِ جبر ہے یاں کسی کو حاصل بقا نہیں ہے

نظامِ دل ہوگیا ہے برہم میں اس کی تنظیم چاہتا ہوں
مگر نہیں، انتظامِ دل کا خیال میں حوصلہ نہیں ہے

نہ جام میں ہے شرابِ ہندی نہ بادۂ اصفہاں ہے باقی
میں اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں کہ نشہ پورا ہوا نہیں ہے

کہاں وہ نغمے کہ جن سے تکمیلِ روح کی تشنگی کو پہنچے
کہاں امیدِ اُن مسرتوں کی کہ جن سے دل آشنا نہیں ہے

میں دیکھتا ہوں کہ جبر ہر اک طرف سے انسان پہ ہے طاری
میں جانتا ہوں مذاقِ فطرت ابھی مکمل ہوا نہیں ہے

نوائے دیرین و لحنِ رفتہ بگوشِ عالم قیام دارد
سلام بر مرغِ پر شکستہ کہ او حیاتِ دوام دارد

(۲)

وہ نقشِ نو بادۂ معانی جو سطحِ عالم پہ مرتسم تھا
کچھ ایسی موج آگئی کہ زینت، دہِ سراپردۂ عدم تھا

وہ نازشِ قدرتِ تکلّم وہ شاعرِ محفلِ محبت
جو اپنی ہستی کے سامنے خود عزیز تھا اور محترم تھا

وہ پردۂ غیب کا مغنی وہ عرش کی سیر کرنے والا
وہ میہمانِ حرم ثریا جسے فلک ایک ہی قدم تھا

جو زندگی کی نہایتوں پر مدام رہتا تھا غور فرما
کبھی سرِ راہِ بتکدہ تھا، کبھی پرِ طائرِ حرم تھا

اک ایسی تخییل میں ہوا گم جو اس کو واپس لائی اب تک
اُسے تھی خود بھی یہی تمنا کہ آشنائے مذاقِ رم تھا

رسائیِ فکر کے لئے ڈھونڈھ لیں حدیں ختم ہونے والی
وہ ایک قطرہ تھا مضطرب جس کے سامنے اک سوادِ یم تھا

فنا بقا میں ملی تو عینِ بقا ہوئی ہاں میں جانتا ہوں
شکایتیں میری بے محل تھیں فضول میں مبتلائے غم تھا

کلیم کو خدشۂ فنا کیا اگر ہے اس کا کلام باقی
کہ شعریت زندگی کی بن کر رہے گا شاعر کا نام باقی

ساغر نظامی سیمابی (علیگ)

آئینۂ دنیا

چہ باید مرد را؟ طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

ایک چھوٹی سی لڑکی کہا کرتی تھی کہ "میں اس لئے ہر وقت ایسی خوش رہتی ہُوں کہ ہر کوئی مجھ سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔" اُسے خبر ہی نہ تھی کہ لوگ کیونکر ناخوش رہتے ہیں۔ لوگ اس لئے اُسے پیار کرتے تھے کہ وہ اُن سے پیار کرتی تھی۔ وہ باغ میں جاتی تھی اور اس کی فضا کو دیکھ کر خوشی سے اچھلتی اور تالیاں بجاتی تھی۔ باغ کا ہر پرندہ۔ ہر پھول اور ہر پتّا اُسے یہ کہتا ہوُا معلوم ہوتا:۔ "خوش رہو۔ خوش رہو۔"

لیکن میں کہتا ہُوں کہ ہم سب کیوں نہ یہی احساس اپنے اندر پیدا کرلیں؟ ہر شخص اور فطرت کی ہر چیز خدا کی قدرت کا ایک اظہار ہے۔ اگر ہم ان چیزوں کو معصومیت اور صداقت کی نظر سے دیکھیں اور اپنی آنکھوں سے ان پردوں کو ہٹا دیں جن میں سے ہر چیز ہمیں بدنما اور بدصورت نظر آتی ہے اور جو اس لئے ہماری آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں کہ ہماری زندگیاں بیہودہ خیالیوں اور بداعمالیوں میں گزرتی ہیں تو یقیناً ہمیں ہر چیز یہ کہتی ہوئی سنائی دے "خوش رہو۔ کامیاب رہو" اگر ہماری طبیعتیں اعتدال پر ہوں تو ضرور ہمیں مسرت اور اطمینان نصیب ہو۔ اور ہماری زندگیاں خوشی سے معمور ہوجائیں اگر تمام دنیا اس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے حقیقت اور صداقت صاف صاف نظر آسکیں تو پھر غربت کا نام ونشان مٹ جائے۔ تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا ازالہ ہوجائے۔

جب ہم مفصلات میں جاتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کی شکلوں میں ہمیں سختی طمع، خود غرضی دیکھ کر ایک عجیب نامناسبت نظر آتی ہے۔ یہ غیر موزونیت قدرت کی گلکاریوں کے مقابلہ میں کس قدر متفاوت ہے۔ اور ساز فطرت سے اس کی آواز کتنی مختلف ہے۔ اس کے برخلاف ان حسین وجمیل مناظر کو دیکھو جو پھولوں کی رنگارنگی مرغزاروں کی سبزی۔ جنگل کی آزادی اور پرندوں کے چہچہوں میں نظر آتے ہیں۔

خود غرضی، طمع، گناہ اور اسی قسم کی تمام دوسری چیزیں خدا کی سلطنت میں کوئی جگہ نہیں پاتیں جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس سے ان کو کوئی مناسبت نہیں۔ یہ تمام چیزیں بدخیالیوں اور بداعمالیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔

صرف دل کی صفائی خدا کو دیکھ سکتی ہے اور صرف بے گناہ اور بے میل دل کے آئینہ میں صداقت کے حسن کا عکس پڑ سکتا ہے - ہر گناہ آلود خیال اور ہر غلط خیال اور ہر زبون کاری آنکھوں کے آگے ایک پردہ ڈال دیتی ہے۔ جو خدا کی بنائی ہوئی تمام چیزوں کی شکل کو ہمارے سامنے مسخ کر کے پیش کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں نیک خیالات اور نیک افعال کی مدد سے ان پردوں کو آنکھوں سے اتار دینا چاہئے - تاکہ ہم دنیا کو اس صورت میں دیکھ سکیں جس میں اسے خدا نے بنایا ہے - اور انسان کی اس خوبی کو معلوم کر سکیں جس میں اُس نے اُسے پیدا کیا ہے ۔

خود غرضی یا خود پرستی کا ہر پردہ - خیانت یا بد دیانتی کا ہر پردہ کسی کے راستے میں حائل ہونے یا اُسے ترقی کی راہ سے روکنے کا ہر پردہ اس سے پہلے اُٹھ جانا چاہئے کہ ہم حقیقت اور صداقت کا صاف اور روشن نظارہ دیکھیں۔

ہم میں سے بہت سے لوگ ہیں جو خوشی اور نفع حاصل کرنے کے لئے ایسی کوششیں عمل میں لاتے ہیں کہ ان سے یہ پردے کثیف ہو جاتے ہیں - یہاں تک کہ ان کی روحانی نظر بالکل زائل ہو جاتی ہے اور پھر ان آنکھوں سے انہیں صرف بھدی اور مادی چیزیں نظر آتی ہیں - ہر چیز کو وہ تاریک اور فرومایہ سمجھنے لگتے ہیں - کیونکہ ان کی آنکھوں پر خود غرضی طمع اور بد دیانتی کی پٹی بندھی ہوتی ہے ۔

دنیا کی ہر چیز کو آدمی اپنے افعال ، اپنے خیالات اور اپنے مقاصد کی عینک لگا کر دیکھتا ہے اس لئے جب اس کی نظر ان شیشوں میں سے گزر کر نظارہ پر پڑتی ہے تو لازمی طور پر اُسے رنگین کر دیتی ہے - ہماری زندگی کا ہر عمل ہر خیال ہر ارادہ ایک پردے کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے لٹکا رہتا ہے - اور ہم مجبور ہیں کہ ہر چیز کو اسی میں سے دیکھیں اگر ہمارے عمل میں صداقت ہے - اگر ہمارے خیال میں صفائی ہے - اگر ہمارے ارادہ میں خلوص ہے تو ہم اس پردے کی صفائی میں سے صداقت حسن اور حقیقت کو دیکھ سکیں گے - ورنہ بدصورت ، بدنما ، اور خوفناک بت ہماری نظروں کے سامنے ہوں گے اس لئے قبل اس کے کہ ہم روشن نظاروں کو دیکھنے کی خواہش کریں ، ہمیں اپنی نگاہ کے پردے اٹھا دینے چاہئیں۔

کبھی تم نے اس بات کو بھی محسوس کیا ہے کہ کتنے عزیزوں اور دوستوں کو تم نے اپنی ترش روئی بدمزاجی اور سرد مہری کی وجہ سے مجبور کر دیا ہے کہ وہ تم سے دور رہیں - ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ وہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں پہنچ جائے اور زمہریر سے نکل کر گرمی میں چلا جائے - ہر شخص کو نور کی تلاش ہے - کبھی کسی نے ظلمت کو بھی پسند کیا ہے ؟

ہر چیز کو اس کے روشن پہلو سے دیکھو یہ ایک ایسا فن ہے کہ اگر اس کو سمجھ لیا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہ دنیا کی ہیئت ہی تبدیل کر دیتا ہے - اپنی فطرت کے روشن حصے کی ایک سال کے لئے تربیت کرو - یہ تمام عمر کے لئے تمہاری زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دے گا - اگر اب لوگ تم سے بھاگتے ہیں تو وہ تمہاری طرف کھنچتے چلے آئیں گے - اگر اب

تمہاری وجہ سے مجلس افسردہ ہوجاتی ہے۔ تو پھر تم اُسے گرما دیا کروگے۔ ذرا سورج کی ایک شعاع کا مقابلہ سایہ کی افسردگی اور ظلمت سے کرو۔ کرۂ ارض کی تمام زندگی اور اس زندگی کی تمام قوت اسی ایک شعاع آفتاب میں پوشیدہ ہے۔ تاریکی میں زندگی کی کوئی رمق امید کی کوئی کرن نہیں۔ جن لوگوں کے لبوں پر تبسم کھیلتا ہے اُن سے ہمیں کتنا انس ہوتا ہے۔ ہم اُن سے ملتے ہیں تاکہ ہم میں نیا جوش پیدا ہو۔ اور فطرت انسانی پر ہمارا اعتماد بڑھے۔ ہم فطرتاً ان کی طرف مڑتے ہیں۔ جس طرح آفتاب پرست پھول آفتاب کے ساتھ ساتھ مڑتا ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی ہماری فطرت ہے کہ ہم ظلمت سے اپنا رخ پھیرلیں۔ اس ظلمت سے جو ایک گھٹے ہوئے اور کبیدہ چہرے پر نظر آتی ہے۔ اس چہرے پر جو ایسا نظر آتا ہے کہ بجلیاں اس پر اکھٹی ہو رہی ہیں ایک شگفتہ اور مسرور دل بڑی عظیم الشان نعمت ہے۔ اور ایک شگفتہ اور مسرور چہرہ ایک ابدی رحمت ہے۔

جس دنیا میں ہم رہتے ہیں ہم خود اس کے بنانے والے ہیں۔ اور اپنے حوالیات کو ہم خود متشکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو ہمیشہ ہر چیز کا تاریک پہلو لینے کے عادی ہیں۔ وہ مرد اور عورتیں جنہیں ظلمت، ناکامی، نامرادی اور زبونی کے سوائے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اُن لوگوں کے مقابلہ میں جو ہر چیز کا روشن پہلو لیتے ہیں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ ان مردوں اور عورتوں کے مقابلہ میں جنہیں ہر چیز میں بہتری ہی بہتری نظر آتی ہے۔ جن کی نظریں ان لوگوں پر پڑتی ہیں جنہیں خدا نے بنایا ہے۔ اور ان پر نہیں پڑتیں جن کے دلوں کو آزار، روگ اور گناہ نے مردہ کردیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو دنیا کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ خدا نے اُسے حسین ترین بنایا ہے اس میں اپنا نور پھیلایا ہے۔ ہم سے کامیابی کے وعدے کئے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں امید کو جگہ دی ہے۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو ہر چیز میں بدصورتی اور بدوضعی دیکھتے ہیں۔ بلکہ یہ وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو قعر مذلت وجہالت سے نکال کر تہذیب و تمدن کی چوٹی پر پہنچا دیا۔ یہ مبارک چہرے جنہوں نے دلوں کو سکون اور امید سے بھر دیا۔ دنیا کے کندھوں سے بوجھ ہلکا کرنے میں زیادہ کام آتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے چہرے غم و الم سے جھکے پڑتے تھے جو ہمیشہ لوگوں کو آنے والی دنیا کے لئے تیار کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہ کہا کہ جب دنیا میں تم رہتے ہو۔ اس کے لئے بھی تشکر و امتنان کی ایک مسکراہٹ کسی وقت اپنے لبوں پر لے آیا کرو۔

وہ اخلاق جن کی ہم تربیت کرتے ہیں۔ بالآخر ہمارے خیالات پر غلبہ پانے لگتے ہیں۔ ہمارے جسم پر اپنی تصویر کو نمایاں کرنے لگتے ہیں اور پھر ہماری زندگی پر حکومت کرنے لگتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں ہمارے ہی قلوب کا پرتو ہوتی ہے۔ دنیا کا گنبد ہماری ہی آوازوں کی صدائے بازگشت ہمیں سناتا ہے۔ ہمارے ہی خیالات

ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اگر ہم غمگین اور افسردہ رہیں گے تو مایوسی، پست ہمتی اور نا امیدی ہم پر چھا جائیگی لیکن اگر ہم ہشاش بشاش رہیں گے اور قلب کو مطمئن رکھیں گے تو ہمیں خوشی اور اطمینان قلب ہی ملے گا۔

ایک شخص ہے کہ جہاں بھی جاتا ہے۔ اسے مسرت ہی مسرت نظر آتی ہے جس چیز کو وہ دیکھتا ہے وہ اسے مسرت کا پیغام دیتی ہے۔ ہر شخص اس سے مہربانی اور سلوک کا برتاؤ کرتا ہے۔ ہر شخص اُسے مدد دینے کے لئے خندہ پیشانی سے ملتا ہے۔ لیکن ایک اور شخص ہے وہ ہروقت کُڑھتا رہتا ہے۔ ہر کسی کی شکایت کرتا ہے۔ اور ہر بات میں اسے نقص ہی نقص نظر آتا ہے۔ کوئی چیز اُسے خوش نہیں کرسکتی۔ وہ دنیا کو سرد مہر غم پرور اور مکروہ خیال کرتا ہے۔ اور وہ اُسے ایسا ہی پاتا ہے۔

دنیا ایک بہت بڑا گنبد ہے جس میں خواہ ہم کسی کی تنقیص کریں یا تعریف اس کی صدائے بازگشت ہمیں سننی پڑتی ہے۔ اور وہ ایک آئینہ ہے جس میں سے ہمیں اپنی ہی اچھی بُری شکل نظر آتی ہے۔

سویٹ ماڈرن — منصور احمد

آرام

دو مصوروں نے آرام کے تصور کو تصاویر میں دکھانا چاہا۔

ایک نے اس مقصد کے لئے انسانی آبادی سے دور پہاڑوں کے آغوش میں ایک جھیل کے خاموش اور پرسکوت منظر کا انتخاب کیا۔

دوسرے نے ایک شور انگیز آبشار گرتا ہوا دکھایا آبشار کی جھاگ پر بید مجنون کا ایک نازک درخت جھکا ہوا تھا۔ اس کی ایک شاخ پر ایک چھوٹا سا پرندہ اپنے گھونسلے میں بیٹھا تھا اور چادر آب کی پھوار سے تقریباً بھیگ رہا تھا۔

پہلی تصویر صرف سکون ظاہر کرتی ہے۔ دوسری کامل آرام، آرام میں ہمیشہ دو عنصر ہوتے ہیں سکون اور عمل، خاموشی اور ہنگامہ آفرینی تعمیر اور تخریب۔ خوف اور بے باکی۔

(ہپکس وا لِسکم) — محمد حنیف

مُسلماناں مُسلمانی بہ بینید

جناب من! تسلیم، خدا نہ کرے کہ "ہمایوں" کا سنہری اصول کہ دل آزار مضامین شائع نہ ہونگے کبھی بھی ٹوٹے مگر کیا یہ ممکن ہے کہ "ہمایوں" دانستہ اپنے آپکو تیرِ ملامت کا نشانہ بنالے، یعنی اس طرح کہ مسلمانوں کو دبی زبان سے اتنا کہہ دے کہ

"سوچ کر چلو"

اگر یہ ممکن ہو اور اگر یہ بھی ممکن ہو کہ مسلمان شاید اس بات پر غور کرلیں (ع دلم راحد نادانی بہ بینید) تو آپ اس مختصر عرضداشت کو شایع کردیں میرِ حجاز کا خدا رکھوالا - تھا اور ہے - مگر ایک مولانا صاحب کو یہ سوجھی کہ یہاں کے عارضی خداؤں کی نقلی عدالتوں کی رہنمائی کیلئے ایک نیا قانون درکار ہے - چنانچہ مسودے تیار ہوئے بحثیں ہوئیں، جلسے ہوئے اور اب وہ قانون ایسی صورت میں پاس ہوا ہے کہ اگر گورنمنٹ مدد کرے تو رآون رآم کو یہودی ابن مریم کو گرفتار کرا سکتا ہے

میرِ حجاز کے پیغام کی ابتدائی آؤ بھگت یہ تھی کہ تلواریں نیاموں سے اچھلی پڑتی تھیں - مگر باوجود تلواروں کے زخموں کے زخموں سے بدتر تہمتوں کے، باوجود زہروں کے وہ پیغام پھیلا - جتنا اس پیغام کو اور پیغام لانے والے کو بُرا کہا گیا - جتنی ان کی مخالفت ہوئی اسی قدر وہ پھیلا - پھیلنے کا ذریعہ ہی یہ ہے کہ دشمن جتنی بھی ہو سکے دشمنی کریں "تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں" کہنے والوں کی اولاد اب تہمتوں کی پرچھائیں سے ڈرتی ہے - کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک نیا ایمان پھیلایا جا رہا ہے - کہ جھوٹ سچ پر غالب آجائیگا؟ اگر یہ مطلب نہیں تو عدالتوں کی حمایت طلبی کیسی؟ ہمارا رویہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ بُرا کہنے والے کے ساتھ وہ احسان، مروت اور رحم کا سلوک ہو کہ اسے بن مسلمان بنے کوئی چارہ نہ رہے مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تنگدلی نے آخر ہم کو مفتوح کرلیا ہے - اور اب ہم بھی بنیئے کی طرح کہنے لگے ہیں "ابکے مار!" ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حتی الامکان خود خدا کا آخری پیغام ہو اور جو یہ بننا چاہے اس کے پاس وقت کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ برا کہنے والوں سے برسرِ پرخاش رہنے میں عمر یا عمر کا کوئی حصہ ضائع کردے - مگر لیڈری کا نیا سوانگ یہ ہے کہ دشمن پر اخلاق و حلم سے فتح نہ پاؤ بلکہ اس سے مقدمہ بازی کی ٹھانو - خود اچھے بننے کی کوشش نہ کرو - بلکہ دوسروں کو بُرا ثابت کرنے کی کوشش کرو یعنی جیسے وہ ہیں ویسے بن جاؤ -

مسلماناں مسلمانی بہ بینید

اپنے جذبات کا احترام اس قدر ہے کہ کوئی ہمارا دل نہ دکھائے اسلام پھیلے یا نہ پھیلے مگر ہمارا دل نہ دکھے کہاں یہ خود پرستی کہاں تواضع محمدی!

جند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم

"ابنِ مسلم"

نئی محبّت کے ارمان

پھر تقاضائے نظر سلسلہ جنباں ہوگا
پھر تماشائے بہارِ رخِ جاناں ہوگا

پھر غمِ دوست کی آمد کی خبر پہنچی ہے
پھر وہی خانۂ دل اور وہی مہماں ہوگا

پھر سکوں عالمِ وحشت سے بدل جائیگا
پھر جنوں گرمِ تقاضائے بیاباں ہوگا

پھر نڈر عرصۂ الفت میں قدم رکھوں گا
پھر وہی پائے ثبات اور وہی میداں ہوگا

پھر وہی نغمۂ دلدوزِ وفا چھیڑوں گا
پھر وہی زخمہ وہی تارِ رگِ جاں ہوگا

پھر وہی دل میں غمِ عشق کی رَو دوڑے گی
پھر وہی شوق کے جذبات میں ہیجاں ہوگا

پھر تعشق کا جنوں اور سوا اُبھرے گا
پھر تعلق میں غلوّ اور دوچنداں ہوگا

پھر نئے سر سے محبت کے مزے آئیں گے
پھر نیا سلسلۂ حسرت و ارماں ہوگا

پھر کوئی غیرتِ گلزارِ جہاں دل لے گا
پھر مقدر گلِ مقصود بداماں ہوگا

پھر گلستانِ محبت میں بہار آئے گی
پھر شبستانِ تمنا میں چراغاں ہوگا

پھر وہی ولولۂ رغبتِ گل اُٹھے گا
پھر وہی مشغلۂ سیرِ گلستاں ہوگا

پھر تمنائے حزیں سازِ طرب چھیڑے گی
پھر دلِ غم زدہ خوش ہوکے غزلخواں ہوگا

پھر لبِ اظہارِ غمِ شوق کے گُر سیکھیں گے
پھر دل اسرارِ محبت کا زباںداں ہوگا

پھر مرا دکھ مجھے تسکین دوا بخشے گا
پھر مرا درد مجھے غیرتِ درماں ہوگا

پھر مری طبع مجھے کفر کی دعوت دیگی
پھر مرا کفر مجھے دولتِ ایماں ہوگا

پھر مرا اخترِ تقدیر چمک اُٹھے گا
پھر مرا مطلعِ امید درخشاں ہوگا

پھر امیدِ کرمِ یار میں خوش گزرے گی
پھر علاجِ ستمِ گردشِ دوراں ہوگا

پھر تمنائے سکوں شکلِ سکوں دیکھے گی
پھر مداوائے خیالاتِ پریشاں ہوگا

پھر مجھے فکرِ دو عالم سے نجاتیں ہونگی
پھر مجھے زیست کا ہر مرحلہ آساں ہوگا

غلط آزادؔ! ترے دل کے یہ شبہات غلط
مطمئن ہوں کہ مرے درد کا درماں ہوگا

حکیم آزادؔ انصاری

گندم گوں قوم یا تورانی قوم

توریت کے باب ۱۱۔ آیت ۲ سے واضح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نے طوفانِ نوح سے ایک مدت بعد جانب مشرق سفر کیا۔ اور جب ملک شنعار یا[۵۱] شنیعار کے وسیع میدان میں پہنچی تو وہیں آباد ہوگئی لیکن اس تمام ملک کو انہوں نے غیر آباد نہیں پایا بلکہ بنی آدم وہاں پہلے سے آباد تھے

آج سے کچھ سال قبل کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ قوم کونسی تھی جو حضرت نوح کی اولاد سے پہلے ملک بابل میں آباد تھی۔ یونانی مورخوں نے بروسس[۵۲] بابلی کے حوالہ سے صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ ملک بابل میں کثرت سے غیر قوم کے لوگ آباد تھے لیکن بروسس بھی یہ نہیں بتا سکا کہ وہ غیر قوم کونسی تھی اور کہاں سے آکر آباد ہوئی تھی۔

یورپ کے علما کا قول ہے کہ یقیناً اس غیر قوم کا تعلق ان اقوام سے نہیں ہے جن کا سلسلہ توریت میں حضرت نوح علیہ السلام سے شروع کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ غیر قوم اُن سے قدیم تر ہے اور طوفان نوح میں تباہ نہیں ہوئی علما رندکور کے نزدیک یہ مسئلہ قریب قریب طے شدہ ہے کہ طوفان نوح تمام عالم میں نہیں بلکہ صرف اُن ممالک میں آیا تھا جو یہودیوں کے علم میں تھے اور جن کو یہودی ساری دنیا تصور کرتے ہیں۔ یہ امر بھی بعید از قیاس ہے کہ اُن معدودے چند اشخاص کے سوا جو کشتی نوح میں تھے تمام عالم طوفان میں تباہ ہوگیا ہو۔ بقول علمائے یورپ توریت کے چھٹے اور نویں باب کو دوسرے ابواب پر غور کئے بغیر پڑھنے سے یہ اعتقاد عام ہوگیا ہے کہ طوفان تمام دنیا میں آیا تھا اور سوائے اہل کشتی تمام مخلوق تباہ ہوگئی تھی جس کے ثبوت میں کوئی قوی شہادت نہیں ہے۔

عیسائی علمار متقدمین نے اپنے زمانہ ہی میں اس مسئلہ کو قابل بحث سمجھا ہے اور یہودی رہبانوں اور عیسائی پادریوں نے اس مسئلہ پر معقول مباحثے کئے ہیں۔

مندرجہ ذیل آیات جو توریت کے چوتھے باب سے اخذ کی گئی ہیں اس مسئلہ پر بہت کچھ روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں قابیل کے جرم جلاوطنی اور اولاد قربیہ کا حال درج ہے۔ جب ہابیل کو قابیل نے مار ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے قابیل سے فرمایا مع تو نے کیا کیا۔

---

۵۱ شنعار یا شنیعار ملک بابل کا قدیم نام ہے جس میں وہ قطعۂ زمین بھی شامل تھا جو بابل کے جنوب میں خلیج فارس سے ملحق ہے۔

۵۲۔ بروسس بابلی۔ مندر بعل مردوخ کا پوجاری سکندر رومی کا ہمعصر تھا۔ پوجاری مذکور نے تاریخ بابل جو ابتدائے پیدائش عالم تا عہد سکندر رومی لکھی تھی۔

تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے" اور حکم ہوا[51] "زمین پر تو پریشان اور آوارہ ہوگا"۔ چنانچہ قابیل عدن[52] کے مشرق کی طرف سفر کرتا چلا گیا اور اس سرزمین میں آباد ہوا جس کو ناڈ یا نوڈ کہتے تھے جس کے معنی جلاوطن یا خانہ بدوش کے ہیں۔ قابیل کا ایک لڑکا حنوق تھا جس کے نام پر اس نے ایک شہر آباد کیا تھا۔ حنوق کا لڑکا ایراد۔ اس کا محویائیل تھا محویائیل کا لڑکا متوسائیل تھا اور متوسائیل کا لمک یا لامخ تھا۔ لامخ نہایت خونخوار، مغلوب الغضب و ناہموار تھا اس کے تین لڑکے تھے (۱) یابل جو سکان خیام اور گلہ بانوں کا مورث ہوا۔ (۲) یوبل جو بین کار اور نے نوازوں کا جد اعلیٰ تھا (۳) توبل قائن جو تانبے اور لوہے کے باڑ دار ہتھیاروں کا موجد ہوا۔

مندرجہ بالا حالات کے علاوہ توریت میں قابیل اور اس کی اولاد کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ البتہ آدم علیہ السلام کے تیسرے صاحبزادہ شیث علیہ السلام کا جو بعد انتقال ہابیل اور جلاوطنی قابیل پیدا ہوئے تھے اور ان کی اولاد کا ذکر توریت کے پانچویں باب میں درج ہے اور نوح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔ چھٹے۔ ساتویں اور آٹھویں بابوں میں طوفان نوح کا واقعہ لکھا ہے۔ نویں باب میں حضرت نوح علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور ان کی اولاد سے دنیا کو دوبارہ آباد کرنے کے حالات مرقوم ہیں۔ دسویں باب میں حضرت نوح کے فرزندوں سام۔ حام اور یافث کی اولاد کا ذکر ہے جس سے طوفان نوح کے بعد دنیا دوبارہ آباد کی گئی۔

غور سے دیکھا جائے تو توریت کا یہ باب نہایت اہم اور ضروری ہے۔ اس سے دنیا کی ان تمام اقوام اور فرقوں کا پتا چلتا ہے جن سے عہد عتیق میں یہودیوں کا کچھ بھی تعلق رہ چکا ہے[53]

---

[51] متذکرہ بالا آیت میں دو مقام پر لفظ زمین آیا ہے مگر معنی مختلف ہیں۔ پہلی دفعہ زمین سے خاص زمین یا مقام مطلب ہے اور اس کے لئے توریت میں عبرانی لفظ اد آمہ آیا ہے جس سے وہ خطہ بار آور جو ایڈن (عدن) کے مشرق میں واقع تھا مراد ہے۔ وہاں بعد ہبوط حضرت آدم علیہ السلام مع حضرت حوا رہتے تھے۔ دوسرے مقام پر لفظ زمین سے مفہوم زمین عام ہے۔ اس کے لئے زبان عبرانی میں لفظ ایرتک استعمال ہوا ہے جس سے مطلب دنیا ہے۔

[52] عہد عتیق میں ملک شام کے ایک خطہ کا نام تھا۔

[53] یہ امر قابل لحاظ ہے۔ توریت میں ہر قوم کو اس کے مورث اعلیٰ کے نام سے خطاب کیا گیا۔ مشرقی اقوام میں عموماً یہ قاعدہ تھا جس کی پیروی اقوام یورپ نے بھی کی ہے۔ کہ مورث اعلیٰ کے نام سے اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے۔ مثلاً قوم اسیرین اپنے مورث اشر۔ قوم ارامین ارم کے نام سے اور قوم ہیبرو (یہودی) ہیبر کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ اقوام نیز عرب اور چند دیگر اقوام ایسی ملتی جلتی زبان بولتے ہیں کہ ایک دوسرے کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ طرز معاشرت اور ناک نقشہ میں بھی بہت مشابہ ہیں جس کی خاص وجہ یہی ہے کہ یہ سب ایک مورث یعنی سام بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ درحقیقت اولاد سام بہت فرقوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے سے بالکل ہو کر مختلف ملکوں میں آباد ہوگئی۔ ہر ایک کا نام بھی جدا ہوگیا۔ انکی ملکی اور قومی تاریخ بھی جداگانہ مرتب ہوگئی۔ لیکن ان کی زبانیں گو ظاہراً مختلف معلوم ہوتی ہوں تاہم مخرج ان کا وہی قدیم زبان ہے۔ بہت سے رسوم و خیالات۔ تمدن و اخلاقی حالات ایسے ملتے جلتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم ایک تھی اور ایک زمانہ میں ایک ہی ملک میں آباد تھی لیکن جس قدر تعداد میں بڑھتی گئی اسی قدر اس کے ٹکڑے ہوتے گئے جن میں سے بعض دنیا کی مشہور اقوام بن گئیں اور بعض مقابلتہً غیر مشہور جرگوں کی صورت میں رہ گئیں۔

توریت کے دسویں باب میں گو اقوام کے شجرے مشرح وصحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں تاہم دنیا کی اکثر اقوام کو چھوڑ دیا ہے۔ حضرت یافث کی اولاد میں یونانیوں کا وجود ان کے مورث یاوَن کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے اور ان کے چند لڑکوں کے نام بتائے ہیں لیکن ان کے علاوہ یورپ کی دیگر قدیم اقوام یعنی جرمن اہل اٹلی اور سلٹ کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جب موجودہ توریت کا دسواں باب مرتب ہوا تو یورپ کی وہ سرزمین جس میں متذکرہ بالا اقوام آباد تھیں فصل اور غیر متعلق ہونے کے باعث دنیائے یہودیت سے باہر تھیں یا یہ خیال کیا جائے کہ یہودی ان اقوام سے بالکل لاعلم تھے یہی قول اس قوم کی دوسری عظیم شاخ پر صادق آتا ہے جو یہودیوں کے مشرق وجنوب میں آباد تھی۔ یعنی ہندی اور ایرانی بشرطیکہ قوم میڈی کو ان سے جدا سمجھا جائے۔ کیونکہ قوم میڈی کے مورث مدائی اور اہل یونان کے مورث یاوَن پسران یافث قرار دیئے گئے ہیں۔

یہ امر استعجاب سے خالی نہیں کہ توریت کے دسویں باب میں سیاہ اور گندم گون اقوام کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ حالانکہ سلف سے ممالک ہند اور افریقہ وجنوبی جزائر ہندوستان وملک آسٹریلیا و جزائر ملحق آسٹریلیا میں سیاہ اقوام آباد ہیں۔ اسی طرح اہل چین ومغل ومانچو وغیرہ کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔ حالانکہ یہ بھی نہایت قدیم اور کثیر التعداد قوم تھی اور ایک زمانہ میں دنیا کا بڑا حصہ انہیں سے آباد تھا اور بہت ممکن ہے کہ اس گندم گون قوم کی آبادی دنیا کی دیگر اقوام کی تعداد کے برابر ہو۔ یہ قوم بہت فرقوں اور جرگوں پر منقسم ہے۔ لیکن بنظر سہولت اسکو لقب تورانی سے اس وجہ سے مخاطب کرنے لگے ہیں کہ سفید رنگ والے ایرانی (آریہ) اور وسط ایشیا کے باشندوں نے ان کو قدیم نام تور یا تورا سے تعبیر کیا ہے جو غالباً ان کا مورث تھا۔ اور اس کی ایک شاخ لقب ترک سے اس وقت تک موسوم ہے۔

گندم گوں قوم کے حالات پر نظر بصیرت ڈالنے سے نہایت دلچسپ مندرجہ ذیل چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ذریات آدم علیہ السلام کا یہ کونسا قبیلہ ہے جس کے آثار قریب قریب ہر ملک میں پائے جاتے ہیں اور جن سے اکثر ملکوں کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے اور صرف متقدمین نے ہی اس کو سب سے زیادہ قدیم قوم نہیں بتایا بلکہ جدید تحقیقات سائنس اس مسئلہ میں روز بروز متقدمین کی ہم خیال ہوتی جاتی ہے۔

(۲) اس قوم کا مورث اعلیٰ کون تھا اور ملجا و ماویٰ کہاں تھا۔

(۳) کس وجہ سے توریت کے دسویں باب میں جس میں اولاد آدم کا مفصل ومشرح شجرہ منضبط کیا گیا ہے اس قوم کو نظر انداز کیا گیا۔ اور اسی سوال کے ساتھ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے جو اوپر کے سوالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی قابیل کی نسل کا کیا حشر ہوا خصوصاً لامک کے تینوں لڑکوں کی نسلوں کا۔ کیونکہ توریت کے چوتھے باب آیات ۱۹ سے ۲۱ تک

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لامخ کے تینوں لڑکوں کو اقوام کا مورث قرار دیا ہے۔ ان کی ہستی کو کافی ضروری تصور کیا ہے۔ اور ان کے پیشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن آیندہ نسلوں کی بابت کیا وجہ ہے کہ توریت میں کچھ ذکر نہیں کیا گیا اور نصف بنی آدم کے تعلقات آغاز دنیا ہی سے دیگر شاخہائے آدم علیہ السلام سے منقطع کر دیئے گئے ہیں یعنی آدم علیہ السلام کے گنہگار لڑکے قابیل کی نسل کا تعلق نیک بخت اور بہشتی صاحبزادہ شیث علیہ السلام سے علیحدہ کر دیا گیا جسکی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ قابیل چونکہ گنہگار اور معتوب تھا اور پاک خطہ سے اس کا اخراج ہوا تھا لہذا اس کی نسل کا عابد اور زاہد شیث کی نسل کے ساتھ ذکر کرنا یا سلسلہ اولاد کا بیان کرنا کفر تصور ہوا اور صرف اس بیان پر اکتفا کیا گیا کہ اولاد قابیل ملک نود میں آباد ہو کر بڑھتی اور زیادہ ہوتی گئی۔ قابیل کی اولاد ان اقوام سے بدتر سمجھی گئی جن کا سلسلہ گو زاہد شیث سے ملتا تھا۔ لیکن اپنے گناہوں کے باعث متواتر سزائیں پاتی رہیں یا قطعاً تباہ و برباد ہو گئیں۔ ان اقوام کے حالات کو تو مقدس توریت میں جگہ بھی دی گئی۔ لیکن قابیل کی نسل ایسی راندہ درگاہ ہوئی کہ اس کا کسی طور پر کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ جس طرح مختلف واقعات اور قصص توریت میں اُن سے غیر متعلق ہیں اسی طرح طوفان نوح کی عام تباہی بھی ان کا تعلق نہ رکھا ہو۔

بہرحال قابیل کی نسل سب سے زیادہ قدیم قوم ہے۔ جو اپنے رنگ شکل و شباہت۔ اخلاق و ادب وغیرہ کے لحاظ سے سفید رنگ کی قوم سے مختلف ہے۔ اور مختلف ممالک میں آخرالذکر کے پہنچنے کے صدیوں قبل سے آباد تھی لیکن راندہ درگاہ ہو جانے کی وجہ سے قابیل کی نسل یا گندم گوں قوم یا تورانی قوم کا تذکرہ یہودیوں نے جو سام بن نوح کی اولاد ہیں ہیں کہیں نہیں کیا۔ حتی کہ جب اولاد سام ملک شنعار میں پہنچی تو اس خطہ کو تورانیوں نے آباد پایا۔ ان پر حکومت کی اور ان میں مل جل گئی۔ پھر بھی توریت میں ان کے وجود کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

المختصر گندم گون قوم کی قدامت توریت کے بیان سے بھی ثابت ہے۔ کیونکہ قابیل حضرت آدم کا بڑا لڑکا تھا اور بددعا کا اثر ہنوز اس کی نسل میں باقی ہے جہاں کہیں اصلی تورانی ہیں خانہ بدوشی کی حالت میں ہیں۔ تورانی اقوام آپس میں بہت مشابہ ہیں۔ فی زمانناسائبیریا و مشرقی روس کے وسیع ملکوں میں بہت سے بچے کھچے نمونے تورانی قوم کے کرغیز۔ بشکیز۔ اوستیاک۔ تنگوز وغیرہ موجود ہیں۔ جو اب تک اسی قدیم حالت خانہ بدوشی میں گڈریوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

کوہ الطائی کا اکثر تورانی اقوام سے ایسا ممتنع الانفکاک تعلق ہے کہ اکثر مورخ تمام گندم گوں اقوام کو اہل الطائی کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ اکثر تورانی اقوام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ ان کے مورثان اعلیٰ کوہ الطائی کی ایک وسیع اور

شاداب وادی میں جو متعدد چشموں سے سیراب تھی ہمیشہ سے آباد تھے۔ یا قتل عام سے محفوظ رہنے کے لئے پہنچ گئے تھے یا غیبی تائید نے وہاں پہنچا دیا تھا۔ وادی مذکور کی نسبت اُن کا بیان ہے کہ چاروں طرف نہایت بلند اور پہلوان پہاڑیوں سے جو ناقابل گذر تھیں محفوظ تھی۔ صدیوں بعد جب کثرت آبادی کے باعث گنجائش نہ رہی اور اس سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے پر نہ ملا تو ان میں سے ایک شخص نے جو لوہار کا کام کرتا تھا تحقیق کیا کہ وہ پہاڑیاں لوہے کی ہیں۔ اس کی رائے سے لکڑیاں جمع کر کے متعدد بڑی بڑی دھونکنیوں کے ذریعہ سے آگ روشن کی گئی جس سے پہاڑ کا ایک حصّہ پگھل گیا اور راستہ نکل آیا۔

اس نقل سے اس قول کی صداقت ہوتی ہے کہ صنعت فلزات۔ حدادی و زرگری وغیرہ کی ایجاد کا سہرا ابتدائی حالت ہی میں گندم گوں قوم کے سر بندھ چکا ہے۔ اس روایت کی بیانِ توریت سے بھی تطبیق ہوتی ہے کیونکہ توبل قائن کو تانبا اور لوہے کے باڑھ دار ہتھیاروں کا بنانے والا ظاہر کیا ہے۔ مسٹر ریگوزن کا قول ہے "تورانی قومیں علم وفضل کے اعلیٰ طبقہ پر پہنچنے سے قاصر ہونے اور ایک خاص حد سے زیادہ ترقی کرنے پر قادر نہ ہونے نیز اپنی ناتکمل زبان کے اعتبار سے باہمدگر بہت مشابہ ہیں اور ان کی ترقی محدود رہے گی۔ جب تک کہ وہ مثل اپنے ہم قوم اہل ہنگری اور اہل فن لینڈ دوسری مہذب سفید رنگ قوموں سے قرابت پیدا نہ کریں"۔

"زمانۂ قدیم وحال کی تمام تورانی اقوام گو ظاہری طرز معاشرت ومذہب میں اختلاف رکھتی ہوں لیکن جو زبانیں وہ بولتی ہیں ان سب میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ یا تو مثل چینی زبان کے وہ بالکل مفرد کلمات سے جو زبان کی ابتدائی شان ظاہر کرتے ہیں ترکیب دی گئی ہیں یا مثل ترکی زبان کے مفرد کلمات باہمدگر ترکیب دے کر بہت ثقیل اور ناگوار الفاظ بنائے گئے ہیں۔ ان میں طریقۂ اشتقاق ممکن نہیں لہذا ان کی زبان کو مرکب جامدات اور چینی زبان کو خالص جامد کہا جائے تو بجا ہے"۔

"یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غالبًا تورانی فن انشا کے موجد ہیں لیکن باوجود اس کے انہوں نے ہر کلمہ کے واسطے ایک نشانی قایم کرنے کے علاوہ کوئی ترقی اس فن میں نہیں کی چنانچہ چینی زبان میں چالیس ہزار نشانیاں ہیں اور وہی ان کی زبان کے الفاظ ہیں۔ انہوں نے شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے۔ اور ابتدا اس کی نہایت پرلطف ہے لیکن اس فن میں بھی ابتدائی حالت سے آگے نہیں بڑھے"۔ یہی قوم غالبًا استحکار و امصار کی موجد ہے لیکن ہمیشہ ان صفات سے محروم رہی جو سوسائٹی بنانے کے لئے ضروری اور ملک اور حکومت کی مضبوط بنیاد اور قیام و دوام کے لئے لازم ہیں۔ عہد عتیق میں سب اقوام سے پیشتر تورانی قوم تمام مغربی ایشیا میں آباد تھی اور سلف سے اسکو قدیم ترین قوم کہتے چلے آئے ہیں لیکن سفید رنگ کی حملہ آور

قوم نے جہاں کہیں اور جب کبھی ان پر حملہ کیا تو ان کو اس ملک سے یا تو بے دخل کر دیا یا زیر کر لیا یا ایسا خلط ملط کیا کہ پھر تورانیوں کا پتہ نہیں چلا لیکن بوجہ خداداد قابلیت و اہلیت مرتبہ اعلیٰ پر قائم رہے"۔

قوم تورانی کے متعلق مسٹر ریگوزن اپنی رائے کے خود ذمہ دار ہیں - اور ایک حد تک اُن کا قول قابل تسلیم بھی ہے لیکن اس واقعہ سے وہ منکر نہیں ہو سکتے کہ گندم گوں قوم ازل سے عقل و فہم سے محروم اور ادراک و ذکاوت سے بے بہرہ نہیں ہے۔ گو سفید رنگ کی قوم نے ان کو زیر کر لیا اور تہذیب ملک و قوم کے ضروری و اہم کام ان کے ہاتھوں سے نکال کر اپنی عالی ہمتی و ہوشمندی سے عروج کمال پر پہنچا دیئے۔ تاہم ہر جگہ اُن کاموں کے شروع کرنے والے تورانی تھے۔ اسی طرح وہ اکثر چیزوں کے بھی موجد ہیں۔ جن کو سفید رنگ کی قوم نے ترقی دی۔ یہ امر مسلم ہے کہ ایجاد سے ترقی نہایت آسان ہے اگر غور کیا جائے تو اہل چین نے اپنی عقل اور فہم سے دنیا کی ایک عظیم الشان سلطنت قایم کی اور اپنے شعور و ہوشمندی کے باعث آج تک اس کا وجود قائم رکھا۔ ان کا علم و فضل بھی نہایت وسیع ہے اور دنیا کی سب سے زیادہ ضروری چیزوں چھاپہ۔ کپڑوں کے چیتھڑوں سے کاغذ۔ استعمال قطب نما۔ بارود وغیرہ کے موجد بھی وہی ہیں۔ ان کی مصوری آج تک ضرب المثل ہے۔ چینی و تانبہ چینی کے ظروف کے وہ موجد ہی نہیں بلکہ زمانہ حاضرہ میں بھی باوجود کوشش بسیار اُنکی نقل نہیں ہو سکی[1] اسی طرح بعض دیگر فنون میں وہ یکتائے روزگار ہیں۔ البتہ بوجوہ نامعلوم اہل چین نے صدیوں سے نہ کوئی چیز ایجاد کی اور نہ کسی ایجاد کو ترقی دی۔ جس کے باعث یہ عظیم الشان قوم ایجادی دنیا میں "نیستند آدم غلاف آدم اند" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

قوم مغل بھی تورانی قوم کی ایک شاخ ہے شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت کے حالات سے تاریخ ایشیا پُر ہے۔

اکبر اعظم کی ایجاد کردہ بارہ نال کی توپ نے یورپ کو لرزا دیا تھا۔ اگر غور کیا جائے تو زمانہ حاضرہ کی مشین گن اسی بارہ نال توپ کے طفیل ہے۔ تاج گنج۔ جامع مسجد دہلی۔ دیوان خاص۔ موتی مسجد وغیرہ وغیرہ ایسی بے نظیر و عدیم المثال عمارات ہیں جن کی خوبی خوش نمائی اور انجنیری میں یورپ کے مستند ماہر فن رطب اللسان ہیں۔ اور جو شاہانِ مغلیہ کی دولت و استقلال کا اعلیٰ ثبوت ہیں۔ آئین اکبری شاہد ہے کہ ملک اور حکومت کی بنیاد کس قدر مستحکم ڈالی گئی تھی۔ نیز مغل ان صفات سے محروم نہ تھے جو سوسائٹی بنانے کے لئے ضروری ہیں۔

---

[1] اہل چین ظروف چینی کے موجد ہیں۔ جیسا کہ نام سے ثابت ہے۔ تانبہ کے ظروف پر چینی کا روغن چڑھا کر رنگ برنگ کی گلکاری کرتے تھے جس میں اس وقت تک اہل یورپ کو کامیابی نہیں ہوئی اہل یورپ صرف اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ کہ لوہے کے ظروف پر روغن پھیر دیتے ہیں جو دیرپا نہیں ہوتا۔

قوم تورانی کی دوسری شاخ اہل جاپان بھی ہیں۔ آج ان کی ترقی اور تمدن سفید رنگ کی قوم کیلئے باعث رشک ہے۔ بہرحال مسٹر ریگوزن کا قول کہ قوم تورانی علم وفضل کے اعلیٰ طبقہ پر پہنچنے سے قاصر اور ایک خاص حد سے زیادہ ترقی کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اور جب تک سفید رنگ کی قوموں سے رشتہ بندیاں پیدا نہ کریگی ترقی محدود رہے گی پایۂ ثبوت سے ساقط ہے۔

ملک بابل میں اولاد نوح کے پہنچنے سے بہت پہلے جو تورانی قوم آباد تھی اُن کا حال بھی ان گلی کتبوں سے واضح ہوچکا ہے۔ جو ملک بابل کے قدیم شہروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ گو اب تک ان تمام کتبوں کا جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں ترجمہ نہیں ہوا تاہم ملک بابل کی قدیم قوم کے طرز معاشرت۔ مذہب۔ صنعت وحرفت کا انکشاف ہوگیا۔ اس قدیم زبان کی بابت یہ بھی جلد تحقیق ہوگیا کہ وہ ایک خاص قدیم اور مستقل زبان کا نمونہ ہے۔ اس میں یہ خصوصیت ہے جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ وہ کچھ مفرد کلمات سے ترکیب دی گئی ہے اور کچھ مفرد کلمات کو باہمدگر ترکیب دیکر ثقیل اور سخت الفاظ بنائے ہیں جو تصریف یا گردان سے ناآشنا ہیں۔ ان کے تیر نما حروف نہایت مفید اور قابل تعریف وتحسین ایجاد ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان حرفوں کو حروف شبیہہ سے اخذ کیا گیا تھا۔ لیکن قدیم سے قدیم کتبے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ بھی حروف شبیہہ سے جداگانہ اور مغائر ہیں۔ علاوہ ازیں فقرہ اور جملہ کے لئے نشانی موضوع نہیں ہے۔ جس سے خیالات کا اظہار ہوتا بلکہ انہوں نے الفاظ وکلمات ایجاد کئے ہیں۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قدیم سے قدیم زمانہ میں فنونِ مذکورہ کو ترقی دے چکے تھے۔ اور یہ بابل میں آباد ہونے سے پہلے ہی ان کے اصلی ملک میں رائج تھے اور جس قوم کی وہ شاخ ہے وہ اعلیٰ مدارج تہذیب پر پہنچ چکی تھی۔

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ملک بابل میں تورانی جن کو اہل شومیر[1] سے خطاب کیا گیا ہے نہایت ضروری اور ابتدائی اصول تہذیب اپنے ہمراہ لائے تھے مثلاً فن کتابت، دھاتوں کو پگھلا کر اشیا کی ساخت، انہار کے ذریعہ آبپاشی وغیرہ۔ وہاں کی مٹی سے خشت سازی اور اُن سے عمارات بنانے والے بھی وہی تھے۔

محمد حامد (دہلوی)

[1] عہد عتیق میں جنوبی حصہ بابل کو شومیر کہتے تھے۔

رُباعیات

(۱)

پہنچے جو ضرر اُسے شفقت سے کرو
پیدا ہو جو نفرت تو الفت سے کرو
ہر بات میں کچھ نہ کچھ غرض ہے ہمراز
ہر کام میں حق کے مصلحت سے کرو

(۲)

بے کار ہے جب تکمیل کا احساس رہے
تحصیل ہے تقصیر کا اقرار رہے
انسان کو ہے سعی مسلسل لازم
پوشیدہ یہ اسرار ہیں اسرار رہے

(۳)

انسان کا جسم ہے مشقت کے لیے
انسان کا نفس ہے مسرت کے لیے
انسان کا دماغ ہے نہاں خانۂ فکر
انسان کی روح ہے محبت کے لیے

(۴)

کچھ فکر نہ غم گردش ایام کرو
عشرت میں بھی اندیشۂ انجام کرو
بن کام کے دنیا میں کچھ آرام نہیں
آرام کی خواہش ہے تو کچھ کام کرو

بشیر احمد

افسانہ کی ماہیّت

افسانہ کا عام مفہوم ایک فرضی مبحث جس کو واقعیت کا لباس پہنا دیا گیا ہو، ایک محدود تخیل جو چند حادثات و سانحات پر مشتمل ہو، ایک خاص جذبہ جس کو انداز بیان سے وسعت دے دی گئی ہو، ایک باریک و لطیف خاکہ جس سے ایک نتیجہ مقصود ہو، ایک نادر اظہار جو طبائع انسانی کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ افسانہ کہلاتا ہے۔

آپ سوسائٹی کے کسی پہلو کو لے لیجئے اور خامہ فرسائی شروع کر دیجئے لیکن شرط یہ ہے کہ ایک ترتیب ملحوظ رہے نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ افسانہ نگار ہو جائیں گے۔ اخلاق و معاشرت کی پیچیدگیوں کو سلجھانا یا ان کی سلاستوں کو مبہم بنانا اور عبارت آرائی کے ذریعے سے اس کا اظہار ناول نویس بنا دیتا ہے۔

"افسانہ" کے مفہوم کا تنوع اس قدر بڑھا ہوا ہے اور وسیع ہے کہ داستان، ناول، قصہ، کہانی، حدیث، حکایات جملہ مصطلحات مع اپنے تمام لوازم اور نازک تعریفات و تخصیصات کے افسانہ ہی کی مختلف شکلیں ہیں اور بہت کم ایسی مربوط عبارتیں اور مرتب تخیلات ہونگے جس کو افسانہ کی تحت میں نہ لایا جا سکتا ہو۔ حتیٰ کہ تاریخی ناول، مذہبی روایات اولیا کے قصص وغیرہ بھی دراصل شجر افسانہ کی ستر اکم شاخیں ہیں۔

اردو افسانہ کا مفہوم۔ تراجم و تلخیصات سے قطع نظر کر کے افسانہ کا مفہوم، اپنی خاص حدیں اور نوعیتیں رکھتا ہے جس پر آپ کو اختیار ہے۔ چاہے ہنسیں چاہے روئیں۔ حسن و عشق، فراق و وصل۔ نیز طوالت بیان اردو افسانہ کے ابتدائی و قدیمی عناصر ہیں ؎

پُر درد وہ افسانے بلبل نے کہے شب بھر
گل چیں کے بہے آنسو، صیاد بہت رویا

چار درویش، طوطا کہانی نیز آرائش محفل سے لیکر بہار، موجودہ افسانہ نگاروں تک جس افسانہ نگار کو دیکھئے ایک نیا مفہوم سامنے رکھ کر اشہب خامہ کو میدانِ قرطاس میں بے لگام کر دیتا ہے اور یہ جانور زقندیں بھرتا، اچکتا، پھاندتا جابجا قیام کرتا یا تو یکایک کہیں رک جاتا ہے یا ایک غیر محدود مدت کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔

میں آیندہ کہیں بہ تفصیل بتاؤں گا کہ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے کہاں تک اردو افسانہ پر منطبق ہوتا ہے۔ خدانخواستہ اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ اردو افسانہ یا افسانہ نگاروں کی "ہو" کروں بلکہ میری صرف یہ گزارش ہے کہ "اردو افسانہ"

ساوتری

اگر شکنتلا کی کہانی عمدہ ترین محبت کا معیار پیش کرتی ہے تو ساوتری کی کہانی زن و شوہر کے عشق کی عمدہ ترین تکمیل ہے۔

ہندو شعرا اس محبت کے افسانے گاتے ہیں جو تا اختتام صرف محبت ہی نہیں ہوتی بلکہ اپنی حقیقت میں اپنی نوعیت میں اپنی کیفیت میں سچی صاف اور پاکیزہ بھی ہوتی ہے۔ بیشک یہی ایک بڑا سبب ہے کہ ان کی نظمیں ہزاروں برس سے زندہ ہیں۔

ساوتری راجہ آشواپتی والئے مدراس کی اکلوتی بیٹی تھی اس نے ستیاوان کو اپنے محل کے نزدیک ایک کٹیا میں دیکھا۔ ایک لمحہ کے لئے دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور اسی لمحہ کے اندر ہر ایک نے اپنا دل دوسرے کے حوالے کر دیا۔ جب ساوتری کو یہ احساس ہوا کہ اس نے نامعلوم طور پر اپنا دل ایک اجنبی کے حوالے کر دیا ہے تو اس نے اس کا نام اور حسب و نسب دریافت کرنے کے لئے جدوجہد کی۔ اس کو معلوم ہوا کہ ستیاوان دیش بدر راجہ سالو اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو اپنی زندگی کے آخری ایام ایک رشی کی طرح گزار رہا ہے۔

مگر ساوتری کی تمام امیدیں کچھ دنوں کے لئے مایوسی سے تبدیل ہو گئیں کیونکہ رشی نرادا نے جس کو قدرت نے قسمت معلوم کرنے کا ملکہ عطا کیا تھا معلوم کیا کہ ستیاوان کی زندگی صرف ایک سال اور باقی ہے اور اس نے کوئی وجہ بتائے بغیر ساوتری کو نہایت دلسوزی کے ساتھ کوئی اور رفیق تلاش کرنے کی صلاح دی۔ ساوتری نے نہایت لجاجت سے کہا کہ اس کے مذہب میں ایک دفعہ دل دے کر واپس لینا کفر ہے۔ اس نے سمجھا کہ نرادا شاید اس خیال سے اس شادی کی مخالفت کرتا ہے کہ ستیاوان ایک بے تاج بادشاہ کا لڑکا ہے۔

ساوتری کے والدین کو آخر وہ راز ظاہر کرنا پڑا جس کو نرادا کی چشم باطن میں نے دیکھ لیا تھا اور انہوں نے بیوگی کی ہولناک تکالیف ساوتری کے ذہن نشین کیں۔ وہ کانپ اٹھی لیکن اس کا دل غیر متزلزل رہا ایک نرالی اور انوکھی استقامت کے ساتھ اس کا دل ستیاوان کے ساتھ وفادار رہا اس نے کہا پتاجی میں آپ کی فرمانبردار ہوں لیکن ایک بات سن لو۔ میں کسی دوسرے سے شادی نہیں کروں گی۔ تمام عمر کنواری بسر کرونگی۔ میں اپنا دل دے چکی۔ اب واپس لے کر دوسرے کو نہیں دے سکتی۔

یوں تو ساوتری کا یہ قول فی نفسہٖ دوسری تمام قوموں کے ادبیات میں مل جائے گا۔ اور راہِ عشق میں اس کی ثابت قدمی بھی اس وقت تک غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ ہندو عورت بیوگی کی زندگی کو بدترین مصیبت خیال کرتی ہے۔

جب اس کے والدین نے دیکھا کہ ساوتری کی استقامت اٹل ہے تو انہوں نے شادی کی اجازت دے دی شاہی آرام و آسائش کی پروردہ شہزادی نے بخوشی اپنے آپ کو سخت، سادہ اور افلاس زدہ زندگی میں ڈال دیا۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، اس کو اپنے خاوند کے انجام کا فکر زیادہ دامنگیر ہوتا گیا۔ نرادا کی بات شب و روز اس کے دل میں کھٹکتی رہی۔ وہ سورج کے طلوع و غروب پر دنوں کا شمار کرتی رہی۔ اور خونخوار سال بسرعت تمام خاتمہ کی طرف دوڑتا رہا وہ مسلسل دیوتاؤں سے دعائیں مانگتی رہی بالآخر سال کے صرف چار دن باقی رہ گئے ساوتری نے تین شب و روز کا روزہ رکھنے کا عہد کیا کہ تین شب و روز نہ کھائے گی نہ پیئے گی۔ بلکہ اتنا عرصہ وہ مسلسل دعاؤں میں مشغول رہے گی۔ آخر وہ دن آن پہنچا جس کی اس کے دل میں دیر سے خلش تھی۔ ستیاوان قربانی کی اگنی کے لئے ایندھن لینے جا رہا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ گئی اس کے تفکرات اور بڑھ گئے۔ یکایک ستیاوان پر موت کی افسردگی طاری ہونے لگی۔ ساوتری نے اُسے اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی سے لگا لیا۔ اور اپنے بازوؤں میں تھامے رکھا۔ یہاں تک کہ اسکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ستیاوان نے دم واپسین لیا تو ساوتری کو اپنے پہلو پر ایک سیاہی مائل دھندلی سی شکل نظر آئی جس کے چہرے سے ایک ہیبت نمایاں تھی۔ وہ شکل سرخ لباس میں ملبوس تھی۔ سر پر تاج تھا اور ہاتھ میں پھندا۔ ساوتری سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ وہ ڈر کر زمین سے اچھل پڑی۔ اور اس شکل کو نہایت ادب سے زمین بوس سلام کیا اور کہا "او طاقتور دیوتا! کیونکہ تو صرف دیوتا ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے اپنا ارادہ بتا"۔

دیوتا نے جواب دیا۔ "میں یم ہوں۔ میں ستیاوان کی روح لینے آیا ہوں۔ تم نے ایک وفادار بیوی کی طرح اس کی خاطر و تواضع کی ہے۔ اس لئے اس کی روح کے لئے مجھے خود آنا پڑا ہے"۔ اتنا کہا اور ستیاوان کی روح کو اس کے جسم بے جان سے کھینچ لیا اور اس کو پھندے میں ڈال کر جنوب کی طرف چل پڑا جس طرف اب بھی ہندوؤں کے عقیدہ میں مردوں کی دنیا واقع ہے۔

ساوتری ان خوفناک واقعات میں جو اس کے سامنے ظہور پذیر ہوئے ثابت قدم رہی۔ مایوسی کی حالت میں بھی امید کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ اُس نے اپنے پیم پتی کی روح کا پیچھا کیا۔ ایک ناقابل مقابلہ طاقت سے متاثر ہو کر یم پیچھے کی طرف مڑا۔ اور اس نے کہا "تم میرا پیچھا کس لئے کر رہی ہو۔ زندہ انسان مردوں کی دنیا میں نہیں

جا سکتا۔ اپنے خاوند کی خاطر جو کچھ تم کر سکتی تھیں کر چکیں۔ اب واپس جا کر اس کی تجہیز و تکفین کرو"۔ ساوتری نے جواب دیا "میرا فرض ہے جہاں میرا خاوند جائے میں اس کے پیچھے جاؤں کیونکہ وفادار بیوی کے لئے اسی دنیا تک ہی نہیں بلکہ ابد تک وفادار رہنا ضروری ہے"۔ اونچی پہاڑیاں، ہموار میدان، عمیق دریا، گھنے جنگل اس کے مستقل ارادوں میں حائل نہ ہوئے۔ بالکل بے خوف و ہراس وہ سیاہ بادشاہ کا پیچھا کرتی رہی۔

یم پھر پیچھے کی طرف مڑا ساوتری کے ثبات محبت کی تعریف کی اور کہا "بچی۔ واپس چلی جاؤ دیر ہو رہی ہے دیکھو دیکھو تمہارے زخمی پاؤں سے خون بہ رہا ہے۔ راستہ بتدریج دشوار گزار ہو رہا ہے"۔ ساوتری نے پھر بھی واپس آنے سے انکار کیا۔ اس نے کہا "مجھے واپس جانے کے لئے نہ کہو۔ بنی نوع انسان کے چار بڑے فرائض ہیں۔ اول کتب مقدسہ کا مطالعہ دوئم نیک و بے عیب گرہستی زندگی بسر کرنا۔ سوئم نفس کشی اور تپسیا۔ چہارم اپنے خیالات کو آسمان کی طرف لگانا۔ لیکن عصمت کی آخری منزل مقصود سچی اور ابدی محبت ہے"۔ اس گفتگو سے یم خوش ہو گیا اور کہا "میں تمہاری آرزو پوری کروں گا۔ لیکن مردہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی سا اور بر مانگو"۔ ساوتری نے خود فراموشی سے جو واقعی سچی مردانگی تھی۔ اپنے خاوند کے دیش بدر باپ کے لئے بر مانگا جو جنگل میں نابینا اور کمزور زندگی کے آخری ایام بسر کر رہا تھا اور التجا کی کہ اس کی قوت باصرہ واپس دے دی جائے۔
یم نے خوشی سے بر دے دیا اور ساوتری کو واپس جانے کے لئے کہا۔ کیونکہ وہ تھک کر چُور ہو رہی تھی۔

شہزادی نے کہا "ساوتری نہ ہی کمزور ہے نہ تھکی ماندی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے سوامی کی خدمت میں ہے۔ اور کیا میں ایک مقدس ہستی کے پاس نہیں ہوں؟ ہماری مقدس کتابیں اعلان کرتی ہیں کہ مقدس اجسام سے ایک اتفاقی ملاقات بھی برکات سے پُر ہوتی ہے"۔

یم ساوتری کی گفتگو سے اور خوش ہوا اور کہا کہ "سوائے اپنے خاوند کی زندگی کے کوئی سا اور بر مانگ میں اس کو پورا کروں گا"۔

ساوتری نے دوبارہ خسر کے لئے بر مانگا کہ اس کو تاج و تخت واپس مل جائے جو ایک غاصب نے غصب کر لیا تھا یہ بھی اس نے فوراً منظور کر لیا۔ اور ساوتری کو ایک دفعہ پھر واپس جانے کے لئے کہا۔

اب کی دفعہ ساوتری نے یم سے یوں خطاب کیا۔

"اے مردوں کے زبردست بادشاہ لوگ تجھ سے خوف کھاتے ہیں لیکن میں دیکھتی ہوں کہ تو سچا اور مہربان ہے۔ لوگ کہتے ہیں تیرا دل کبھی نہیں پسیجتا۔ تیرے حکم سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔ لیکن دیوتا رحم دل ہوتے ہیں میرا تجھ پر ایمان ہے۔ میں تیری پرستش کرتی ہوں اور تیرے پاؤں پکڑ کر حفاظت کی التجا کرتی ہوں"۔

یم اب کامل طور پر تسخیر ہوگیا۔ اور کہنے لگا "ساوتری مانگ جو بر مانگنا چاہتی ہے"! لیکن ساوتری نے کھلم کھلا بر مانگنے میں پس وپیش کیا اور کہا تو نے میرے دیش بدر خسر کو تاج اور تخت واپس دے دیا۔ اس کو از سر نو نظر اور طاقت بخشی اتنا احسان اور کر کہ اس کے خاندان کا خاتمہ نہ ہو۔ اس کی سلطنت ستیاوان اور ساوتری کے لڑکوں کو وراثتًا ملے۔

یم ستیاوان کی روح واپس کرنے کے لئے مجبور ہوگیا۔ ساوتری اس جگہ واپس آئی جس جگہ اس نے اپنے خاوند کی لاش کو چھوڑا تھا اور دیکھا کہ وہ زندہ ہوگیا ہے۔ دونوں محبت اور مسرت میں سرشار کٹیا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں جاکر انہوں نے دیکھا کہ بوڑھے بادشاہ کی آنکھیں روشن ہیں۔ اور وہ امیروں وزیروں کے حلقہ میں کھڑا ہے۔

عشق ومحبت کی کوئی کہانی اب تک ساوتری کی کہانی سے سبقت نہیں لے سکی۔ ساوتری کی پرستش ایک دیوی کی طرح ہندوستان کے ہر گوشے میں امیر وغریب عورتیں یکساں طریقہ سے کرتی ہیں۔ جیٹھ (مئی۔جون) کے مہینے میں پورنماشی کی رات کو ہزارہا عورتیں اس مجسمۂ وفا کی یادگار میں ایک مذہبی تہوار مناتی ہیں جس کی محبت کو موت بھی تسخیر نہ کر سکی۔

(ترجمہ) **فضل محمد جگرانوی**

محبّت

اگر وہ مسرت کا ایک مختصر لمحہ ہوتی۔ تو وہ ایک تبسمِ لطیف کے رنگ میں پھول کی طرح کھلتی۔ اور تم اسے فوراً جان اور پہچان جاتے۔

اگر وہ درد والم کی ایک ٹیس ہوتی، تو وہ شفاف آنسوؤں کے قطروں میں حل کر نکلتی۔ اور ایک لفظ کہے بغیر تم پر میرے دل کے سربستہ راز کھل جاتے۔

مگر اے دوست! وہ محبت ہے۔

اس کا رنج اور اس کی راحت بے حساب ہیں۔ اور اس کی احتیاج اور اس کی دولت بے اندازہ۔

یہ تم سے اتنی ہی قریب ہے جتنی تمہاری روح تمہارے جسم سے قریب ہے۔ لیکن تم اس کو پورے طور پر کبھی نہیں جان سکتے۔

(ٹیگور) **محمد رفیع صدیقی**

محوِ دعا

ایک تصویر کو دیکھ کر

صبح کی رنگینیوں میں تیرا اندازِ دُعا
اُف کہیں برہم نہ کر ڈالے زمانے کی فضا

تیری نظروں میں ہے پنہاں جذبۂ معصومیت
اے سراپا حُسن تو ہے جانِ جانِ عبدیت

ہیچ ہیں تیری نظر میں عشق کی نیرنگیاں
تیری دامن کش نہیں امواج کی بیتابیاں

یہ سُہانا وقت، یہ مندر، یہ دریا کا خرام
کچھ خبر بھی ہے تجھے یہ دے رہے ہیں کیا پیام

سُن یہ فرطِ شوق میں تیرے لئے بیتاب ہیں
یعنی اپنی حسرتِ دیدار سے بے خواب ہیں

اک مگر تو ہے کہ ناواقف گدازِ عشق سے
گرچہ دنیا بےخبر ہے تیرے سازِ عشق سے

کس قدر جادو اثر ہے تیری شرمیلی نگاہ
تو مجسّم حُسن ہے اور حُسن کی اک جلوہ گاہ

دیکھنا سُورج کو تیرا کس قدر ہے دلنشیں
یعنی فرطِ شوق سے آنکھیں بھی جھپکاتی نہیں

بھر دیا ہے دل میں تیرے کس نے جوشِ بندگی
کس پہ تُو قربان اپنی زندگی ہے کر رہی

آ ادھر آ چھوڑ کر مندر کی یہ پابندیاں
تیرے دل میں مضطرب ہیں عشق کی بیتابیاں

بندگی کرتی ہے کس کی تُو تو خود معبود ہے
تیرے ہی انفاس سے عالم کی ہست و بود ہے

ثاقب کانپوری

مایوسِ زندگی

اس رات کو جب کہ فرحت دبے پاؤں چوروں کی طرح کمرہ میں داخل ہوا۔ میں اور جمالی نظریں بساط پر جمائے خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی چالیں سوچ رہے تھے۔ آہٹ پاتے ہی جمالی نے نظر اٹھائی اور بے ساختہ کہا "کون؟ فرحت؟ خیریت تو ہے۔ تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ ادھر آکر بیٹھ جاؤ۔ دیکھو کہیں بساط پر نہ گر پڑنا۔

ساتھ ہی جمالی نے مجھ پر کچھ ایسی پُرمعنی نظریں ڈالیں جنہوں نے زبانِ بے زبانی بن کر مجھ سے کھلے الفاظ میں کہہ دیا "نصیر! دیکھنا یہ حضرت انہی میں سے ایک ہیں جن کا ابھی تذکرہ تھا"۔

تعارف کے لئے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میں اور جمالی بچپن کے ساتھی تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھے ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں رہے۔ بلکہ بعد کو بھی دنیاوی کشمکش میں برابر چولی دامن کا ساتھ رہا حتیٰ کہ جمالی کی قسمت نے کروٹ لی۔ وہ دفعتہً ایک وسیع اور مالدار ریاست کا بلا شرکت غیرے تعلقہ دار ہو گیا۔ اور ایک محدود خزانہ کا مالک بھی۔ چنانچہ منصوری سرکلر روڈ پر جس وقت اس نے اپنے رہنے کے لئے ایک فلک بوس ٹیلے پر خوشنما، وسیع کوٹھی خریدنا چاہی تو میں نے مشورۃً کہا "جمالی! یہ کیا کرتے ہو تمہاری طبیعت یہاں ہرگز نہ بہلے گی"۔ اس نے حیرت بھرے الفاظ میں میری رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ہنس ہنس کر جواب دیا "نصیر ہمارے گزشتہ ایام کو بھولا ہوا خواب سمجھو۔ پہلے میری حالت شمع سحر کی مانند تھی مگر اب کہربائی روشنی رکھنے والا فانوس سمجھو جس پر ہر دم قسم قسم کے پروانے اندھا دھند نثار ہونے کی آرزو کریں گے۔ میرے آسمانِ عشرت کا ہر ستارہ روشن و تاباں نظر آئے گا۔ اور میرے بحرِ عیش کی ہر موج مسرت و شادمانی سے مملو دکھائی دے گی"۔

چنانچہ آنے والے فرحت صاحب کو میں جمالی کی اس پیشگوئی کی قسطِ اولیں سمجھا۔ یہ حضرت دبلے پتلے۔ گھبرائے ہوئے منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں۔ ایک لمبے سیاہ کوٹ میں سر سے پاؤں تک لپٹے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے۔ احتیاط سے دروازہ بند کیا چٹخنی بھی چڑھا دی اور پھر پُر التجا لہجہ میں بولے "کوئی ہرج نہ ہو۔ تو کھڑکیوں کے پردے نیچے تک گرا دیجئے"۔

میں نے دیکھا کہ جمالی نے بلا تامل اس کی تعمیل کی بلکہ ایک حد تک ہمہ تن مستعد ہو کر اُن کے مزید ارشادات کا منتظر ہو گیا۔

فرحت نے میری طرف بھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور دبی آواز میں "سلام علیک" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی فرحت صاحب ہیں جن کا شرف نیاز ہمیں عرصہ گزرا کہ لکھنؤ میں حاصل ہوا تھا۔ یہ حضرت امین آباد کی ایک مختصر سی دکان میں ممنوعہ اور ضبط شدہ کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔ جمالی سے پرانی ملاقات تھی حسنِ اتفاق سے ہماری

موجودگی میں پولیس ان کی خانہ تلاشی کے لئے پہنچی۔ گو کوئی خاص کتاب وغیرہ برآمد نہ ہوئی مگر پھر بھی مجھے اور جمالی کو ضرورت سے زیادہ قیام کرکے ان کی مدد کرنا پڑی۔ چنانچہ میں نے اس وقت ان کے متعلق یہ رائے قایم کی تھی کہ فرحت صاحب ایک شعلۂ ملتہب ہیں جن کو حوادث زمانہ ایک نہ ایک دن ٹھنڈا کرکے چھوڑیں گے۔

جمالی ۔ "فرحت آخر بتاؤ تو ۔ کیا مصیبت ہے۔

فرحت ایک غیر اختیاری حرکت کے ساتھ کرسی پر گر گیا۔ اس کا سر خود بخود ایک طرف کو جھک گیا۔ اور دونوں ہاتھ بے جان اعضا کی مانند ادھر ادھر لٹک پڑے اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "جمالی! میرا خاتمہ ہو گیا ــــ مجھے مردہ سمجھو"

جمالی ۔ "ہنس کر" ابھی تو یقین نہیں آتا"

فرحت "نہیں بس اب میری زندگی کا ایک ہی گھنٹہ اور باقی ہے۔

جمالی ۔ تب تو موت سے بچنے کے لئے کافی وقت ہے"

فرحت نے سر اٹھا کر کہا "جمالی خدا کے لئے میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ گیارہ بج چکے ہیں مجھے زندہ رہنے کے لئے فقط بارہ بجے تک مہلت دی گئی ہے"

جمالی بیٹھ گیا اور اپنی کرسی فرحت کے قریب لا کر بولا "کیا مطلب؟ ــ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تم کسی بزدل سوسائٹی کے پنجۂ ظلم وستم میں گرفتار ہو"

"تم ان کو بزدل کیوں کہتے ہو"

"محض اس لئے کہ ایک قوی اور باہمت آدمی اُن کے ظلم وتشدد کا نہایت دلیری سے مقابلہ کرسکتا ہے"

"تم اپنے فیصلہ میں سب کو شامل کرتے ہو؟"

"ہاں سب کو ــــــ بجز ایک کے"

"اور وہ ایک کون ہے؟"

"وہ ایک غیر معمولی قوت اور اختیارات رکھنے والی یہاں کی پہاڑی" یا لٹو سوسائٹی "ہے"

"پھر تو تم کو میری موت کا یقین کرنا چاہئے"

"کیا تم کو انہی لوگوں نے دھمکی دی ہے؟"

"ہاں ہاں ۔ یہی لوگ میرے درپئے آزار ہیں"

"تب تو میں مانتا ہوں کہ تمہاری جان خطرے میں ضرور ہے۔ تم کو آج رات کے بارہ بجے تک کا وقت دیا ہے؟"

"ہاں ـــــ میں نے ابھی بتایا تو تھا"

جمالی سراسیمہ ہو کر اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"تو آخر تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ میں کیا اس معاملہ میں تمہاری کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا، پالٹو سوسائٹی، کے نام سے بڑے بڑے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا انتقام یقینی ہوتا ہے اور ان کے طریقے بھی عجیب وغریب مشہور ہیں ـــــ مگر فرحت! آخر تمہاری کیا شامت آئی تھی جو تم ایسے خونخوار لوگوں سے الجھ بیٹھے"

"بھائی جمالی! نصیحت کا وقت نہیں۔ میں تمہارے پاس اس لئے ـــــ ہاں اس لئے آیا ہوں کہ اس خوف ودہشت سے میری جان پر بن آئی ہے۔ مجھے تمہارے حالات کا اخبارات سے پتہ چل چکا ہے کہ ماشااللہ تم تعلقہ دار ہو گئے ہو ـــــ تم پہلے بھی ایک مرتبہ میری مدد کر چکے ہو"

"مگر اس خاص معاملہ میں تو میں تمہاری مدد کرنے سے قطعی معذور ہوں۔ غالباً تم نے یہ سوچا ہوگا کہ میں اپنی دولت سے تمہارے دشمنوں کا انتقام خرید سکوں گا۔ مگر میں تم کو بتائے دیتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے ـــــ اور قطعی ناممکن۔ یہ لوگ اپنی بات کے دھنی ہیں اور کسی لالچ سے باز نہیں آتے"

فرحت نے آہ سرد بھر کر کہا "ہاں۔ میری کم بختی تھی کہ میں اُن سے برسرپیکار ہوا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں نے اپنی غیر یقینی معلومات کی بنا پر ان کی اور ان کی سوسائٹی کا خاتمہ کرنے کی بے سود کوشش کی۔ کاش میں ان کے معاملات میں خلل انداز نہ ہوتا اور اپنے آپ کو اس آفت ناگہانی میں نہ پھنساتا۔ ناکامی کے بعد فوراً ہی میرے پاس حکمنامہ پہنچا کہ مجھے محض چھ ہفتے زندہ رہنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اپنے مظالم میں التوا کی مہلت دے کر روح فرسا تکلیف پہنچانا اُن کا خاص شیوہ ہے میں اس عرصہ میں اُن سے پناہ پانے کے لئے ہر چند کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگتا چھپتا پھرا لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ مجھے روزانہ اُن کا معمولی حکمنامہ کسی نہ کسی ذریعہ سے بلاناغہ پہنچتا رہا جس میں لکھا ہوتا "اگر تمہارے خیال میں اپنے سایہ سے بھاگنا ممکن ہے تو تم پالٹو سوسائٹی کے انتقام سے بچ سکتے ہو" ان کے نیچے ہی ان دنوں کی تعداد درج ہوتی جو میری زندگی کی میعاد کے اختتام میں باقی رہ جاتے۔ مگر اس کی بجائے آج سے ہر تحریر میں بقیہ گھنٹوں کی تعداد درج ہوتی ہے۔ تمہارے پاس آنے سے پہلے بھی مجھے ایک تحریر مل چکی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جمالی کے دفعتہً اس کا بازو پکڑنے اور دروازے کی طرف اشارہ کرنے کی وجہ سے اس کا سلسلہ بیان منقطع ہو گیا ـــ دروازہ کی درز میں سے ایک سفید کاغذ کا پرچہ اندر کی طرف سرکایا جا رہا تھا۔ میں جھپٹ کر اس لئے اٹھا کہ جو بھی ہو دروازہ کھول کر ایک دم اس پر ٹوٹ پڑوں۔ مگر جمالی نے عجلت کی اور میرے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ کر مجھے روکتے ہوئے بولا "ہائیں یہ کیا غضب کرتے

ہو۔ یہ ایسا جال ہے جس میں دیدہ و دانستہ ہم کو نہ پھنسنا چاہیے اس میں دخل اندازی کے بعد نتائج کا خمیازہ لازمی ہے۔"

ایک منٹ کے بعد وہ آگے بڑھا۔ دروازہ سے پرچہ کھینچکر کھولا اور پڑھنے لگا:-

"پالٹو سوسائٹی کے خنجر موت کی طرح تیز اور روز ابد کی طرح دراز ہیں"

جمالی "غضب خدا کا۔ کس قدر جدت آمیز ہیں ان کے مظالم — اور دیکھنا عبارت کے نیچے اس صفر سے صاف یہ مراد ہے کہ اب کوئی گھنٹہ باقی نہیں رہا۔"

فرحت (سراسیمہ نظریں اٹھاکر) "آہ ان ظالموں نے اپنے معمولی مگر جاں ستاں طرز عمل سے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔"

جمالی - "بیشک! یہ حالت نہایت خلش انگیز ہے"

اس نے کاغذ کے پرچے کو سامنے انگیٹھی کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا اور اپنے خیالات کی ادھیڑ بن میں محو ہوگیا

فرحت - "اب چالیس منٹ بعد کیا ہوگا؟"

جمالی - (اپنے استغراق میں) "افسوس؟"

فرحت - "اچھا میں اب مکان پر واپس جاتا ہوں - میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔"

جمالی - "کیا فائدہ؟"

فرحت - "افسوس! میری زندگی کا بہترین زمانہ قریب تھا —— اس مہینے بعد میری شادی ہونے والی تھی۔"

جمالی (اسی محویت میں) "ہاں؟"

فرحت "اس مہ جبین کے ساتھ جس پر میں سو جان سے فدا ہوں اور جس کا قرب میری دنیا کو جنت بنا دیتا - میں نے ابھی تک احتیاطاً اپنی مصیبت کا اظہار نہیں کیا۔

جمالی - "یہ بہت اچھا کیا" (وہ بظاہر ابھی تک انتہائی غور و خوض میں مبتلا تھا)

فرحت - "آہ - اس خبر کو سن کر خدا جانے اس کا کیا حال ہوگا" —— اس خیال نے اس کے جسم میں ایسی سنسنی پیدا کی کہ وہ دیوانہ وار کھڑا ہوگیا - گویا اب اس میں اس تکلیف دہ احساس پر اختیار پانے کی سکت باقی نہ تھی - اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں بھرائی ہوئی آواز میں اس کے منہ سے نکلا - کیا میں اس طرح کتے کی موت ہی مروں گا"

جمالی (تسکین دیتے ہوئے) "فرحت ذرا صبر کرو"

فرحت "آہ جمالی! صبر - صبر کیسے کروں - تم کو کیا معلوم کہ اس عرصہ میں میری روح پر کیا کچھ رنج والم گزرے ہیں" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے - اور وہ کرسی پر بیٹھ گیا -

اب میرا جی نہ مانا۔میں نے بڑھ کر جمالی سے پوچھا۔فرحت کو کامل یقین ہے کہ بارہ بجے کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح ضرور مار دیا جائیگا۔کیوں جمالی! کیا تم کو بھی اس سے اتفاق ہے"؟

جمالی "بے نصیر اس میں شبہ کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔یہ لوگ بڑے چالاک اور فتنہ پرداز ہیں۔میں نے تو آج تک نہیں سنا کہ انہوں نے کسی کو بخشا ہو"۔

نصیر۔فرض کرو کہ فرحت صاحب یہاں ہمارے کمرہ میں رہیں تو؟"

جمالی "تمہارا مشورہ ناتجربہ کاری پر مبنی ہے"۔

فرحت۔یہ تو میں خود ہی گوارا نہ کروں گا گو آپ لوگ مجھے مجبور ہی کیوں نہ کریں۔وہ مہلک لمحہ اور اس کے ساتھ اہم واقعات پیش آئیں گے آپ لوگوں نے اگر دخل اندازی کی تو ناحق کی زحمت اپنے سر لیں گے اس میں تو شبہ نہیں کہ ان لوگوں کو یہاں میری موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔میں اب زیادہ نہ ٹھہروں گا۔آپ لوگوں نے لکھنؤ والے معاملہ میں اپنی محبت و عنایت کا کافی ثبوت دیا تھا جس کو میں مرتے دم تک فراموش نہیں کر سکتا ——— اچھا دوستو ——— خدا حافظ ——— گزشتہ چند ہفتوں کی مسلسل تشویش اور پیہم خلش کا بقیہ نصف گھنٹہ خاتمہ کر دے گا ——— اور اپنے ساتھ ہی میری پر ارمان زندگی اور ناکام محبت کا بھی"۔اس نے رخصت ہونے کے لئے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

جمالی۔(باطمینان) ٹھہرو! ابھی تمہاری رہائی کا ایک ذریعہ باقی ہے۔

فرحت "نہیں۔بس اب کوئی ذریعہ باقی نہیں"۔

جمالی "میں تسلیم کرتا ہوں۔مگر تمام باتوں کا دارومدار تمہاری ہمت اور استقلال پر ہے۔اگر اب بھی کچھ ہمت باقی ہے تو میری تجویز منظور کرو جس کی کامیابی تمہارا ایسا شاندار کارنامہ ہوگا جس کا اعتراف خود سوسائٹی والے کرنے پر مجبور ہو جائینگے کیونکہ ان کے انتقام کے آخری لمحہ میں تم ایسا رخنہ ڈال دو گے جو ان کے تمام تر انتظامات اور منصوبوں کو یک لخت الٹ دے گا ——— نصیر تم بھی اٹھاؤ اپنا کوٹ اور ٹوپی۔مگر ذرا جلدی"۔

فرحت۔"کیا بازار چل رہے ہو؟"

جمالی۔اب کچھ پوچھنے گچھنے کا وقت نہیں ——— جلدی کرو"۔

دو منٹ کے بعد ہم تینوں کتاب گھر کی سڑک پر خاموشی کے ساتھ قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے مطلع ابر آلود تھا۔ہوا گو فرحت آمیز تھی مگر اس کے رخ کی مخالفت ہماری رفتار میں گونہ حارج ہو رہی تھی۔پہاڑ کے بے ترتیب ٹیلے اور گھاٹیاں اپنے ہیبتناک منظر سے ہمارے دلوں پر بزدلی کی مہر ثبت کئے دیتے تھے۔سڑک پر بجز چند رکشا اور ڈانڈیوں کی سواریوں کے

کوئی نظر نہ آتا تھا۔ ہوٹل اور کلبوں کی پردہ دار کھڑکیوں سے بجلی کی روشنی چھن چھن کر سڑک پر بکھر رہی تھی۔

جمالی ۔ "ذرا قدم بڑھاتے چلو"

ہم سب نے اپنی رفتار اور تیز کردی۔ فرحت برابر بیچ میں رہا اور ہم دونوں داہنے بائیں۔ میں نے کئی بار غور سے دیکھا کہ فرحت اپنے سایہ سے ڈر ڈر کر۔ ہر گلی کوچے کے موڑ پر اور در و دیوار کے ہر گوشہ پر بھیانک اور خوفزدہ نظریں ڈالتا۔ خاص کر اس وقت جب ہم "اسٹیفل" کے سامنے پہنچے تو وہ بالکل ہی بدحواس اور سراسیمہ نظر آیا۔

سچ پوچھئے تو موجودہ حالت واقعی خلش انگیز تھی۔ میرا ذاتی خیال خواہ کچھ بھی ہو مگر میرے ساتھیوں کو یقین واثق تھا کہ اب کسی گوشہ سے کوئی خونخوار صورت نمودار ہو کر قاتلانہ حملہ کرتی ہے ــــ یہ ممکن تھا کہ ہم اپنی حفاظت جان کی خاطر دفعتہ گتھم گتھا نظر آئیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ تخیل میں میں نے تو آستینیں چڑھا کر چھڑی کی گرفت کو قابو میں کرلیا۔

جمالی چلتے چلتے ایک دم رک گیا اور بولا "شکر ہے ہم اپنی منزل مقصود پر بخیریت تمام پہنچ گئے۔ ذرا سامنے نظر جما کر دیکھو وہ جو بجلی کے چار قمقمے یکجا نظر آتے ہیں۔ ایک جوہری کی دکان ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہاں جواہرات کی خرید و فروخت کی سب سے بڑی فرم ہے۔ ان کا مال بہترین قسم کا ہوتا ہے۔ اور اسی لئے ان کو گرد و نواح میں خاص شہرت اور وقعت حاصل ہے"

اب ہم دوکان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ صدر دروازہ کے اوپر ہی چار قمقموں کا گچھا اس لئے تمام رات روشن رکھا جاتا تھا تاکہ پہرہ والا کانسٹبل اندر باہر سب کی خبر لیتا رہے۔ دروازوں میں قد آدم آئینے اور ان کے دو چار انچ پیچھے پیتل کے سلاخدار خوشنما اور سبک کواڑ تھے۔ جن سے ملا ہوا الینڈ و کمپنی کے بیش قیمت جواہرات زیورات اور دیگر مختلف سامان نفیس میزوں اور الماریوں میں آراستہ تھا۔

جمالی ۔ یُوں ہی آگے بڑھے چلو۔ وہ دیکھو سامنے کانسٹبل کھڑا ہے۔ غالباً بارش کی وجہ سے اپنی خاص جگہ چھوڑ کر کونے میں جا دبکا ہے۔ ہم دونوں تو رخصت ہوتے ہیں۔ مگر فرحت تمہاری زندگی اب تمہارے حسن تدبیر و فراست پر منحصر ہے!"

جمالی کی تجویز کا مفہوم میری سمجھ میں تو کماحقہٗ فوراً آگیا۔ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا فرحت کی عقل نے کہاں تک کام کیا۔ تاہم اس نے متعجب لہجہ میں پوچھا "کیا مطلب ؟"

جمالی ۔ "مطلب کیا ؟ بھلے آدمی۔ سڑک کو پار کرکے دوکان تک جاؤ۔ شیشہ توڑو۔ اور جو کچھ ہتے چڑھے لیکر فرار ہو جاؤ۔ دم زدن میں کانسٹبل تم کو گرفتار کرلے گا۔ پھر تم فقط ایک ہی رات حوالات میں آرام کی نیند سونا کیسا کئی ماہ قید خانہ کی چار دیواری کے اندر بسکون تمام محفوظ رہ کر آرام کرسکو گے۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "پالٹو سوسائٹی" کے خنجر نہ تو اس قدر تیز اور نہ ایسے دراز ہیں جو قید خانہ کے اندر اپنا کام کرسکیں"۔

فرحت ۔ "خدا سے ڈرو۔ کیا تمہارا یہ مقصد ہے کہ دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو گرفتار کرا دوں"۔

جمالی ۔ "بیشک! اگر تم کو آج کی رات کے بعد بھی زندہ رہنے کی تمنا ہے۔"

فرحت ۔ "ایک چور کے نام سے ۔ قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں سزا یافتہ کی حیثیت سے ۔ چور ۔ بدمعاش ۔ ڈاکوؤں کی صحبت میں آہ! ـــــ خدایا۔"

جمالی ۔ "مگر موت سے یہ تمام حالتیں کم خطرناک ہیں۔"

فرحت ۔ "نہیں ۔ نہیں ۔ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔"

جمالی ۔ "تو پھر تمہارے لئے اب پانچ منٹ کا وقفہ اور باقی ہے ۔ کس قدر بزدل آدمی ہو ۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو بلا تامل گزرتا۔"

فرحت ۔ "مگر جمالی یہ تو بڑا ہمت شکن سوال ہے۔"

جمالی ۔ "دیکھو اب چار ہی منٹ باقی رہ گئے۔" "موت کا لمحہ بعجلت قریب تر ہوتا جاتا ہے۔"

فرحت ۔ "اچھا لو ۔ یہ چند چیزیں جو میں اپنے ہمراہ قید خانہ لے جانا نہیں چاہتا تم رکھ لو۔"

اس نے اپنی جیبیں خالی کیں اور سڑک کو بعجلت عبور کرتا ہوا دوکان کی طرف چل دیا۔

جمالی ۔ "کانسٹبل نے ابھی تک ہم کو دیکھا نہیں ہے ۔ نصیر آؤ ۔ ہم تم اس طرف کو ہٹ جائیں ۔ فرحت کی حرکت کے بعد کہیں ہم لوگ شبہ ہی میں نہ دھر لئے جائیں ۔ ایلو ـــــ فرحت نے ہاتھ مار دیا۔"

فرحت نے اپنی چھڑی کی دوہری ضربوں سے شیشہ چُور چُور کر دیا ۔ داہنا ہاتھ اندر ڈال کر چند قیمتی زیورات اٹھائے ہی تھے کہ کانسٹبل ایک دم چونک کر بے تحاشا اس کی طرف دوڑا جس کو دیکھتے ہی فرحت کے ہوش و حواس جاتے رہے ہمت جواب دے گئی اور قبل اس کے کہ قانون کے زبردست شکنجہ میں گرفتار ہو ۔ سر پہ پاؤں رکھ کر ایسا بھاگا کہ ہوا ہوگیا۔

جمالی ۔ "ہے کمبخت ۔ نادان۔"

کانسٹبل کی سیٹی فضائے خاموش میں گونجی ۔ اور دوڑ شروع ہوگئی۔

جمالی (گھبرا کر) "آؤ نصیر ہم لوگ چلیں ۔ ناحق اپنی جان زحمت میں کیوں پھنسائیں ـــــ ہائیں ۔ ہائیں ۔ دوڑنے کی ضرورت نہیں ۔ آہستہ آہستہ چلو۔"

ہم لوگ مشکل سے پچاس قدم بڑھے ہونگے کہ گھنٹے پر بارہ ضربوں کی آواز فضائے خاموش میں گونجی اور اسی میں حل حل کر ناپید ہوگئی۔

میں نے نہایت بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ علی الصباح اخباروں کے کالموں پر نظر ڈالی مگر واقعۂ سبق کے متعلق کوئی

کوئی اشارہ بھی نہ پایا۔ مگر شام کو منصوری ٹائمس میں جن الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا تھا اس نے مجھے دریائے حیرت میں غرق کر دیا۔ اسمیں لکھا تھا کہ لینڈ ٹ کمپنی۔ کی دوکان میں سرشام عجب دیدہ دلیری سے چوری کی گئی ہے۔ شیشہ توڑنے کی تفصیل۔ اور مجرم کی گرفتاری کے لئے پولیس کی سرتوڑ کوشش کا بھی ذکر تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ مجرم ایسی غیر معمولی تیزی سے بھاگا اور کسی پوشیدہ مقام میں اس صفائی سے جا دبکا کہ باوجود تعاقب کے اس کو فرار ہونے کا کافی موقع مل گیا۔ کمپنی کے چند بیش قیمت زیورات اس کے ہاتھ آ گئے تھے۔ مگر بھاگتے ہوئے ایک ایک کر کے اس نے سب پھینک دیئے۔ بجز ایک خوشنما انگوٹھی کے جس پر قیمتی فیروزہ کا اصلی بے داغ نگ جڑا ہوا تھا۔ اس انگوٹھی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔

میں اسی طرح اخبار ہاتھ میں لئے سیدھا جمالی کے مکان پر پہنچا۔

جمالی "کہو نصیر! خیریت تو ہے"

میں نے اس کے سامنے اخبار بڑھا دیا۔

جمالی (اخبار پڑھ کر) "کہو کیا سمجھے؟"

نصیر۔ "فرحت صاف نکل گیا ــ اور کیا؟"

جمالی "ہاں۔ غالباً پولیس نے اس کے حق میں ہمدردی نہیں کی"۔

نصیر۔ "تو کیا وہ اپنے دشمنوں کے دام میں گرفتار ہو گیا"

جمالی۔ یہ بھی یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر وہ کہیں اور کسی طریقہ پر محفوظ رہ سکا ہے تو انتہائی حیرت کا مقام ہے"

نصیر۔ مگر وہ لوگ تو نہایت چالاک ہیں اور کبھی غفلت کے مرتکب نہیں ہوتے"

جمالی "بیشک یہ سچ ہے۔ یاد رکھنا کہ دروازہ سے پرچہ سرکاتے وقت میں نے تم کو دخل اندازی سے باز رکھکر تم پر بڑا احسان کیا"

نصیر۔ تم کو اس کا بھی خیال ہے کہ ایک انگوٹھی غائب ہے"

جمالی "انگوٹھی مل جائے گی"

نصیر۔ مگر صاحب! فرحت نے ایسا گاڑھا ہاتھ مارا کہ مجھے اس کے بیان کردہ قصہ کی صداقت میں شبہ پیدا ہو گیا۔

جمالی "یہ غلط ہے۔ تم یہ نہیں سوچتے کہ قید خانہ کی تجویز تو میری پیش کی ہوئی تھی ـــــ اور سچ پوچھو تو ترکیب ــ تھی اچھوتی۔ بہت ممکن تھا کہ اس ذریعہ سے وہ اپنی جان بچائے جاتا . . . . " جمالی دفعتہً خاموش ہو گیا۔

ملازم (اندر آ کر) "ایک صاحب حضور سے ملنے آئے ہیں۔ نام نہیں بتاتے مگر بضد ہیں کہ جلد سے جلد اطلاع کر دی جائے ان کو اشد ضروری کام ہے"

جمالی نے نظریں اٹھا کر ملازم کو ایک بار غور سے دیکھا۔

جمالی "نصیر۔ دال میں کچھ کالا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال دیکھنا تو چاہیئے کون صاحب تشریف لائے ہیں" (ملازم سے) انکو یہاں بلالاؤ۔

انتظار کی ان چند ساعتوں میں مجھ پر ایک ناخوشگوار کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے دوست کے چہرہ پر بھی انتشار و ہیجان بین طور پر نمایاں تھا۔ اس کے "دال میں کچھ کالا معلوم ہوتا ہے" کے الفاظ اور مزید برآں چند بے چین حرکتوں نے میرا خون منجمد کرتے ہوئے مجھے صاف بتادیا کہ سنبھل بیٹھو! اب مصیبت کا سامنا کرنا ہے۔

ایک نوجوان چست پائجامہ چست اچکن پہنے اور سر پر رنگین بنارسی صافہ باندھے ہوئے کمرہ میں داخل ہوا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ آدمی حسین۔ خوش وضع اور خوش پوش ہے۔ کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے ایک دلفریب ادا کے ساتھ "آداب عرض" کہا۔ نہایت اطمینان اور استقلال سے اپنی چھڑی ایک طرف رکھ کر میز کے قریب والی آرام کرسی پر بیٹھا اور فوراً ہی کرسی کے دونوں ہتھوں پر ہاتھ دراز کرکے بے تکلف لیٹ گیا۔

اب تک جانبین پر خاموشی طاری تھی۔ جمالی ایک کرسی سرکا کر قریب آبیٹھا چنانچہ میں بھی اسی کرسی کے ایک ہتے پر ٹک گیا۔

اجنبی نے سلسلۂ کلام میں پیش قدمی کی مگر کچھ عجب بے تکے سوال کے ساتھ۔ اس نے دفعتہً پوچھا "جمالی صاحب آپ نے نیلی چھتری ناول پڑھا ہے۔" مگر یہ الفاظ کچھ ایسی شیریں آواز اور دلآویز ادا کے ساتھ کہے گئے کہ میں اپنے تمام شبہات کو غلط فہمیوں پر محمول کرنے پر مجبور ہوگیا۔

جمالی "جی ہاں پڑھا تو ہے۔ مگر عرصہ گزرا"

اجنبی "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا قصہ آپ کو یاد نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ بہرام کا نام آپ نہ بھولے ہونگے۔ بہرام کے علاوہ فضل خاں پاربتا حشمت اور رودآراب شاہ وغیرہ کا نام بھی آپ نے سنا ہوگا"

جمالی "ہاں کچھ یاد تو آتا ہے"

اجنبی "خیر آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ سب لوگ تن تنہا اپنے کارناموں کی وجہ سے غیر معمولی طور پر مشہور ہوئے"

جمالی "بے شک"

اجنبی "اور اب ایک ایک کرکے اُن سب کا خاتمہ ہوچکا ہے"

جمالی "ہوگیا ہوگا"

اجنبی "مگر آپ کو اس کا بھی علم ہے کہ فی زمانہ ایک پالٹو سوسائٹی برسر اقتدار ہے"

جمالی "جی ہاں میں نے سنا ہے کہ اس کی ابتدا اور قیام بڑے قدیم اور معزز ذرائع سے وابستہ ہے"

اجنبی ''غالباً ـــــ مگر شاید آپ اس سے ناواقف ہیں کہ ان لوگوں کا حلقۂ اثر اگر ایک مخصوص مقام ضلع یا خطہ تک محدود تھا تو یہ سوسائٹی ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اپنا اثر رکھتی ہے۔''

جمالی ''دعویٰ تو زبردست ہے۔''

اجنبی ''جمالی صاحب! آپ کیا اس سے انکار کرتے ہیں؟''

جمالی ''ہرگز نہیں۔''

اجنبی ''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی'' اس نے جیب سے کیس نکال کر سگرٹ سلگایا اور پھر جمالی پر متبسم نظریں ڈال کر بولا ''مجھے واقعی خوشی ہوئی'' (دیا سلائی کو ایک طرف جھٹکے سے پھینک کر) ''کیونکہ یہاں میری حاضری کسی ناگوار مقصد پر مبنی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو ایک حد تک میرا ممنون ہونا چاہئے۔''

یہ الفاظ سنتے ہی مجھے اپنے سینہ کی ہیجانی کیفیات میں گونہ سکون محسوس ہوا۔ میں ٹکٹکی باندھے جمالی کو دیکھتا رہا۔ مگر اللہ رے استقلال اور بل بے تیرا استغنا اس کے چہرہ پر کہیں شکن بھی نہ پڑی تھی۔ اس نے اسی صبر و سکون کی حالت میں جواب دیا۔

جمالی ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ اپنی سوسائٹی کی جانب سے ان خیالات کا اظہار فرما رہے ہیں۔''

اجنبی ''جی ہاں محض اس کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے۔''

جمالی ''میں بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اجنبی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بلکہ جمالی کی طرف تھوڑا جھک کر اس نے آہستہ سے کہا ''جمالی صاحب کل ما بین گیارہ اور بارہ بجے رات ہمارے اور ہمارے مجرم کے معاملات میں آپ کی خلل اندازی یا محض اس کی کوشش ـــ کیا معنی رکھتی ہے؟''

بالآخر میری رگ رگ میں خوف و ہراس برق بیتاب بن کر سرایت کر گئے۔ مجھے اب خواہ مخواہ اس معاملہ میں اپنی ٹانگ اڑانے پر ندامت ہوئی اور اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے دیدہ و دانستہ ایک خونخوار شیر کے منہ میں ہاتھ گھسیڑا ہے۔ مجھے سوسائٹی کے انتقام کے مختلف ڈراونے عفریت دانت نکالے نظر آنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ جمالی کا دماغ بھی انہی تخیلات کا فانوس خیال بن رہا ہوگا۔ مگر بظاہر اس کے چہرہ سے انتشار و پریشانی ذرا نہ ٹپکتی تھی۔

جمالی ''مجرم کو جرم کی سزا دینا جائز ـــــ مگر اس کو روحانی تکالیف سے گھلا گھلا کر مارنا ـــــ یہ نہیں ہو سکتا۔''

اجنبی ''اوہو! ـ آپ کو ہمارے طرز عمل پر اعتراض ہے؟''

جمالی ''کم از کم اس نقطۂ نظر سے''

اجنبی ''ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ بزدل نہیں ـــــ میں ایک خاص تجویز پیش کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں جس کو

سن کر ممکن ہے آپ متعجب ہوں سب سے پہلے تو میں آپ کی اس حسن تدبیر کی داد دیتا ہوں جو آپ نے اس موقع پر مجرم کو پناہ دلانے کے لئے استعمال کی۔"

جمالی نے اس کے اقرار کو تبسم زیر لب تک ہی محدود رکھا۔

اجنبی۔ "بے پناہ اور لاجواب تھی واقعی آپ کی چال —— ہم کو صدہا ایسے مجرموں سے سابقہ پڑا ہے جنہوں نے مختلف تجاویز سے اور مختلف ذرائع سے ہمارے انتقام سے پناہ لینی چاہی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی تجویز ایسی یقینی۔ اور کوئی تدبیر ایسی کارگر دیکھنے میں نہیں آئی مجرم صاف نکل گیا ہوتا لیکن ناکامی کے نہ تو آپ ذمہ دار ہیں اور نہ آپ کی تجاویز۔ میں پھر اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کی دماغی کاوش قابل تحسین ہے جس کی میں داد دئیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

جمالی "یہ آپ کا حسن ظن ہے۔ ورنہ . . . ."

اجنبی "تکلفات کو دخل نہ دیجئے۔"

جمالی۔ "آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ مجرم صاف نکل گیا ہوتا —— کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ وہ نکل گیا۔ یا سچ فرمائیے کہ وہ قتل کر دیا گیا۔"

اجنبی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ مگر فوراً ہی سنبھل کر بولا "نہیں —— آپ کو اس کی بابت دریافت کرنے کا کچھ حق حاصل نہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ پر بخوبی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے حاضر نہیں ہوا ہوں بلکہ میری حاضری کی غرض و غایت آپ کی خدمت میں ایک تجویز پیش کرنا ہے جس کو آپ ہر چند غیر معمولی تصور کریں مگر وہ محض اس بات کو آپ کی دماغی اندازی کے نتیجہ پر مبنی ہے۔ آپ نے جس ہمت اور دلیری کا ثبوت دیا ہے وہ بجائے کسی سزا کے مستحق ہونے کے مقتضی ہے اس امر کی کہ آپ کی ہمت افزائی کی جائے مختصر یہ ہے جمالی صاحب کہ آپ کو ہماری سوسائٹی کے ممبر ہونے کی دعوت دی جاتی ہے"

میں تو حیرت و استعجاب کی حالت میں اچھل پڑا ۔تجویز ۔ اور اس کے پیش کرنے کا انداز دونوں ہی نرالے تھے۔ میں نے سوچا چلو جان بچی۔ لاکھوں پائے۔ مگر جمالی ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اسی طرح کرسی پر ڈٹا بیٹھا رہا۔

اجنبی "آپ کو نہایت شوق کے ساتھ دعوت دی جاتی ہے"۔

جمالی پھر بھی خاموش رہا۔

اجنبی "بذات خود مجھے آپ کی شرکت سے نہایت مسرت ہو گی"۔

جمالی "میں شکریہ ادا کرتا ہوں"

اجنبی۔ "تو گویا آپ منظور کرتے ہیں"۔

جمالی "جی نہیں"!

اجنبی "مگر چند وجوہات ایسے ہیں جن کی بنا پر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی شرکت آپ ہی کے مفاد پر مبنی ہو گی۔ ارشاد ہو تو عرض کردوں"

جمالی "جی نہیں۔ معاف فرمایئے۔ آپ خوب سمجھ لیں کہ کسی ایسی سوسائٹی میں جس کا مقصد قتل و غارت اور خلق خدا پر جا و بے جا سختیاں کرنا ہو میری شرکت امر محال کیا بلکہ ناممکن ہے"

اجنبی "آپ سخت الفاظ سے کام لے رہے ہیں مگر مجھے یہ عرض کر دینا چاہئے کہ سوسائٹی کی جانب سے اس قسم کی دعوت کا فخر بجز حضرت جمالی کے اور کسی کو آج تک نصیب حاصل نہیں ہوا!"

جمالی "ممکن ہے"

اجنبی "اور مجھے آپ کے آخری جواب کا انتظار رہے"

جمالی "میں عرض کر چکا"

اجنبی "تو کیا آپ کے دل میں اس دعوت کی کوئی وقعت نہیں"

جمالی "بصورت موجودہ مطلق نہیں"

اجنبی کھڑا ہو گیا اور تھوڑے سے توقف کے بعد بولا "افسوس کا مقام ہے۔ اگر آپ نے میری تجویز منظور کر لی ہوتی تو ممکن تھا کہ آپ کی دخل اندازی نظر انداز کر دی جاتی۔ مگر بصورت دیگر آپ یقین رکھیں کہ ہم اس سے درگزر نہیں کر سکتے"

جمالی بھی کھڑا ہو گیا "تو گویا آپ مجھے ڈراتے ہیں ——— دھمکاتے ہیں"

اجنبی "جی نہیں۔ بلکہ میں آپ کے قصور کے متعلق صفائی طلب کرتا ہوں"

جمالی "ہوش کی باتیں کیجیے"

اجنبی "یہ ملحوظ رہے کہ ہم پالٹو سوسائٹی کے ممبر ہیں"

جمالی "اچھا آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں"

اجنبی "ہم چاہتے کچھ نہیں بلکہ مجبور کرتے ہیں ——— آپ کو اسی مقام پر ایک مخصوص رقم کا چک لکھنا پڑے گا"

جمالی "اوہو۔ تو آپ نے اس قدر زحمت ناحق اٹھائی۔ پیشتر ہی فرما دیا ہوتا"

اجنبی "آپ مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنی غلطی کا احساس کیجیے۔ ایسی بااختیار سوسائٹی کی ہتک خطرہ سے خالی نہیں۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میری اولین تجویز پر دوبارہ غور کیجیے۔ میں اب بھی آپ کا جواب باصواب سننے اور قبول کرنے کے لیے تیار ہوں"

جمالی :۔ "میری جانب سے پھر وہی جواب نفی قبول فرمائیے"
اجنبی :۔ "تو آپ کو تاوان دینا پڑے گا"
جمالی :۔ "کس قدر"
اجنبی :۔ "دس ہزار روپیہ"۔
جمالی :۔ "میں آپ کو ——— ایک کوڑی بھی نہ دوں گا"۔

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس قضیہ میں مجھے اپنی شرکت کا اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ اپنے وجود کا۔ جمالی اعتراف کر چکا تھا کہ یہ سوسائٹی واقعی مخدوش ہے۔ اس لئے مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ رقم مطلوبہ بلا حیل وحجت حوالے کر دی جائے۔ بجائے اس کے کہ فرحت کی طرح ہر روز اپنی زندگی سے مایوس ہونے کے لئے پرچے اور احکامات وصول کرنے کی کوفت گوارا کی جائے۔ میں نے لاکھ چاہا کہ جمالی سے ذرا نظر ملے تو آنکھ مار کر اس سے علیحدہ چلنے اور اس تجویز پر مزید غور کر کے روپیہ حوالے کرنے کا مشورہ دوں مگر اُس نے مجھے موقع ہی نہ دیا۔

اجنبی :۔ "آپ کی خوشی"۔ اُس نے میز پر سے اپنی چھڑی اٹھائی اور واپسی کا ارادہ کرتے ہوئے بولا "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں ——— ذاتی طور پر درخواست کرتا ہوں کہ اس نازک سوال پر ایک بار اور غور کر لیجئے ——— میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ ایک بار اور سوچ لیجئے۔ محض اس ذاتی انسیت کی بنا پر جو مجھے آپ سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں ——— سوچئے ——— اور خدا کے واسطے ہوش میں آجائیے۔ اپنی جوانی پر رحم کیجئے"

جمالی :۔ "میں آپ کے اس خلوص اور ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خاص کر ان ذرّہ نوازیوں کا جن سے آپ اپنی ذاتی انسیت اور محبت کا بار بار اعادہ کرتے ہوئے مجھے مفتخر فرما رہے ہیں ——— مگر میری رائے میں تزلزل ذرا مشکل سے پیدا ہوتا ہے اور اس موقع پر تو سمجھ لیجئے ہر طرح ناممکن ہی ہے"۔

اجنبی نے اب کوئی جواب نہ دیا، بلکہ خاموشی کے ساتھ واپس جانے لگا۔

جمالی :۔ "نصیر! دروازہ تو بند کر لو"

میں نے بلا تامل جھپٹ کر دروازہ کی چٹخنی پر ہاتھ رکھ دیا ——— اجنبی کی سڈول ابروؤں میں ایک خفیف جنبش پیدا ہوئی اس کے چہرہ سے خوف وہراس تو نہیں مگر قدرے تشویش نمایاں ہو گئی۔

اجنبی :۔ "کیا مطلب!"

جمالی :۔ (آگے بڑھ کر) "مطلب کچھ نہیں محض آپ کو یہ لاکٹ دکھانا مقصود ہے۔ جو آپ کا مجرم فرار ہونے سے پہلے میرے سپرد کر گیا

تھا۔ آپ دیکھیں کہ جو تصویر اس کے اندر آویزاں ہے۔ وہ اس عورت کی تصویر ہے جس پر وہ فریفتہ ہے"!

اجنبی۔ "اس سے اور اس قصہ سے کیا سروکار"؟

جمالی۔ "بہت کچھ"

اجنبی۔ "کیونکر؟"

جمالی۔ "کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تصویر ——— آپ کی ہے"۔

میں تو حیرت سے انگشت بدنداں رہ گیا مجھے یقین تھا کہ ہمارا مہمان ایک فرمائشی قہقہے کے ساتھ اقرار کے بجائے انکار کردیگا یا یہ کہ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی مگر اس نے بجز ایک ادائے تبسم کے جس کا مقصد محض جمالی کا دل موہ لینا تھا اور کچھ بھی تو نہ کیا

جمالی۔ "فرمایئے کیا آپ اس سے انکار کرسکتی ہیں؟"

اجنبی۔ "میں ——— جی نہیں ——— برخلاف اس کے میں آپ کی قیافہ شناسی کی داد دیتی ہوں۔ بلکہ مزید برآں میں اس کا بھی اقرار کرتی ہوں کہ میرے اس حلیہ میں آنے کی وجہ محض آپ کا شوق تھا۔ میں صاف عرض کروں کہ اس خونخوار سوسائٹی میں میں ہی ایک عورت نہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ قانوناً ہمارے سپرد کوئی عملی کام نہیں کیا جاتا۔ مجھے آپ کو ملنا تھا ——— آپ کو دیکھنا تھا ——— کیا اب بھی آپ مجھے مایوس ہی رکھیں گے"!

جمالی۔ "اللہ غنی!۔ آپ کا دل بھی خزینۂ طلسمات ہے۔ فرحت بیچارے کو اپنی محبت کا یقین دلا دلاکر دیوانہ بنا نا کیا سراسر فریب تھا۔ اس کے دل میں آپ کی یاد۔ اس کے دماغ میں آپ کا خیال۔ بلکہ اس کی زندگی کا آسرا۔ اس کا مقصدِ حیات آپ تک محدود ہوچکا ہے۔ لیکن آپ ...."

اجنبی۔ "جمالی صاحب معاف فرمایئے۔ آپ کو ایک حد تک غلط فہمی ہوئی۔ میری توجہات غیر جانبدارانہ تھیں۔ مجھے نہ تو اُن سے کبھی محبت ہی ہوئی اور نہ نفرت۔ آپ بھول گئے کہ میرا تعلق ایک ایسی با اختیار سوسائٹی سے ہے جس کے لئے مجھے اپنی تمام تر توجہات وقف رکھنے کا قانوناً پابند بنا لیا گیا ہے۔ مگر خوب سمجھ لیجئے کہ مجھے آپ کی خدمت میں اس طرح خوشامدانہ عرض و معروض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر کوئی خاص سبب ایسا ہے۔ خدا کے لئے غور کیجئے ——— للہ محبت کی نزاکتوں کو مجروح نہ کیجئے اور ......"

جمالی اس کی معشوقانہ اداؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے کمرہ میں ٹہلنے لگا "آپ سمجھ لیں کہ اگر فرحت مارڈالا گیا ——— قتل کردیا گیا تو آپ ہی اس کی قاتل قرار پائیں گی۔ میں نے اس کے بچانے کی کوشش کی۔ مجھے اب اس تصور سے مسرت ہے ——— اچھا وہ زیورات جو اس نے میرے کہنے پر چرائے ...."

اجنبی ":اور جو اس نے بھاگتے میں سب پھینک دیئے"

جمالی -جی ہاں جو ایک ایک کر کے سب مل گئے ——— بجز ایک انگوٹھی کے جس میں فیروزہ جڑا تھا -اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہ انگوٹھی فرحت کے کسی دوست نما دشمن نے اٹھائی ہے"

اجنبی "سچ کہئے"

جمالی "اگر آپ یہ دریافت کریں کہ وہ کیا ہوئی تو میں عرض کروں گا کہ وہ کسی کی نازک انگلی کی زیب و زینت ——— ارشاد ہو تو صاف صاف کہہ دوں"

اجنبی کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا -"آپ کا مطلب مجھ سے ہے"

جمالی -آپ نے ابھی اپنا دستانہ اتارتے ہوئے اسی قسم کی انگوٹھی پہنے نظر کر دی تھی مگر جھٹ آپ کو خیال آیا اور فوراً دستانہ دوبارہ پہن لیا

اجنبی "اب آپ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں" مگر اس کے چہرے سے تشویش نمایاں تھی۔

جمالی "جی کیا فرمایا -بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں -بہر حال مجھے یقین ہے کہ فیمتی گم شدہ انگوٹھی اس وقت آپ کی انگلی میں موجود ہے -کیا آپ اس سے انکار کر سکتی ہیں؟"

اجنبی "انکار——— قطعی انکار ——— دیکھئے -خبردار——— آپ یہ کیا کرتے ہیں؟"

جمالی ٹیلیفون کی طرف بڑھ گیا -اور ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بولا" میں پولیس کو اطلاع دوں یا نہ دوں یہ آپ کے طرز عمل پر منحصر ہوگا -اگر بفرضِ محال مجھ کو اطلاع دینی پڑی تو آپ ایک مسروقہ انگوٹھی کے قابض ہونے کے الزام میں یہیں گرفتار ہو جائیں گی پولیس تمام واقعات سے باخبر ہے -میں آپ کو آگاہ کئے دیتا ہوں"

اجنبی (پاؤں پٹک کر) آپ نہایت فتنہ پرداز ہیں ——— اگر آپ کے شبہات غلط ثابت ہوئے؟"

جمالی "تو مجھے ان کی سزا منظور ہے"

اجنبی -لیکن میں آپ کے ذہن نشین کر دینا چاہتی ہوں کہ بفرضِ محال آپ کا خیال صحیح ہو اور میں گرفتار ہو جاؤں تو یاد رکھئے کہ آپکو اس حماقت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا -آپ جانتے ہیں کہ اس کا تاوان کیا ہوگا؟"

جمالی "میں اپنی حفاظت کی پوری کوشش کروں گا"

اجنبی "ناممکن"

جمالی -"پھر بھی میں کوشش تو ضرور کروں گا ——— فرمایئے ریسیور اٹھاؤں"

اجنبی -"اٹھایئے"

جمالی -"بہتر ہے" اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

اجنبی ۔ ٹھیرئیے ۔" جمالی نے ریسیور اٹھا لیا۔

اجنبی ۔" اچھا بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔"

جمالی ۔" تم با اختیار رہو۔ مجھ سے وعدہ کرو۔ اور حلفیہ وعدہ کرو کہ میں اور میرے دوست سوسائٹی کی دست برد سے محفوظ رہینگے"

اجنبی ۔" میں یہ نہیں کرسکتی۔"

جمالی ۔" مجھے یقین ہے کہ آپ کرسکتی ہیں۔"

اجنبی ۔" میں نہیں کروں گی۔"

جمالی نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ بات کرنے والے آلہ کی طرف منہ جھکا کر آواز دی ۔" ایکسچینج! ۔ نمبر۔ ۔ ۔"

اجنبی کا چہرہ فرطِ خوف و غصّہ سے تمتمانے لگا۔ اس نے گھبرا کر کہا ۔" ٹھہرئیے ۔ ٹھہرئیے ۔"

جمالی ۔" جلد فرمائیے ۔ کیا کہتی ہیں۔"

اجنبی ۔" اچھا میں وعدہ کرتی ہُوں کہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔"

جمالی ۔" اور میرے دوست کو؟"

اجنبی ۔" جائیے وہ بھی آزاد کئے جاتے ہیں۔"

جمالی نے ریسیور رکھ دیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اجنبی نے جاتے وقت جمالی پر کچھ ایسی حسرت آمیز نگاہیں ڈالیں جن کا تصور جمالی کو خلوت و جلوت دونوں میں بے چین رکھنے لگا۔ جمالی نے دروازہ بند کیا آرام کرسی پر لیٹا اور اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر بولا ۔" نصیر مجھے اب بھی فکر لاحق ہے"

نصیر ۔" تو کیا تمہیں اس کے وعدہ کا یقین نہیں ــــــ آخر کیوں؟"

جمالی ۔" بھائی! یقین تو سب کچھ ہے ۔ لیکن اگر وعدہ خلافی کی ۔ تو سمجھ لو کہ ہمارا خاتمہ ہے ۔ مجھے یہی خیال بے چین نہیں کر رہا ۔ بلکہ تم نے دیکھا کہ وہ کافرجمال حسن کا نمونہ ہے ۔ اُسکی ایک ادائے تبسم قوی سے قوی آدمی کے ہوش وحواس کھونے کے لئے کافی ہے ۔ میں خوب سمجھتا ہُوں کہ وہ مجھ سے انتقام لینا نہیں چاہتی ۔ اور یہی میری بدقسمتی ہے ۔ میں انتقام سے نہیں ڈرتا مگر عورت کا اظہار محبت ہی کیا کم ہیبت ناک انتقام ہے ۔ تم سمجھے؟"

جمالی نے لاکٹ کھول کر تصویر کو ایک بار غور سے دیکھا ٹھنڈی سانس لی ۔ لرزتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے گلے میں پہن کر بولا ۔" نصیر یوں نہیں تو یوں سہی ۔" مجھے بہرحال "مایوسِ زندگی" ہونا پڑا ۔"

دیوانہ (بریلوی)

زیست

کہربا ہے کہ برقِ مضطر ہے، | اس سے مطلب؟ غرض کہ جوہر ہے

گرچہ مستور ہے حقیقتِ زیست | جلوہ فرما ہے واقعیّتِ زیست

کیا کریں؟ کیف و کم ہے پردے میں | وسعتِ زیر و بم ہے پردے میں

اس کا مفہوم ہے مگر اتنا | ہم کو معلوم ہے مگر اتنا

خود عمل ہی حیات ہے۔ یعنی | زندگی اور عمل ہیں ہم معنی

خلدِ شادی نہ دوزخِ غم ہے | زندگی ارتقائے پیہم ہے

دستِ قدرت کا انتخاب ہے زیست

ایک تصویرِ اضطراب ہے، زیست

امینِ حزین

رقاصہ

اماں[1] رقاصہ غمگین ہے۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھی رہتی ہے اور اس کی آنکھیں حیرت اور پریشانی میں گم رہتی ہیں۔ میں اس کی طرف دیکھ کر ڈر جاتی ہوں۔ اماں میں نے اسے بہت دفعہ دعا مانگنے کو کہا ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ دعا کیونکر مانگتے ہیں۔ اُسے دعا پر ایمان نہیں ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا اقرار بھی نہیں کرتی۔ وہ کافر ہے۔۔۔ مگر وہ کافر ہے۔ اماں مجھے بتاؤ حسرت و یاس کی ان گھڑیوں میں اُسے خوش کرنے کے لئے کوئی کیا کر سکتا ہے وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ وہ بیٹھی رہتی ہے اور اس کی آنکھیں حیرت اور پریشانی میں کھوئی رہتی ہیں۔ اس کی طرف دیکھتی ہوں تو میرے دل میں ایک ٹیس اٹھتی ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی بات نہیں جو موت سے پہلے اُسے تھوڑی سی تسکین بھی دے سکے؟ آہ! اس جوانی اس امنگ کے زمانے میں موت کیسی حسرتناک ہے خصوصاً اس کافر کے لئے۔ آہ اس کی جوانی اس کا حسن! کیا یہ گولیوں کا نشانہ بننے کے لئے ہی تھے۔ اماں! میں یہ سوچ کر لرز جاتی ہوں۔"

اپنی گفتگو ختم کر کے بوڑھی بہن نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر سینے پر باندھ لئے۔ اس کی رحم آلود بھوری آنکھیں مستفسرانہ نظروں سے اس زرد چہرے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے سامنے تھا۔ یہ بڑی اماں تھی جس کا سیدھا اور نحیف جسم اس کے بھورے اور سفید لباس میں موجود بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ متفکر تھا۔ جاسوس عورت جو اس وقت اس کی تحویل میں تھی ایک رقاصہ تھی جو یا تو جپسی قوم میں سے تھی یا حبشی قوم سے۔ اس عورت نے اپنے فرانسیسی عاشق سے میدان جنگ کے راز معلوم کر کے جرمنوں کو بتا دیئے تھے۔ جرم ثابت ہو چکا تھا اور وہ اسے یہ کہہ کر باکرہ عورتوں کی خانقاہ میں چھوڑ گئے تھے کہ اسے ہماری خاطر پندرہ دن کے لئے یہاں رہنے دو۔ وہ یہاں قید خانے سے زیادہ اچھی طرح رہ سکے گی۔" عورت! اور اس کو گولی سے اڑا دیا جائے! اس خیال سے ہی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے لیکن یہ جنگ کے ایام تھے۔ اور یہ سب کچھ ملک کیلئے ہو رہا تھا

بڑی اماں نے اپنی بھوری متین آنکھوں سے چھوٹی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری بچی! میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے کمرہ کی طرف لے چلو۔"

دونوں برآمدے میں سے گزرتی ہوئیں آہستہ سے اس کمرے میں پہنچیں جہاں رقاصہ اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی رنگ روپ نہ تھا۔ مگر مشرقی خون نے اس کے بدن پر گویا زعفران چھڑک رکھا تھا۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا بھویں کمان

[1] گرجا کی راہبہ عورتیں بہنیں کہلاتی ہیں۔ اور جو بہن منصب میں سب سے بڑی ہوتی ہے اسے تمام بہنیں اماں کہتی ہیں۔ اس مضمون میں بہن اور اماں کے الفاظ اسی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔

کی طرح اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں نے اس کی پیشانی کو کناروں سے چھپا رکھا تھا۔ اور اس کے عیاش مگر پتلے پتلے خوبصورت ہونٹوں میں سے اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکتے تھے اُس نے اپنے دونوں بازوؤں کو اپنے سینے پر لپیٹ رکھا تھا گویا وہ اس آگ کو دبا رہی تھی جو اس کے نازک جسم کے اندر مشتعل تھی۔ اس کی آنکھیں جو انگوری شراب کی طرح مست تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں کو چیر چیر کر گزر جاتی ہیں۔ اس چیتے کی آنکھوں کی طرح جو کسی پنجرے میں بند ہو۔

بڑی اماں نے کہا "میری بچی بتا ہم تیرے لئے کیا کر سکتے ہیں"۔

اس نے اپنی کمر کو ایک عجیب جنبش دی جس سے اس کا نرم و نازک جسم اس کے ریشمی لباس میں سے تھرتھراتا ہوا نظر آیا۔

بڑی اماں نے کہا "تم رنج اٹھا رہی ہو میری بچی، مجھے میری بہنوں نے بتایا ہے کہ تم دعا نہیں مانگتیں۔ میری بچی یہ نہایت افسوسناک بات ہے"۔

رقاصہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک لطف تھا۔ ایسا لطف جو کسی چیز کے چکھنے میں یا کسی راگ کے سننے میں یا ایک طویل بوسے میں ہوتا ہے اور پھر اس نے سر کی ایک جنبش سے انکار کر دیا۔

بڑی اماں نے کہا "تجھے دکھ دینے کے لئے کوئی کچھ نہ کہے گا۔ میری بیٹی تیرے حال پر سب کو رحم آتا ہے۔ سب تیرے غم کو سمجھتے ہیں۔ کیا تو کوئی کتاب پڑھے گی یا شراب پئے گی؟ یا کوئی اور ایسی چیز ہے جو تیرا غم غلط کرنے میں مدد دے سکے؟"

رقاصہ نے اپنے ہاتھ کھول دیئے اور ان کو پھر ملا کر اپنی گردن کے پیچھے لے گئی۔ اس کی اس حرکت میں ایک عجیب حسن تھا ایک عجیب لچک تھی۔ جسے دیکھ کر **بڑی اماں** کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر بھی ایک ہلکی سی سرخی نمایاں ہو گئی۔

بڑی اماں نے کہا کیا تو رقص کرنا چاہتی ہے میری بچی؟"

یہ سن کر پھر رقاصہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پیدا ہو گئی جس میں شراب کا سا کیف تھا۔ مگر اس دفعہ یہ مسکراہٹ پہلے کی طرح فوراً ہی ختم نہ ہو گئی۔ اس نے کہا "ہاں خاتون صاحبہ میں آپ کے لئے رقص کرنے کو تیار ہوں۔ اس سے مجھے راحت حاصل ہو گی"۔

بڑی اماں نے کہا "یہ بہت اچھا بیٹی۔ تیرا رقص کا لباس منگا لیا جائیگا۔ اور آج شام کے وقت کھانے کے بعد ہم تمہیں رقص کے لئے بلائیں گے۔ اور اگر تو چاہتی ہے کہ موسیقی بھی ہو تو ہم پیانو بھی مہیا کر سکتی ہیں بہن میتھائیلڈ موسیقی کی بڑی ماہر ہیں"۔

رقاصہ بولی "ہاں! ہاں۔ موسیقی ..... اور ایک سادہ رقص" "مگر خاتون صاحبہ کیا مجھے سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟"

بڑی اماں نے کہا "ہاں بچی۔ میں تیرے لئے ابھی سگریٹ بھیجتی ہوں"۔

رقاصہ نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ **بڑی اماں** کا کمزور پتلا ہاتھ جس کی نیلی نیلی باریک رگیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ رقاصہ کے

نرم نرم ہاتھ کی گرمی سے مس ہوا تو وہ کانپ گئی۔ آہ کل یہی ہاتھ سرد اور سخت ہو جائیں گے۔ اس نے کہا اچھا اب ہم رخصت ہوتے ہیں میری بیٹی"

"رقاصہ آج ہمارے لئے رقص کرے گی" یہی الفاظ تھے جو ہر زبان پر جاری تھے۔ سب بہنیں اسی انتظار میں تھیں انہیں یہ ایک عجوبہ معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی پیانو اٹھا لائی کسی نے موسیقی کی کتاب مہیا کی۔ اور شام کے کھانے پر آ بیٹھیں۔ سب آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ کوئی تعجب ظاہر کرتی تھی۔ کوئی کہتی تھی کہ خانقاہ کی مقدس فضا میں یہ ایک عجیب بد اخلت ہوگی۔ اور کسی کی نظروں کے سامنے گزرے ہوئے زمانے کی تصویریں پھر رہی تھیں۔ غرض کہ اس عجیب و غریب واقعہ نے سب کے دلوں میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر رکھا تھا۔ کھانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ میزیں صاف کر کے اٹھالی گئیں۔ دیوار کے سامنے لمبے لمبے بنچ بچھا دیئے گئے اور ان پر ساٹھ کنواریاں رقاصہ کے انتظار میں آ کر بیٹھ گئیں درمیان میں بڑی اماں بیٹھیں اور پیانو پر بہن میتھا ئیلڈ۔

کمرے میں پہلے رقاصہ کی محافظ بہن اور پھر رقاصہ داخل ہوئی۔ رقاصہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کھانے کے لمبے کمرے میں جس کی دیواریں سفید براق تھیں اور جس کا فرش سیاہ لکڑی کا بنا ہوا تھا بڑھتی چلی آتی تھی۔ سب کی نظریں اسکی طرف اُٹھ گئیں۔ صرف بڑی اماں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ کہیں یہ رقص نوجوان دلوں اور خام دماغوں میں وسوسہ نہ ڈال دے۔

رقاصہ نے سیاہ ریشم کا لہنگا پہن رکھا تھا۔ اور اس کی جوتی اور موزے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی کمر میں ایک خوب چوڑی اور چست مطلّا پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور اس کا سینہ زربفت کے ایک چست کپڑے سے ڈھنپا ہوا تھا جس کے کناروں پر سیاہ رنگ کی کور ٹانکی گئی تھی۔ اس کی باہیں برہنہ تھیں اور ایک سرخ پھول اس کے بالوں میں ایک طرف کو لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھی دانت کا ایک پنکھا تھا۔ اور اس نے اپنے ہونٹوں کو سرخی لگا رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا اور اس کا چہرہ بالکل ایک مصنوعی چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں نیچی نگاہیں کئے کھڑی ہو گئی۔ بہن میتھا ئیلڈ نے پیانو بجانا شروع کیا رقاصہ نے اپنا پنکھا اٹھایا۔ اس اندلسی رقص کے دوران میں وہ مشکل اپنی جگہ سے ہلی ہو گی۔ اس کے ہاتھ کی جنبشیں اسکے بدن کی لرزشیں، اس کی کمر کی لچک ایک ہی مقام پر محدود رہیں۔ صرف اسکی نگاہوں میں ایک حیات مضطرب معلوم ہوتی تھی جو کنواریوں کی لمبی قطار میں سے کبھی اس چہرے پر پڑتی تھی اور کبھی اس چہرے پر۔ ان چہروں پر جن میں ہزاروں قسم کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے کہیں شکوک و شبہات تھے۔ کہیں مسرت۔ کہیں خوف و ہراس۔ کہیں حیرت و انبساط بہن میتھا ئیلڈ نے ساز کو خاموش کر دیا رقاصہ ٹھہر گئی۔ کنواریوں کی صف میں سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کا ایک شور اُٹھا۔ اور رقاصہ نے ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا بہن میتھا ئیلڈ نے پھر پیانو بجانا شروع کیا۔ یہ ایک پولی رقص کی سر تھی۔ ایک لمحہ کے لئے رقاصہ اس کو سنتی رہی ایسا معلوم

ہوتا تھا جیسے موسیقی کی یہ طرز اُسے کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی ہے۔ پھر اس کے پاؤں ہلنے شروع ہوئے اور اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ اس وقت وہ بہت حسین اور مسرور معلوم ہو رہی تھی۔ بالکل ایک تیتری کی طرح اس وقت اسے کوئی غم نہ تھا۔ دیکھنے والیوں کے چہروں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور انکی زبانوں سے جوش مسرت میں بعض مبہم سے الفاظ ادا ہونے لگے۔

بڑی اماں بے حس وحرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پتلے پتلے ہونٹ خوب زور سے ملے ہوئے تھے اور اس کے دونوں ہاتھوں کی نحیف انگلیاں آپس میں گتھی ہوئی تھیں۔ گزرے ہوئے ایام کی تصویریں اُسے ابھرتی اور گرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں جیسے کسی جادو کے ڈبے میں سے نظر آیا کرتی ہیں۔ وہ ان گزرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہی تھی جب اس کا محبوب جنگ میں مارا گیا تھا اور اس نے اپنی زندگی مذہب کے حوالے کردی تھی۔ کافر دنیا کی یہ گدگدی صورت جس کے سیاہ بالوں میں سرخ پھول تھا جس کا چہرہ سفید تھا جس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ اس کے دل میں قدیم زمانہ کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ اس زمانے کی جب اسکی رسیلی امنگیں، اس کے مسرور جذبات ابھی مردہ نہ ہوئے تھے۔ اور جب وہ ابھی ان کو گرجا میں دفن کرنے کے لئے نہ لائی تھی۔

پیانو کی آواز ذرا رکی، اور پھر ایک نئے رقص کے لئے بیدار ہوئی۔ افسردہ جذبات میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ سینوں میں راز تڑپنے لگے۔ دل ایک دفعہ زور زور سے دھڑکے لیکن پھر تاریکی ہی تاریکی چھاگئی۔ بڑی اماں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ اس نے دانشمندی سے کام نہ لیا تھا۔ کتنے ہی خام دماغ، کتنے ہی نوخیز دل تھے۔ جو اس شعلہ جوالہ سے مشتعل ہوگئے تھے مگر کافر رقاصہ کی ان تاریک گھڑیوں میں تسکین کا سامان بہم پہنچانا بھی تو نہایت ضروری تھا۔ وہ رقص کرکے خوش ہو رہی تھی۔ ہاں وہ خوش ہو رہی تھی۔ اور اس کی خوشی میں کتنی طاقت کتنا وفور تھا۔ اس سے انسان ڈر جاتا ہے۔ تمام آنکھیں اس کے سحر سے مسحور ہو رہی تھیں۔ اسی طرح جیسے سانپ ایک خرگوش کی آنکھوں کو مسحور کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ لوسی بھی اس سحر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ بڑی اماں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ آہ غریب لُوسی! لیکن لُوسی کے خوفزدہ چہرے کے پیچھے اس نے کیا دیکھا نوجوان ماری! آہ وہ کس غور سے دیکھ رہی تھی . . . . آہ! اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ! ماری . . . مجسم شباب . . . بیس برس کی عمر . . . اس کا عاشق جنگ میں پچھلے ہی سال مرا ہے۔ بہن ماری . . . . تمام کنواریوں سے زیادہ خوبصورت! اسکے ہاتھ . . . . . . اس نے انہیں کس مضبوطی سے سینے پر باندھ رکھا تھا۔ اور ہاں . . . رقاصہ ماری ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اسکے گدگدے آتشین جسم کا پیچ وخم اسی کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ ماری کے لئے رقاصہ کے لبھانے والے سرخ ہونٹوں پر بار بار ایک عجیب تبسم نمودار ہوتا تھا۔ جس میں شہد کی سی حلاوت ہوتی تھی اور رقص میں ماری کو رقاصہ اپنے لئے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی شہد کی مکھی اپنے مرغوب پھول کے اُوپر منڈلا رہی ہو۔ بڑی اماں نے اپنے دل میں سوچا "کیا مقدس مریم عذرا کا ہی کام میں انجام دے رہی ہوں؟ یا یہ شیطان کا کام ہے"؟

رقاصہ اب تیزی سے بہنوں کی قطار کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکیں، اس کا چہرہ ایک پر غرور انداز سے تمتما اُٹھا۔ اس کا تمام جسم سراپا شوکت بن گیا۔ آہ ماری! یہ کیا؟ رقاصہ نے اس پر ایک عجیب نگاہ ڈالی اور اپنے پنکھے سے ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ رقاصہ نے ہوا میں ایک بوسہ لیا۔ ایک آگ سی بھڑک اٹھی . . . . . کہاں؟

رقاصہ جس طرح آئی تھی اسی طرح آہستہ آہستہ کمرے سے چلی گئی اور بوڑھی محافظ بہن اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

بہنوں کی طویل قطار میں سے ایک آہ کی آواز آئی اور . . . . ہاں . . . . کسی نے ایک سسکی بھی لی۔

بوڑھی اماں نے کہا جاؤ میری بچیو۔ اپنے اپنے کمروں میں چلی جاؤ . . . . . بہن ماری!"

نوجوان راہبہ آگے بڑھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

بڑی اماں نے کہا بہن ماری دعا کرو کہ اس غریب کے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔ مگر ہاں میری بچی یہ اندوہناک ضرور ہے۔ جاؤ اپنے کمرہ میں اور اس کے لئے دعا مانگو"

ماری وہاں سے چل پڑی۔ اس کے انداز میں بھی ایک تمکنت تھی۔ اس کے اعضا میں بھی ایک زیبائش اور حسن تھا۔ بڑی اماں نے ایک آہ کھینچی . . . .

~~~~~~~~

صبح ہوئی۔ سردی زوروں پر تھی۔ دھند ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ زمین پر برف کا ایک چھینٹا پڑا ہوا تھا۔ نماز ہو رہی تھی کہ وہ رقاصہ کو لینے آئے . . . . بندوق چلنے کی آواز آئی۔ بڑی اماں کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے خدا سے رقاصہ کے لئے دعا مانگنے لگی . . . ."

اُس شام انہوں نے ماری کو بہت تلاش کیا۔ لیکن وہ نہ ملی۔ دو دن کے بعد ایک خط آیا:۔

اماں مجھے معاف کر دو۔ میں دنیا کی زندگی میں واپس چلی گئی ہوں۔

"ماری"

بڑی اماں خاموش رہ گئی۔ زندگی! موت کے بعد! اس کے پردۂ خیال پر نقوش حرکت کرنے لگے . . . . رقاصہ کا چہرہ اس کے سیاہ بالوں میں سرخ پھول۔ سیاہ آنکھیں۔ سرخ لب۔ پھر ان پر اس کی انگشت پر اں کا ایک مس۔ اور پھر ایک بوسے کے ساتھ اس کا الگ ہونا۔ یہ سب مناظر ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئے۔

منصور احمد "کاروان"

~~~~~~~~

برسات کا راگ

پھر چلی آج ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا فصلِ گل کا پیام پھر آیا
کالی کالی گھٹائیں آئی ہیں تہ بہ تہ آسماں پہ چھائی ہیں
روشنی دن کی پڑ گئی پھیکی ہر طرف بڑھ رہی ہے تاریکی
ہے ہوا سے لہک رہا سبزہ لہریں لیتی ہے تازگی گویا
ہے جو موجِ ہوا سرور آمیز ذرّہ ذرّہ ہے کیف سے لبریز
نشہ رگ رگ میں کر گیا ہے اثر کن امنگوں سے جھومتے ہیں شجر
چارسُو چہچہا رہے ہیں پرند راگ ساون کا گا رہے ہیں پرند
غیرتِ صحنِ گلستاں بن ہے رشکِ فردوس ہے کہ گلشن ہے
زورِ نشو و نما ہویدا ہے ذرے ذرے میں جوش پیدا ہے
اللہ اللہ یہ فصلِ گل کا اثر دہر دولہ بن گیا ہے سر تا سر
کوئلیں کر رہی ہیں شور ادھر حشر برپا کئے ہیں مور اُدھر
ہے پپیہا کہ عاشقِ جانباز پی کہاں ہے کہ ایک دردکا ساز
ہائے یہ پی کہاں پپیہے کی
جائے اُن سے کوئی کہے اتنا

پی کہاں بانی ہے برچھی کی آہ دل میں اتر گئی سیدھی
کون وہ جھولتا ہے جھولے پر آتی جاتی ہیں پینگیں رہ رہ کر
روئے رنگیں ہے یا گلاب کا پھول سینہ اُٹھتے ہوئے شباب کا پھول
پینگیں جھولے کی یا امنگیں ہیں جذبۂ شوق کی ترنگیں ہیں
سرخ ساری ہوا میں بھرتی ہے موجِ رنگِ شباب ابھرتی ہے
کالی زلفیں ہیں سر سے لہراتی یا بڑی ناگنیں ہیں بل کھاتی
ایک تصویرِ حسن لرزاں ہے ایک برقِ جمال جولاں ہے
لیجئے چھڑ گئی ملار اک دم دل ہے اور ایک ہوک کا عالم
لگ گئی آہ تن بدن میں آگ شعلہ آتشیں ہے یہ یا راگ

~~~

جب گھٹا آسماں پہ آتی ہے آگ سی تن میں پھیل جاتی ہے
کوئی سونتن نہیں ہوں میں تیری مجھ کو برسات کیوں جلاتی ہے
دل میں نشتر چبھوئے جاتی ہے
یہ بھی برسات بیتی جاتی ہے

جگر بریلوی

خواہش

ہے جد و جہد کی دنیا، یاں آرام کی خواہش کس کو ہو آرام کی خواہش آپ کریں پھر کام کی خواہش کس کو ہو؟
وہ دور چلے پھر بزمِ جہاں میں زیست کے چرچے ہونے لگیں جو کیفیت سے خالی ہو اس جام کی خواہش کس کو ہو
جب نیک و بد کا فرق نہ ہو معلوم دعائیں مانگیں کیا آغاز ہی کا جب ہو نہ پتہ۔ انجام کی خواہش کس کو ہو
جس چیز کی خواہش کرتا ہے اس چیز کے قابل بن کے دکھا جب گھر میں بتی تیل نہ ہو پھر شام کی خواہش کس کو ہو
ہم آپکی چوٹیں سہہ نہ سکیں گے عاصف دل میں سوچو تو یوں آپ ہمیں بدنام کریں، پھر نام کی خواہش کس کو ہو

عاصف۔ ملانوی
~~~

محفلِ ادب

تین ہزار سال پہلے کی مصری شاعری

آتن (آفتاب) کا جلال

کیا دلفریب ہے تیرا ظہور افق آسمان میں!
اے روپہلے طباق! اے سرچشمۂ حیات!
ہر صبح ہم تجھے آسمان کے پورب میں دیکھتے ہیں۔
تو پوری زمین اپنے حسن سے معمور کر دیتا ہے!
تو ہی خوبصورت ہے، عظیم ہے، روشن ہے، زمین پر بلند ہے!
تیری شعاعیں تمام زمینوں کو اپنے دامنوں میں لئے ہوئے ہیں!
ہاں تمام زمینوں کو لئے ہوئے، جنہیں تو ہی نے بنایا ہے!
اور تو نے ہی ان پر انسانوں کو آباد کیا ہے!
وہ انسان جنہیں تو نے محبت کے بندھن سے جوڑ دیا ہے!
کہتے ہیں تو دور ہے۔ بہت دور ہے!
مگر تو دور کہاں ہے؟ تیری شعاعیں تو زمین پر پھیلی ہوئی ہیں!
اے بلند تر! کیا دن کی تابناکی تیرا ہی ایک جلوۂ نورانی نہیں ہے؟

دن اور پانی

کشتیاں آنے جانے لگیں۔
اپنے مستول ہوائیں اڑاتی ہوئیں!
سب راہیں تیرے نور سے روشن ہو گئیں!
مچھلیاں سطح پر دوڑ آئیں!

اے نور وہ تیرے سامنے سجدے میں گر پڑیں!
تیری شعاعوں نے موجیں توڑ دیں!
وہ سمندر کی تہ پر بچھ گئیں!

"الہلال" کلکتہ

ٹیگور کی معرکتہ الآرا نظم

مشہور بنگالی ادیب بنکم چندر چیٹر جی نے ایک دفعہ ٹیگور کو لکھا کہ آپ ایک معرکتہ الآرا نظم لکھیئے۔ آپ کی شہرت دنیا میں قایم ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس خط کا جواب آیا اور اس میں کچھ اشعار بھی لکھے ہوئے تھے جن میں شاعر نے اپنی محبوبہ کو مخاطب کر کے ذیل کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

"میں نے چاہا کہ میں بھی ایک معرکتہ الآرا نظم لکھ کر مسلم الثبوت شعرا میں سے ہو جاؤں، مگر میں نہیں جانتا کہ میرا تخیل کب تیری کھنکھناتی ہوئی چوڑیوں سے جا ٹکرایا اور اس میں سے ہزاروں نغمے پھوٹ پڑے۔ اسی غیر متوقع حادثہ کے باعث میری وہ معرکتہ الآرا نظم ریزہ ریزہ ہو کر تیرے قدموں میں پڑی ہوئی ہے۔"

"ماڈرن ریویو" کلکتہ

رموزِ عشق

وہ چھری تیز نہ ہو جس سے میرا محبوب مجھے ہلاک کرے تاکہ اُس کے ہاتھ دیر تک میری گردن کو لگتے رہیں

اگر محبت کا دعویٰ کرتا ہے تو ہلاک ہوتے وقت نہ تڑپ۔ بلکہ اس درد کو خوشی سے قبول کر۔

عشاق زہر پینے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ تو جہاں زہر دیکھتے ہیں وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس کے تلخ ذائقہ اور قاتل اثر سے واقف ہوتے ہیں۔

زہرِ فراق عاشق کی رگ رگ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ پھر بھی وہ آہ تک نہیں کرتا۔ کہ کوئی اس کی محبت سے باخبر نہ ہو جائے۔

محبوب کی ہر چیز میٹھی معلوم ہوتی ہے۔ چاہے وہ زہر ہی کیوں نہ ہو۔
اگر پروانہ بننے کا شوق ہے تو گرمی محسوس کر کے واپس نہ لوٹ۔ بے خوف اندر جا کر دولہا بن جا۔
جو جلتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ باقی سب تاریکی میں ہیں سینے میں آگ سلگا کر سب کچھ دیکھ لے۔

ابھی کانٹا چبھنے سے ہی تیرا خون نکل آتا ہے تو محبت کے تیروں کو کیونکر برداشت کرے گا۔ ابھی تیرا شوقِ محبت ہی بے جا ہے۔

شوقِ دید اس کو نہیں کہتے جس طرح تو چھپ چھپ کر سوراخوں میں سے دیکھتا ہے۔ دیوانہ وار اندر گھس جا اور دیکھ لے اگر تجھ پر رسوائی کا خوف طاری رہا تو تو اُسے اچھی طرح نہیں دیکھ سکے گا۔

اگر ساقی شراب کا سارا مٹکا اٹھا کر تیرے منہ سے لگادے تو تُو اُسے پئے جا۔ جب تک وہ خود نہ ہٹائے۔ تو سر نہ ہٹا تا حیات محبت کا غم کھائے جا اگر تو مر گیا تو رشتۂ زندگی ٹوٹ جائیگا۔ لیکن رشتۂ محبت ہمیشہ کے لئے استوار ہو جائے گا۔

صبر میں راحت ہے۔ سنجیدہ نگاہوں سے دیکھا کر صبر صرف زبان تک محدود نہیں ہے۔

کرم حسین "شاہ کا رسالہ" (سندھ)

فریبِ محبّت

"کیوپڈ ایک جامِ بلوریں لایا۔
"جس میں ایک عرق تھا۔
"اس کے متعلق اس نے کہا کہ جو اسے پی جائے۔
"اسے محبت کے کسی خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینی چاہیئے۔
"میں حریص تھا اُسے پی گیا۔
"اور جام کو جلد خالی کر دیا۔
"اس نے میرے بدن میں ایسی آگ لگا دی کہ میں خیال کرتا ہُوں
"کہ اس میں آتشِ دوزخ تھی"

ہیرک "علی گڈھ میگزین"

کشمیری لڑکی کا گیت

میرے پیارے بھائی تمہاری قسم میں تم کو اچھی اچھی چیزیں بنوا کر دوں گی۔

تمہارے لئے پھوپھی یا خالہ کی لڑکی جس کو تم چاہو گے بیاہ کر لاؤں گی -
یا الٰہی! یہ ابھی بہت چھوٹا ہے - اس کو اپنی حفاظت میں رکھیو - اور اس پر اپنی برکت نازل کیجو -
پیارے بھائی حوریں اور پریاں تمہارے لئے گیت گاتی ہیں -
تم نہایت خوبصورت اور پیارے ہو اس لئے پریاں تمہاری محبت کا گیت گاتی ہیں -
پیارے بھائی میں اپنا سر تم پر سے تصدق کر کے رکھ دوں - تم میرے چاند ہو میرے چھوٹے بھائی ہو -
میں تم پر سے صدقے اور قربان ہو جاؤں تم مجھے بہت پیارے لگتے ہو -

"نور جہاںؒ" امرت سر

نغمۂ حقیقت
فلسفۂ گیتا

مرا رازِ نہاں ہرگز سمجھ میں آ نہیں سکتا
جہاں کی سرحدِ ادراک میں اے دوست کب میں ہوں
سبب پیغمبر و عارف مرا بتلا نہیں سکتا
کہ اُن سب کا سبب ہے ایک ہی اور وہ سبب میں ہوں

(۲)

محبت اور نفرت کامیابی اور ناکامی
مری ہی ذات سے سب ہیں یہاں نشو و نما پاتے
تغافل ہوش دکھ سکھ نیک نامی اور بد نامی
یہ آخر کار میری ذات ہی میں محو ہو جاتے

(۳)

شفق میں ہوں میں سُرخی چشمِ انجم میں ہوں بیداری
شعاعِ مہرِ عالمتاب میں مَیں تھرتھراہٹ ہوں
بَن ہوں پچھلے پہر میں منظرِ عالم کی سرشاری
طلوعِ صبح میں مَیں ہی فضا کی کپکپاہٹ ہوں

(۴)

وہ حرکت ہوں سکونِ انتہائی جس میں پنہاں ہے
سکوں ایسا ہوں جو افلاک کی گردش کا حامل ہے
وہ منزل ہوں جہاں کیفیتِ شامِ غریباں ہے
غبارِ رہ گزر ہوں جس کے ہر ذرہ میں منزل ہے

(۵)

ہے جس میں سر بسر وحدت کا عالم میں وہ کثرت ہوں
وہ وحدت ہوں نہاں رہتی ہیں جس میں کثرتیں کھول

نہاں رہتے ہیں لاکھوں ہوش جس میں میں وہ وحشت ہوں ۔۔۔ میں ہوں وہ ہوش جس میں جوش زن ہیں وحشتیں لاکھوں

(۶)

ادا جس میں شناسائی کی ہے وہ کم نگاہی ہوں ۔۔۔ اُٹھے بیگانہ وش جو وہ نگاہِ آشنا ہوں میں
جو آئے خوبیِ قسمت کے ہاتھوں وہ تباہی ہوں ۔۔۔ جہاں سوتی ہیں تقدیریں وہاں بخت آزما ہوں میں

(۷)

اجل کا راز جو ہے وہ حیاتِ جاودانی ہوں ۔۔۔ بندھے جو ٹوٹنے سے وہ طلسمِ رنگ و بو ہوں میں
جو چشمک زن بقا سے ہے میں وہ دنیائے فانی ہوں ۔۔۔ جسے خود کھا گیا ہوں وہ فریبِ آرزو ہوں میں

(۸)

وہ اک لمحہ ہوں میں جس کا کبھی کٹنا نہیں ممکن ۔۔۔ وہ دن ہوں آ کے جو شہرِ خموشاں کو جگا جائے
میں ایسا وقت ہوں جس کا کبھی گھٹنا نہیں ممکن ۔۔۔ وہ شب ہوں میں ستاروں کو بھی جس میں نیند آ جائے

(۹)

غرض بزمِ جہاں میں حسن اور رونق ہے جو کچھ بھی ۔۔۔ ظہور اس کا یہاں اے دوست میری ہی بدولت ہے،

مگر دنیا کی ہستی تو فقط اک شان ہے میری
بھلا وہ کب عیاں ہے جو مرا رازِ حقیقت ہے

"سہیل" علی گڈھ

مطربِ جاں

نہیں یہ معلوم مطربِ جاں یہ تیرے نغموں میں ئے ہے کیسی
پلا رہا ہوں جو کوش دل کو ہوں محوِ حیرت یہ ئے ہے کیسی
جو رقصِ انجم میں بن کے نغمہ ہوا ہے روشن ہے راز تیرا
فلک کے پردوں میں ساز تیرا ہے راگ کیا جاں نواز تیرا
بہا کے سنگِ گرانِ ہستی کو جا ڈبوتا ہے ہُو کے یم میں
ہے گویا سیلابِ مستیٔ عشق تیرے نغموں کے زیر و بم میں

ہے مرتعش تارِ سازِ دل کا کہ تیری نے سے ملا سکے نے

نہ بن پڑا جب تو ناامیدی میں نغمۂ فریاد ہوگیا ہے

یہ آرزوئے دلِ حزیں تھی کہ تو اسے ہمصفیر کرلے

پہ تونے چاہا کہ دل کو دامِ نوا میں اپنے اسیر کرلے

گیتانجلی — "تجلّی" حیدرآباد دکن

خاک

راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستان میں اور افریقہ کے صحرائے اعظم میں ریت کے ٹیلے پہاڑوں جیسے اونچے ہوتے ہیں۔ اور قدرت نے ان کو ایک جگہ پہاڑوں کی طرح قید کرکے نہیں رکھا۔ وہ ہوا کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔ ابھی یہاں صاف اور چٹیل میدان تھا۔ ہوا چلی اور ذرّے دوڑ دوڑ کر آنے لگے۔ ہوتے ہوتے ایک بڑا اونچا پہاڑ سا ٹیلا تیار ہوگیا۔ یہ خاک صاف و شفاف جگمگاتے ذرّوں کا مجموعہ ابھی یہاں ٹیلہ کی شکل میں نمودار ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہاں سے اُڑے گی اور کسی دوسری جگہ اس کا ٹیلہ بن جائے گا۔

سورج گرماتا ہے تو یہ خاک آگ بن جاتی ہے۔ رات آتی ہے اور خنکی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ تو ان ٹیلوں کو ٹھنڈا برف بنادیتی ہے۔

یہ ٹیلے اور ذرات، خاک کے انبار بڑے خونی ہوتے ہیں بے شمار جانور اور آدمی ان کے نیچے دب جاتے ہیں اور مرے کے مرے رہ جاتے ہیں لمبی لمبی ٹانگوں اور گردنوں کے اونٹ اور اُن پر سوار ہونے والے آدمی رات کو صاف میدان میں سوتے ہیں۔ یکایک ہوا چلتی ہے اور کوئی ٹیلہ دوڑتا ہوا آتا ہے اور ان اونٹوں اور آدمیوں پر سوار ہوجاتا ہے اور یہ سب ٹیلہ کے نیچے دب کر دم گھٹنے سے مرجاتے ہیں اور بغیر کسی دوسرے کی امداد کے خود بخود قبر میں دفن ہوجاتے ہیں پھر خاک ان کے بدن اور ان کی ہڈیاں رفتہ رفتہ اپنے اندر جذب کرلیتی ہے اور جس خاک سے یہ بنے تھے آخر کار اسی خاک کی صورت بن جاتے ہیں۔

یہ ہے مجھ خاک کی سفاکی اور جلادی۔ افریقہ کے ریگستان میں ہزاروں میل تک میرے ذروں کے سوا نہ کوئی درخت نظر آتا ہے نہ انسان نہ حیوان۔ نہ سڑک نہ مکان۔ وہاں میرے اوپر نہ کوئی چلنے والا ہے نہ مجھ پر کوئی گندگی ڈالنے والا ہے اور وہاں میں انسانوں کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوتی ہوں۔ میرے ذروں کے چہرے نہایت صاف شفاف اور ان میں زندگی کی امنگ بھری ہوئی ہے۔ بس وہ سورج کی کرنوں اور ہوا کے جھونکوں میں رات دن کھیلتے رہتے ہیں۔

"نظام المشائخ" دہلی

تبصرہ

تاریخ فلسفۂ اسلام - یہ کتاب ہالینڈ کے مشہور مستشرق فلسفی ٹی جے، ڈی بور کی جرمن تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم - اے - پی - ایچ - ڈی اس کے مترجم ہیں۔ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے فلسفۂ اسلامی کی نمود و بود کا میدان - فلسفہ اور عربی علوم - فیثاغورسی فلسفہ - مشرق کے نوفلاطونی اور ارسطاطالیسی حکما - مشرق میں فلسفہ کا انحطاط - فلسفہ مغرب میں - ابن خلدون - عرب اور سوفسطی فلسفہ - مسلمان قوموں نے اپنی تمدنی ترقی کے زمانہ میں جن فلسفیانہ مسائل پر غور کیا اور فطرت کے جن عقدہ ہائے سربستہ کو کھولا اس کی تشریح اس کتاب میں نہایت عمدہ پیرایہ میں کی گئی ہے۔ ترجمہ بھی بہت اچھا ہے قیمت دو روپے ہے۔ ملنے کا پتہ :- مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

مطالبۂ فطرت یعنی اتحادِ مذہب و فلسفہ حصہ اول - مصنفہ محمد فاروق صاحب ایم - ایس سی (علیگ) یہ کتاب ڈاکٹر ولیم ڈریپر کی کتاب معرکۂ مذہب و سائنس سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اور اس میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی جنگ در اصل کسی حقیقی اختلاف کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اعتباری ہے۔ در حقیقت دونوں کی غایت ایک ہے۔ دونوں فطرت کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے میں مصروف ہیں۔ اور اگر مذہب کے بعض مسائل فہم سے بالاتر ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ حقیقت سے ہی عاری ہیں۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقل انسانی بحالت موجودہ ان کے ادراک سے عاجز ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے قاصر نہیں ہے۔ بقول مصنف یہ کتاب جوانانِ نوخاستہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی قیمت ۱۲ار مینیجر مطبع حکیم برہم گورکھپور سے منگائیے۔

فلسفۂ الٰہیات - ایک سو صفحے کی خوبصورت کتاب ہے جس میں مولانا آزاد مرحوم کے وہ جذباتِ احساسات درج کئے گئے ہیں جو آپ نے بحالت بے خودی تحریر فرمائے اور جسے آزاد کے مداح الہامی اردو کہتے ہیں قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ :- آغا محمد طاہر صاحب مہتمم آزاد بک ڈپو لاہور

فلسفیانہ مضامین - سوا دو سو صفحات کے اس مجموعہ میں مولوی عبدالماجد صاحب بی، اے کے چھ نہایت قیمتی مضامین درج ہیں جن کے عنوان یہ ہیں (۱) فلسفہ اس کی ماہیت اور اس کے مذاہب (۲) فلسفہ کی تعلیم - گزشتہ اور موجودہ (۳) فلسفہ تشکیک - (۴) مل کی منطق (۵) نظام ازدواج (۶) ہکسلے کے حالات - ان مضامین کے علاوہ آخر میں فہرست اصطلاحات اور فہرست اسما بھی دی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد کا نام ہی اس کتاب کی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے اور اس لئے بیان کسی مزید تعریف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے مقرر کی گئی ہے۔ الناظر پریس لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

عروس ادب - یعنی ہوش بلگرامی کے اخلاقی - ادبی - تاریخی اور سیاسی مضامین کا مجموعہ - ایک نہایت قابل قدر کتاب ہے۔ مصنف موصوف مشہور ادیب ہیں - آپ حیدر آباد دکن سے ایک رسالہ "ذخیرہ" کے نام سے نکالا کرتے تھے - جس کے مضامین کی پاکیزگی اور لطافت تمام ملک سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے - ان مضامین کا انداز بھی نہایت شگفتہ اور شستہ ہے۔ کتاب کا حجم ۲۲۴ صفحات ہے - اور قیمت ۸ ؍ بہت عمدہ چھپی ہے - ملنے کا پتہ - سید نصیر الحسن صاحب ہوش بلگرامی - رام پور سٹیٹ

مرآۃ الشعر - مصنفہ مولوی عبد الرحمٰن صاحب سٹیفنس کالج دہلی - اس کتاب میں قابل مصنف نے صناعتِ شعر پر مختلف حیثیات سے بحث کی ہے - مثلاً شعر کی زبان - مجازیات کا استعمال - معانی - جذبات - خیال - تمثیل - جدتِ ادا - فکر حسن ادا - وغیرہ - اس مقصد کے لئے انہوں نے عربی - فارسی اور اردو تین زبانوں کو منتخب کیا ہے - اور تینوں زبانوں کی بہترین مثالیں اس کتاب میں جمع کر دی ہیں - اس اصول پر انہوں نے ایک سیر کن بحث کی ہے کہ ہر زبان کی شاعری کہاں تک عام طبعی اصول پر چلتی ہے اور کہاں تک ہر زبان کے شعر کا حسن ایک عام انداز رکھتا ہے - بحث اور تنقید میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ مشرقی شاعری اور اس کی صناعت کو مشرقی نگاہ سے دکھایا جائے تاکہ وہ اپنے حقیقی اور اصلی رنگ میں نظر آئے حجم تین سو صفحے سے زائد اور کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے قیمت تین روپے مصنف موصوف سے ملتی ہے

دنیائے افسانہ - مصنفہ محمد عبد القادر صاحب سروری بی اے - اردو زبان میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے افسانہ نویسی بھی فنونِ لطیفہ میں سے ہے - آج یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ قصہ کا رنگ مذہب، اخلاق، سیاسیات غرض تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہے - مگر اردو افسانہ ابھی فن کے لحاظ سے بڑی پست حالت میں ہے - کیونکہ افسانہ نویس حضرات عموماً فن افسانہ نویسی سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں - اپنی زبان میں تو انہیں فن کی کتابیں میسر ہی نہیں آتیں اور دوسری زبانوں سے وہ تحصیل کی تکلیف ہی گوارا نہیں کرتے - ہمارے خیال میں یہ کتاب ان تمام لوگوں کو پڑھنی چاہئے جو افسانہ نویسی کا شوق رکھتے ہیں - حجم ۱۰۲ صفحات قیمت ۱۲ ؍ - ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ابراہیمیہ اتحادی سٹیشن روڈ حیدر آباد (دکن)

تذکرۂ بابر - مصنفہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی - صدر الصدور امور مذہبی حیدر آباد دکن مصنف موصوف کی تحریر تنقید سے بالاتر ہے محمد ظہیر الدین بابر بادشاہ غازی کی یہ سوانحعمری جو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے بہترین سوانح عمری سمجھی جانی چاہئے - بہت عمدہ چھپی ہے - قیمت ۶ ؍ - کتب خانہ مسجد چوک حیدر آباد دکن سے منگائیے -

خالدہ ادیب خانم - مولفہ محمد عبد المجید صاحب عتیقی - یہ کتاب ترکی کی اس مشہور وطن پرست خاتون کی سوانح عمری ہے جس نے اپنی حریت نوازی اور قابلیت کی بدولت وزیر تعلیم کا درجہ حاصل کیا - دنیا میں خالدہ خانم پہلی خاتون ہیں جنہیں یہ عظیم الشان منصب تفویض ہوا - ہندوستانی خواتین کو قومیت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے یہ سوانح عمری ضرور پڑھنی چاہئے طرز بیان نہایت دلچسپ اور سلیس ہے - قیمت ۸ ؍ مجلد ۱۲ ؍ ملنے کا پتہ مہتمم کمال بک ڈپو - بازار رنگ محل لاہور

فہرست مضامین

بابت ماہِ دسمبر ۱۹۲۷ء

جلد ۱۲ — نمبر ۶

تصاویر:- (۱) مجبورِ غم
(۲) ابوالفضل — داراشکوہ — اکبر

آپ اور ہم

تقریباً دو سال سے ہمایوں کو زیادہ دلکش زیادہ دلچسپ اور زیادہ مفید بنانے کی جو کوششیں ہم کر رہے ہیں ان کے نتائج آپ کے سامنے ہیں۔

ہمایوں کا یہ نمبر صاف بتا رہا ہے کہ اس نے گزشتہ دو سال کے عرصے میں کتنی نمایاں ترقی کی ہے۔ اور اگلے نمبر سے اور زیادہ روشن ہو جائیگا۔ کہ ہم آیندہ اس کا معیار کتنا بلند کرنا چاہتے ہیں۔

ہمایوں پر آپ کے حقوق جو ہمارے ذمہ تھے ان کو ہم نے حتی الامکان ادا کرنے کی کوشش کی اور آیندہ بھی انشأ اللہ یہ کوشش جاری رہے گی۔

آپ نے بھی ہمایوں کی اعانت کو جاری رکھتے ہوئے اس کے ان حقوق کے احساس کا ثبوت دیا ہے جو آپ کے ذمہ تھے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ اس وقت ہمایوں کی اشاعت پہلے سے دوگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو چکی ہے لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے دو سال پہلے ہمایوں نے آپ سے کچھ اور توقعات بھی ظاہر کی تھیں۔

یعنی دسمبر ۱۹۲۵ء میں جب ہم نے رسالہ کو ترقی دینے کے لئے کوششیں شروع کیں۔ تو ہم نے آپ سے کہا کہ "آپ اپنے حلقہ معاشرت میں ہمایوں کے لئے چند خریدار پیدا کیجئے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ہم سے ایک پرچہ مفت طلب کر کے اسے اپنے دوستوں کو دکھایئے، سنایئے، پڑھایئے اور ترغیب دیجئے کہ جنوری سے بلکہ ابھی سے وہ ہمارے خریدار بن جائیں پھر ہم بھی سمجھیں گے کہ آپ نے ہماری محنت کی طرف توجہ کی ہے"

کیا آپ نے اس پہلو سے ہمایوں کی ترقی کے لئے کچھ توجہ فرمائی؟

ہم کہیں گے کہ بہت کم!

گو ہمایوں اس وقت خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہترین اردو رسالوں میں تصور کیا جاتا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمایوں کا معیار صوری و معنوی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے انگریزی رسالوں سے کسی طرح بھی کم نہ ہو۔ مگر اس مقصد کے حصول کیلئے یقیناً ہم آپ کی مدد کے بغیر پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ اپنے حلقۂ اثر سے دو دو، چار چار خریدار بھی ہم پہنچائیں تو ہمایوں کی اشاعت دوگنی اور چوگنی ہو سکتی ہے۔ اور اسی نسبت سے اس کی خوبیوں میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہمایوں کا سالگرہ نمبر

سنہ ۱۹۲۷ء کی جلد اس نمبر کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ ماہ جنوری کا ہمایوں سالگرہ نمبر ہوگا۔ اور اس کا حجم غیر معمولی طور پر غالباً ایک سو تیس صفحات کے قریب ہو جائیگا۔ اس میں ہندوستان بھر کے ادیبوں اور فاضلوں کی نظم و نثر کے بہترین نمونے پیش کئے جائینگے اور مشرق و مغرب کے ان شہرۂ آفاق مصوروں کی سہ رنگ اور ایک رنگ تصاویر درج کی جائینگی۔ جو دنیائے مصوری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمایوں کا یہ نمبر پہلے تمام خاص نمبروں پر فوقیت لے جائیگا بلکہ ادبیاتِ اردو میں ایک قابلِ یادگار اضافہ ہوگا

افسانوں میں ایک لطیف افسانہ ہوگا جس میں بتایا گیا ہے کہ محبت کا بلند ترین معیار کیا ہے۔ اور بلند ترین محبت کیونکر ناکامی و کامرانی کے مراحل طے کرتی ہے۔ افسانہ کی دنیا میں یہ ایک بالکل نئی چیز ہوگی جس میں رنگینی اور پاکیزگی نور کے ایک چشمے کی طرح ابل رہی ہے۔

ہمایوں کے فلک پیما مقالہ نگار خصوصی کے جدت طراز اور سحر نگار قلم سے ایک انوکھا افسانہ ہوگا جس کی شگفتگی اور شوخی آپکے قلب میں گدگدی سی پیدا کر دے گی۔

تاریخ دنیا کے متعلق ایک جامع و مانع اور پر از معلومات سلسلۂ مضامین شروع کیا جائیگا جسے تحریر کی سلاست اور واقعات کی دلچسپی نے بہت دلکش بنا دیا ہے۔ اردو زبان میں دنیا کی مختصر تاریخ پر یہ پہلی کتاب ہوگی جسکی ایک قسط ہر مہینے ہمایوں میں درج ہوا کرے گی اس سلسلہ کی ہر قسط بجائے خود ایک مستقل اور مکمل مضمون ہوا کرے گی جس سے ناظرین کی دلچسپی میں کوئی فرق نہ آئیگا۔

ان کے علاوہ دو اور نہایت دلچسپ اور مختلف النوع افسانے ہونگے۔

ایک مشہور و معروف یورپی مصور کی رنگین تصویر ہوگی جس میں محبت کی تمناؤں اور دل کی آرزوؤں کا عکس نظر آتا ہے۔

کم از کم تین تصویروں کے ساتھ نظمیں بھی شامل کی جائیں گی۔ جو ان بے جان پیکروں میں جان ڈال دیں گی۔

بہترین معلومات اور اقتباسات کے لئے خاص اہتمام کیا جائے گا۔

دوسرے بلند پایہ مضامین اور دل کش اور خوبصورت تصاویر بھی قابل دید ہونگی۔

حضرت ہمایوں (مرحوم) مولانا وحید الدین سلیم۔ میاں عبدالعزیز۔ مرزا محمد سعید۔ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا گرامی (مرحوم) شبیر حسن صاحب جوش۔ رضا علی صاحب وحشت۔ پنڈت شو نرائن شمیم۔ حکیم آزاد انصاری۔ ضیاالدین صاحب شمسی اور اور بہت سے ممتاز اہل قلم اس محفل میں جلوہ افروز ہونگے۔

یہ نمبر کثیر تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے لیکن اگر آپ اپنے دوستوں کیلئے یہ تحفہ حاصل کرنے کا جلد انتظام نہ کرلیں گے تو بعد میں مایوسی کا سامنا ہوگا اسکی قیمت ایک روپیہ ہوگی لیکن سالانہ خریداروں سے چندہ بدستور سابق صرف پانچ روپے (علاوہ محصول ڈاک) لیا جائیگا جس میں یہ نمبر بھی شامل ہوگا۔

مینیجر

جہاں نما

ترکی کی پہلی مردم شماری

اس سال ترکی میں پہلی مرتبہ باقاعدہ مردم شماری ہوئی۔ صحیح اعداد و شمار حاصل کرنے کے لئے نہایت شدید ذرائع استعمال کئے گئے شہریوں کو دن بھر میں کسی وقت بھی گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ تمام دوکانیں بند تھیں۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ گاڑیوں کی آمد و رفت بھی ممنوع تھی۔ باسفورس اور شاخ زریں کے پانی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی آلودگی سے پاک تھے۔ صرف قسطنطنیہ میں ۶۵۰۰ اہلکار پولیس کی مدد سے فہرستیں تیار کرنے میں مصروف تھے۔ فوجی سپاہی دیکھ رہے تھے کہ لوگ گھروں سے نکلنے نہ پائیں۔

اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ

جب اونٹنی بے کار کر دی جائے گی (قرآن حکیم)

ابن سعود اونٹ کی سواری کو چھوڑ کر اپنے لئے آبدار الومینیم کی آٹھ برطانی موٹر کاروں کا ایک بیڑا تیار کرنے والے ہیں جس پر گیارہ ہزار پونڈ صرف ہونگے۔ اعلیٰ حضرت کے آیندہ صحرائی سفر انہیں موٹروں میں طے ہوا کریں گے۔ ان کے حرم کی چوبیس خواتین کے لئے بھی یہی بے دریغ "موٹر کاروان" کام میں لائے جائیں گے۔ ان کی چھتیں دھندلے شیشے سے تیار کی جائینگی اور ان کے اندر ہوا کے لئے بجلی کے پنکھے نصب کئے جائیں گے۔

پانچ ہزار سال پہلے کی بافت کا نمونہ

محکمہ آثار قدیمہ نے حال ہی میں ایک نہایت دلچسپ تحقیقات کی ہے۔ کہ ہندوستان میں سوت سے کپڑا بننے کا رواج مسیح سے تین ہزار سال پہلے سے موجود ہے۔ اس کا ثبوت اس قدیم تاریخ شہر موہن جوداڑو (سندھ) سے ملتا ہے۔ جہاں آج کل کھدائی کا کام ہو رہا ہے۔ یہاں سے جواہرات کا بھرا ہوا چاندی کا ایک گلدان نکلا ہے۔ جسے ایک سوتی کپڑے میں لپیٹا گیا تھا۔ اس کپڑے کا کوئی کوئی چیتھڑا اب بھی اس گلدان کی سطح پر چپک رہا ہے۔ مگر یہ کپڑا پانچ ہزار سال تک مٹی میں دبے رہنے کے باعث بہت بودا اور کمزور ہو چکا ہے۔

سوتی اشیا کے لئے قدیم بابلی اور یونانی نام سند یا سنداں ہے جس سے قدرتی طور پر دماغ سندھ کے علاقے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جو روئی کی پیداوار کا گھر ہے لیکن یہ امر ہمیشہ سے مشتبہ رہا ہے کہ آیا جس کو یونانی اور بابلی روئی سمجھتے رہے وہ کپاس کے پودے سے حاصل کی ہوئی تھی۔ یا وہ کوئی اور پودا تھا لیکن جب سے یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ اس قسم کے کسی اور پودے کی دریافت سے بھی پہلے سندھ میں روئی سے کپڑا تیار کیا جاتا تھا۔ تب سے یہ شبہ بالکل رفع ہو گیا۔

زرِ مضروب

جب کسی چیز کی قیمت کی ادائی میں قیمتی دھاتیں مثلاً سونا، چاندی، تانبا، لوہا استعمال ہونی شروع ہوئیں۔ تو پہلے پہل ان کو صرف تول لیا جاتا تھا۔ چنانچہ انگریز لوگ اب تک سونے کے سکّے کو پونڈ کہتے ہیں۔ جو ایک وزن کا نام بھی ہے اس راہ میں دوسرا قدم یہ تھا۔ کہ سونے اور چاندی کے تُلے ہوئے ٹکڑے جاری کئے گئے۔ اس کے بعد ہر ایک ٹکڑے پر اس کا وزن اور قیمت بھی لکھی جانے لگی۔

یہ طریقہ بابل اور شام میں رائج تھا۔ جہاں کے شِکل یا سونے چاندی کے سکّے ہمارے دیکھنے میں اب بھی آتے ہیں مشرقی قوموں کی تجارت صدیوں تک ان دھات کے اوزان سے ہوتی رہی لیکن سکّے تیار کرنے کا خیال سب سے پہلے نوشیا کے یونانیوں کو ساتویں صدی قبلِ مسیح میں آیا۔

ان سکوں پر وہ اپنے شہر کے اسلحہ کی تصویر بناتے تھے۔ گویا ان کی یہ مُہر دھات کے اس ٹکڑے کی قیمت اور وزن کی صحت کی ضمانت ہوتی تھی۔ نوشیا سے یہ رواج بہت جلد ایشیائے کوچک کے دوسرے یونانی شہروں میں پھیل گیا۔ اور وہاں سے ایجینا۔ میلی پولی سوس۔ ایتھنز اور افریقہ اور اٹلی کے یونانی مقبوضات میں پہنچ گیا۔

ان تمام ملکوں کے قدیم ترین طلائی سکوں کا وزن وہی ہوتا تھا۔ جو قدیم بابل کے طلائی شِکل کا تھا۔ صرف مختلف ممالک کے اپنے اسلحہ کی تصاویر اس پر بنی ہوتی تھیں جس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ وہی اس کی صحتِ وزن کے ذمہ دار ہیں۔ یہ طلائی شِکل یا پونڈ باوجود کثیر تاریخی انقلابات کے صدیوں اپنی اصلی صورت میں قائم رہا۔ کریسس۔ دارا۔ فیلقوس اور اسکندر سب کے طلائی سکّے قریباً قریباً بابل کے طلائی شِکل کے ہموزن ہی تھے۔ اس قسم کے ساٹھ سکّے ایک طلائی ماینا کے برابر ہوتے تھے۔ اور جو بات اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہے وہ یہ ہے کہ ساورن یا پونڈ یا شِکل تقریباً ایک وزن رکھتے ہیں۔ یعنی یہ ساٹھ سکّے بھی قدیم بابل کے طلائی ماینا کے برابر ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں چاندی کے بیس درہم یا بیس نصف شِکل سونے کے ایک شِکل کے برابر ہوتے تھے بالکل اسی طرح جیسے آج انگلستان میں چاندی کے بیس شلنگ ایک پونڈ کے برابر ہوتے ہیں۔ اور یہ قدیم شلنگ پھر تانبے کے ساٹھ سکوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ساٹھ کا عدد یونانیوں کے ہاں بہت مقبول تھا۔

اپنے غمگین دوست سے

مصیبتیں ہیں تجھے اور غم ہے مجھ کو دوست
الم سے تیرے شب و روز الم ہے مجھ کو دوست

میں خوش ہُوا بھی تو میرے لئے خوشی کیا ہے
خوشی نہ تیرے لئے تھی یہ غم ہے مجھ کو دوست

تجھے ہو دُکھ تو میں سُکھ میں رہوں ہزار افسوس
غضب ہے کشمکش بیش و کم ہے مجھ کو دوست

مری نظر میں ہیں سارے جہاں کی خوشیاں ہیچ
پیام عیش محبت کا غم ہے مجھ کو دوست

زر و گہر کی کمی ہے مجھے فراوانی!
متاعِ عشق ہو جتنا بھی کم ہے مجھ کو دوست

نظارۂ رخِ غمگیں ہیں کر چکا جب سے
سرورِ منظرِ راحت قسم ہے مجھ کو دوست

وہ دلکشی تری آنکھوں میں ہے کہ میں جانوں
گل و سمن ترا نقشِ قدم ہے مجھ کو دوست

ہوئی ہیں خون تمنائیں میرے سینے میں
یہ بے کلی تری تیغ دو دم ہے مجھ کو دوست!

کسے خبر ہے کہ مر مر کے جی رہا ہوں میں
مراد جو و صدائے عدم ہے مجھ کو دوست

ہزار شکر کہ پایا ہے رہبرِ الفت!
حیات جادۂ پُرپیچ و خم ہے مجھ کو دوست

عمل کی راہ دکھائی تری محبت نے
تلاشِ عشق ہی طوفِ حرم ہے مجھ کو دوست

بشیر حاضرِ خدمت ہے آنکھ اٹھا کر دیکھ
اک اک نگہ تری لُطف و کرم ہے مجھ کو دوست

بـ ا

رُباعیات

(۱)

کچھ دل میں کرے جو وہ زباں سے کہیے
دکھ درد جہاں کے غم خوشی سے سہیے
ہر بات میں راستی ہو فطرت کا تقاضا
دنیا کا بھلا ہو اس طرح سے رہیے

(۳)

غنچے ہوں دلوں کے جب صبا سے آویز
ہوتی ہے جہاں میں منتشر ان کی شمیم
فطرت ہے ہماری درد و کلفت سے بلند
طوفاں کے فشار سے ہی پاکیزہ نسیم

(۲)

اے کاش کہ زینتِ چمن کی ہو جاؤں
اے کاش خودی کے خواب میں کھو جاؤں
یہ کام ذرا ذرا سے چھوڑوں کیسے
ہونا مجھے چاہیے جو کچھ ہو جاؤں

(۴)

شہرت کو ہے گرچہ زیب عیاری سے
وابستہ ہے احترام زرداری سے
ممکن نہیں ہو فلاح نیکی کے بغیر
انسان کی زندگی ہے خودداری سے

بشیر احمد

رامائن کی بھاکا

شری کرشن اور رگھوکل تلک راجہ رام چندر جی ہندوؤں میں ایسے دو اوتار ہوئے ہیں جن کی اخلاقی اور مذہبی داستانیں آج تک نہایت عزت اور ادب سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ان کی داستانیں کیا ہیں حیات و ممات کی معلومات کے دلگداز وعبرت افزا افسانے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنے ملک کی زبان کو بھی وہ محبوب خلائق بنایا کہ کرشن مراری کی بدولت برج بھاشا نے روپ نکالا اور راجہ رام چندر کے طفیل پوربی بھاکا نے جنم لیا جس طرح بھگت سورداس کی شاعری نے عوام کو شری کرشن کا گرویدہ بنایا۔ اسی طرح گوسائیں تلسی داس نے رامائن لکھ کر ہر ایک ہندو کو رام بھجن کی طرف مائل کیا۔ فطرت نگار تلسی کا کلام عارفانہ جذبات کا مرقع اور وارداتِ قلبی کا آئینہ ہے۔ معرفت، قدرتی مناظر اور ناصحانہ انداز بیان کی ایسی دلکش تصویریں ان کے کلام میں موجود ہیں جو اہل نظر کے لئے جنت نگاہ ہیں جس طرح فارسی میں مولانا نظامی رح اور عربی میں متنبی کا کلام نہایت قابل قدر ہے۔ اسی طرح تلسی کا کلام بھاشا کی شاعری کا زیور اور ہندی زبان کا سرمایہ افتخار ہے۔ گنجائش نہیں کہ اس مختصر سے مضمون میں اس پر مفصل بحث کی جائے۔ تاہم اپنے خیالات کو نہایت اچھی طرح واضح کر دینے کے لئے تلسی کرت رامائن میں سے کچھ اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مندرجہ ذیل چوپائیاں اور دوہے کشکندھا کانڈ میں سے منتخب کئے گئے ہیں۔

سندر بن کسمت ات شوبھا
گنجت چنچر یک مدھ لوبھا

خوبصورت پھولوں سے بھرے ہوئے جنگل پر بہار آگئی (اور وہاں پر) مدھ (شہد) کی لالچ سے بھونرے گونج رہے ہیں۔

منگل روپ بھیئے بن تب تے
کینھ نواس رماپت جب تے

منگل روپ بن تب ہی سے ہوگیا (رونق آگئی پھول پھلواڑی پر جوبن آگیا) جب سے شری رام چندر جی نے (اس بن میں) باس لیا۔

برکھا کال میگھ نبھ چھائے
گرجت لاگت پرم سُھائے

برکھا رت کے جو بادل آکاش میں چھا رہے ہیں۔ وہ گرجتے ہوئے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں (ان کو دیکھ کر شری رامچندر جی

لچھمن جی سے فرماتے ہیں)

لچھمن دیکھو مور گن ناچت بارد پیکھ
گرہی برت رت پرکھ جم بشن بھگت کا دیکھ
دوہا

لچھمن جی دیکھو تو یہ مور بادلوں میں پانی کی لہر دیکھ کر کیسا خوش ہو ہو کر ناچ رہے ہیں۔ جیسے بیراگی گرہستی لوگ (خدا پرست) وشنو بھگوان کا درشن پا کر خوش ہوتے ہیں" غور کیجئے تشبیہ و تمثیل کی قوت سے نفس مضمون میں کس قدر دلکشی پیدا ہو گئی ہے

گھن گھنڈ نبھ گرجت گھورا
پریا ہین ڈرپت من مورا

بادل جو اکاش میں امنڈ امنڈ کر بڑے زور سے گرجتے ہیں (ان کو سن کر) میرا دل اپنی پیاری (جانکی جی) کے پاس نہ ہونے سے ڈرتا ہے۔

دامن دمک چھپت گھن ماہیں
کھل کی پریت جتھا تھر ناہیں

(دیکھو اے لچھمن) یہ چنچل بجلی بادلوں میں چمک چمک کر پھر بادلوں ہی میں کیسے چھپ جاتی ہے۔ جیسے اوچھے کی پریت (کم ظرف کی محبت) تھوڑی دیر ہی جاتی رہتی ہے۔ (ناقابل اعتبار ہوتی ہے) تشبیہات نے چوپائی میں جان ڈال دی ہے۔

برکھیں جلد بھوم نیرا ئے
جتھا نویں بدھ بدیا پائے

پانی سے بھرے بادل زمین کے (قریب آکر) جھوم جھوم کر کیسے برستے ہیں۔ جیسے پنڈت بدیا (علم) کو پا کر جھک کر چلتے ہیں (بادل زمین کے قریب آکر اس طرح رہتے ہیں جیسے علم حاصل کر کے علما منکسر اور فروتن بن جاتے ہیں۔ جس طرح پانی بادل سے بھرا ہوا رہتا ہے اسی طرح علما علم سے بھرپور رہتے ہیں) کتنی خوبصورت اور بلیغ تشبیہ ہے۔

بوند اگھات سہیں گر کیسے
کھل کے بچن سنت سہیں جیسے

پربت مینہ کی بوندوں کی چوٹ اسی طرح سہہ رہے ہیں۔ جیسے اچھے لوگ دشٹوں (جاہلوں۔ ظالموں) کی سخت کلامی سہتے ہیں (جس طرح اچھے صابر شاکر لوگوں کو جاہلوں کی گالی گلوچ سے اذیت نہیں ہوتی۔ پہاڑوں کو بھی بوندوں کی چوٹ سے اذیت نہیں پہنچتی) کیسی، دل کش اور اخلاقی تشبیہ ہے۔

چھُدر ندی بھر چلی اترائی
جس تھورے دھن کھل بورائی

چھوٹی چھوٹی ندیاں پانی سے بھر بھر کر آپے سے باہر ہو کر بہ چلی ہیں۔ جیسے کوئی اوچھا کم ظرف آدمی تھوڑا سا روپیہ پاکر باولا ہو جاتا ہے۔ (اور اتراکر چلتا ہے) بلاغت یہ ہے کہ ندی کا پانی اس کا اپنا نہیں ہے۔ بلکہ برسات میں اِدھر اُدھر تال تلیوں سے آگیا ہے

بھوم پرت بھا ڈھابر پانی
جم جیوہ مایا لپٹانی

زمین پر پاک و صاف پانی گر کر یوں گندلا اور ناپاک ہو رہا ہے جیسے روح مایا کے بندھن (دنیا کی آلائشوں میں لپٹ کر) سے مکدر ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ کوئی شعر اخلاقی نتیجے سے خالی نہیں۔ یہی وہ شاعری ہے جو کوشش سے بھی نہیں آتی۔ طرز بیان کو سحر اور شعر کو حکمت اسی بنیاد پر کہا گیا ہے۔

سمٹ سمٹ جل بھریں تلاوا
جم سدگن سجن پہنہ آوا

پانی سمٹ سمٹ کر تالابوں میں اس طرح آرہا ہے جیسے نیک آدمیوں کے پاس اچھی خصلتیں خود چلی آتی ہیں۔ شاعری اسے کہتے ہیں۔ ہمارے اردو شعرا غور کریں اور سبق لیں۔

سرتا سر جل ندہ ماں جائی
ہوئے آچل جم جن ہریائی

ندی نالیوں کا پانی سمندر میں جا کر یوں گم ہو رہا ہے۔ جیسے عارف لوگ خدا کو پاکر خدا ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔

ہرت بھوم ترن سنکل سمجھ پڑے نہیں پنتھ
جم پاکھنڈ بواد تے گپت ہونہہ سر گرنتھ دوہا

گھاس کے گھنے ہونے سے زمین ہری ہری ہو رہی ہے۔ راستہ نہیں سوجھ پڑتا جیسے پاکھنڈیوں (کم علم والے) کے جھگڑے اور مباحثے سے اچھی کتھا (وید وغیرہ) کی سچائی چھپ جاتی ہے۔ (اور لوگ ادھر ادھر بھٹکنے لگتے ہیں) سبحان اللہ۔

دادُر دھن چھوں اور سہائی
وید پڑھیں جن بٹ سمدائی

مینڈکوں کی آواز چاروں طرف سے کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے گویا کہ (ودیالیہ میں) بہت سے پنڈت وید پڑھ رہے ہیں۔

جن لوگوں نے بنارس میں کبھی بہت سے پنڈتوں کو گنگا جی کے کنارے وید پڑھتے دیکھا ہوگا وہ اس تشبیہ کا بخوبی لطف اٹھا سکتے ہیں۔

کھوجت کتھوں ملے نہیں دھوری
کرے کرودھ جم دھرمہ دوری

خاک دھول تو کہیں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکتی ہے (برسات کے پانی نے اس کا اس طرح سے نشان مٹا دیا ہے) جس طرح غصہ دھرم کو مٹا دیتا ہے۔"

ششش سمپن سوہ مہہ کیسے
اپکاری کی سمپت جیسے

کھیتی کی باڑھ سے ساری زمین ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ جیسے دھرماتما لوگوں کی (فیاض) دولت (بڑھتی بنتی ہے)

کرکھی نراوین چتر کسانا
جم بدھ تجیں موہ مد مانا

اپنے اپنے کھیتوں کو ہوشیار کسان لوگ نراتے ہیں (کھیت میں سے گھاس پھوس نکال کر پھینک دیتے ہیں) جس طرح اچھے لوگ اپنے دل کو دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک وصاف کر لیتے ہیں ''نہایت کیف انگیز چوپائی ہے۔

دیکھت چکرواک کھگ ناہیں
کلمہ پائے جم دھرم نشاہیں

چکئی چکوا ایسے غائب ہوگئے ہیں جس طرح لڑائی جھگڑے سے دھرم جاتا رہتا ہے۔

بیدہ جنت سنکل مہہ بھرا جا
پڑھت پر جا جم پائے سراجا

طرح طرح کے کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی زمین کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے سندر راج کو پاکر پرجا بڑھتی ہے

کبھوں دوس مال نبڑ تم کبوُنک برگٹ تپنگ
اپجے بنشٹے گیان جم پائے سسک کسنگ (۱)

کبھوں چلے مارت پربل جنہہ تہنہ میگھ بلاین
جم کپوت کے جنم تے سب کُل دھرم نشاین (۲)

(۱) کبھی تو دن میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور کبھی سورج نکل آتا ہے (روشنی ہو جاتی ہے) جیسے اچھی صحبت سے عقل و تمیز آتی ہے اور بری صحبت سے عقل جاتی رہتی ہے۔

(۲) کبھی تیز ہوا کے چلنے سے بادل غائب ہو جاتے ہیں جیسے کپوت کے پیدا ہونے سے خاندان کے سب دھرم برباد ہو جاتے ہیں یہاں برکھا رت اور شرد رت (جاڑے کا موسم) کے ملنے کے متعلق دو دوہے گسائیں تلسی داس جی نے کہے ہیں۔ جیساکہ آگے کی چوپائی سے شرد رت کا آنا ثابت ہے۔

برکھا بگت شرد رت آئی
دیکھو لچھمن پرم سہائی

راجہ رام چندر جی فرماتے ہیں "برکھا رت تو گذر گئی اور سرد موسم آگیا۔ اے لچھمن دیکھو یہ رت بھی کیسی سہاونی ہے۔

پھولے کاس سکل مہہ چھائی
جن برکھا کرت پرگٹ بڑھائی

(اجلے اجلے پھولے ہوئے کاسوں سے زمین کیسی بھری ہوئی ہے۔ گویا کہ برکھا رت نے اپنا بڑھاپا ہی دکھا دیا ہے۔ دلآویز تشبیہ ہے

رس رس سوکھ سرت سر پانی
ممتا تیاگ کریں جم گیانی

آہستہ آہستہ ندی نالوں کا پانی دن دن کیسے سوکھتا جاتا ہے جس طرح خدا رسیدہ دھیرے دھیرے دنیاوی محبت کو چھوڑتے جاتے ہیں

سکھی میں گن نیرا گادھا
جم ہر شرن نہ ایکو بادھا

گہرے پانی میں مچھلیاں آرام سے رہتی ہیں۔ (ان کو پانی کے سوکھنے کا ڈر نہیں رہتا) جس طرح خدا رسیدہ لوگوں کو کسی طرح کا ڈر یا خوف نہیں رہتا" نہایت پاکیزہ چوپائی ہے۔ خیال کرنے سے کیف پیدا ہوتا ہے۔

گنجت مدھکر نکر انوپا
سندر کھگ مرگ نانا روپا

جھنڈ کے جھنڈ بھونرے گونجتے ہیں۔ ہر قسم کے خوبصورت چرند و پرند (خوشی سے پھولے نہیں سماتے)

چکرواک من دکھ نشی پیکھی
جم درجن پر سمپت دیکھی

چکوا چکوی کو رات آتے دیکھ کر اس طرح رنج ہوتا ہے جس طرح بُرے آدمیوں کو دوسروں کی دولت دیکھکر دکھ ہوتا ہے) مشہور ہے کہ رات کو چکوا چکوی (سرخاب کا جوڑا) قدرتاً جدا ہو جاتے ہیں اگر چکوا دریا کے اس پار رہتا ہے تو چکوی اُس پار چلی جاتی ہے اور رات بھر دونوں ایک دوسرے کو پکارتے رہتے ہیں۔

چاتک رٹت ترکھا ات اوہی
جم سکھ لئے نہ شنکر دروہی

پپیہا پیاس کے مارے پکارتا ہے۔ اس کو سکھ نہیں ملتا جس طرح شری شوجی مہاراج کا دشمن کبھی چین نہیں پاتا۔

دیکھیں بدھ چکور سدائی
چتوین جم ہرجن ہر پائی

چکوروں کے جھنڈ چندرماں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے بھگت ہر بھگوان کو پاکر دیکھتے ہیں۔

بھوم جیو سنکل رہے گئے شرورت پائے
سد گر ملے تے جاین جم سنشے بھرم سدائے
دوہا

زمین کے کیڑے مکوڑے جاڑے کے موسم میں اس طرح برباد ہو گئے ہیں جس طرح اچھا اور سچا گرو ملنے سے ڈر اور بھرم جاتے رہتے ہیں۔ کس قدر عالی خیالات ہیں۔ سبحان اللہ۔ اس قسم کے خیالات جتنے بھاشا کی شاعری میں ہیں اور کسی زبان میں نہیں ہیں۔

اعظم کریوی

اے حُسن

تو زندگی کے شور و غوغا میں پتھر کے ایک بت کی طرح ساکن و صامت تنہا اور یکتا ہے۔
اور وقت انتہائے فریفتگی میں تیرے پاؤں میں بیٹھا ہوا ہے۔
"بول، بول، میری پیاری مجھ سے بول، میری دلہن"!
مگر تیری گویائی تیرے وجود کے پتھر میں گم ہے۔ اے ساکن و صامت حسن!

ٹیگور

سلطان محمد عادل شاہ

اُس کے اخلاق و عادات اور اُس کے عہد کی شاہانہ شان و شوکت

سلطان محمد عادل شاہ کے متعلق مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ وہ دانائی، عزم، بردباری، حلم، رائے۔ عالی حوصلگی، اور عفو وانکسار بے تکلفی و سادہ مزاجی کی صفتوں سے متصف تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ عموماً سلاطین اسلام میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اور حکمران میں اِن صفات کا ہونا ضروری بھی ہے۔ کیونکہ جب اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا حکم رکھتا ہے تو اسی مناسبت سے ضرورت تھی کہ وہ دیگر خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتا کہ وہ اپنے عفو و کرم تحمل و بردباری سے ایسے واقعات کو جو خاطر شاہی کو ناگوار گزریں نظر انداز کردے۔ اور ارکان دولت کی خیر خواہی و جاں نثاری کا خیال کرتے ہوئے ایسی خفیف حرکات سے چشم پوشی کرے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان محمد، سرکش سے سرکش امیر کو رازدار اور صلاح کار بناتا اور اپنے اخلاق پاکیزہ سے گرویدہ کرلیتا تھا پھر وہ امیر اپنا مطمح نظر یا مقصد زندگی بقائے سلطنت میں سعی و کوشش اور ملک کی فلاح کے لئے جدوجہد کرنا سمجھتا تھا۔ گو بعض ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں ان عنایات و نوازشات و مراحم خسروانہ کا بدلہ بعض مفسد امرا نے اور طرح پر دیا ہے لیکن ایسی مثالیں شاذ ہیں جن سے اس کلیہ پر اثر نہیں پڑتا۔ اگرچہ خواص خاں اپنا اقتدار بڑھانا چاہتا اور مختار کل بنا چاہتا تھا تاہم باوجود ان برائیوں کے وہ خیر خواہ سلطنت تھا، سلطان کے نفع اور فائدہ کا بیحد خیال رکھتا تھا، لیکن دو امراء سے چشمک، دو قومی جماعتوں کی ناچاقی، اور فساد کے اٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے مجبوراً سلطان نے خواص خاں کو نذر سلطنت کردیا۔

جب ہم سلطان کے عام اخلاق و عادات پر غور کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ایک اجمالی نظر عام افعال و حرکات پر ڈالیں تاکہ صحیح طور پر عام اخلاق و عادات کی سچی تصویر پیش نظر ہو جائے۔

نقل ہے کہ چاندنی رات میں "عدالت محل" کی چھت پر سلطان رونق افروز تھا۔ خاص طور پر اہتمام کرکے تمام فرش سفید آراستہ کیا گیا تھا اور تمام امرا بھی سفید لباس میں حاضر تھے۔ اس سادگی میں عجیب لطف تھا، محل بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ اور مجلس رقص و سرود اور جشن شاہی کا شور برپا تھا۔ آدھی رات کے وقت سلطان نے کھڑے ہو کر شہر کی حالت دیکھی تو ہر طرف سے سوائے نائے سرور اور صدائے سرور اور آوازِ چنگ و رباب و طنطنہ شادی و نشاط کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر وہ نیچے اتر آیا اور سجدہ شکر ادا کیا۔ کہ "الحمدللہ میرے زمانہ میں رعایا فارغ البال اور رنج والم سے آزاد ہے"۔ کسی بادشاہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت

ہوسکتی ہے کہ اس کی رعایا اس کے ظلِ عاطفت میں امن اور چین کی زندگی بسر کرتی ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شاہجہان نے بعض امور کے متعلق سختی سے اعتراض کیئے تھے۔ اور یہاں سے ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا تھا۔ افضل خاں سراپردہ کے پاس کھڑا تھا۔ سلطان نے کہا۔ "افضل خاں! شہر کیا کہتا ہے؟" افضل خاں آداب بجالایا اور عرض کیا "سارا شہر اپنے پیارے بادشاہ کے حق میں دعائے خیر کرتا ہے اور دن عید اور رات شب برات ہے۔ جہاں پناہ کے عدل و انصاف سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں" سلطان یہ سُن کر خوش ہوا۔ ساتھ ہی سوچ میں پڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد افضل خاں سے دوبارہ مخاطب ہو کر کہا کہ "یہ تو کہو کہ اگر شاہجہان سے اور ہم سے چھڑ جائے تو ہمارے ملک کا کیا حال ہوگا" افضل خاں نے کہا "جہاں پناہ یہ تو دنیا کا قاعدہ ہی ہے کہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، اور یہ پھولا پھلا چمن بگڑ جائے گا۔ بجائے مسرت کے نالہ ہائے واویلا بلند ہونگے"[1]

سلطان نے یہ سُن کر کہا "ہاں تو سچ کہتا ہے لیکن اب صلاح کیا ہے؟" افضل خاں نے عرض کیا کہ "اگرچہ بافضال الٰہی و اقبال دولت شاہی ہم ہر طرح پادشاہانِ مغلیہ کے مقابلہ کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ان کو نربدا کے پار اترنے بھی نہ دیں۔ تاہم اس میں ہزارہا جانیں ضائع ہونگی اور کتنے بچّے یتیم اور کتنی عورتیں بیوہ ہو جائیں گی، اور ملک تباہ ہوگا سو الگ، فدوی کی رائے میں اگر یہ نوبت ہی نہ آئے تو اولیٰ و انسب ہے"، سلطان نے افضل خاں کی رائے پسند کی اور ایلچی کو جو پہلے بھیج دیا گیا تھا تین منزل سے واپس بلا لیا اور جواب صلح آمیز لکھا[2]۔

سلطان محمد سے پہلے عموماً امرا کو بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اور پھر اس ادب و احترام کی اس درجہ قید تھی کہ آقا و خادم کا تعلق صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا، سلطان ابراہیم ثانی نے اس رسم کو توڑنے کی کوشش کی، کہ اسکے عہد تک دربار اسی قسم کے آئین و آداب کا پابند تھا۔ لیکن اس بادشاہ نے اس سختی کو بالکل مناسب خیال نہ کیا۔ بلکہ ان کو عام طور پر جشن اور شاہی جلسوں میں شریک کرتا تھا اور بے تکلف اس سے باتیں کرتا۔ اور مختلف مباحث پر بات چیت کرتا تھا جس سے وہ سلطان کی قدردانی کے معترف اور اس کی سادہ مزاجی و فیاضی کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ جرات کر کے بعض اوقات سلطان کے طرزِ عمل کے متعلق بے لاگ اپنی رائے کا اظہار کر دیتے تھے۔ بلکہ نقائص بھی بیان کر دیتے تھے۔ لیکن امرا کی اس قسم کی باتوں سے سلطان کبھی ناراض یا غصّہ نہ ہوتا بلکہ ہنس کر ٹال دیتا اور بخوشی ان کے مشوروں کو قبول کر لیتا تھا۔

گو یہ تعجب انگیز نظر آئے گا کہ اس طرح کے غیر معتدل رحم کو جو بظاہر شانِ سلطانی کے شایاں نہ تھا، سلطان کیوں روا رکھتا تھا۔ سلطان کو اس پر ناز تھا اور وہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ خواص و خدام اکثر جلسوں میں بیٹھ کر بلا روک ٹوک گفتگو کرتے ہیں لیکن میں

---

[1] بساتین السلاطین ص ۳۴۱ [2] بساتین السلاطین ص ۳۴۳

خود اپنے کانوں سے سُن کر دانستہ اغماض کرتا ہوں۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک عظیم الشان سلطنت کا ذمہ دار تاجدار عام دوستوں سے ملنے جلنے میں شانِ سلطنت کا لحاظ نہ رکھتا تھا۔ بلکہ اس کو قطعی ناپسند کرتا تھا۔ لیکن اس سے ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ امرا کی اس گستاخی و بیباکی نے سلطان کی عظمت و شان میں کوئی کمی پیدا کر دی تھی۔ اس واسطے کہ سلطان محمد بڑی عظمت و شان کا بادشاہ تھا، اور ناموری کے دفتر میں اس کے جاہ و جلال کی داستانیں جلی خط سے لکھی ہوئی ہیں۔ اور اس کی یہ سادہ مزاجی اور بے تکلفی اس کی تاریخ زندگی کو نہایت مزین اور پر اثر بنا دیتی ہے۔

سلطان محمد کی رحمدلی اور رعایا کی داستانیں یوں تو بہت ہیں مگر ہم دو ایک ذیل میں درج کرتے ہیں۔ جن سے فلاح خلائق اور بہبود رعایا کا جو خیال اس کے دل میں تھا اس کا اندازہ ہو سکتا ہے،

ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو عام طور پر شہر میں محفل مولود منعقد ہوتی تھی، سلطان خود اس جلسہ میں شریک ہوتا، اور وہاں بیٹھ کر مجلس کی رونق بڑھاتا، اور اس محفل کے منتظمین کی عزت و حوصلہ افزائی اور اظہار خوشنودی کی غرض سے وہاں کے لنگر کا کھانا چکھتا۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کا اس زمانہ میں جب کہ وہ ظل اللہ سمجھا جاتا تھا، ایسی عام مجلسوں میں شرکت کرنا اور وہاں کا پکا ہوا کھانا چکھنا کس قدر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن یہ سلطان کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی تھی۔ کہ وہ شوق سے رعایا کی خوشنودی کی خاطر اس قسم کے جلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔

ایک مہاجن جو نایکواڑوں سے ناراض ہو کر اور ان کی اس حرکت پر کہ انہوں نے اس کے مرتبے کا خیال نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ عزت کا سلوک نہ کیا تھا شہر کے چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن رعایا پرور و عدل گستر سلطان نے جسے اپنی رعایا کا حد درجہ پاس و لحاظ تھا۔ نہایت سادگی سے اپنی رعایا کے چند افراد کو آزردہ دیکھ کر ان کی دلجوئی کے لئے چند خاص ارکان کو بھیجا اور ان کی خاطر ملحوظ رکھ کر نایکواڑوں کو سزا دی۔

یہ وہ اخلاق تھے جنہوں نے سلطان کو ہر دل عزیز بنا دیا تھا اور اس کے اشارہ پر جان دینا لوگ باعث فخر سمجھتے تھے کیوں نہ ہو جب بادشاہ کو خود اپنی رعایا کا اس درجہ خیال ہو تو پھر رعایا بھی احسان و تشکر کے جذبات لئے جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

بادشاہ کی جس سادہ زندگی کا ہم نے ذکر کیا ہے کہیں اس سے یہ نہ خیال کیجیئے کہ شان و عظمت کے لوازمات کا وجود نہ تھا، بلکہ جہاں تک سلطان کی ذات کا تعلق تھا وہاں تک تو البتہ اس سادگی کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن جہاں سلطان کی ذات کے علاوہ درباری شان اور خاندانی عظمت و شوکت کا تعلق تھا اس قسم کے شاہانہ جاہ و حشم یا مسرفانہ فیاضی میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی اسکے دسترخوان

کا روزانہ خرچ سینکڑوں روپے ہوتا تھا ۔سلطان محمد کی شادی کی تقریب جس شان و شوکت سے ادا ہوئی وہ اس عہد کی مسرفانہ فیاضی اور حشمت و دولت کا سب سے بڑھا ہوا نمونہ ہے ۔یہ خوش قسمت لڑکی جس سے سلطان محمد کا نکاح ہوا خاندان شاہی کے رکن اور سلطان کے حقیقی ماموں عبد الرحمٰن کی دختر تھی ۔سلطان معہ خاندان شاہی دارکان دولت اور کل فوج اور تمام افسران ملکی و خدام کے عبد الرحمٰن کا مہمان ہوا ۔کئی دن تک عیش و نشاط کا سلسلہ جاری رہا ۔اور اس عظیم الشان بارات میں ایسے فیاضانہ انداز سے مہمانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کیلئے امیرانہ زندگی بسر کر لی ۔اور غریبوں کو تو فکر معاش سے ہی نجات مل گئی ۔

سلطان محمد کی فیاضی سخاوت اور دریا دلی کا ذکر تواریخ میں نہایت فخر اور جوش کے ساتھ کیا گیا ہے ۔سلطان کی مخصوص عطایات اس قسم کی حیرت انگیز فیاضیوں سے معمور ہیں ۔کہ ان کے لئے ایشیائی عبارت آرائی کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ وہ سلطان کی زندگی کے معمولی اور اصلی واقعات ہیں ۔مگر بالکل ممکن ہے بلکہ حالات بھی اسی کے مقتضی ہیں ۔کہ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو کہ کیا یہ ایشیائی روایتیں قابل تسلیم ہیں اور ان پر مبالغہ آرائی کا رنگ غالب نہیں ہے ؟

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کی اقتصادی حالت ،اور کسب معاش کی کشمکش ،دولت کی قلت اور بے روزگاری کی فزونی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ سوال زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ کیا اس زمانہ میں ملکی اور فوجی مصارف سے بچ کر اتنا روپیہ ہوتا تھا کہ ان تمام بے انتہا فیاضیوں اور فضول خرچیوں کے لئے مکتفی ہو ۔ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں ان روایتوں کو بے اعتباری کی نگاہ سے دیکھ کر ان کو مبالغہ پر محمول جائے ۔اس زمانہ کے صفحات تاریخ پر گہری نظر ڈالئے اور اس وقت کی معاشرت پر غور کیجئے اور طریق حکومت کا تجزیہ کیجئے ۔تو آپ پر بخوبی روشن ہو جائیگا کہ اس زمانہ میں ایشیائی سلطنتوں کے ملکی و فوجی مصارف کی مقدار موجودہ زمانہ کی طرح بڑھی ہوئی نہ تھی ۔اور نہ اس وقت اس قدر مختلف صیغے اور عہدے تھے ۔نہ اتنی کثیر تنخواہیں تھیں اور نہ حکومت کو اس قدر کثیر اور بے شمار اخراجات کا بار اٹھانا پڑتا تھا ۔سب سے بڑھ کر قابل توجہ بات یہ ہے کہ اقتصادی حالت اس قدر ناگفتہ بہ نہ تھی ،دولت کی فراوانی تھی ۔اشیا کی بہتات تھی ۔ضروریات زندگی ارزاں تھے ،معیار زندگی اس قدر بڑھا ہوا نہ تھا ،بالکل معمولی اخراجات پر جن کا ہم باور بھی نہیں کر سکتے ایک خاندان کی پرورش ہو سکتی تھی ۔شاہی آمدنی ان اخراجات و مصارف حکومت سے زیادہ تھی اس لئے وہ تقریبیں جنہیں ہم آج فضول اور لغو سمجھتے ہیں ان میں خزانہ عامرہ کا بڑا حصہ صرف ہوتا تھا ؛

دولت کی فراوانی تھی ،امن و فراغ ،اطمینان اور زر و مال سب کچھ میسر تھا اور حوصلہ مندی ،آزادی ،لطافت طبع سب موجود تھے پھر کیا چیز ہو سکتی تھی جو ان کو زندگی سے لطف اندوز نہ ہونے دیتی عیش و نشاط کی بزم آراستہ تھی ۔نغمہ و سرود کی آواز روح کو وجد میں لاتی تھی ۔اس وقت کے اسلامی تمدن و معاشرت عموماً اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی اس دور کی خصوصیات ہیں ۔

اس بے انتہا دولت کی وجہ سے عیدین، شب برات، نوروز اور سالگرہ کے مواقع پر عہد سلطان محمد شاہ میں بڑے بڑے جشن ہوا کرتے تھے۔ تمام شہر کے بازار، دوکانات، د مکانات آراستہ کئے جاتے تھے۔ ہر طرف گلی کوچہ میں عجب دھوم دھام ہوتی شور وغل اور چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی، دربار کے تکلفات کا کیا کہنا۔ اس زمانہ کی اس شان و شوکت اور آرائش و زیبائش کا اندازہ محال ہے۔ دربار باغ و بہار بنا رہتا تھا، جہاں باغبان اس کی زیبائش و زینت کو دیکھ کر مسرور و شاداں ہو جاتا تھا اور بیجاپور، دارالسرور۔ فردوس بریں کا نمونہ بن جاتا تھا۔[۱]

یہ قاعدہ تھا جس کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی کہ عیدین اور سالگرہ کے زمانہ میں تمام بڑے بڑے امرا جاگیردار و زمیندار بخوشی و رغبت اظہار وفاداری و خیر خواہی کے لئے دربار میں حاضر ہوتے۔ ہر شخص ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے بڑھ بڑھ کر نظریں پیش کرتا اور اپنے جوشِ عقیدت کا اظہار کرتا۔ سلطان ذی شان اپنے جاں نثاروں اور خیر خواہوں کے اس جوشِ عقیدت و خلوص کو قدر کی نگاہوں سے دیکھ کر ان کی نذروں کو قبول کرتا اور اپنی خوشنودی کے اظہار میں ان کی عزت افزائی کرتا۔ انہیں علی قدر مراتب خلعت و انعام عطا کرتا۔ عیدین کے صدقات اور سالگرہ کی خیرات سے ضعفا و فقرا کے لئے تمام سال کا سرمایہ جمع ہو جاتا تھا۔[۲]

بیجاپور میں نوروز کی رسم بھی منائی جاتی تھی۔ نوروز میں نوروز تک عیش و طرب کے جلسے منعقد ہوتے رہتے داد و دہش کا دروازہ کھل جاتا۔ انعام و اکرام عطا ہوتے۔ "نوروزہ باغ" اسی تقریب کے لئے مخصوص تھا، اس کا بازار دنیا کے عجائب و غرائب اور نوادر اشیا سے مملو ہوتا تھا یہ ایک طرح کی نمائش ہوتی تھی جہاں "مینا بازار" بھرتا تھا۔ مینا بازار کے متعلق علمائے ظاہر یہ خیال کرتے ہیں کہ اس میں مسلمان خواتین کی بے حرمتی و رسوائی منظور تھی۔ حالانکہ حقیقت کا پتہ لگائیے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے ان کا اصلی مقصد یہ تھا کہ پردہ میں رہنے والی عورتیں جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں اور گھروں میں اکیلی پڑی رہتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ملیں جلیں، زمانہ اور حالات زمانہ سے واقف ہوں ہندو اور مسلمان عورتیں جو الگ تھلگ رہتی ہیں آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے اوضاع و اطوار اختیار کریں، مسلمان عورتیں ہندو عورتوں کی شوہر پرستی و خود فراموشی سیکھیں اور ہندو عورتیں مسلمان بیویوں سے وفا شعاری، شائستگی، خوش اخلاقی، وضعداری اور سلیقہ شعاری کا سبق لیں۔ سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ ہندو عورتیں مسلمان عورتوں سے مل کر ان کی دینوی خوبیوں کے ساتھ ان کے سچے دین اور ان کی توحید و رسالت سے بھی واقف ہو جائیں۔

اس "نوروزہ باغ" میں ایک حصہ عورتوں کے لئے مخصوص تھا یہ ایک قسم کا زنانہ بازار ہوتا تھا جہاں تمام امرا و معززین

---

[۱] بساطین السلاطین صفحہ ۳۵ [۲] بساطین السلاطین صفحہ ۳۵

کی عورتیں دکان رکھ کر اپنے جواہرات اور دوسری نادر چیزیں فروخت کرتی تھیں، نازنین و دلربا مہ جبینیں دور دور سے آکر بازار کو آباد کرتیں۔ اور حورانِ بہشتی کا جلوہ دکھاتیں۔ عام عورتیں سیر و تفریح اور خرید و فروخت کے لئے بازار میں آتیں عجیب لطف کا مجمع ہوتا تھا۔ خریداری اور سیر کرنے والیاں خوب خوب بن سنور کے آتی تھیں، دکانیں خوب سجی ہوئی ہوتی تھیں، فروخت کے لئے سامان تجارت مرتب ہوتا تھا بیچنے والیاں اس کو اپنے مذاق اور شوق کے مطابق آراستہ کرتی تھیں،

عمارت کی آرائش ہی ایسی دلکش ہوتی تھی کہ طبیعت لوٹ جایا کرتی تھی، پہلے تو ڈیوڑھی کی جگہ ایک بہت بڑا وسیع احاطہ ہوتا تھا، جہاں سواریاں آکر اترتی تھیں۔ اس کے بعد دوسری ڈیوڑھی ہوتی تھی۔ مکانوں کو بیل بوٹوں اور مینا کاری کی صنعتوں سے جنت کا نمونہ بنا دیا جاتا تھا جس پر نظر پڑتے ہی انسان محو حیرت ہو جاتا تھا۔

آخری دن سلطان خود سوار ہو کر معہ شہزادوں اور مخصوص مصاحبوں اور امرا کے اس بازار میں جا کے خرید و فروخت کرتا اور عورتیں جو دام مانگتیں دیتا۔ اسی دن تمام امرا، ارکانِ دولت اور جملہ خدام حضوری و شاگرد پیشہ و حوالداران محلات و کارخانہ جات حاضر ہوتے اور انعام و اکرام پاتے تھے

گو سلطان محمد کے عیش و طرب کے جلسوں میں رنگینی اور جذبات کو ابھارنے والی دلکشی پائی جاتی ہے۔ لیکن جلسوں کی دلچسپی اسی حد تک محدود نہ تھی۔ اس نغمہ و سرود، رنگینی و رندی کے ساتھ ساتھ علمی مذاق بھی اپنا رنگ دکھاتا تھا۔ اس قسم کے جلسے شاعرانہ جذبات اور دبی ہوئی قابلیتوں کو پورے جوش کے ساتھ ابھارتے تھے۔ سلطان ایسے باپ کا بیٹا تھا جو موسیقی میں ماہر فن اور استاد کامل سمجھا جاتا تھا۔ خود بھی نکتہ رس، سخن سنج اور موسیقی کا ماہر تھا۔ یارانِ مجلس بھی عموماً نازک خیال اور نکتہ شناس ہوتے تھے۔ بات بات پر شاعرانہ لطیفے ایجاد ہوتے تھے۔ کبھی موسیقی کی بحث چھڑ جاتی تھی تو پھر وہ وہ نکات بیان ہوتے تھے کہ موسیقی بھی ایسے مربیوں پر ناز کرتی تھی۔

سعیدی - بی، اے (علیگ)

تجلّیات

مائلِ لطف جو وہ لعبتِ چیں ہو جائے
رشکِ ارژنگ مرا قلبِ حزیں ہو جائے

اے دلِ زار نہ کر شکوۂ بے مہریِ دوست
ہائے کمبخت اگر چیں بہ جبیں ہو جائے

وہ نہ چاہے تو رہے تیرہ و تاریک حرم
وہ اگر چاہے تو دیدار کہیں ہو جائے

خوب ہے اُس گلِ خوبی کے تصوّر کی بہار
آنکھ جس چیز پہ پڑ جائے حسیں ہو جائے

نقش سجدوں کے چمک اُٹھیں ستاروں کی طرح
کہکشاں زار مری لوحِ جبیں ہو جائے

تُو خدا کو بھی بنا دیتا ہے پتّھر اے شیخ!
میں جو پتّھر کو بھی دیکھوں تو حسیں ہو جائے

دلِ تاریک کا ہر ذرّہ بنے شعلۂ طور
اک جھلک آج پھر او پردہ نشیں ہو جائے

نام بھی لوں نہ کبھی ساغر و مینا کا اثرؔ
مجھ کو جنّت کا اگر کچھ بھی یقیں ہو جائے

اثر صہبائی

گِلہ

اب تو خیر محض ایک قصۂ باطل ہوں۔ مگر وہ دن بھی تھے جب کہ میں خود اپنے لئے ایک کافی دلچسپ فسانہ تھا۔ اچھے دلوں میں میری محبت تھی۔ خط آتے تھے جواب نہ جاتے تھے۔ دل یہ کہتا رہا کہ عارضی بیتاب محبت کے خراج سے آرزو دل کو مالا مال کرلو۔ مگر عقل کمبخت ہمیشہ دھوکا دیا کی اور آخر اس دشمن جان نے کہیں کا نہ رکھا۔ غالب مرحوم کی طرح ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کا دفتر داور محشر کے سامنے کھولوں گا، اگر اس نے انصاف کیا تو میرے لئے ایک نئی دنیا بنادیگا۔ اور اگر یہ توقع بھی اٹھ گئی۔ تو پھر

کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

گِلہ! گلہ!!! بہت لوگوں کا خیال ہے کہ گلہ شخصی ہوتا ہے یعنی زید کو کچھ کرنا چاہئے تھا۔ اور اس نے نہیں کیا در حالیکہ عمرو کو بجا توقع تھی کہ زید ضرور ایسا کرے گا اور ایسی صورت میں عمرو زید کا گلہ کرنے میں راستی پر ہوتا ہے حضرت اقبال کی نظم "شکوہ" بھی "مسلم" کی جانب سے خدا پر ایک ذاتی گلہ ہے۔ غالب مرحوم کے مفصلہ ذیل شعر کی تفسیر ہے۔

آج کیوں اپنے اسیروں کی تجھے پروا نہیں

کل تلک تیرا بھی دل مہرو وفا کا باب تھا

مگر میرا گلہ ذاتی یا شخصی گلہ نہیں اور اس کی مختصر سوانح عمری یہ ہے۔

میز پر کھانا کھانے والے ہم تین تھے۔ میں جس کی زبان بند تھی، وہ جس کے بال کھلے تھے اور تیسرا وہ شخص جس کو اس گلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بال باربار گل رخسار کی طرف جھکتے تھے اور نازک گوری انگلیاں انہیں ہٹاتی تھیں۔ میری کیا مجال تھی کہ رموز مملکت میں دخل دینا، یعنی گو کا زاہونے کی حیثیت سے میری ہمدردی بالوں کے ساتھ تھی اور جی چاہتا تھا کہ یہ ایشیائی بلا روک ٹوک یورپ پر پھیلیں۔ مگر میری کامیاب بزدلی ان انگلیوں کی دست درازی پر خاموش رہی یعنی میری لامذہبی کی انتہا ہوگئی کیونکہ میرا دلی عقیدہ یہ ہے کہ خدا سب گناہ بخش دے گا مگر اس خاموش زبان کو ضرور فی النار کریگا جو حسن کے دربار میں مدح سرائی نہ کرے۔ اور اس لئے میرا گلہ یہ ہے کہ کیوں اخلاقاً اس ملک میں حسن پرستی کا اظہار ممنوع ہے۔ ہزاروں عبادت کے موقعے ملے، یعنی یہ کہ کسی کی آنکھ کی، کسی کی ادا کی، کسی کی چال کی رو در رو داد دی جاتی، مگر ہمیشہ اس ملک کی الٹی تہذیب اور اپنی اندھی عقل مانع رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہونا موت ہے۔ پیدا ہوکر زندہ رہنا عذاب بعد مرگ

ہے۔ زندہ رہ کر اپنی مجبوریوں معذوریوں کو سمجھنا اور بے بسی سے کچھ نہ کر سکنا جہنم ہے۔ خدا کرے یہاں کوئی پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو زندہ نہ رہے۔ اور اگر اس بدبخت کو زندہ بھی رہنا ہو تو خدا اسے ذکی الحس ہونے کے جہنم سے بچائے۔ یہ ملک بجائے خود گلہ ہے مگر کس کا؟ اور کس پر؟

فلک پیما

وہ رات

کس قدر سیمین و زریں جانِ من وہ رات تھی — کس قدر رنگین و شیریں اُف تری ہر بات تھی

بھول سکتی ہے کبھی اُلفت تری عصمت تری — تو تنِ تنہا تھی، میں تھا اور خدا کی ذات تھی

زندگی میری تری اک گیت سا ہوتی مگر — دہر حائل تھا، اور اسکی شورش اک آفات تھی

گام زن دونوں بہم ہوتے خوشی کی راہ میں — اپنی قسمت ہی مگر بھٹکی ہُوئی ہیہات تھی

گلشنِ دنیا کو اے جاں تو نے دیکھا بھی تو کیا — ہر گھڑی جورِ خزاں تھا ہر قدم پر گھات تھی

چاندنی دلکش تھی مجھ کو رات دم بھر کے لئے — تو جب آئی یاد تیرے سامنے وہ مات تھی

دن مرے نیکی سے مالامال ہیں اُس رات سے

کس قدر سیمین و زریں جانِ من وہ رات تھی

لطیف

دِل

(ایک تاریخی افسانہ)

اسکاٹ لینڈ کی پہاڑیاں جن کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا ہے، ہرے بھرے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ سرسبز پہاڑیوں کے دامن اور بھی دلفریب ہیں۔ جا بجا پانی کے چشمے، جھیلیں اور آبشار ہیں۔ دریا اپنی سفید لہروں سے اس قدرتی منظر میں اور بھی چار چاند لگا رہے ہیں۔ اگر کسی بلند مقام سے دیکھا جائے تو سبزہ کے درمیان یہ بہتے ہوئے دریا نقرئی سانپ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض پہاڑوں کی چوٹیوں پر دو دو تین تین میل مربع میدان ہیں۔ ان میدانوں میں عالیشان سربفلک عمارات بنی ہوئی ہیں۔ جن کی شان و شوکت ان کے مالکوں کی ثروت و دولت کا اظہار کر رہی ہے۔

ان ہی بلند پہاڑیوں میں سے ایک پر شاہ بروس والیٔ اسکاٹ لینڈ کا عظیم الشان قصر واقع ہے جس پر شاہی جھنڈا بڑی شان سے لہرا رہا ہے۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے اکثر اوقات یہ جھنڈا بالکل کھل جاتا ہے۔ اور اسکاٹ لینڈ کا شاہی نشان اس پر صاف نظر آنے لگتا ہے۔

۱۳۲۸ء میں انگلستان و اسکاٹ لینڈ کے مشہور عہد نامہ پر دستخط ہو چکے ہیں جس کی رو سے اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ آئندہ ایک خود مختار حکمران تسلیم کیا جائیگا۔ اس طرح شاہ بروس ملک اسکاٹ لینڈ کا پہلا خود مختار فرمانروا ہوا۔

(۲)

قصرِ شاہی کا وہ حصّہ جہاں بادشاہ کی خواب گاہ ہے۔ سپاہیوں کے مسلح گارد سے محفوظ ہے۔ اندر ایک کمرہ میں شاہ بروس نیم جان، اور چند گھنٹوں کا مہمان بسترِ مرگ پر پڑا ہوا ہے۔ جملہ ارکانِ سلطنت، رفقا، مصاحب، طبیب اور بڑے بڑے جرنیل جو اس کی سیادت میں اپنا ملک آزاد کرنے کے لئے گھمسان کی لڑائیوں میں جوہرِ شجاعت دکھا چکے تھے، اس وقت قضا و قدر کے زبردست ہاتھوں کے سامنے بالکل عاجز و لاچار بیٹھے ہیں۔ تمام کوششیں جو ایک بادشاہ کی جان بچانے کے لئے کی جا سکتی ہیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن بادشاہ کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی ہے یہاں تک کہ خود بادشاہ کو بھی یقین ہو گیا ہے کہ میں صرف چند ساعت کے لئے اس دنیاوی تخت و تاج کا مالک ہوں اور مجھ کو بہت جلد اس معبودِ حقیقی کے روبرو ایک ادنیٰ غلام کی طرح دست بستہ حاضر ہونا پڑے گا۔

بادشاہ نے اپنے خاص رفقا اور معتمدین کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا جس پر وہ سب فرمانبردارانہ انداز میں اس کی مسہری کے قریب جمع ہو گئے۔ بادشاہ نے زاروقطار روتے ہوئے نہایت دردناک لہجہ میں کہا "میں اپنی تمام بدافعالیوں پر پشیمان ہوں، اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، خصوصاً اس گناہ کبیرہ سے جو سلطنت کے دوسرے دعویدار کامین کے بے گناہ قتل میں مجھ سے سرزد ہوا۔ افسوس کہ ہم نے خدا کے گھر میں محراب و منبر کے قریب بیچارے کامین کی ناحق جان لی۔ جب مجھ کو اس کا خیال آتا ہے تو میں کانپنے لگتا ہوں۔ میری عمر وفا کرتی تو میں یروشلم جا کر ضرور ہنگامۂ جنگ برپا کرتا۔ اور بیت المقدس کو ناپاک ظالموں سے چھین لیتا۔ اور یہ کار ثواب میری اس بداعمالی کا بہترین کفارہ ہو جاتا۔ افسوس اب مجھ کو زیست کی امید نہیں، اے میرے معبود تو معاف کر دے" میں ان سب کے سامنے نہایت عجز و انکسار سے اپنے گناہ کی معافی مانگ رہا ہوں ـــــ اے رحیم، اے کریم تو مجھے معاف کر دے" یہ کہکر افسردہ دل بادشاہ اپنے عمائد میں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ میرے پیارے جاں نثار ڈگلس ایک نہ ایک دن ضرور مجھ کو تیری شجاعت سے توقع ہے کہ تو میرا دل بیت المقدس لے جائیگا اور یہی میری آخری وصیت ہے"۔

لارڈ ڈگلس اس دردناک اپیل کو سن کر زاروقطار رونے لگا اور کہا "جہاں پناہ، یہ حضور کی قدرافزائی اور بندہ پروری ہے کہ اپنے ایک نہایت حقیر خادم کو یہ خدمت سپرد کرتے ہیں"۔

بادشاہ کی پیشانی سے کسی قدر اطمینان و مسرت کے آثار نمایاں ہوئے اور فوراً اپنی جاں جان آفرین کے سپرد کر دی۔

(۳)

ماتمی توپیں داغی جانے لگیں۔ تمام ارکان سلطنت نے فوراً سیاہ ماتمی لباس پہن لئے۔ ملک میں کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جس کے دل پر ایسے فدائے قوم و ملک بادشاہ کی وفات کا اثر نہ ہوا ہو۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اپنے ہردلعزیز تاجدار کے لئے خون باری نہ کر رہی ہو۔ شاہ بلوط اور صندل کی لکڑیاں شاہ متوفی کی نعش کے اردگرد جلائی گئیں۔ شاہی رسوم کے مطابق تابوت کے چاروں کونوں پر محافظ ماتمی لباس میں ایک ایک گھنٹے کے لئے باری باری پہرہ دینے لگے پادری نے جو آج جنازہ کی رسوم ادا کرنے کے لئے خاص جبہ پہن کر آیا تھا۔ انجیل ہاتھ میں لے کر کچھ دعا پڑھی اور بادشاہ کے لئے معبود حقیقی کی درگاہ میں خلوص دل سے دعا مانگنے لگا۔

لارڈ ڈگلس نے جس کو بادشاہ کی آخری وصیت کی تعمیل کرنے کا فخر حاصل ہوا تھا۔ فوراً ایک تجربہ کار ڈاکٹر کو طلب کیا، اور حکم دیا کہ شاہی نعش کی پسلیاں کاٹ کر اندر سے دل نکال دے، چنانچہ دل نکالا گیا اور لارڈ ڈگلس نے

اُسے ایک قیمتی مرصع ڈبیہ میں بند کر کے سونے کی زنجیر میں ڈالا اور تعویذ کی طرح گلے میں پہن لیا۔

(۴)

دوسرے دن جب کہ آفتاب نے سیاہ ماتمی رات کی نقاب سے اپنا چہرہ نکالا ڈگلس نے تمام افواج کا معائنہ کیا۔ اور تجربہ کار جانباز سپاہ کا ایک جرار لشکر تیار کر کے یروشلم پر حملہ کرنے کے ارادے سے چل کھڑا ہوا۔ عام باشندگان میں سے بھی ہزاروں آدمی جو اپنے بادشاہ کی موت سے غمزدہ تھے۔ اس مہم پر جانے کی غرض سے شریک ہو گئے۔

بیت المقدس پہنچنے سے قبل ڈگلس نے ہسپانیہ میں کچھ قیام کرنا چاہا۔ یہاں سلطان عثمان، الفارسو والیِ ہسپانیہ سے جنگ کر رہا تھا۔ الفارسو کے لئے اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اسکاٹ لینڈ کے سپہ سالار ڈگلس کو اپنے ساتھ ملا لے۔ چنانچہ الفارسو نے ڈگلس سے کہا۔

الفارسو۔ آپ جس غرض کے لئے بیت المقدس پر یورش کرنے جا رہے ہیں۔ وہ مقدس مطلب یہیں حاصل ہو سکتا ہے۔"

لارڈ ڈگلس۔ لیکن میرے مالک نے تو مجھے بیت المقدس کو ظالم مسلمانوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لئے یروشلم پر چڑھائی کرنے کی وصیت کی ہے۔

الفارسو۔ جی ہاں تو میرا مدعا بھی یہی ہے کہ آپ سلطان عثمان سے جس کی قلمرو میں بیت المقدس بھی شامل ہے۔ یہیں پر جنگ کر ڈالئے۔ میری اور آپ کی فوجیں مل کر سلطان عثمان کو شکست فاش دے دیں گی۔ صرف عثمان کو شکست دینا ہی مذہب عیسوی کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔

ڈگلس۔ بے شک آپ درست فرماتے ہیں۔ میں دل و جان سے حاضر ہوں۔

(۵)

ایک طرف الفارسو والی ہسپانیہ کا جرار لشکر اور اسکاٹ لینڈ کے جاں نثار مذہبی جوش میں سرشار مجاہدین دوسری طرف تنہا سلطان عثمان دشمن کے ملک میں دو مشترکہ طاقتوں کے مقابلہ میں صف آرا ہے۔ سلطان نے اپنی فوج کو مخاطب کر کے کہا۔

"میرے جاں نثار اسلامی بھائیو! جاسوسوں نے خبر دی ہے کہ اسکاٹ لینڈ کا نامور جرنیل ڈگلس بھی اب شاہ ہسپانیہ کے ساتھ مل گیا ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہم مسلمان ہیں۔ گویا ہمارا مسلمان ہونا ہی ہمارا سب سے بڑا گناہ ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مخالفین کا لشکر مذہب اسلام سے جنگ کر رہا ہے۔ بہادر سپاہیو۔ ہم اپنے ملک سے بہت دور حملہ آور کی حیثیت سے یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کوئی ذلت نہیں ہو سکتی۔ کہ ہم دو طاقتوں سے ہراساں ہو کر شکست کھائیں۔

اور اپنا سامنہ لیکر سمندر کی خوفناک موجوں میں مچھلیوں کا طعمہ بنیں۔ اگر ہم کو مرنا ہے تو مار کر مریں تاکہ دنیا کے بہادروں کی فہرست میں ہمارا نام بھی زریں حروف سے لکھا جائے اور ابدالاباد تک ہمارا نام باقی رہے۔ یہی وقت ہے کہ ہم اسلامی حمیت، غیرت اور اخوت اسلامی سے کام لیکر دشمن پر حملہ کریں اور نہایت شان سے ان پر فتح حاصل کر کے غازی بن کر اپنے پاک مذہب اسلام کا بول بالا رکھیں۔"

سلطان کی اس دل سوز اور پرجوش تقریر نے تمام لشکر اسلام میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ "اللہ اکبر" کے نعروں کی صدائیں گونجنے لگیں۔ مسلمانوں نے ایک ہی حملہ میں مخالفین کو تین طرف سے گھیر لیا اور سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ڈگلس نے جب دیکھا کہ تین طرف سے اس کی فوج گھری ہوئی ہے اور بھاگنے کی کوئی صورت نہیں تو سخت مایوس ہوا۔ اس نے اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

آخر کار اس نے مایوسی کی حالت میں اپنی آخری تدبیر کام میں لانے کی غرض سے "شاہ بروس کا دل" جو تعویذ کی طرح اس کے سینہ پر لٹک رہا تھا اتار کر میدان میں پھینک دیا۔ اور اس سے اس طرح مخاطب ہوا۔

"پہلے تو جا، تیرے بعد ڈگلس میدان میں اپنی جان نثار کرنے کے لئے آگے بڑھے گا"

جس جگہ بروس کا دل گرا، ڈگلس بھی ایک آخری کوشش کے بعد اسی جگہ پہنچ گیا اور لڑتا لڑتا مارا گیا۔

(۶)

ڈگلس اور اس کے ہزاروں رفقا کی لاشیں بے گور و کفن خاک و خون میں پڑی ہیں۔ جو زندہ بچے وہ یروشلم تو کیا جاتے ان کا تو اسکاٹ لینڈ پہنچنا بھی دشوار نظر آتا تھا۔ ہاں البتہ اس ہزیمت خوردہ فوج کے باقی ماندہ افسروں نے اتنا ضرور کیا کہ ان کشتوں کے ڈھیر میں شاہ بروس کا دل اور ڈگلس کی لاش تلاش کی۔ جرنیل کی لاش اس تعویذ نما ڈبیہ کے اوپر پڑی ہوئی ملی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ڈگلس نے شاہ بروس کے دل کی حفاظت میں اپنی انتہائی کوشش کا ثبوت دیا ہے۔

شاہ بروس کا دل اسکاٹ لینڈ کی ایک عظیم الشان خانقاہ میں منبر کے قریب دفن کیا گیا۔ اس کی نعش تو پہلے ہی دفن کی جا چکی تھی۔ لیکن زمانہ ہوا، صدیاں گزر گئیں۔ دنیا بدل گئی وہ عالی شان خانقاہیں اب ٹوٹے پھوٹے کھنڈر رہ گئیں اور یہ جاننے والا بھی کوئی نہ رہا کہ شاہ بروس اور اس کا دل کونسی خانقاہ میں کس جگہ دفن ہیں۔

(۷)

پانچ صدیاں گزر جانے کے بعد ۱۸۲۷ء میں زمانہ نے کروٹ بدلی۔ کھنڈروں کی مرمت و تعمیر شروع ہوئی۔ شاہ بروس کی قبر کا سنگ مرمر کا کتبہ مٹی میں دبا ہوا نہایت محنت و تلاش کے بعد برآمد ہوا۔ انتہائی جستجو کے بعد شاہ متوفی کی لاش بھی مل گئی

جو صرف اس وجہ سے شناخت کر لی گئی کہ کسی زمانہ میں پسلی کی ہڈیوں کو تراش کر دل نکالا گیا تھا جس کی وجہ سے پسلی کی ہڈیاں ترشی ہوئی نظر آتی تھیں۔

حکومت نے فوراً حکم دیا کہ شاہ بروس کی لاش اس وقت تک نہایت احتیاط و حفاظت سے رکھی جائے جب تک کہ نیا مقبرہ تیار نہ ہو جائے۔ جب مقبرہ تیار ہو جائے گا تو شاہی لاش کی از سرِ نو تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کی جائیں گی۔

ہزاروں لاکھوں مرد، عورت شاہ بروس کی لاش دیکھنے دور دور سے آنے لگے۔ چونکہ تمام خلقت ایک ہی خانقاہ میں نہ سما سکتی تھی اس لئے قرار پایا کہ فرداً فرداً ہر ایک شخص لاش کے پاس سے گزرے اور اس طرح ہر امیر و غریب کو اس نامور اور رفداۓ ملک و قوم کی لاش دیکھنے کا موقع مل جائے۔

لاش جب مل گئی اور یہ تحقیق ہو گیا کہ یہ شاہ بروس ہی کی لاش ہے تو قدرتی امر تھا کہ ہر کس و ناکس کا خیال اس مرصع ڈبیہ کی جستجو کرنے کی طرف متوجہ ہوا جس میں شاہی دل محفوظ تھا اور جو قومی محبت، آزادی و اخوت سے معمور تھا۔ پتھر کی چند بھاری سلوں کے نیچے یہ طلائی زنجیر والی ڈبیہ مل گئی۔ اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ وہ دل جس کی خاطر ہزاروں ہستیوں کا خون ہو گیا، جس کی حفاظت کے لئے ڈگلس نے اپنی جان قربان کر دی ایک کثیر مجمع کے سامنے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

(ماخوذ) مشہود زائر

اپنا راز اپنے سینے میں چھپا کے نہ رکھ، اے دوست!

مجھے بتا دے، آہستہ سے صرف مجھے بتا دے۔

تُو جو پھول کی طرح مسکراتا ہے آہستہ سے اپنا راز کہہ دے۔ میرے کان نہیں، مگر میرا دل اس کو سن لے گا۔

گھُپ اندھیری رات چھا رہی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ پرندوں کے گھونسلے نیند کی چادریں لپٹے ہوئے ہیں۔

رُک رُک کر بہتے ہوئے آنسوؤں، چھپ چھپ کر نکلتی ہوئی مسکراہٹوں، رسیلی حیا اور درد کی زبان سے مجھے بتا دے۔ اپنے دل کا راز اے دوست!

ٹیگور

ضیائے محبّت

بھڑک اُٹھا ہے شعلہ دل میں یہ کس کی محبت کا؟ | کہ میری روح پر ٹوٹا ہے اک طوفاں مسرت کا
ضیائے عشق سے روشن ہوئی ہے زندگی میری | یہ پرتو پڑ گیا کس ماہِ تاباں کی مروّت کا؟
کسی کو پیار ہو مجھ سے یہی ہے آرزو میری | نہ ثروت کی تمنّا ہے نہ کچھ ارماں ہے شوکت کا
عزیزوں کے چمن میں دوستداری کی بہار آئے | مرے گُل کو رہے کھٹکا نہ کچھ خارِ قرابت کا
مسرت کا سبق ملتا ہے ہر کارِ مشقت میں | مری زحمت بھی ہے مظہر الٰہی تیری رحمت کا!
نظر آئے حقیقت کس طرح سے زندگانی کی | مرے دل میں اندھیرا چھا رہا ہے میری ذلت کا!
بدل ڈالوں میں اپنی زندگی کو جی میں آتا ہے | مرا نفس مکدّر ہو اک آئینہ صداقت کا!
شرانگیزی کے شُعلے سب یکایک سرد پڑ جائیں | امنڈ آئے جہاں طوفان خیرِ بے نہایت کا!
غرض کی زندگی سے موت اچھی ہے کہیں اے دل! | وہ جینا کیا ہے جس میں ہو خیال اپنی ہی راحت کا

بشیر اپنی محبت لطف و نیکی کا مرقع ہو
ملے موقع کسی ناآشنا کو کیوں شکایت کا؟

بشیر احمد

خاک بر سر کُن غمِ ایام را

دنیا میں کوئی چیز اتنی پژمردگی اور افسردگی لانے والی نہیں جتنا کہ کھوئے ہوئے مواقع اور گزری ہوئی زندگی کا غم ہے۔ تمہارا ماضی، وہ کتنا ہی تاریک کیوں نہ ہو، تم اُسے بھول جاؤ۔ اگر یہ تمہارے حال پہ اپنا بھیانک سایہ ڈالتا ہے اور غم و الم کو تم پر مستولی کر دیتا ہے، تو جان لو کہ اس میں تمہیں مدد دینے کی ذرہ بھر بھی قوت نہیں ہے۔ اور کوئی ایسی وجہ بھی نہیں ہے کہ تم اسے اپنی یاد میں محفوظ رکھو۔ بلکہ اس کے بالمقابل ایک ہزار وجوہ ایسی ہیں جن پر نظر کرتے ہوئے تمہیں اسے اتنا گہرا دفن کر دینا چاہیے کہ پھر یہ کبھی ابھر ہی نہ سکے۔

کوئی اتنا احمقانہ فعل نہیں۔ کوئی اتنا ظالمانہ فعل نہیں۔ جتنا کہ زمانہ کی قبروں میں سے ماضی کے ڈھانچ گھسیٹ گھسیٹ کر نکالنا ہے۔ وہی نامرغوب تصورات، وہی غیر دانشمندانہ افعال، وہی بدبخت تجربات جو کل ہم سے سرزد ہوئے آج ہمارے کام کی روح کو تباہ کرنے کے لئے ہمارے سامنے نہیں آنے چاہئیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ اس قسم کے ہیں جو اپنی زندگی بھر ناکامیاں اٹھاتے رہے۔ اور اٹھا رہے ہیں۔ آہ! اگر وہ صرف ماضی کو بھول جاتے اگر وہ صرف اس سے اپنا رشتہ منقطع کر لینے کی قابلیت رکھتے۔ اگر وہ صرف ماضی کا راستہ چھوڑ کر مستقبل کی منزل پر نئے سرے سے پڑ لیتے تو یقیناً اُن کی کامیابی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی۔

میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں۔ جو اپنی قسمت اور اپنی تقدیر کی شکایت کرتے ہیں۔ اور جو اپنی بدنصیبی کو ایک آہنی طوق کی طرح اپنے گلے میں پڑا ہوا سمجھتے ہیں۔ میں کہوں گا وہ اپنے بدترین دشمن ہیں۔ ایک نیم شعوری حالت میں وہ اپنی فضا اور اپنے حوالیات کو ناکامی کے تصور سے زہریلا اور کمزور کر رہے ہیں۔ ان کی قنوطیت جو ان کے جسم کے ایک ایک مسام سے سانس لے رہی ہوتی ہے ان کے گرد ایک کثیف مگر غیر مرئی فضا تعمیر کر دیتی ہے۔ جس میں سے روشنی یا امید کی کوئی کرن ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ مگر پھر بھی وہ حیران ہوتے ہیں کہ انہیں کامیابی کیوں نہیں ہوتی۔ وہ نور میں ظلمت کی تلاش کرتے ہیں۔ ناکامی سے کامیابی کی توقع رکھتے ہیں۔ اور رنج میں راحت کو ڈھونڈتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں کہ اگر وہ کسی کسان کو زمین میں بچھو کے بیج بوتے اور مکئی یا گندم کی توقع رکھتے دیکھیں یا باغ میں تمکو کا پودا لگا کر گلاب اور موتیا حاصل کرنے کی امید میں پائیں تو اس پر کیا کچھ مضحکہ نہ اُڑائیں۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ تمام دنیا میں یہی ایک اصول کام کر رہا ہے جو کچھ ہم بوتے ہیں وہی ہم کاٹتے ہیں۔ جس قسم کے خیالات کو ہم اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں ویسے

ہی واقعات ہمیں پیش آتے ہیں۔ دل کے باغ میں اگر ہم قنوطیت کے تلخ و ترش بیج کی آبیاری کرتے ہیں۔ تو اس کا پھل اپنی تمام خصوصیات لیکر پیدا ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ کانٹوں پر انگور کبھی پیدا نہ ہونگے۔ اور اونٹ کٹارے کو انجیریں کبھی نہیں لگیں گی۔

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بے بدہ پخت و خیالِ باطل بست

وہ لوگ جو قسمت کی شکایت کرتے ہیں، حالات کو ناموزوں کہتے ہیں۔ جو ہمیشہ دنیا کی عدل کشی اور قدر ناشناسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جو زمانہ کی ناسازگاری اور بے تمیزی کا رونا روتے ہیں۔ ان تنگ دلوں اور پست ہمتوں کو زمانہ بھی اپنی ایک ہی ٹھوکر سے ذلت اور پستی میں گرا دیتا ہے۔ فراخ حوصلہ اور بڑے دل کے لوگ اپنی طاقت اور قوت کو کڑھنے اور رونے میں ضائع نہیں کرتے۔ اگر ان کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو صبر اور استقلال کے ساتھ اس میں سے گزر جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا تمام وقت اور ان کی تمام طاقت محض زندگی کی تعمیر میں صرف ہونے چاہئیں۔ جو کڑھتے رہتے ہیں وہ نہ صرف اپنی طاقت اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ بلکہ وہ لوگوں کو اپنے متعلق بدظن بھی کر لیتے ہیں۔ ایسے شخص کو کوئی بھی مدد دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ جو ہر وقت حالات کی شکایت کرتا ہے۔ اور قسمت پر الزام دھرتا ہے کیونکہ انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔

انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ جتنا وہ خوش رہتا ہے اتنا ہی اچھی طرح وہ کام کرتا ہے۔ اس کی تعمیر ہی خوشی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اس لئے جب وہ بالکل مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔ تو وہ اپنا کام بھی نہایت خوش اسلوبی سے کرتا ہے فکر انسان کے ہنر کا دشمن ہے۔ اور وہ آرام و آسائش کو ضائع کر دیتا ہے۔ یہ ہماری طاقت اور قوت کو قطع کرنے کے لئے تیز سے تیز خنجر ہے۔

جب انسان کا دل تفکرات اور پریشانیوں سے گھرا ہوا ہو، جب اس کا دماغ اور جسم مسرت کے ساز سے ہم آہنگ نہ رہا ہو اس وقت وہ ایک آزاد اور شگفتہ راگ کبھی پیدا نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ ایک جوہر قابل ہی کیوں نہ ہو۔

لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ غم، فکر اور تشویش کس سُرعت کے ساتھ انسان کی طاقت کو تباہ کر دیتے ہیں اور ان کا درشت اور بے سرا راگ نغمۂ حیات کو کتنا بے لطف بنا دیتا ہے۔

کتنے ہی لوگ ہیں کہ اس قسم کی باتوں پر جو قابلِ اعتنا بھی نہیں جل جل کر اور کڑھ کڑھ کر اپنے آپ کو بالکل بیکار کر لیتے ہیں کتنے ہی لوگ ہیں جو اپنی گرم مزاجی، پیچ بینی، اپنی بدانتظامی اور اسی قسم کے سینکڑوں طریقوں سے اپنی قوت حیات کو جلا ڈالتے ہیں۔ حالانکہ ان کی تھوڑی سی توجہ سے وہ نازک انسانی ساز جسے وہ بجا رہے ہیں ان کے تمام تاسف کو زائل کر کے بہترین

موسیقی پیدا کر سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس سرمایہ میں سے جو اس نے سالہا سال میں کسی تجارتی غرض کے لئے جمع کیا تھا تھوڑا تھوڑا نکال کر گلچھرے اڑاتا رہے، تو ہم اُسے نہایت ہی بیوقوف خیال کریں گے۔ اور ہم کہہ دیں گے کہ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم میں سے بہت لوگ ہیں جو کامیابی اور مسرت کے سرمایہ کو اسی بے وقوفانہ انداز سے ضائع کرتے ہیں۔ کیونکہ غم و تاسف کا ہر لمحہ ہماری زندگی میں سے کامیابی کو خارج کرتا رہتا ہے۔ ہم اپنی طاقت سے بیک وقت دو کام کبھی نہیں لے سکتے۔ اگر ہم اُسے غم اور افسوس میں صرف کرنا شروع کر دیں۔ تو ہم اس سے کوئی موثر کام نہیں لے سکتے۔

مسرت ہی سازِ زندگی کا نغمہ ہے۔ اور جسم کا ہر عضل اور ہر عصب اس نغمہ سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ جس طرح ایک پیانو بجانے والا پیانو کی آواز کا خفیف سے خفیف نقص بھی رفع کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی جسے کامیابی حاصل کرنی ہے۔ غم، غصے، نفرت، حسد اور فکر کی بے سری گتیں اپنے سازِ حیات سے نکال دیتا ہے۔ جس طرح ایک بہت بڑا موسیقی دان جسے کسی مجمع میں اپنے فن کا اظہار کرنا ہو وقت سے بہت پہلے اپنے ساز کے سروں کو بالکل درست کر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی کام شروع کرنے سے پہلے اپنے سازِ حیات کے تمام نقائص دور کر لیتا ہے۔

غرض مستقبل کے متعلق تمام حزن و ملال۔ تمام غم و غصہ اور سازِ حیات کو بگاڑ دینے والے تمام جذبات اس سے پہلے محو ہو جانے چاہئیں کہ اس میں سے روح پرور نغمے نکلیں اور حیات آفرین موسیقی پیدا ہو۔ ہماری تخلیق سے صانعِ ازل کا یہی ایک مقصد تھا۔

ماڈرن   منصور احمد

غزل

دلِ آگاہ عابدؔ میرے مرنے کی نشانی ہے
جسے نیرنگِ ہستی میں جنونِ رازدانی ہے

فروغِ خوں فشانی ہے بہارِ گُل چکانی ہے
محبت فتنہ زارِ حسن کی رنگیں کہانی ہے

تمہارے رنگ کی تنویر موجِ ارغوانی ہے
تمہارے حُسن کی تصویر خوابِ شادمانی ہے

ابھی کچھ سیر باقی ہے سرابِ کامرانی کی
ابھی ان کے تغافل پر گمانِ مہربانی ہے

میرے کام و دہن آلودۂ زہرِ محبت ہیں
شرابِ تلخ کیا شے ہے شرابِ تلخ پانی ہے

محبت سے دیارِ حُسن میں اک شمع روشن ہے
محبت سے فضائے دل طرب زارِ جوانی ہے

اسی مینا میں نزہت ہے سرورِ جاودانی کی
کہا کس نے کہ حسنِ رنگ و نقشِ فانی ہے

نیازِ عشق اُن کی مہربانی پر نہ اترائے
کہ اُن کے حسنِ بے پروا کو خوئے سرگرانی ہے

زباں کھولے تو مجبورِ جنونِ عشق کہلائے
دلِ مایوس اچھا ہے کہ محوِ بے زبانی ہے

یُونہی سینے میں میرے آگ سی اک لگ اُٹھی عابدؔ
بلائے عشق ہیں شانِ بلائے ناگہانی ہے

سیّد عابد علی عابدؔ

تیلی راجہ

ہمارے حیدرآباد میں تیلی راجاؤں کی کمی نہیں۔ شہر کے قدیم محلے ان سے آباد ہیں "پرانا پل" "بیگم بازار" "چندرائی گنہ اور رُسیدہ باغ" میں ان کے "ایوانِ بکنگھم" ہیں۔ ہمارے راجہ کی بھی بڑے مزے کی زندگی ہوتی ہے۔ صبح ہوئی اور راجہ اپنا خاص لباس پہن کر شہر کے دورے کے لئے روانہ ہوتے۔ ان کا لباس عموماً ایک وضع کا نہیں ہوتا جیسا کہ ہونا چاہئے۔ بعض تو کوٹ دھوتی اور شملہ کو کافی سمجھتے ہیں۔ اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی رعیت کچھ زیادہ نہیں۔ بعضوں کے پاس گلے میں کوڑیوں کا مالا اور کلائی میں چاندی کا کڑا ہوتا ہے۔ ان کی رعیت زیادہ ہے۔ لباس میں کچھ فرق اور نیرنگی سہی لیکن اُن کی چال تقریب قریب سب کی ایک ہوتی ہے۔ یعنی یہ لوگ نہایت پھونک پھونک کر اور سنبھل سنبھل کے قدم رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ چال میں جلدی اور سراسیمگی کا اظہار راجاؤں کی شان کے بالکل خلاف ہے اور ممکن ہے یہ بھی ہو کہ اگر کوئی شخص ان کا درشن کرنا چاہے تو آسانی سے کر لے۔ کسی کو سرفراز کر دینا اور کسی کو شکستہ حال بنا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن شکستہ حال بنانے کی نوبت بہت کم آتی ہے۔ اور آتی بھی ہے تو اُن پر آتی ہے جو ان کی خیرخواہ رعیت ہیں۔ اُن کی صدا ہمیشہ سرفرازی کے مخصوص الفاظ اور مخصوص لہجے میں بلند ہوتی ہے "بھول بالا (بول بالا) ہوتا ہے۔ فتح بازی ہوتی ہے۔ دلدّر دور ہوتے ہیں" کی آواز پر سمجھ جائیے کہ ہمارے تیلی راجہ گشت لگا رہے ہیں۔ بازاروں اور شاہراہوں پر تیلی راجا ایک یا دو صداؤں سے زیادہ صدائیں لگانا اپنی سبکی اور بے وقری سمجھتے ہیں۔ تنگ گلیوں اور چھوٹے محلوں میں بہت کھلتے ہیں اور قدم قدم پر "بھول بالا ہوتا ہے سرفرازی ہوتی ہے" کی آواز سے غریب گلیوں کے رہنے والوں کو سرفرازی بخشی جاتی ہے۔ یہ معتقدین کی خوش اعتقادی پر منحصر ہے کہ انہیں کتنا نذرانہ دیا جائے! مگر جب کوئی اللہ کا بندہ ان کو گھٹ گیا تو پھر انہیں اس روز کے گزارے کے لئے یقینی مل گیا۔ آپ ایک تیلی راجہ کو بلائیے تو وہ آپ کی طرف غور سے دیکھے گا کہ یہ بلاوا کس قسم کا ہے۔ خوش اعتقادی کا ہے یا خوش مذاقی کا یا "خوش دہولی" کا۔ اگر بلاوا پہلی صورت پر مبنی ہے۔ تو وہ اس طرح آئے گا جس طرح کوئی بڑا نجومی، جوتشی پنڈت اور گیانی آتے۔ آنے کے بعد آپ کے سامنے اپنی پوتھی پیش کرے گا۔ یہ پوتھی چھ انچ لمبی اور دو انچ چوڑی آٹھ دس موٹے پرانے ورقوں کی ایک بیاض ہوگی جس میں چند اشکال اور زائچے اور کچھ تلنگی حروف آپ کو نظر آئیں گے آپ کو ایک پیسہ اس پوتھی کے بند ورقوں پر کسی حصے میں رکھنا پڑے گا۔ اس پر وہ ان صفحوں میں سے اپنی پوتھی کھولے گا جن پر پیسہ

رکھا گیا ہے۔ اور پھر آپ کا نام دریافت کریگا اور آپ کی صورت دیکھتے ہوئے ان خاص الفاظ کو دہرائے گا جو اباً عن بعدٍ اس کی میراث میں آرہے ہیں۔ الفاظ قریب قریب یہ ہونگے "آپ کا ستارہ زحل ساتواں مشتری پانچواں ہے۔ اڑان ہرن کی عقل کوے کی قدم تانبے کا ہے۔ ایک سفر اس طرف (رخ بتا کے) عنقریب ہونے والا ہے۔ مگر اپنے ہاتھ کی لکڑی پاؤں کا جوتہ پہننے کا لباس کسی کو نہ دینا، اور منگل کو بھولے سے ناخن نہ نکالنا۔ ایک بلا گزر گئی، ابھی ایک بلا ہور زاور ہے۔ اس کے ٹونکے (ٹوٹکے) کے لئے سوا روپیہ اور اڑھائی سیر چاول دیں تو میں ایک چیز دوں گا" (یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ٹوٹکے کا موازنہ آپ کی ظاہری حالت آپ کے کپڑوں وغیرہ پر کیا جاتا ہے۔ ہمارے تیلی راجہ بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔ کبھی اڑھائی سیر چاول اور سوا روپیہ ہے۔ تو کبھی اڑھائی پاؤ چاول اور پانچ آنے۔ اور بعض وقت تو اس سے بھی کم۔ کبھی آپ کا قدم تانبے کا، کبھی چاندی کا اور کبھی سونے کا ہے گا۔ اڑان کبھی ہرن کی تو کبھی شیر کی، کبھی چیتے کی تو کبھی گھوڑے کی اور شاید کبھی گدھے کی۔ عقل کبھی کوے کی اور کبھی کوتے کی اور کبھی شاید چوہے کی بھی ہو جائے۔ ستارے تو عموماً زحل اور مشتری رہیں گے۔ مگر بعض جہاندیدہ راجاؤں کے پاس ممکن ہے کچھ اور ستارے اضافہ ہو جائیں) اگر آپ اللہ کے پورے ہیں اور "ٹوٹکے" کی تکمیل ہو جائے تو آپ کو ایک گنڈا اس حکم کے ساتھ دیا جائیگا کہ اس کو حفاظت سے گلے میں ڈال کے یا بازو پر باندھ کر رکھو۔ جاہل اور گنوار عورتوں کے ساتھ تیلی راجہ کا منتر خوب چلتا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ عورت کیسی اور کس حال میں ہے۔ خوش وخرم ہے یا ناشاد ومغموم ہے۔ اگر خوش ہے اور مردوالی ہے (مردوالی کے لئے زیادہ تاڑنے کی ضرورت نہیں گلے کا لچھا خود نشان دہی کر دیتا ہے) تو ساس نند کی طرف سے دو چار باتیں انٹ سنٹ لگائیں گے۔ کہ ساس بیٹے کی محبت اپنی طرف ہونے کے لئے جادو ٹونہ کر رہی ہے اور اگر ناشاد ومغموم ہے تو ضرور کسی دوسری عورت پر مرد کی نظر ہے مرد کو قابو میں لانے کے لئے ایک چیز دی جائیگی جس کے لئے برنج ومبلغ علیہ السلام کا معاوضہ طلب کیا جائیگا۔

دوسری صورت ہم نے خوش مذاقی کی فرض کی تھی۔ اگر اس کو محض تفنن طبع کے لئے بلایا ہے۔ تو آئے گا مگر کسی قدر جھجکتے ہوئے۔ امید تو رہے گی کہ پیسہ معمول کا کہیں نہ جائے گا۔ دو تین فقرے کئے وہ آپ سے پنڈ چھڑانے کی کوشش کرے گا۔

"خوش دہوئی" میں سوائے اس کے کہ دم دبا کے باقاعدہ پسپائی کے ساتھ اپنا راستہ لے اس کے لئے کوئی دوسری صورت نہیں۔

سات روز میں ایک روز بارہ مہینے میں ایک مہینہ اس کے لئے بڑا مبارک ہے۔ ہفتہ کو کہیں لے صدقہ کا تیل اور ماش کی دال مل جاتی ہے۔ اور صفر کا مہینہ خصوصاً ابتدائی تیرہ دن اور تیرہویں تاریخ اس کے لئے عید کا دن ہے۔ یہ

کس لئے ؟ یہ اس لئے کہ توہم پرست مسلمان ان دنوں میں اپنے سرہانے صدقۃً از قسم ماش، تیل اور انڈے رکھتے اور تیلی راجہ کو دیتے ہیں۔ تیرہویں تاریخ شہر کے ہر محلے میں تمام دن تیلی راجاؤں کی کان پڑی آوازیں آتی رہیں گی۔ کہ آج "تیرہ تیزی کا روز ہے۔ بلائیں دور ہوتے ہیں۔ مقدر جاگتا ہے۔ تقدیر کی سرفرازی ہوتی ہے" بعض بعض گھروں میں ہدایت یہ کی جاتی ہے کہ صبح اُٹھتے وقت اپنے سرہانے تیل کی کٹوری میں اپنی صورت دیکھنا اور اس میں تھوکنا۔ بھلا تھوک صبح کو کہاں سے آئے۔ بڑی مشکلوں سے تھوک جمع کرکے یا بلغم ہی کھنکار کر تھوک دیا جاتا ہے۔ یہ سب تیل تیلی راجہ اپنی پتیلی لٹیا میں جمع کرتے اور اسے بنیے کی دوکان میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اور پھر یہی تیل کھانے کے لئے بنیے کی دوکان سے گھروں میں آتا ہے۔

تیلی راجہ کا بیان ہو چکا اب "جوتشی بامن" کا حال بھی سُن لیجئے۔ یہ گھر گھر ہانک لگاتے ہوئے۔ مقدر کی سرفرازی دیتے ہوئے نہیں پھرتا بلکہ بازار کے گوشے میں اپنا رومال بچھا کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اس کے سامنے تلنگی کی چار پانچ کتابیں پڑی ہونگی۔ جو شاید نجوم کے متعلق ہوں تو ہوں - اس کی آمدنی خوش اعتقادوں کی آمد پر موقوف ہے۔ مگر یہ اُن سے خوب سمیٹتا ہے۔ فقط

شیدا محمد۔ حیدرآبادی

یادِ الست

نمک داں ہیں وہاں کیا کیا نمک پاشی کے ساماں ہیں
یہاں فرطِ تشکر سے مرے سب زخم خنداں ہیں

نہیں منظور مطلع صاف رکھنا دل کی دنیا کا
کہ مژگاں ابرِ غم کے فیض ہی سے گل بداماں ہیں

یہ روحیں ہیں کہ صحرائے حوادث کے بگولے ہیں
غم و رنج و محن کے ہیں ہیولے یا کہ انساں ہیں

سراپا میرا روحِ مضطرب کا قید خانہ ہے
مری آنکھیں نہیں یہ روزنِ دیوارِ زنداں ہیں

نہ چھوٹے گی بساطِ غم نہ دامانِ وفا مجھ سے
یہی ہیں حاصلِ ہستی یہی اجزائے ایماں ہیں

نہ دیکھی مجھ میں قدرت درد کا طوفاں چھپانے کی
مرے زخم جگر کم مایگی پر میری خنداں ہیں

فروزاں ہے یہ کس کے عشق میں خورشید کا سینہ
شعاعِ مہرِ تاباں کس کے آگے خس بدنداں ہیں

یہ کس کے واسطے کالی گھٹا اُٹھ اُٹھ کے آتی ہے
یہ غم کی بجلیاں کیوں ابر کے سینہ میں پنہاں ہیں

یہ کس کی راہ میں نرگس نے یوں آنکھیں بچھائی ہیں
یہ کس کے واسطے صحرا و گلشن لالہ ساماں ہیں

لکھا تم نے دمِ تحریر کیسی روشنائی سے
مٹے سب حرف ہاں کچھ کچھ حروفِ لا نمایاں ہیں

ح - ب

انکار

(۱)

پھاگن کے مہینے کا آغاز تھا۔ اور چودھویں رات کا چاند۔ بہار کے جھونکوں میں آم کی خوشبو آتی تھی۔ تالاب کے کنارے پرانے لیچی کے درخت میں نظر سے اوجھل پپیہا بول رہا تھا۔ اور اس کی رس بھری آواز ایک ایسے کمرہ میں جا رہی تھی، جہاں نیند مفقود تھی۔ ہمنتا اپنی بیوی کے بال آہستہ آہستہ اپنی انگلی پر لپیٹ رہا تھا پھر اس کی کلائی کی چوڑیوں کو جھنکارتا تھا۔ اور کبھی اس کے مالا سے پھول لیکر اس کے منہ پر چھوڑ دیتا تھا۔ اس کی یہ چہلیں ایسی تھیں، جیسے شام کو بادِ بہاری پھولوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہے۔

کسم ساکت و صامت تھی، مگر کھلے ہوئے دریچے سے اس کی نظر چاند کی سیمیں روشنی پر پڑ رہی تھی۔ اور اس کے شوہر کا یہ اظہارِ محبت بالکل بے سود اور فضول ثابت ہو رہا تھا۔ آخر کار ہمنتا نے اپنی بیوی کے دونوں ہاتھوں کو ملا کر کہا

"کسم تم کہاں ہو؟ مجھے تو گمان ہو رہا ہے کہ اس وقت اگر بڑی سے بڑی دوربین بھی اٹھا کر دیکھا جائے تو شاید تم ایک دھبہ کی مانند کہیں نظر آؤ گی۔ آخر یہ اجتناب کیوں ہے؟ پیاری! میرے قریب آؤ! دیکھو رات کتنی سہانی اور کیف بار ہے"

کسم نے کھلے میدان سے اپنی نظریں اٹھا کر شوہر کو نرم لہجہ میں کہا:۔

"میں ایک ایسا منتر بھی جانتی ہوں، جس کے پڑھنے سے بہار کی یہ دلچسپیاں اور چاند یہ ضیا پاشیاں ایک لمحہ میں ختم ہو کر رہ جائیں"

ہمنتا نے ہنس کر کہا:۔

"اگر تم واقعی اس قسم کا کوئی منتر جانتی ہو تو خدارا اُسے نہ پڑھنا۔ ہاں، اگر کوئی اس قسم کا منتر جانتی ہو جس کے پڑھنے سے یہ رات ختم ہی نہ ہو۔ تو ضرور پڑھو"

یہ کہہ کر اس نے کسم کو اپنی آغوش میں لینا چاہا، مگر کسم اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی اور کہا:۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج میں اپنا وہ راز تمہیں بتانا چاہتی ہوں جسے شاید میں مرتے دم بسترِ مرگ پر افشا کرتی تم مجھے اس کی جو سزا بھی دو میں برداشت کر لوں گی!"

ہمنتا نے دیو کا ایک شعر پڑھ کر کُسم کی باتوں کو ہنسی میں ٹالنا چاہتا تھا کہ معًا پاؤں کی آہٹ کانوں میں سنائی دی۔ یہ اس کے باپ ہری ہر کرجی کے قدموں کی چاپ تھی۔ جس سے اس کے کان اچھی طرح مانوس تھے۔

ہری ہر کرجی کی اس بے وقت آمد نے ہمنتا کے ہوش وحواس باختہ کر دیئے۔ اُس نے دروازے سے باہر کھڑے ہو کر کہا

"ہمنتا! ـــــــ اپنی بیوی کو فوراً گھر سے نکال دے"۔

ہمنتا نے اپنی بیوی کے چہرے پر نظر ڈالی، مگر کسم اس حکم کو سُن کر کچھ زیادہ پریشان نہ ہوئی۔ صرف ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ کاش! مجھے موت آجائے اور میرا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

پپیہا اب بھی نغمہ سرا تھا مگر اس کی آواز کوئی نہ سنتا تھا۔

آہ ـــــ دنیا میں گوناگوں نیرنگیاں اور دلچسپیاں ہیں، مگر انسان اُن سے کس قدر جلد منہ پھیر لیتا اور ان کی شکل وصورت کو کس آسانی سے بگاڑ دیتا ہے"۔

(۲)

ہمنتا نے باہر سے واپس آکر کہا "کیا یہ سچ ہے؟"

کُسم نے جواب دیا "ہاں"

ہمنتا نے کہا "لیکن ـــــــ تم نے آج تک مجھے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا"۔

کُسم نے جواب دیا "میں نے بارہا یہ کوشش کی ہے کہ آپ سے کہوں، مگر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آہ میں بڑی بدبخت ہوں"۔

ہمنتا نے کہا۔ اب مجھے صاف صاف بتاؤ۔

کُسم نے نہایت استقلال کے ساتھ اپنی داستانِ غم کہنی شروع کی۔ یقیناً وہ آگ کے فرش پر اپنے غیر متزلزل قدموں کے ساتھ چل رہی تھی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اُسے کس قدر اذیت ہوئی!

ہمنتا یہ بیتا سُن کر باہر چلا گیا۔ کُسم نے خیال کیا کہ اب وہ پھر کبھی اس کے پاس نہ آئے گا۔ وہ اس سے کچھ زیادہ متحیّر نہ ہوئی۔ کیونکہ پچھلے چند لمحات سے اس کا دل اس قدر سخت ہو گیا تھا کہ اس حادثہ کو اس نے زندگی کا ایک معمولی واقعہ تصوّر کیا۔

اس دنیا اور محبت دونوں کی کہانی اول سے لیکر آخر تک اُسے بے حقیقت معلوم ہونے لگی۔ اس کے شوہر کے تمام وہ قول وقرار جو اس نے پچھلے چند دنوں میں کئے تھے اس کے منہ پر زہر خند لاتے تھے اور چھری بن کر

کلیجے کے پار ہو جاتے تھے۔ وہ خیال کرنے لگی:۔

"کیا وہ محبت جس نے زندگی کو اس قدر رنگین اور کیف انگیز بنا دیا تھا اور اپنے ساتھ اس قدر چاہ لائی تھی کہ لمحہ بھر کی فرقت عذاب جان اور لحظہ بھر کا وصال حیات افروز ہوتا تھا۔ اس کی یہ ابدی اور غیر تناہی کیفیتیں محض بے حقیقت اور خواب و خیال تھیں؟ کیا ـــــــ وہ اس قدر کمزور ہے کہ مذہبیت کی ذرا سی ٹھوکر اسکی "ابدیت" کو ضائع کر دے گی؟

ابھی ابھی ہمنتا نے اس سے کیا کہا تھا؟ رات کس قدر سہانی اور کیف بار ہے، وہی رات اب بھی موجود ہے۔ وہی پپیہا اب بھی بول رہا ہے، وہی ہوا اب بھی چل رہی ہے، چاندنی اب بھی ویسے ہی چھٹکی ہوئی ہے کیا یہ سب کچھ بے حقیقت تھا؟

اس نے محسوس کیا کہ محبّت اس سے بھی بڑھ کر فریب کار ہے۔

(۳)

دوسری صبح کو رات کے جاگنے سے تھکا ماندہ ہمنتا اٹھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ سیدھا پیارے شنکر گوسال کے مکان پر گیا۔

پیارے شنکر نے پُوچھا "کیوں بھائی خیریت تو ہے نا؟"

ہمنتا آگ کے شعلے کی مانند بھڑک اٹھا مگر پھر سنبھل کر آہستگی سے کہا:۔

"تم نے ہماری ذات کو بٹہ لگایا ہے۔ اور ہم پر یہ تباہی تمہاری ہی لائی ہوئی ہے۔ تم ہی اس کے ذمہ دار ہو" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی اور وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

پیارے شنکر نے شماتت سے جواب دیا۔ "اور کیا تم نے مجھے ذات اور برادری میں رہنے دیا ہے ـــــــ تم نے میرے ساتھ کیا بھلائی کی ہے؟

ہمنتا چاہتا تھا کہ میرے برہمنی غصے کی آگ پیارے شنکر کو جلا کر راکھ کر دے، مگر یہ آگ خود اُسے جلا رہی تھی پیارے شنکر آرام سے اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

ہمنتا نے کہا "کیا میرے ہاتھوں تمہیں کوئی گزند پہنچا ہے؟" اور اس کی آواز ہکلانے لگی۔

پیارے شنکر نے پھر اسی انداز میں جواب دیا "میری اکلوتی لڑکی نے تمہارے باپ کا کیا بگاڑا تھا؟ ـــــــ ہمنتا اس وقت تم بچّے تھے، شاید تم نے یہ کہانی سنی بھی نہ ہو۔ مجھ سے سنو اور پھر بتاؤ کہ اس ناگوار واقعے کا کون ذمہ دار

ہے ۔۔۔۔۔ ؟" پیارے شنکر سنبھل کر بیٹھ گیا اور کہا۔

"تم ابھی بہت چھوٹے تھے کہ میری لڑکی کا خاوند نب کا نتا اُس کے جواہر چُرا کر ولایت بھاگ گیا، اور شاید تمہیں وہ افراتفری یاد بھی ہو جو اس کے آنے کے بعد تمہاری بستی میں ہوئی ۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم کلکتہ سکول میں ہونے کے سبب اس واقعے سے بے خبر ہو ۔ تمہارے والد نے مغرورانہ انداز سے اعلان کیا کہ اگر میں اپنی لڑکی کو اس کے خاوند کے گھر بھیجوں تو ہمیشہ کے لئے اُسے الوداع کہوں۔

میں تمہارے والد کے پاؤں پڑا منتیں کیں اور کہا کہ بھائی خدارا اِسے مجھے بچا لو۔ میں لڑکے کو گائے کا گوبر کھلا دوں گا اور پر اسچت کرنے کی رسم ادا کر دوں گا ۔ اِسے اپنی ذات برادری میں واپس لے لو۔ مگر تمہارا باپ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ میں اپنی اکلوتی بیٹی سے تعلقات کا رشتہ کسی طرح نہیں توڑ سکتا تھا۔ آخر میں نے اس کی نسبت دوسری جگہ ٹھیرائی اور جب شادی میں چند دن رہ گئے تو تمہارے والد نے لڑکی والوں کو بھڑکایا اور یہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا ۔ وہیں میں نے قسم کھائی کہ اگر میں براہمن زادہ ہُوں اور میری رگوں میں برہمنی خون موجود ہے تو ضرور اس کا بدلہ لوں گا ۔ پیارے شنکر نے پھر کھِسں کر کہا کہ اب تم سمجھے اصل معاملہ یہ ہے مگر ۔۔۔۔۔ ٹھیرو میں اکبار تمہیں سارا قصہ سنا لوں ۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا :-

"جب تم کالج میں پڑھتے تھے ۔ ہیرداس چیٹرجی تمہارے ساتھ والے مکان میں رہتے تھے ۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ۔ لیکن ان کے گھر میں ایک بیوہ لڑکی رہا کرتی تھی، جس کا نام کُسم تھا ۔ یہ ایک کھتری خاندان کی بدنصیب اور راندۂ روزگار لڑکی تھی ۔ لڑکی نہایت ہی حسین اور صاحب جمال تھی ۔ چیٹرجی نے چاہا کہ کالج کے طالب علموں کی پیاسی اور للچائی ہُوئی نظروں سے اُسے پوشیدہ رکھیں ۔ لیکن ایک نوجوان لڑکی ایک بوڑھے کو بڑی آسانی سے دھوکا دے سکتی ہے ۔ اور وہ اکثر اپنے گیلے کپڑے کوٹھے پر سکھانے کی غرض سے لے جاتی تھی ۔ ادھر تم نے اپنے کوٹھے ہی کو مطالعے کے لئے موزوں جگہ سمجھا ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہیں اپنے اپنے کوٹھوں پر ایک دوسرے سے بولنے چالنے کا اتفاق بھی ہوا یا نہیں ۔ مگر لڑکی کی حرکات وسکنات سے چیٹرجی کے دل میں کئی قسم کے شکوک گزرے ۔ واقعہ یہ ہے کہ لڑکی اکثر گھر کے کام کو نظر انداز کرنے لگی ۔ اور محبت کی محویت میں اس کی نیند اچاٹ اور قرار مفقود ہو گیا ۔ اور بسا اوقات شام کے وقت بے اختیار رونے بھی لگ جاتی تھی ۔

آخر چیٹرجی کو تمہاری ملاقاتوں کا پتہ چل گیا ۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تم اکثر کالج سے غیر حاضر کوٹھے پر تنہا مطالعہ میں مصروف رہتے ہو ۔ انہوں نے یہ سارا ماجرا بیان کر کے مجھ سے اپنا مشورہ طلب کیا ۔

میں نے جواب دیا کہ چچا جی آپ کی دیرینہ آرزو ہے کہ آپ ہردوار جائیں - بہتر ہوگا اگر آپ اس طرف چلے جائیں اور لڑکی کو میرے سپرد کر جائیں - میں اس کی پوری پوری نگہداشت کروں گا - وہ چلے گئے اور میں لڑکی کو سری پتی کے گھر سے آیا - اس نے لڑکی کا والد بننا منظور کر لیا - اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے تم ناواقف نہیں ہو - مجھے آج بہت ہی تسکین ہوئی - کہ میں نے یہ تمام باتیں تم سے کہہ ڈالی ہیں - مجھے تو یہ ایک اچھا خاصہ ناول معلوم ہوتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اُسے مرتب کر کے شائع کر دوں لیکن بدقسمتی سے لکھنا نہیں جانتا - کہتے ہیں کہ میرا بھتیجا مضمون نگار ہے - اُسے لکھنے کے لئے آمادہ کروں گا، مگر آپ بھی اس کا ہاتھ بٹائیں - کیونکہ قصے کا آخری حصہ آپ سے متعلق ہے -

ہمنتا نے اس کی آخری ظالمانہ چوٹ پر التفات نہ کیا، اور کہا "تم نے اس شادی پر کیوں نہ اعتراض کیا؟"

پیارے شنکر نے کہا "اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے - تم عورت کی فطرت کو سمجھتے ہو - اس کی نفی اثبات کی مترادف ہوتی ہے - جب ہم نے مصلحتاً اپنا گھر بدل لیا، تو آتش فراق سے وہ جلنے لگی اور چند دن میں سڑی اور دیوانی سی ہو گئی - آخر تم نے ہمارے گھر کا بھی پتہ نکال لیا - کیونکہ کالج کی واپسی پر میں تمہیں اکثر سر یہ اسکے گھر کے آگے ٹہلتا ہوا دیکھا کرتا تھا - تمہاری نظریں کتابوں اور کالج سے ہٹ کر اس بند کھڑکیوں والے گھر میں داخل ہونا چاہتی تھیں - بخدا میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کا بہت افسوس اور رنج ہوا - تمہاری پڑھائی میں ہرج ہو رہا تھا اور ادھر لڑکی کی حالت بھی سنبھالے نہ سنبھلتی تھی - ایک دن میں نے کسم کو بلا کر کہا - "بیٹی! میں بوڑھا ہوں، مجھ سے شرم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جس کو تم چاہتی ہو وہ میرا آشنا ہے - اس کی حالت بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی - میری دلی خواہش ہے کہ تمہارا ملاپ ہو جائے!"

یہ سن کر کسم بے اختیار رونے لگی اور پھر اُٹھ کر چلی گئی -

پھر میں اکثر اس کو بلاتا اور اس سے اس رشتے کے متعلق بحث کرتا رہا - حتی کہ وہ مجھ سے کھل گئی اور اس کی وہ شرمیلی جھجھک بھی جاتی رہی - آخر ایک دن میں نے کہا کہ میں ضرور تمہاری شادی کرا دوں گا -

اس پر اس نے کہا "وہ کس طرح؟"

میں نے جواب دیا "تمہیں اس کی فکر نہ ہونی چاہئے - میں اُن سے کہوں گا کہ کسم برہمن زادی ہے"

کسم نے کہا "لیکن واقعات کو کون جھٹلا سکتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "لڑکا دیوانہ ہو رہا ہے - اس دیوانگی میں وہ حسب و نسب پوچھنے کا بھول کر بھی خیال

نہ کرے گا۔ شادی ہو لینے دو، سب معاملات سلجھ جائیں گے جب راز کے افشا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ تو پھر خواہ مخواہ اس تردد سے کیا حاصل ہے؟"

مجھے معلوم نہیں کسم کو میرا مشورہ پسند آیا یا نہ مگر مجھے یہ تو خوب یاد ہے کہ وہ کبھی روتی تھی اور کبھی چپ ہو جاتی تھی۔ اور جب یہ کہتا تھا کہ چلو قصہ مختصر اس رشتہ کو ہی جانے دیں تو وہ بے چین سی ہو جاتی تھی۔ آخر میں نے سرسی پتی کو تمہارے پاس بھیجا اور تم نے خوشی کی چھولی ہوئی سانسوں میں یہ رشتہ منظور کر لیا۔ شادی سے تھوڑا عرصہ قبل کسم نے پھر ضد کی اور مجھے مشکلوں سے راضی کرنا پڑا۔ وہ کہتی تھی کہ چچا اس رشتے کو آپ جانے دیجئے، مگر میں اسے فوراً جواب دیتا کہ اب تو معاملہ طے ہو چکا ہے۔ اور یہ رشتہ کسی کے بس میں نہیں۔ وہ کہتی کہ مجھے کسی جگہ بھیج دیجئے، اور ان سے کہیئے کہ لڑکی مر گئی ہے۔ پھر میں کہتا کہ لڑکے کا کیا حال ہوگا۔ اب جب کہ وہ انتہائی خوشی میں ہے اور کوئی دن میں اپنی آرزو سے ہم کنار ہونے والا ہے۔ اگر میں اُسے تمہاری موت کی خبر سناؤں گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری صبح کو اس کی موت کی خبر تمہیں سنانی پڑے گی اور شام کو تمہاری موت کی خبر ہمیں سننی پڑے گی۔ کیا تم خیال کرتی ہو کہ میں اس عمر میں ایک برہمن زادے اور ایک لڑکی کی موت کا گناہ اپنی گردن پر لوں گا؟

آخر کار شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی اور مجھے ایک گونہ تسلی بھی ہوئی کہ میرے خود ساختہ ڈرامے کا ایک نہایت اہم باب ختم ہو گیا ہے۔

ہمنتا نے کہا "اتنی بڑی آفت ڈھانے کے بعد کیا تم سے چپ نہ رہا جا سکا۔ اور تم نے یہ راز افشا کیوں کر دیا؟"

اُس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "جب میں نے یہ دیکھا کہ تمہاری بہن کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں تو میں نے خیال کیا کہ ایک برہمن کی ذات کو تو بٹہ لگ چکا ہے۔ خیر وہ تو ایک بدلہ تھا، اب ایک دوسرے برہمن کی حرمت خطرے میں ہے۔ میں نے فرض کے طور پر محسوس کیا کہ یہ رشتہ نہ ہونے پائے تو بہتر ہے۔ اس لئے میں نے لڑکے والوں کو لکھا کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ تم نے ایک شودر کی لڑکی سے نسبت ٹھیرائی ہے۔

ہمنتا نے جی کڑا کر کے پوچھا "اب اس لڑکی کا کیا حال ہوگا۔ کیا اگر میں اسے چھوڑ دوں تو تم اسے پناہ دوگے؟

اس ظالم نے جواب دیا "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اب یہ میرا کام نہیں کہ لوگوں کی مطلقہ بیویوں کو پناہ دیا کروں" پھر اُس نے زور سے پکار کر کہا "ارے کوئی جو ہمنتا بابو کے لئے دودھ کا گلاس اور پان کا بیڑہ لے آئے"

ہمنتا انتظار کئے بغیر اُٹھ کر چلا گیا۔

(۴)

چاند کی پانچویں رات تھی، اور تاریکی چھائی ہوئی تھی پرندے خاموش تھے۔ تالاب کے کنارے لیچی کا درخت

ایک سیاہ دھبے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

اس اندھیرے میں جنوبی ہوا تھم تھم کر چل رہی تھی۔ ستارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ وہ ظلمت کی گہرائیوں میں کوئی عمیق راز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

کمرے میں بھی تاریکی تھی۔ ہمنتا بستر کے کنارے بیٹھا دریچہ سے اندھیرے میں تاک رہا تھا۔ کسم اپنی جبین ناز اس کے قدموں پر جھکائے بیٹھی تھی۔

قسمت نے رات کی پشت پر عورت کی مظلومی کی تصویر ہمیشہ کے لئے کھینچ دی تھی۔ جس میں زچ درمیان میں تھا اور مجرم اس کے قدموں پر پڑی تھی۔

کسی کے چلنے کی آواز آئی اور ہری ہر مکرجی نے پکار کر کہا:-

"تم بہت سا وقت لے چکے ہو، زیادہ مہلت نہیں دی جاسکتی۔ لڑکی کو گھر سے نکال دو۔"

کسم نے جب یہ سُنا تو خاوند کے پاؤں سے لپٹ گئی اور رو فور شوق میں انہیں کئی بار چُوما۔ اور پھر اپنی پیشانی جھکا کر علیحدہ ہو گئی۔

ہمنتا نے باہر نکل کر کہا "پتاجی! مَیں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا"

اس کے باپ نے گرج کر جواب دیا۔ "کیا ذات پات کے بندھن توڑ دوگے؟"

ہمنتا نے مطمئن لہجہ میں کہا "مجھے ذات اور برادری کی پروا نہیں"

مکرجی نے کہا "اور میں بھی تمہیں برادری سے خارج کرتا ہُوں"

(ماخوذ از ٹیگور)

صادق ایوبی

میں کیسی ہی مفلسی کی حالت میں ہُوں۔ لیکن اگر کوئی مجھ کو دنیا کی تمام دولت بھی دے دے تو میں اس کو اپنی بیوی سے نہ بدلوں گا۔

لوتھر

میں اپنی بیوی کی ذکاوت اور فراست پر مغرور ہُوں اور فخر کرتا ہُوں۔ اور میں اپنے آپ کو تمام دنیا میں زیادہ خوش نصیب خیال کرتا ہُوں

ٹینی سن

غزل

قصۂ حسنِ یار کہتے ہیں — داستانِ بہار کہتے ہیں

بات کیا ہے کہ اس تلطف پر — تجھ کو غفلت شعار کہتے ہیں

ہائے اہلِ خرد کی کم نگہی — جبر کو اختیار کہتے ہیں

اک فریبِ نظر ہے کچھ بھی نہیں — لوگ جس کو بہار کہتے ہیں

یا تو کہتے نہ تھے فسانۂ دل — یا مگر بار بار کہتے ہیں

وہ کبھی ملتفت نہیں ہوتے — ہم فسانے ہزار کہتے ہیں

ہم وہ امیدوارِ الفت ہیں — ہجر کو انتظار کہتے ہیں

بادۂ عشق سے ہے مست اکبر
کم نظر میگسار کہتے ہیں

جلال الدین اکبر

خدا کی پادشاہت

(۱)

پندرہ سال کی طویل قید کے بعد جب وہ قید خانے سے باہر نکلا۔ تو بغیر جاننے کے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ سامنے والی سڑک پر ہولیا اور سچ تو یہ ہے کہ وہ جاتا کہاں ؟ خدا کی وسیع دنیا اس کی سفاکیوں کی لرزا دینے والی داستانوں نے اس پر تنگ کر دی تھی۔ اور انسانی آبادیاں اس کی بے باک جسارتوں کے قصوں سے خوف زدہ تھیں۔ پاداش جرم کی محدود اقلیم جسے قانون و آئین کی ہمہ گیری قید خانے کے نام سے پکارتی ہے۔ اور جہاں اس نے اپنی زندگی کا بہترین اور شاید اگر حالات موافق ہوتے تو نہایت ہی کار آمد حصہ گزارا تھا، اس کے نام سے ترساں تھی۔ وہ مختصر سا قصبہ بھی جہاں پینتیس سال گزرے وہ پیدا ہوا تھا۔ اور جہاں ہوش سنبھالتے ہی بدبختی نے اُسے محنت اور مشقت کے حوالے کر کے حیوانوں کی طرح کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی مجرمانہ جراتوں سے خائف تھا۔

آخر آدم کے اس نابکار فرزند کا قصور کیا تھا کہ تمام دنیا اس کے سایہ سے بھی پرے رہنا چاہتی تھی۔ محض یہ کہ اس نے اپنی بیوہ بہن کی یتیم اولاد سے بے حد محبت کی۔ اور معصوموں کو فاقوں کی موت سے بچانے کے لئے چند روٹیاں چرانے کی ناکام کوشش میں پکڑا گیا اور رائج الوقت قانون کی سخت گیریوں نے اُسے کئی سال کے لئے شباب کی آزادیوں سے محروم کر دیا۔ بس یہی اس کا اصلی جرم تھا۔ انسان کے جبر و اختیار نے قید و بند کی مجبوریوں پر ضبط و انتظام کی بے جا سختی عائد کر دی۔ اور اس نے تنگ آ کر دو یا تین بار بھاگ جانا چاہا۔ مگر پہرہ دار کی تیز آنکھوں نے اُسے ہر بار ناکام رکھا۔ اس کی قید کی میعاد ہر بار بڑھا دی گئی اور آخر بدنصیب نوجوان اپنی بے بسی پر ماتم کرتا ہوا مجبور ہو کر رہ گیا۔

اس روز سے کئی سال پہلے کہ روٹیوں والا ناشدنی واقعہ پیش آیا۔ وہ ہر طرح کی مزدوری کر کے روٹی کمایا کرتا تھا۔ آمدنی قلیل تھی۔ مگر وہ قانع تھا۔ اور اس زمانے میں کہ تھوڑی بہت مزدوری میسر آجایا کرتی تھی۔ اس کے معصوم دل میں چوری کا وہم تک بھی نہ گزرتا تھا۔ مگر دنیا کے انتظام میں ایک مفلس مزدور کا کیا دخل۔ ایک سال قدرت نے دنیا کو اپنی سیرابیوں سے محروم کر دیا۔ قحط پڑ گیا اور کام کا ملنا مشکل ہو گیا۔ اُن دنوں جب کہ غریبوں کی زندگی بے قیمت ہو گئی اور بھوک کی ہولناکیوں نے مفلس مخلوق کی ناکارہ جانوں کو کھلونوں کی طرح پامال کر ڈالا۔ تو اپنے لئے نہیں کیونکہ وہ ایماندار تھا۔ بلکہ ننھے بچوں کی خاطر مجبور ہو گیا۔ کہ ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کے لئے چند ایک روٹیاں

اس طریقہ سے حاصل کرے جس کا خیال تک بھی کبھی اُسے نادم کردینے کے لئے کافی تھا۔ دنیا نے ایثار اور محبت کو حقارت سے پرے پھینک دیا۔ گویا ان پاک جذبات کا یہی صلہ تھا۔ قانون کے محافظوں نے اس کی گزشتہ زندگی کی معصومیت کو ناقدری کے پاؤں میں کچل ڈالا۔ گویا وہ اسی لائق تھا۔ اور اس کا دل سخت ہوگیا۔ اتنا سخت کہ اب نیکی کا اس میں راہ پانا ہی ناممکن تھا۔

وہ بڑا بدقسمت تھا۔ ماں کی محبت اور باپ کی شفقت سے ابھی چھ برس ہی کا تھا کہ محروم ہوگیا۔ بہن نے ترس کھایا۔ کیونکہ اور کوئی تھا ہی نہیں۔ خدا کی مرضی وہ خاوند کھو بیٹھی۔ اس لئے غریب کو اس عمر میں جو کھیل کود کی رونقوں سے معمور ہوتی ہے۔ اپنی اور اپنے رشتہ داروں کی بے کار زندگیوں کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی جسکا انجام اُف اس کے لئے کس قدر اندوہناک تھا۔ اور دنیا کے لئے کس قدر عبرت ناک۔

(۲)

ہاں تو وہ بغیر کسی ارادے کے ایک طرف چل پڑا۔ صرف ایک ٹھکانا اس کے خیال میں آسکتا تھا۔ اور وہ اس کی بہن کا گھر تھا۔ مگر وہاں وہ کس کے پاس جاتا۔ کیونکہ وہ سُن چکا تھا کہ غریب بیوہ ماں اور اس کے یتیم بچے فاقوں سے جانبر نہ ہوسکے تھے۔ پھر بھی دنیا ویسی ہی آباد اور بارونق تھی جیسی اس روز سے پندرہ سال پہلے۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ قدرت کے کارخانے میں ناکامیوں کی چیخیں اور کامیابیوں کے قہقہے یکساں ہیں۔ اور بزم جہاں کی آبادی آہوں کی تلخی اور آنسوؤں کی گرمی سے یکسر مستغنی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی شہرت اس سے پہلے پہنچ چکی ہے۔ کیونکہ ہر رہرو دہشت سے اس کی طرف دیکھتا اور کترا کر نکل جاتا تھا اس پر وہ دل ہی دل میں برہم ہوتا تھا۔ اس کی پیشانی غصّہ اور نفرت کی شکنوں سے سکڑ جاتی تھی۔ اور وہ دمبدم نیکی کی لطافتوں سے پرے ہٹتا چلا جاتا تھا۔ آخر اس نے دنیا کا کیا بگاڑا تھا کہ اس کے لئے اس کی غمگین دھڑکنوں میں صرف تلخی ہی تلخی باقی رہ گئی تھی۔

راستے میں وہ ایک پڑاو پر کچھ دیر سستانے کے لئے ٹھہرنا چاہتا تھا۔ مگر سرکاری پہرہ دار نے یہ کہہ کر اُسے دھتکار دیا۔ کہ یہ جگہ چوروں کے لئے نہیں ہے۔ اُسے غصّہ تو بہت آیا مگر قانون کے نمائندے سے الجھنا مناسب نہ سمجھ کر وہ بڑبڑاتا ہُوا چلا گیا۔ انسان کے بیدردانہ سلوک نے اُسے خالق اور مخلوق دونوں سے بیزار کردیا۔ اور اس نے ٹھان لی کہ عمر عزیز کی باقی ماندہ فرصتوں کو اپنے ہم جنسوں کی دل آزاری کے لئے وقف کرے گا۔ بدبخت انسان کے سامنے دو راہیں تھیں۔ اور قید و بند کی پرآشوب آزمائش کے بعد اگر وہ چاہتا تو اپنی مطعون زندگی کی ناکارہ گھڑیاں کسی گمنام گوشہ میں گزار دیتا،

مگر جذبۂ انتقام نے اُسے گمراہیوں میں ڈال دیا۔ اور اس خیال نے کہ انسانی آبادیاں اُسے رد کر چکیں۔ اُسے روزمرہ کے معمولی اخلاق سے باغی بنا دیا۔ اور وہ چاہنے لگا کہ اپنی ناپاک خواہشوں کو جلد سے جلد پورا کرے۔

سرِراہ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں ایک چشمہ تھا جہاں ایک نوجوان چرواہا فانی دنیا کی امن سوز جدوجہد سے بےفکر بیٹھا گا رہا تھا۔ ٹھنڈے اور شیریں پانی اپنی نغمہ زا دلفریبیوں سے پیاسے اور تھکے ہوئے مسافروں کو آرام کی دعوت دے رہے تھے۔ اس نے غصہ اور انتقام کے جوش میں نہ تو اب تک تکان محسوس کی تھی اور نہ ہی بھوک اور پیاس مگر گھنے سایہ دار درختوں کی دلکشی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور وہ اسی ناگوار کیفیت میں کہ اس کی فراخ اور کشادہ پیشانی بیزاری کے شکنوں سے تنگ تھی۔ اور آنکھیں غمگین خیالات کا مرقع بنی ہوئی تھیں۔ اس جانب لپکا۔ ہوا خوشگوار تھی چشمہ کی دلکش روانیاں اطمینان اور یک سوئی کا پیغام دے رہی تھیں۔ اس پر چرواہے کا سکون افزا گیت ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ دنیا جس کی بے اعتنائیوں نے اُسے انسانیت کے شریف اوصاف سے محروم کر دیا تھا۔ محبت اور پیار کی رنگینیوں سے معمور ہے۔ اب اس کے ماتھے کے بل ایک ایک کر کے اتر رہے تھے اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی افسردگی تسکین کے نور میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا موٹا سا ڈنڈا اور تھیلہ کہ یہی اس کی کل کائنات تھی۔ آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ گویا وہ سکون کی اس مختصر سی فضا میں جسے چرواہے نے اپنی آزاد موسیقیت سے پیدا کیا تھا خلل انداز نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اور بیٹھ گیا بیٹھ گیا اور سننے لگا۔ چرواہا گاتا گیا۔ گاتا گیا۔ اور اجنبی مسافر کی باطنی خونخواریاں سوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ خوبصورت دکھائی دینے لگا اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے اُسے حسین پیدا کیا تھا۔ اور بچپن میں جب اس کے ماں باپ زندہ تھے تو افلاس اور تنگدستی کے باوجود بھی اس کی صورت دلکش تھی مگر تفکرات نے پیش از وقت اس کے شباب کو گھیر لیا۔ اور زندگی کی کلفتوں نے حسنِ مردانہ کی تمام رعنائیوں کو افسردہ کر دیا۔

اب کہ وہ بڑی توجہ سے چرواہے کے گیتوں کو جو قانونِ موسیقی کی پابندیوں سے آزاد تھے، بیٹھا سن رہا تھا۔ اور شاید اس کی بےفکر زندگی پر دل ہی دل میں رشک کھا رہا تھا کہ اُسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اور سخت دل انسان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو چار قطرے ٹپک پڑے۔ اور چشمہ کے پانیوں میں مل گئے ـــــ کاش حالات موافق ہوتے۔

بہتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو جو محنت سے اسی طرح سخت ہو چکے تھے جیسے لاپروائی سے اس کا دل، بڑھایا۔ تاکہ خشک ہونٹوں کو جن پر سفر کی کوفت اور راستے کی گرد سے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ تر کرے۔ کہ اس کی نگاہ ایک اور چرواہے پر پڑی جو انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ گویا اپنے دوسرے ساتھی کو اس کی ناپاک شخصیت سے

خبردار کر رہا تھا۔ بدبخت انسان کے ہاتھ جہاں تھے تھم گئے۔ اور وہ چہرہ جو تسکین کے نور سے منور ہو چلا تھا، باطنی کشمکش سے پھر تاریک ہو گیا۔ آنکھوں کی روشنی کی جگہ مایوسیوں کی تیرگی نے لے لی۔ اور اس کا بیدار دل پھر گمراہیوں کی ظلمت میں بھٹکنے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا مگر اس طرح کہ جسم فرطِ غضب سے کانپ رہا تھا۔ اور رخسارے انتقام کے جوش سے سرخ تھے۔ وہ بڑھتا اور نہ جانے غصہ کی حالت میں کیا کر گزرتا۔ کہ اچانک وہ چرواہا جس کے گیتوں نے اس کے احساساتِ مردہ کو کچھ وقت کے لئے زندہ کر دیا تھا "چور۔ چور" پکار اُٹھا اور وہ جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ صدا دم بھر فضا میں گونجی اور ٹکرا کے رہ گئی۔ اس کے بعد دو خوفزدہ انسانوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جو اس دہشت کی جگہ سے پرے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اور وہ تنہا رہ گیا۔

(۳)

شام ہو چلی تھی۔ جب وہ انسانوں کی ایک مختصر سی آبادی میں داخل ہوا۔ لمبے سفر کی تکان سے وہ چُور چُور ہو رہا تھا۔ اور اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا چشمہ سے روانہ ہونے کے بعد اس نے راستے میں ایک اور مقام پر ٹھہرنا چاہا۔ مگر اس کی گزشتہ زندگی کی بدنامیاں اس جگہ بھی پہلے سے موجود تھیں۔ قانون کے وردی پوش ملازموں نے اُسے پہچان لیا۔ اور وہ بچتا جھکتا پھر اس سفر پر روانہ ہو پڑا جو گویا کبھی ختم ہونے والا نہیں تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ جب آدم کے اس خانماں برباد فرزند نے ایک سرائے کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور نووارد اندر داخل ہوا۔ جاڑے کے دن تھے، کمرہ آگ سے روشن تھا۔ اور مسافر حلقہ کئے بیٹھے ہوئے آگ تاپ رہے تھے۔ سرائے کے مالک نے مشتبہ نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس سے پوچھا "تم کون ہو" اجنبی جھجکا، اور مصنوعی آواز میں بولا "م۔م۔ میں غریب راہرو ہوں"۔ "تم کیا چاہتے ہو" سرائے کے مالک نے سوال کیا۔ "کھانے کو روٹی اور پڑ رہنے کو بستر" اجنبی نے جواب دیا۔ اور بھوکی نگاہوں سے روشن چولہوں کی طرف دیکھا جہاں دیگچوں میں کھانا تیار ہو رہا تھا۔ سرائے کے مالک نے کہا "اور قیمت"؟ "قیمت میں ادا کر دوں گا" اجنبی نے جواب دیا۔ اور اس کے چہرے پر ایک غمگین سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اس نے اپنے جیب سے ایک لمبی بوسیدہ تھیلی نکالی اور سب کے سامنے اُسے زمین پر الٹ دیا۔ مختلف قسموں کے سکّے تھے۔ چاندی کے زیادہ اور تانبے کے کم۔ سرائے کا مالک مطمئن ہو گیا اور کہنے لگا "بیٹھ جاؤ۔ سب انتظام ہو جائے گا" تھکا ماندہ اجنبی بڑھا۔ ڈنڈا اور تھیلا گوشے میں رکھا اور ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پھیلا کر آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔

بات چیت جو نووارد کی آمد کی وجہ سے بند ہو گئی تھی۔ پھر شروع ہو گئی۔ ایک بولا "آج صبح مشہور بدمعاش فیروز رہا کر دیا گیا ہے۔ اور میں نے راستے میں سنا کہ وہ ادھر ہی آ رہا تھا" اجنبی چونک پڑا اور سننے والے خوف سے لرز گئے۔

اتنے میں سرائے کا دروازہ کھلا اور مقامی پولیس کا افسر اندر داخل ہؤا۔ سب دہشت سے اس کی طرف تکنے لگے۔ اور اجنبی کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

افسر نے سرائے کے مالک کے کان میں کچھ کہا اور اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ وہ رک رک کر بولا "خدا خیر کرے۔ فیروز یہاں پہنچ گیا ہے"۔

مسافر پھر کانپ اُٹھے اور اجنبی کا چہرہ اور تاریک ہوگیا۔

پولیس کا افسر چلا گیا سرائے کا دروازہ پھر ایک بار بند ہوگیا۔ اور کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ مگر مسافروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے کو شک اور خوف کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ دروازہ پھر ایک بار کھلا۔ اب کے گاؤں کا پہرہ دار تھا لالٹین اس کے ہاتھ میں تھی اور بندوق اس کے کندھے پر۔ وہ اس طرف بڑھا جہاں سرائے کا مالک بیٹھا ہؤا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے انگلی سے اجنبی کی طرف اشارہ کیا۔ اور آہستہ سے یہ کہہ کر چلدیا۔ "فیروز وہ ہے"۔ سرائے کے مالک کا رنگ پھر زرد ہوگیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہؤا آیا اور کانپتی ہوئی آواز میں اجنبی سے کہنے لگا۔ "دوست ادھر آؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔ دونوں ایک طرف جاکر کھڑے ہوگئے۔ تو وہ بولا "دوست کسی اور جگہ چلے جاؤ"۔ اجنبی نے متعجب ہوکر پوچھا "آخر کیوں"؟ سرائے کے مالک نے لفظوں پر زور دے کر جواب دیا "اسلئے کہ یہ جگہ شریفوں کے لئے ہے بدمعاشوں کے لئے نہیں"۔ اجنبی کچھ نہ بولا۔ اُس نے بڑھ کر اپنا ڈنڈا اور تھیلا اُٹھا لیا۔ اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ مگر اس کا چہرہ بھیانک اور ڈراؤنا تھا۔

(۴)

رات سرد اور تاریک تھی۔ اور بازار میں جہاں وہ اپنی تمام لاچاریوں سمیت مایوسی سے گھرا کھڑا تھا۔ بالکل خاموشی تھی جانوروں کو بھی گوشۂ عافیت میسر تھا۔ مگر آدم کا ایک بیکس فرزند پناہ کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا تھا۔ وہ کچھ دیر تو کھڑا رہا۔ گویا کچھ سوچ رہا ہے۔ اور پھر ایک جانب چل دیا۔ آبادی سے پرے ایک مکان سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ یہ بھی ایک سرائے تھی وہ اس طرف بڑھا۔ اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا مگر دربان نے اُسے پہچان لیا۔ اور فوراً دروازہ بند کردیا۔ اب وہ بالکل مایوس ہوگیا۔ اُدھر ہوا میں تیزی پیدا ہوگئی۔ اور وہ سردی سے کانپنے لگا۔ آزادی جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کبھی بار بار قانون شکنی کی تھی۔ اس وقت اُسے ایک بارِ گراں ثابت ہو رہی تھی۔ دنیا اس کے سامنے تھی مگر اس کی فراخ سطح پر سر چھپانے کے لئے اسے کوئی جگہ میسر نہیں تھی جیلخانہ کی چاردیواری جس کی تنگیوں میں اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ رہا ہونے کی آرزو میں گزارا تھا۔ اس وقت کیسی آرام دہ دکھائی دیتی تھی۔ اس کا زخمی دل تڑپ اٹھا۔ اور

اس کے ارادوں نے ساری کائنات سے بغاوت کی ٹھان لی۔ کاش وہ رہا نہ ہوتا۔ وہ مرتا۔ اس واسطے نہیں کہ آزاد مخلوق کے آزاد نشینوں کو آزمائے بلکہ اس لئے کہ روح اور جسم کی آزادی کی تمام آرزوؤں کو خود بخود اسیری کی تمام سختیوں کے حوالے کردے۔ مگر قید خانہ کے سنتری نے اُسے ٹوکا۔ اور بدقسمت انسان بیتاب ہوکر چلا اُٹھا "مجھے لے لو۔ کیونکہ آزاد دنیا نے مجھے لینے سے انکار کردیا ہے" سنتری بولا "دیوانے آدمی جاؤ۔ جرم کرو۔ اور اس مکان کے دروازے تم پر کھل جائینگے" یہ کہہ کر سنتری نے اُسے سختی سے پرے ہٹا دیا۔ گویا کہ وہ اُسے گناہ کی دنیا میں دھکیل رہا تھا۔

افسوس! بدنصیب کے لئے اس دوزخ میں بھی جگہ نہ تھی۔ جو صلح اور آشتی کے مدعی حکمرانوں نے مغلوب اور مقہور مفسدوں کو امن و امان کی تعلیم دینے کے لئے بنا رکھی تھی۔ ادھر لوگ اس کی گناہ آفرین جراتوں سے خائف تھے اور ادھر جرم کے گھر قید خانے کے دروازے اس پر اس لئے بند تھے۔ کہ وہ مجرم نہیں تھا۔ تو کیا اب وہ جرم کرے گا؟ یقیناً۔ اس کے لئے دنیا کی دلچسپیوں میں رکھا ہی کیا تھا۔ فضا طعن و تشنیع سے بھری پڑی تھی۔ اور دنیا کے رہنے والے اُسے نفرت و حقارت کی ٹھوکروں سے پامال کردینے کے لئے مستعد اور تیار تھے۔ وہ اب جیلخانے کو ہی اپنا مسکن بنائے گا۔ اور باقی ماندہ ناکارہ زندگی کی بے کار فرصتوں کو کسی جرم کی وساطت سے، روٹی اور پناہ کے عوض میں اسیری کے ہاتھوں فروخت کردے گا۔

وہ وہاں سے ہٹ آیا کہ کہیں تنہائی میں بیٹھ کر جلدی جلدی اس طریق انتقام کو سوچے۔ جو وہ نسل انسانی کے کسی فرد سے ان بدسلوکیوں کی وجہ سے لینا چاہتا تھا۔ جن کا تجربہ دن بھر اس نے کیا تھا۔ راستے میں ایک عبادتگاہ تھی جہاں آدم کی نیک اولاد اپنی نیکیوں کے انعام کی آرزو میں مصروف نیاز و عبدیت تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان پر ہنسا۔ اور نفرت سے منہ پھیر کر چلا گیا۔

آبادی سے باہر سڑک کے کنارے پر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ بھوک کی تکلیف کو بھول گیا۔ اور موسم کی سختی سے بے پروا ہوکر سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ جاندار مخلوق کی مصروفیتوں پر نیند کے گہرے پردے پڑ گئے اور جرم اپنی تمام ہولناکیوں سمیت جاگ اُٹھا۔

(۵)

آبادی کی امن سوز کشمکش سے پرے ایک باغ تھا۔ جہاں کسی خدا پرست نے تنہائی کی پاکبازیوں کو شور و شغب کی آلائشوں سے بچانے کے لئے ایک مکان بنا رکھا تھا۔ اس مکان میں جو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہر آنے والے کو دعوت دینے کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ ایک حجرہ تھا جسے اس خدا پرست انسان نے اپنی خلوت نشینی کے لئے مخصوص

کر دیا تھا۔ وہ دن بھر خلق خدا کی خدمت کرتا۔ اور جہاں جاتا تسلیوں کو ساتھ لے جاتا۔ دکھے ہوئے دل اس کی غمگین سکراہٹ سے راحت پاتے اور رونے والی آنکھیں اس کے تسکین بخش پیاموں سے خشک ہو جاتیں۔ اس کی زندگی کے دن دنیا والوں کی محبت میں گزرتے۔ اور رات کی فرصتیں دنیا کو پیدا کرنے والے کی محویت میں بسر ہوتیں۔ اُسے انسان کی کمزوریوں پر ترس آتا تھا اور اس کی خطاؤں پر روتا۔ کیونکہ اس کے معصوم دل کی فراخیوں میں نفرت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور اس کی فیاضیاں نیک و بد کی تمیز سے یکسر آزاد تھیں۔ اس روز کہ ایک بدبخت نجات کے راستے کی تلاش میں بدیوں کی تیرگی میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ وہ کسی درد رسیدہ کو تسکین اور محبت سے سیراب کر کے بہت رات گئی واپس لوٹا۔ دسترخوان پر بیٹھا تھا کہ کسی نے آہستہ سے دروازہ کو دھکیلا۔ وہ بولا "اندر آجاؤ" اور کچھ دیر کے بعد فیروز اس کے سامنے تھا۔ ایک اجنبی مسافر کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پکارا "خادم آپ کے لئے آگ جلاؤ۔ اوہ آپ تو سردی سے کانپ رہے ہیں"۔ فیروز جس کی نگاہوں میں دنیا میں انسانوں کی بجائے سانپ اور بچھو آباد تھے ششدر رہ گیا۔ اور بھیانک آواز سے کہا "تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں"۔ "آپ میرے بھائی ہیں" اس نے جواب دیا۔ فیروز نے کہا "تم دھوکے میں ہو" میں ایک سیاہ کار مجرم ہوں۔

اس نے بےتکلفی سے کہا "نہیں آپ میرے بھائی ہیں۔ اور اُسے اپنی جگہ پر بٹھایا"

فیروز نے کہا "سُن تو لو۔ تم ایک ایسے آدمی کو پناہ دے رہے ہو۔ جو بڑا ......"

نیک دل آدمی نے پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا "انگیٹھی آپ کے پاس رکھ دو۔ لیجئے یہ کمبل ہے اوڑھ لیجئے"

خوفناک مجرم کہنے لگا "تم عجیب آدمی ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میں بڑا خطرناک آدمی ہوں"

وہ آہ بھر کر بولا "خدا آپ پر رحم کرے۔ اور پکارا "خادم کھانا لاؤ۔ آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی"

فیروز نے کہا "سنو تو سہی"

نیک دل آدمی نے جواب دیا "ہم تاریک دنوں کا کیوں ذکر کریں۔ جب کہ زندگی کی فرصتیں محبت کے نور سے منور کی جا سکتی ہیں"

فیروز نے جوش میں آ کر کہا "محبت ؟ محبت کا تو نام ہی نہ لو۔ میں نے اپنے ہم جنسوں سے پناہ کی التجا کی۔ اور انہوں نے مجھے دھکیل دیا۔ میں بھوکا تھا۔ میں نے روٹی مانگی۔ اور انہوں نے مجھے پتھر دیئے۔ میں سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اور انہوں نے مجھے سرد ہوا کی تندیوں کے حوالے کر دیا"

نیک بخت آدمی نے کہا "خدا ہم سب کو ہدایت دے"

فیروز بولا "خدا؟ مجھ پر دن بھر ظلم ہوتا رہا۔ اور تمہارا خدا خاموشی سے دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی مخلوق نے گالیاں دیں اور

وہ سنتا رہا۔ اس کے بندے میرے ہاتھوں سے اس کا پیدا کیا ہوا رزق چھینتے رہے۔ اور وہ نہ بولا۔ میں دربدر بھٹکتا پھرا۔ اور اس نے میری دستگیری نہ کی۔

میں نے اپنی مایوسیوں میں رو رو کر اُسے پکارا۔ اور اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ خدا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خدا پرست بات کاٹ کر بولا "دنیا نے تمہیں چھوڑ دیا۔ تو غمگین مت ہو۔ کیونکہ وہ تمہیں قبول کرے گا"

فیروز کہنے لگا "مگر تم ہو کون۔ تم مجھ سے کیوں نفرت نہیں کرتے۔ حالانکہ تمہارے ہم جنس مجھ پر تھوکتے ہیں۔ تم مجھے کیوں پیار کرتے ہو جب دوسرے مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ تم مجھے کیوں آپ آپ کہتے ہو۔ جب اور لوگ مجھے گالیاں دیتے ہیں"

پیار کے لہجے میں رحمدل آدمی نے کہا "اس لئے کہ خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے"

فیروز بولا "تم یقیناً اس دنیا کے رہنے والے نہیں ہو۔ جاؤ۔ جہاں سے آئے ہو چلے جاؤ پیشتر اس کے کہ انسان کی بدسلوکیاں تمہاری زندگی کو تاریک کر دیں"

رحمدل آدمی نے کہا "محبت سب تاریکیوں کو بھگا دیتی ہے"

فیروز نے جواب دیا "میں نے محبت کی۔ مگر تمہارے خدا نے اس کے عوض میں مجھے قید میں پھنسایا"

خدا پرست نے مسکرا کر کہا "میرے عزیز بھائی خدا اپنے بندوں کی بہتری چاہتا ہے۔ وہ بے انصاف نہیں ہے"

فیروز نے قہقہہ لگا کر کہا "اچھا انصاف ہے"

بھلا آدمی پھر مسکرایا اور کہنے لگا "محبت کیجئے آپ جان جائیں گے۔ آپ دکھوں کی سرزمین سے آرہے ہیں۔ جہاں نامہربانیوں کی حکومت ہے۔ اور آپ کا دل زخمی ہے۔ ورنہ یہ دنیا محبت سے معمور ہے۔ محبت کیجئے۔ اور آپ سب کچھ پالیں گے"

فیروز خاموش ہو گیا اور کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دسترخوان چنا گیا۔ اور دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میزبان نے کہا "رات بہت گزر گئی۔ اور آپ تھکے ہوئے ہیں۔ آئیے آرام کریں" اور دونوں کمرے میں چلے گئے۔

(۶)

سالہا سال تک سخت اور ننگی زمین پر سونے کے بعد فیروز کو چارپائی اور نرم بستر میسر آیا۔ تو پڑتے ہی سو گیا۔ آدھی رات سے کچھ اوپر گزر رہی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اور ناکام زندگی کی ناکامیاں اپنے اصلی رنگوں میں یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ بچپن کا زمانہ جب خوشی اور مسرت کی پریاں اُسے اپنے کاندھوں پر اڑائے پھرتی تھیں۔ اپنی

تمام بے فکریوں کے ساتھ آن موجود ہوا۔ اور سنگدل انسان کی آنکھیں غم کے آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ پھر یتیمی کی سختیاں ڈراونی اور بھیانک شکلوں میں ظاہر ہوئیں۔ اور وہ لرز اُٹھا۔ اب اس رات کا منظر اس کے سامنے تھا جب اس نے بھوک سے روتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر۔ گھر کو اس ارادے سے چھوڑا کہ گاؤں کے نانبائی کی دکان سے روٹیاں چرالائے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو جیل کی چاردیواری میں پایا۔ اور اس نے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ مگر سختی کے زمانے کی یاد نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور جبر و اقتدار کی کارفرمائیاں دہشت اور خوف کی سہناک صورتوں میں اس کے سامنے آگئیں۔ اس کے بعد دن بھر کے تلخ تجربے آئے۔ اور گزرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو حجرے میں آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ اب وہ اپنے میزبان کے حالات پر غور کرنے لگا۔ یہ کون ہے کیا کرتا ہے۔ یہاں کیوں رہتا ہے؟" یہ سوال تھے۔ جو بار بار وہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا اور کوئی تسلی بخش جواب نہ پاکر جھنجھلا کر رہ جاتا تھا۔

"غالباً کوئی دولت مند آدمی ہوگا" اس نے سوچا اور ساتھ ہی اُسے وہ بڑا بھاری صندوق یاد آگیا۔ جو حجرے کے کونے میں رکھا تھا۔ "اس میں کیا ہوسکتا ہے۔ وہ غور کرنے لگا" مال و دولت" ـــــ ممکن ہے۔ مگر نہیں۔ دیکھوں توسہی، اگر ایسا ہو تو ـــــ" اس کا پاپی دل اب ایک کش مکش میں پڑ گیا۔ "تو چپکے سے اٹھا کر چلدوں" وہ اپنے ارادے کو مضبوط بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ضمیر کی بیداری نے گناہوں کے موٹے پردوں کے پیچھے سے جھانکا۔ اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"نیک آدمی ہے" وہ سوچنے لگا، "نہیں احمق ہے" کچھ دیر تامل کے بعد اس نے اپنے جی میں کہا "صبح کو جب مجھے نہ پائیگا۔ اور صندوق کو خالی دیکھ کر اپنا سر پیٹ لے گا۔ تو اُسے دنیا کا پتہ چل جائیگا ـــــ مگر یہ ضرور نہیں کہ صندوق میں زر و مال ہی ہو۔ دیکھوں توسہی" یہ سوچ کر وہ اٹھا۔ پاس کی چارپائی پر میزبان منہ لپیٹے پڑا تھا۔ اور اس کے تنفس کی آواز اس میٹھی نیند کا پتہ دے رہی تھی۔ جو صرف ان لوگوں کو میسر آسکتی ہے جنہیں نفس کی پاکیزگی اطمینان کی دولت سے مالامال کردیتی ہے۔ چراغ کی مدھم سی روشنی میں خاموشی سے سرکتا ہوا وہ صندوق کے پاس پہنچ گیا۔ اور بڑی احتیاط سے کہ شور نہ ہو۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا قفل کوئی نہ تھا۔ اُسے حیرت ہوئی مگر سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ڈھکنا اٹھایا۔ اور دیکھنے کے لئے جھک گیا۔ سونے کے کچھ برتن تھے اور چاندی کا ایک آفتابہ۔

میزبان بے خبری میں سویا پڑا تھا۔ نوکر بھی محو خواب تھا۔ اُسے کون دیکھتا تھا ـــــ خدا ـــــ اور وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ پھر آہستہ سے اس نے برتنوں کو نکالا۔ خاموشی سے حجرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اور باہر کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں اس کا ڈنڈا اور تھیلا پڑا تھا۔ یہاں بھی خاموشی تھی۔ اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور باہر نکل آیا۔

اس خیال سے کہ باغ کا بڑا دروازہ مقفل ہوگا۔ وہ باغ کی دیوار کی طرف لپکا۔ دیوار اونچی تھی۔ اور پھاندنا ناممکن۔ ڈنڈے سے اس نے چوٹی کی اینٹیں سرکائیں۔ اور پھاند کر باہر آرہا۔

(۷)

صبح ہوئی، اور دنیا کی وسعتیں بیداریوں سے آباد ہوگئیں۔ خدا پرست نے مہمان کے بستر کو خالی پایا۔ تو خیال کیا کہ باہر باغ میں ہوگا۔ مگر جب سورج کی روشنی پست و بلند کو یکساں روشن کرچکی تو اُسے تشویش ہوئی۔ اور وہ خود اس کی تلاش میں باغ میں داخل ہوا۔ احسان فراموش مسافر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہاں ٹوٹی ہوئی دیوار کی شکستگی زبان حال سے کسی کی فرار بے باکیوں کی داستان سنا رہی تھی۔ جانے والے مسافر کی نادانیوں اور جلد بازیوں پر افسوس کرتے ہوئے کہ اس نے ناحق دیوار پھاندنے کی تکلیف اٹھائی تھی کیونکہ باغ کا پھاٹک ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ حجرے کی طرف واپس لوٹا۔ صندوق کھلا پڑا تھا اور سونے کے برتن غائب تھے۔ اُسے سیاہ دل مسافر پر رحم آگیا۔ اور اس کی غمگین آنکھیں محبت کے آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ "افسوس ایک انسانی روح ضائع ہوتی جارہی ہے" اس نے اپنے جی میں کہا اور مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

دوپہر ہونے کو تھی۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں باغ کی روش پر ٹہل رہا تھا۔ کہ اس نے چار آدمیوں کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ پولیس کے تین سپاہی کسی مجرم کو کشاں کشاں لئے آرہے تھے۔ یہ فیروز تھا۔

اس نے اپنے رات کے مہمان کو پہچان لیا۔ ایک آہ بھر کر آگے بڑھا اور کہنے لگا "میرے عزیز دوست شکر ہے کہ آپ آگئے۔ میں نے تو چاندی کا لوٹا بھی آپ کو دے دیا تھا۔ مگر جلدی میں آپ لے جانا بھول گئے"

اس پر فیروز نے اپنی حیرت اور تعجب سے بھری ہوئی نگاہیں اٹھائیں اور اس کا چہرہ نیکی اور پاکیزگی کے حضور میں ندامت سے سرخ ہوگیا۔

ایک سپاہی بولا "تو جناب کیا پھر جو یہ کہتا ہے۔ صحیح ہے۔ ہمیں اُسے بھاگتے دیکھ کر شبہ ہوا۔ اور اس لئے ہم نے اس کو گرفتار کرلیا۔ اس کے پاس برتن تھے ——— " وہ کچھ اور کہنے کو تھا کہ پاکباز بزرگ بات کاٹ کر بولا۔

"ہاں۔ انہوں نے جو کچھ کہا درست کہا"

سپاہی نے کہا "تو پھر ہم اُسے چھوڑ دیں"

اس نے جواب دیا۔ "بے شک"

اس پر سپاہیوں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اور سلام کرکے چلے گئے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور ایک بے معنی سی آواز میں گویا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ چلّا اٹھا "کیا میں جاؤں؟"

پاکیزہ نفس آدمی نے کہا "ہاں۔ تم آزاد ہو۔ مگر جانے سے پہلے اپنا چاندی کا لوٹا لیتے جاؤ"
یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اندر گیا۔ اور لوٹا لاکر فیروز کے ہاتھ میں دے دیا۔ فیروز نے لوٹا لے لیا۔ مگر اس کی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ اور دل نہ جانے کہاں تھا۔

خدا پرست کہنے لگا "خدا حافظ میرے نیک دوست جاؤ۔ آیندہ جب آپ اس مکان سے باہر جانا چاہیں تو دیوار پھاندنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سامنے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے"

فیروز جہاں تھا کھڑا رہ گیا۔ میزبان کے نیک سلوک نے اُسے مرعوب کر دیا تھا۔ اس کی پیشانی پشیمانیوں کے پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اور اس کا جسم باطنی جذبات کی شورشوں سے لرز رہا تھا۔ اس کی جسمانی طاقت ضرب المثل تھی۔ مگر نیکی کی زبردست قوتوں کا مقابلہ کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ روشن چہرے والے زاہد نے ایک حسرت بھری نگاہ اپنے کانپتے ہوئے بھائی پر ڈالی اور کہنے لگا "یاد رکھو۔ تم نے اب مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ ان برتنوں کو فروخت کرکے ایماندارانہ زندگی بسر کرو گے"

فیروز جس نے جہاں تک اُسے یاد تھا کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔ خاموش کھڑا رہا اور خدا پرست کہتا گیا "میرے عزیز بھائی فیروز میں نے تمہاری روح شیطان سے چھین کر نیکی کے فرشتوں کو دے دی ہے۔ آج سے تمہارا جسم اپنے بھائیوں کی خدمت کے لئے وقف ہو چکا ہے۔ تمہارا دل اب اپنی مصیبتوں پر نہیں کڑھے گا۔ بلکہ دوسروں کی تکلیفوں کو دیکھ کر تڑپا کرے گا۔ الوداع تم اب خدا کی بادشاہت میں ہو" فیروز نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور گرتا پڑتا باغ سے نکل گیا۔

(۸)

تمام کائنات دھوپ کی آغوش میں پڑی مُسکرا رہی تھی۔ اور اگرچہ خزاں کا موسم تھا۔ اور درخت سبزی کے چشم پرور جلووں سے محروم تھے۔ تاہم اس بے رونقی میں بھی ایک تمکنت موجود تھی۔ اور خزاں کی خودداریاں ہر جگہ یکساں مسلط تھیں۔ بزم قدرت اپنی سنسان دلفریبیوں سے معمور تھی۔ اور موسم کی اداسیاں ہر طرف روشنی میں بھاگی پھرتی تھیں۔ فیروز سر جھکائے لڑکھڑاتا ہوا نہ جانے کہاں چلا جا رہا تھا۔ اور وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ کھیتوں میں چلا گیا۔ اور جو راستہ اپنے سامنے پایا اسی پر ہو لیا۔ بار بار وہ ایک ہی راستے پر سے گزرا مگر اُسے خبر نہ ہوئی۔

مویشیوں نے جو ادھر اُدھر کھیتوں میں چر رہے تھے۔ اس کی وارفتگیوں سے بیدار کرنے کے لئے اسے اپنی اپنی زبان میں مخاطب کیا۔ مگر وہ چلتا گیا۔ پرندے بے برگ و بار درختوں پر سے چہچہائے۔ کہ اس کی محویتوں کی یکسانیت کو تبدیلیوں کا پیغام پہنچائیں۔ مگر اس کی گردشوں میں فرق نہ آیا۔ ہواؤں نے اُسے بڑھ بڑھ کر چھنگایا۔ مگر اس کی بیخودانہ

کیفیتوں نے پرواہ نہ کی۔ اور وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوگیا اور شام کی سیاہی نے دنیا کو چھپا لیا۔ اب وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور اس کی ناکارہ زندگی کی تاریکیاں ڈراونی اور بھیانک شکلوں میں اس کی آنکھوں میں پھرنے لگیں۔ وہ ان خوفناک نظاروں کے دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا۔ اس کے دل کی سختیاں اس کے اختیار میں نہ رہیں۔ وہ ضبط نہ کرسکا اور عورتوں کی طرح دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ پشیمانی کا ہر آنسو جو اس کی آنکھوں سے نکلا اس کے دل کی تاریکیوں کو دھوتا چلا گیا۔ اور اس کا قلب ندامت کی روشنی سے منور ہوگیا۔

وہ اپنی زندگی کی ہولناکیوں کو جان گیا۔ اور اپنی روح کی ناپاکیوں کو محسوس کرنے لگا اس نے اس دھندلی مگر نئی روشنی میں باقی ماندہ زندگی کے راستے کو دیکھ لیا۔ جو اگرچہ کٹھن تھا۔ تاہم ایماندارانہ جدوجہد سے روشن ہو رہا تھا۔ وہ اب سچ مچ خدا کی بادشاہت میں داخل ہوگیا تھا۔

نہ جانے وہ کب تک بیٹھا روتا رہا۔ اور کب اور کہاں چلا گیا۔ مگر دوسرے دن گاؤں کے ایک کسان نے بیان کیا۔ کہ اس نے بہت سویرے کسی آدمی کو خدا پرست کے مکان کے سامنے سربسجود دعا مانگتے دیکھا تھا۔

ماخوذ — امیر حسن ناز

جستجو

میں آہوئے مشکیں کی طرح تاریک جنگل میں دیوانہ وار اپنی خوشبو کے پیچھے بھاگتا ہوں۔

رات جو سہانی ہے مئی کی رات ہے۔ اور ہوا جو چل رہی ہے، جنوب کی ہوا ہے۔

میں راستہ سے بھٹک کر اس کو ڈھونڈھتا ہوں جس کو میں نہیں پا سکتا اور اس کو پاتا ہوں جس کو میں نہیں ڈھونڈتا

میری آرزو کا پیکر میرے دل سے باہر نکلتا ہے۔ اور میرے سامنے رقص کرتا ہے

میں اس کو پکڑنا چاہتا ہوں مگر وہ پیکر نور میرے آگے آگے بھاگتا ہے۔ اور میرے ہاتھ نہیں آتا۔

میں اس کو ڈھونڈھتا ہوں جس کو میں نہیں پا سکتا۔ اور اس کو پاتا ہوں جس کو میں نہیں ڈھونڈتا۔

ٹیگور

جذبات

دیکھیے دشت میں کیا حشر بپا ہوتا ہے
عازمِ راہ کوئی آبلہ پا ہوتا ہے!

ڈوبنے والے بھی ساحل پہ پہنچ جاتے ہیں
کون دریائے حقیقت میں فنا ہوتا ہے؟

میں نے مانا، ہے غلط فلسفۂ جذب و کشش
کون پھر دیدۂ عاشق میں چھپا ہوتا ہے؟

درپئے پرسشِ آزارِ محبت کیوں ہے؟
چارہ گر درد مرا اور سوا ہوتا ہے

جس کا دم نام پہ ٹوٹے ترے اے بانیٔ جَور!
مٹ کے وہ بادشہِ ملکِ بقا ہوتا ہے

کس کا رہتا ہے تصوّرِ دلِ محزوں میں مدام
کون آنکھوں میں مری جلوہ نما ہوتا ہے؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوتا ہے؟
حق میں دشمن کے مرا نالہ دعا ہوتا ہے!

کر رہے ہیں وہ دلِ زار کے زخموں کا شمار
آج اندازۂ اربابِ وفا ہوتا ہے!

رہِ امید میں کیا غیر کی حاجت مجھ کو؟
نقشِ پا آپ مرا راہ نما ہوتا ہے!

کاٹنا قیدِ مصیبت کا ہے آساں کوئی
مر کے صادق کہیں انساں رہا ہوتا ہے

صادق ایوبی

محفلِ ادب

زندگی

ذرے ذرے میں رواں روحِ رواں پاتا ہوں میں
زندگی کو ایک بحرِ بیکراں پاتا ہوں میں

غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر
پتے پتے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں میں

زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتارِ نفس
بوئے گل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں میں

برق کی جنبش ہو، یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموج میں نشاں پاتا ہوں میں

چپہ چپہ اس مکاں کا ہے مکینوں سے بھرا
زندگی کو شش جہت میں حکمراں پاتا ہوں میں

اس سے آگے بھی ہیں جن میں اڑتی پھرتی بے شمار
طائرِ سدرہ کا جس جا آشیاں پاتا ہوں میں

ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں
اس کی رگ رگ میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں

چار سو راہِ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر
زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں
آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں

الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں
زندگی کے انقلاب ان میں نہاں پاتا ہوں میں

وحید الدین سلیم
"اردو"۔ اورنگ آباد (دکن)

ماں

دنیا میں ایسی کونسی محبّت ہے۔ جس کو ماں کی محبت سے مشابہت دی جائے۔

تم کو ہفت اقلیم کی حکومت ماں کی محبت کے عوض ملتی ہو۔ تو حکومت پر تھوک دینا۔ حکومت کی کوئی خوشی ماں کی خوشی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تم کو دنیا میں بہشت دی جائے اور اس کے بدلے میں ماں کی شفقت لی جائے تو جنت سے منہ پھیر لینا

ماں کی گود میں فردوس سے زیادہ بہار ہے۔

آسمان کی جنت ماں کے قدموں تلے مشہور ہے۔ میں کہتا ہوں وہ سراپا بہشت ہے۔ اس کی آنکھوں میں جنت ہے۔ اس کی باتوں میں جنت ہے۔ وہ ایسی جنت ہے جس کی نظیر آسمان کی جنت میں ملنی دشوار ہے۔

اے خدا! تو نے سب کچھ دیا۔ اگر ماں نہ دی، مجھے کہنے دے کہ کچھ نہیں دیا۔ ماں نہیں تو جینے کا مزا نہیں۔ مرنے کا مزا نہیں، ہنسنے کا مزا نہیں، رونے کا مزا نہیں۔ وہ ہو تو دنیا کے ہر غم میں راحت ہے۔ ہر تکلیف میں آسائش ہے۔

مجھے بتاؤ تم میں کون کون شخص خوش نصیب ہے۔ جس کی ماں زندہ ہے۔ میں اس پر ساری کائنات صدقہ کرکے پھینک دوں۔ اور کون کون ایسا بدنصیب ہے۔ جس کو ماں کی نعمت میسّر ہے اور وہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ سامنے آئے۔ میں اس کو دونوں جہان سے مٹا دوں۔

"نور جہاں" امرتسر

قلم

مہلک ہتھیاروں کا دور ختم ہوا۔ اور لوہے کے قلم کا زمانہ آیا۔ وہ قلم جس میں توپوں اور بندوقوں اور پستولوں سے بہت زیادہ لوہا خرچ ہوتا ہے۔ اور حساب لگایا گیا ہے کہ لوہے کی چھوٹی چھوٹی پتیاں اتنی کثیر تعداد میں تیار ہوتی ہیں۔ کہ اگر تمام دنیا کی توپیں اور بندوقیں اور آہنی ہتھیار ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور دوسرے پلڑے میں یہ پتیاں رکھی جائیں تو پتیوں کا پلڑا جھک جائیگا۔ کیونکہ ان کا وزن بہت زیادہ ہوگا۔

لوہے کی قلم کی تحریر اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔ نیک کاموں کے لئے بھی ہوتی ہے اور بد کاموں کے لئے بھی۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ قلم مہلک ہتھیاروں سے اچھا ہے۔ اور اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ کیونکہ قلم بھی ایسے حروف اور ایسی عبارتیں لکھتا ہے جو عالم اخلاق میں شدید گناہ ہیں۔ تاہم قلم کی نیکیاں گناہوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔

قلم عدالتوں میں فیصلے لکھتا ہے۔ اور ظالموں سے مظلوموں کے حق دلواتا ہے۔ قلم دل کا اور دماغ کا ترجمان بنتا ہے۔ اور انسان کے خیالات و جذبات کو کاغذ پر بشکل حروف نمایاں کرتا ہے۔ قلم ہی وہ چیز ہے جس سے محبت اور نفرت، شادمانی اور رنج والم کی کیفیات ظاہر کی جاتی ہیں۔

ایک عورت اپنے گھر میں بیٹھی ہے اور اس کے سامنے برسات کے موسم میں مزیدار میٹھی مکیاں رکھی ہیں۔ اسکے

دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر میرا شوہر بھی اس وقت یہاں موجود ہوتا ہے۔ تو وہ بھی میٹھی ٹکیاں کھاتا۔ اور ان کی تعریف کرتا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے لوہے کا قلم ہاتھ میں لیا۔ روشنائی میں ڈبویا اور کاغذ پر اپنے شوہر کو یہ خط لکھ دیا۔

"یہ میٹھی ٹکیاں جو اماں جان نے بڑے چاؤ سے پکائی ہیں کھا نو رہی ہُوں مگر رہ رہ کر تم یاد آ رہے ہو"

حسن نظامی — "نظام المشائخ" دہلی

جوسما

ایک ہیئت دان کا قول ہے، کہ آسمان کی فرضی تصویر جو مثل خلائے گنبد کے زمین کے افق سے افق تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے عظیم الشان اور نہایت عظیم الشان ہے۔ اور میں دل سے چاہتا ہوں کہ میں آسمان کے اس تصور سے آگے نہ بڑھا ہوتا۔ لیکن اصلی آسمان ایک پر ہیبت چیز ہے۔ وہاں اول ایک ایسی وسعت ہے جہاں سے شان و رفعت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسی وسعت آتی ہے جہاں سے عظمت و جلال شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جہاں سے قہارانہ متانت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایسی وسعت نمایاں ہوتی ہے۔ جہاں سے ہیبت شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایسی وسعت شروع ہوتی ہے جہاں سے وحشت کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس وسعت سے وسعت عالم کا خفیف سا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر تم خوش و خرم ہو اور ایسا ہی رہنا چاہتے ہو تو علم ہیئت کے مطالعہ کا نام نہ لو۔ تمام علوم و فنون میں علم فلکیات سب سے زیادہ دہشت خیز اور وحشت انگیز ہے۔ لیکن اگر تم اپنے مستقبل کے لئے مضطرب و پریشان ہو تو فوراً علم ہیئت کا مطالعہ کرو۔ اور تمہاری پریشانیاں کم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ کمی عجیب و غریب ہوگی یعنی دنیا کی ہر چیز کی اہمیت و عظمت تمہاری نظر میں گھٹ جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ علم ہیئت اگر آب حیات ہے تب بھی نہایت خوفناک ہے"!

"معارف" ۔ اعظم گڑھ

چین کی شاعری

میرالباس

میرا لباس اس وقت سے چلا آتا ہے جب "چن" خاندان کا ایک بادشاہ حکمران تھا۔

اس کثرت سے حسین عورتوں نے اُسے رقص کے لئے پہنا کہ موسیقی سانپ کی طرح بل کھائے اس کی تہوں میں سما گئی ہے اور اس کثرت سے نسیمیں اس میں سے گزری ہیں کہ یہ ایسا شفاف بن گیا ہے جیسے تیتری کا پر۔

سدا بہار پھول

میں نے انار کے پیڑ سے ایک پھول توڑا۔ اور اپنی محبوبہ کو پیش کیا جس کا منہ ایسا ہی نازک، ایسا ہی سرخ ہے

جیسا یہ انار کا پھول ہے۔

میں نے گھونسلے سے ایک سیاہ پروں والی ابابیل پکڑی۔ اور اپنی محبوبہ کو پیش کی جس کے ابرو ابابیل کے پروں جیسے ہیں۔

دوسرے ہی دن انار کا پھول مرجھا گیا۔ اور ابابیل نیلی پہاڑی کی طرف دیکھتی ہوئی، کھڑکی کی راہ سے اڑ گئی۔
مگر میری پیاری کے ہونٹ سدا سرخ رہتے ہیں۔ اور اس کے سیاہ ابرو کبھی نہیں اڑتے۔

"مخزن" لاہور

کنفیوشس کے اقوال

میرا وطن مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہے۔

میں بھوک کی تکالیف برداشت کرتا ہوں اور حصول علم کی خوشی میں اپنے مضمون کو بھلا دیتا ہوں۔ اور اس سلسلہ میں مجھے اپنے بڑھاپے کا بھی خیال نہیں آتا۔

میں نہ علم حاصل کرنے سے تھکتا ہوں اور نہ لوگوں تک حق بات پہنچانے سے۔

بہ نسبت دوسروں کے اپنی ذات سے زیادہ امید نہ رکھو۔

ہم عوام کو انصاف کی پابندی کے لئے مجبور کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے ان میں محبت پیدا نہیں کر سکتے۔

نیکی پیدا نہیں ہوتی۔ علم حاصل نہیں کیا جاتا۔ انصاف و مساوات کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا
بدمعاش کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ . . . . . یہی میرا رنج و غم ہے۔

اعلیٰ درجہ کا عقلمند، اور ادنیٰ درجہ کا بیوقوف کبھی اپنی فطرت تبدیل نہیں کر سکتے۔

میں انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو راز کا افشا کر کے اپنے آپ کو صاف گو کہتے ہیں۔

"نیرنگِ خیال" لاہور

ضبطِ گریہ

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پہ ۔۔۔ سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو کو دل ہو آئینہ ۔۔۔ ستارے توڑ لے اور آفتاب پیدا کر

"مجلہ عثمانیہ" حیدر آباد دکن

تبصرہ

"تجلّی" - مولوی محمد سردار علی صاحب کی ادارت میں ہر سہ ماہی کو کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد دکن شائع ہوتا ہے حجم عام طور پر ۹۶ صفحے سے کم - اور ۱۰۰ صفحے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سالانہ قیمت دو روپے اور فی پرچہ ۱۲ مقرر ہے۔ اس پرچے میں علمی و ادبی مضامین درج ہوتے ہیں۔ اس وقت اکتوبر کا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ اس نمبر میں یوں تو سب ہی مضمون بہت عمدہ ہیں۔ لیکن "مدرسہ نظامیہ بغداد اور اس کے اساتذہ" "غزنوی دور کا آغاز اور ایرانی علم و فضل"، اور "ہیرامن دہلوی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہماری رائے میں یہ رسالہ ہندوستان کے بہترین رسالوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

"آفتاب" ہفتہ وار۔ مقام اشاعت نمبر ۲ گنگا دھر بابو لین۔ بھو بازار۔ کلکتہ۔ زیر تبصرہ "آفتاب" کے دور جدید کا چوتھا پرچہ ہے۔ یہ مصوّر رسالہ جناب چراغ حسن صاحب حسرت کی ادارت میں شائع ہوتا ہے جو ایک نکتہ رس شاعر اور ادیب ہیں۔ اس وقت الہلال کے بعد ہفتہ وار اخباروں میں یہی ایک ہے جو ادبی حیثیت سے نہایت بلند پایہ رکھتا ہے۔ اس میں ہر ہفتہ ٹیگور۔ کانن ڈایل اور ایڈگر ایلن پو کے بہترین افسانوں کے تراجم۔ دلکش نظمیں اور عمدہ علمی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ اور تصویروں کا انتخاب بھی اچھّا ہوتا ہے۔ سالانہ قیمت للعہ ہے۔

"آئینہ" - انجمن آئینہ ادب کانپور کا ماہوار صحیفہ ہے جس کے ایڈیٹر ابو الفاضل راز چاندپوری ہیں۔ جناب راز سے "ہمایوں" کے ناظرین اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کا ذوق علم و ادب نہایت ہی سلیم واقع ہوا ہے۔ یہ رسالہ ان کی رنگین تحریر کا ایک دلکش مرقع ہے۔ سالانہ قیمت عہ ہے مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیے منیجر رسالہ "آئینہ" ماڈل پرنٹنگ پریس مسٹن روڈ کانپور

"پیام تعلیم" - یہ پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ ۲۹۔ اکتوبر کا پرچہ "تاسیس نمبر" تھا۔ تعلیمی مسائل پر اس میں نہایت عمدہ مضامین درج ہیں۔ خصوصاً خواجہ غلام السیدین صاحب کا مضمون "تعلیم اور زندگی" رہنمایان قوم کی دس تصویریں بھی اس نمبر کو زینت دے رہی ہیں۔ سالانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے

"مشیر صحت" - ریلوے روڈ لاہور - ماہوار طبی رسالہ ہے۔ جو ڈاکٹر امان اللہ صاحب ایم۔ بی ہومیو کی ادارت میں شائع ہوتا ہے طبی معلومات کے علاوہ اس میں کچھ علمی و ادبی مضامین بھی درج ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے ناظرین بھی اس کو پڑھ کر اپنے طبی معلومات میں اضافہ کریں گے۔ سالانہ قیمت عمر ہے۔

۱ - "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے +

۲ - علمی و ادبی تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں +

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴ - ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵ - خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے +

۶ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا +

۸ - جواب طلب امور کیلئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے +

۹ - قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے علاوہ محصول ڈاک (فی پرچہ ۸؍ نمونہ ۶؍) +

۱۰ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے +

۱۱ - خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیئے +

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۴ - مزنگ روڈ - لاہور

منشی علم الدین منیجر رسالہ ہمایوں نے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپوا کر شائع کیا